جنوری 2015
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
سالِ نو نمبر
PDFBOOKSFREE.PK

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نگین غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----	700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ---	روپے

مستقل سلسلے

جنوری 2015
جلد 29 شمارہ 5
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲۱ پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع جنوری 2015ء کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ایک اور 16 دسمبر دلوں میں سیل درد بھر گیا۔ یہی دن تھا جب پاکستان دولخت ہوا تھا۔ اس سانحے نے پوری قوم کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ہر آنکھ اشکبار ہے۔ ہر دل دکھ سے بوجھل ہے۔ ان معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟ یہ کس گناہ کی پاداش میں مارے گئے۔ انہیں کس جرم کی سزا دی گئی۔ زندگی سے بھرپور ہنستے کھلکھلاتے بچے ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دیے گئے۔ آنسو، سسکیاں، آہیں، گریہ۔ یہ سب اس قوم کے لیے معمول بن چکا ہے۔ سابقہ دور میں باجوڑ کے ایک مدرسے میں جہاں بچے قرآنی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اس پر ڈرون حملہ کیا گیا اور اسی بچے شہید ہو گئے تھے۔ یہ کیسی جنگ ہے جس میں قوم کے بچے نشانہ بنائے جا رہے ہیں۔

کراچی ایک مدت سے قتل گاہ بنا ہوا ہے۔ آج تک کوئی گرفت میں نہیں آیا۔ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں۔

اس واقعہ کا سب سے اندوہ ناک پہلو یہ ہے کہ اس کی آڑ لے کر اسلام کو بدنام کرنے کی مذموم کوشش کی جا رہی ہے جبکہ اسلام میں حالتِ جنگ میں بھی عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اُٹھانے کی ممانعت کی گئی ہے۔

ایک اندوہناک سانحہ،

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے دیرینہ اور مخلص کارکن شعبۂ اشتہارات کے مینجر رضا امام کے جواں سال صاحب زادے عدنان رضا کراچی میں ہونے والی ٹارگٹ کلنگ کا شکار ہو گئے۔ رضا امام صاحب کے لیے جوان بیٹے کی اچانک وفات انتہائی اندوہناک صدمہ ہے۔ دکھ کی اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

رضا امام صاحب کی ادارہ خواتین ڈائجسٹ سے دیرینہ رفاقت کی بنا پر ادارے کے تمام لوگ ان سے دلی وابستگی رکھتے ہیں۔ اس صدمے پر ہمارا پورا ادارہ سوگوار ہے۔ ہم سب اس شدید دکھ کو دل سے محسوس کرتے ہیں اور دکھ کی اس کٹھن گھڑی میں ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور رضا امام اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- سمیرا حمید کا مکمل ناول ۔ یارم، • مریم عزیز کا مکمل ناول ۔ تم ساتھ رہنا،
- مصباح نوشین کا مکمل ناول ۔ میرے بے خبر میرے بے نشاں،
- سحر ساجد کا ناولٹ ۔ عزیق رحمت،
- ملیحہ صدیقی، کنیز نور علی، سیما بنت عاصم، سمیرا عثمان گل اور حمیرا نوشین کے افسانے،
- مقبول مزاح نگار، کالم نگار یونس بٹ سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

جنوری کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنے خطوط کے ذریعے ہمیں ضرور آگاہ کیجیے گا۔

تُو ہی اَلَم ہے تو ہی خوشی تری شان جل جلالہٗ
تُو ہی موت ہے تو ہی زندگی، تری شان جل جلالہٗ

تیرا ذکر ہی تو نماز ہے، تری یاد ہی تو نیاز ہے
بڑی سہل ہے تری بندگی، تری شان جل جلالہٗ

جسے چاہے ہوش میں لائے تُو جسے چاہے مست پھرائے تو
تُو ہی ہوش دے تو ہی بے خودی، تری شان جل جلالہٗ

کبھی مست دیکھ کے پھول کو کبھی ترے حسن قبول کو
یہی کہہ رہی ہے کلی کلی، تری شان جل جلالہٗ

تُو ہی خود نشاں تو ہی بے نشاں تو ہی خود عیاں تو ہی خود نہاں
تُو ہی رہ بھی رہبرِ راہ بھی، تری شان جل جلالہٗ

تُو ہی دیر و بیت صنم بھی تو، تُو ہی بت کدہ بھی حرم بھی تو
ہے ترا ہی ذکر گلی گلی، تری شان جل جلالہٗ

نہیں راز میرا چھپا ہوا تری چشم بندہ نواز سے
جو تری خوشی وہ مری خوشی، تری شان جل جلالہٗ

بہزاد لکھنوی

ہر وقت تصور میں مدینے کی گلی ہے
اب دربدری ہے نہ غریب الوطنی ہے

وہ شمع حرم جس سے منور ہے مدینہ
کعبے کی قسم رونق کعبہ بھی وہی ہے

اس شہر میں بک جاتے ہیں خود آ کے خریدار
یہ مصر کا بازار نہیں شہر نبیؐ ہے

اس ارضِ مقدس پہ ذرا دیکھ کے چلنا
اے قافلے والو یہ مدینے کی گلی ہے

نظروں کو جھکائے ہوئے خاموش گزر جاؤ
بے تاب نگاہی بھی یہاں بے ادبی ہے

اقبالؔ میں کس منہ سے کروں مدح محمدؐ
منہ میرا بہت چھوٹا ہے اور بات بڑی ہے

اقبالؔ عظیم

ادارہ

پیاری پیاری باتیں

شرعی طور پر ثابت نسب میں طعن کرنا حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بغیر قصور کے تکلیف دیتے ہیں' یقیناً" انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔58)

بین کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"دو چیزیں لوگوں میں ایسی ہیں جو ان کے کفر کا باعث ہیں' نسب میں طعن کرنا اور فوت شدہ پر بین کرنا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : 1۔ یہ دونوں گناہ ایسے ہیں کہ اگر انسان انہیں حلال سمجھ کر ان کا ارتکاب کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا' تاہم بشری کمزوری کی وجہ سے ان کا صدور سخت کبیرہ گناہ ہے۔

2 ۔ نسب میں طعنہ زنی کا مطلب ہے کہ کسی شخص کو اس کی تحقیر و توہین کی نیت سے کہا جائے کہ تیرا باپ تو فلاں کام کرتا ہے' تیری ماں تو ایسی ویسی ہے' یا تو جولاہا' لوہار' دھوبی اور موچی وغیرہ ہے۔ پیشوں کی وجہ سے بھی کسی خاندان یا شخص کو حقیر سمجھنا طعن فی النسب ہی کی ایک صورت ہے۔

3 ۔ نوحہ و ماتم (بین کرنے) کا مطلب : مردے کے اوصاف بیان کر کر کے رونا پیٹنا اور زور زور سے چیخنا اور واویلا کرنا ہے۔

جعل سازی اور دھوکا دہی کی ممانعت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے' وہ ہم (مسلمانوں) میں سے نہیں۔ اور جو ہمیں دھوکا و فریب دے' وہ ہم میں سے نہیں۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے "بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلّے کے ایک ڈھیر پر سے گزر ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں اپنا ہاتھ داخل کیا تو آپ کی انگلیوں نے تری محسوس کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔
"اے غلے والے! یہ کیا ہے؟"
اس نے عرض کیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اسے بارش پہنچی ہے۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تو تو نے اس (بھیگے ہوئے حصے) کو غلے کے اوپر کیوں نہ کر دیا تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ (یاد رکھ) جس نے ہم سے دھوکا کیا' وہ ہم میں سے نہیں۔"

فوائد و مسائل : 1۔ ہتھیار اٹھانے سے مراد مسلمانوں کی جماعت کے خلاف خروج و بغاوت کرنا یا بغیر کسی وجہ کے کسی مسلمان پر تلوار' بندوق' ماؤزر اور کلاشنکوف وغیرہ اٹھانا اور اسے مار دینا ہے' جیسے آج کل بدقسمتی سے یہ دہشت گردی عام ہے۔

2 ۔ جعل سازی اور دھوکا دہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک معنوی ہے' جیسے باطل پر حق کا غلاف چڑھا دینا اور دوسری مادی اور ظاہری ہیں' جیسے سودے میں کوئی عیب ہو تو اسے ظاہر نہ کرنا' اچھے مال میں ردی اور گھٹیا مال کی آمیزش کر دینا' سودے میں کسی اور چیز کی ملاوٹ کر دینا تاکہ اس کا وزن زیادہ ہو جائے' اس طرح کی اور متعدد صورتیں۔

3 ۔ ہم میں سے نہیں کا مطلب ہے' مسلمانوں کے طریقے پر نہیں۔ اس کا یہ کردار مومنانہ نہیں' غیر مومنانہ ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو ہر قسم کی دھوکا دہی سے اجتناب کرنا چاہیے۔

دھوکا دہی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"خریداری کی نیت کے بغیر بولی میں اضافہ مت کرو۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : انسان کی نیت خریدنے کی نہ ہو' پھر بھی قیمت بڑھا کر بولی لگائے تو ظاہر بات ہے کہ اس سے دوسرا خریدار دھوکا کھا جائے گا اور اسے اصل قیمت سے کہیں زیادہ قیمت پر وہ چیز خریدنی پڑے گی۔ گویا یہ بھی دھوکا دہی کی ایک صورت ہے۔

قیمت بڑھانا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکا دینے کی نیت سے قیمت بڑھانے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ : اس میں بھی نرخ پر نرخ بڑھانے سے منع فرمایا گیا ہے جب کہ مقصد خریدنا نہ ہو' بلکہ صرف دوسرے کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہو۔

پہلے طے کرنا

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا کہ وہ خرید و فروخت میں دھوکا کھا جاتا ہے؟
تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس سے تو سودا کرے تو یہ کہہ دیا کر کہ دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : مذکورہ الفاظ کہنے سے مقصد' یعنی اگر سودے میں کوئی دھوکا اور فریب ہوا تو خریدار کو سودا واپس کرنے کا حق ہو گا۔ بیچنے والوں کو بھی اس حق کا احترام کرنا پڑے گا۔

ورغلانا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص کسی کی بیوی یا اس کے غلام کو دھوکا دے تو وہ ہم میں سے نہیں۔" (ابو داود)

فائدہ : کسی کی بیوی یا غلام کو ورغلا کر خاوند اور مالک کے خلاف کر دینا اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کر کے انہیں ایک دوسرے سے متنفر کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ مومن کی شان تو اصلاح بین الناس ہے نہ کہ فساد بین الناس (لوگوں کے درمیان فساد ڈالنا)

بد عہدی حرام ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو۔" (المائدہ۔1)

نیز فرمایا:
"عہد کو پورا کرو' اس لیے کہ عہد کی بابت پوچھا جائے گا۔" (الاسراء۔34)

فائدہ آیات : ایک عہد تو وہ ہے جو انسان آپس میں کرتے ہیں اور ایک عہد وہ ہے جو اللہ نے انسانوں سے لیا ہے کہ وہ اس کی توحید و ربوبیت کا اقرار کریں اور اس کے احکام و ہدایات کے مطابق زندگی گزاریں۔ ان دونوں قسم کے عہدوں کی پاس داری ضروری ہے' اور ان میں کوتاہی پر قیامت والے دن باز پرس ہو گی۔

چار خصلتیں

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"چار خصلتیں ہیں، جس میں وہ ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی یہاں تک کہ وہ اسے چھوڑ دے:

جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔

جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

جب کوئی عہد کرے تو بے وفائی کرے اور جب کسی سے جھگڑے تو بدزبانی کرے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل : 1 یہ منافقانہ خصلتیں ہیں، ایک مومن کو ان تمام خصلتوں سے پاک ہونا چاہیے۔

2۔ اخلاق فاضلہ کا ایمان سے گہرا تعلق ہے، جہاں ایمان ہوگا، وہاں حسن اخلاق کی بھی جلوہ گری ہوگی اور جہاں ایمان نہیں ہوگا، اخلاق کا بھی فقدان ہوگا۔

حکمرانوں کے خلاف

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا "ہر عہد شکن کے لیے قیامت والے دن، اس کی سرین کے پاس ایک جھنڈا ہوگا۔ اسے اس کی بد عہدی کے تناسب سے بلند کیا جائے گا۔ سنو! عام لوگوں کے امیر و حاکم کے عہد کو توڑنے والے سے بڑا عہد شکن کوئی نہیں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل : 1 عامتہ المسلمین کے امیر سے مراد حاکم وقت (خلیفہ، بادشاہ اور حکمران) یا اس کا نائب ہے۔ اس کے عہد کو توڑنے سے مراد اس کے عہد اطاعت اور بیعت کا توڑنا اور اس کے خلاف خروج و بغاوت ہے۔ اسلام نے حکمرانوں پر تنقید کرنے اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کی اصلاح کرنے کی تو تاکید کی ہے اور اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم دیا ہے، لیکن ان کے فسق و فجور یا ان کے ظلم کی وجہ سے ان کے عہد اطاعت کو توڑ دینے اور ان کے خلاف خروج و بغاوت کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس طرح ملک میں فساد اور بد امنی پیدا ہوتی ہے، جس سے حالات مزید خراب ہی ہوتے ہیں، اصلاح پذیر نہیں ہوتے۔ خلفاء و سلاطین کے خلاف خروج و بغاوت کی تاریخ کا جائزہ لینے سے بھی اس حکم کی افادیت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔

تاریخ میں خروج و بغاوت کے جتنے بھی واقعات ہیں، ان میں سے کسی سے بھی امت مسلمہ یا اسلام کو فائدہ نہیں ہوا بلکہ نقصان ہی ہوا ہے۔

اسی طرح آج کل کی جمہوریت میں بھی، جس میں حکومت وقت کے خلاف مظاہرے جمہوریت کا ایک حصہ بلکہ اس کی جان سمجھے جاتے ہیں، یہ ایک بے ثمر عمل ہے۔ جس سے نہ حکمرانوں کی اصلاح ہوتی ہے، نہ ملک و قوم کو کوئی فائدہ حاصل ہوتا ہے، البتہ توڑ پھوڑ سے لوگوں کی املاک اور قومی املاک کو نقصان پہنچتا ہے اور بعض دفعہ انسانی جانوں کا ضیاع بھی ہوتا ہے۔ اس لیے یہ سیاسی مظاہرے بھی شرعاً" محل نظر ہیں۔

اس حدیث میں حکمرانوں کے خلاف اس قسم کے اقدامات پر سخت وعید بیان کی گئی ہے، اس لیے ہمیں حکومت وقت اور حکمرانوں کی اصلاح کے لیے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لیے کوئی اور مناسب طریق کار وضع اور اختیار کرنا چاہیے جس میں محض تنقید برائے تنقید نہ ہو بلکہ صحیح معنوں میں خیر خواہی اور ملک و قوم کے مفادات کا جذبہ کار فرما ہو۔ یہ احتجاجی ہڑتالیں اور سیاسی مظاہرے شرعی لحاظ سے بھی غلط ہیں اور تجربات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ ان سے سوائے نقصان کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

عربوں میں رواج تھا کہ وہ بد عہدی کرنے والوں کے لیے بازاروں میں جھنڈے گاڑ دیا کرتے تھے تاکہ وہ بدنام اور ذلیل ہوں۔ اسی رواج کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان کی اخروی سزا کا تذکرہ فرمایا تاکہ اس جرم اور اس کی سزا کی نوعیت لوگ سمجھ سکیں۔

تین آدمی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین آدمی ہیں جن سے قیامت والے دن میں خود جھگڑوں گا:

ایک وہ آدمی جس نے میرے نام سے عہد کیا، پھر اسے توڑ دیا۔

دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھالی۔

اور تیسرا وہ آدمی جس نے اجرت پر ایک مزدور حاصل کیا، چنانچہ اس سے اپنا کام تو پورا لیا لیکن اسے اس کی اجرت نہیں دی۔" (بخاری)

فائدہ : اس میں عہدوں کو پورا کرنے، آزاد شخص کو فروخت نہ کرنے اور مزدور کو اس کی مزدوری دینے کی ترغیب ہے۔

عطیہ وغیرہ دینے کے بعد احسان جتانا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اے ایمان والو! احسان جتا کر اور تکلیف دے کر اپنے صدقے ضائع مت کرو۔" (البقرہ۔264)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"وہ لوگ جو اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتلاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ (ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے، ان پر نہ تو کچھ خوف ہے اور نہ وہ اداس ہوں گے۔") (البقرہ262)

نامراد

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"تین آدمیوں سے قیامت والے دن اللہ تعالیٰ نہ کلام کرے گا، نہ (رحمت کی نظر سے) انہیں دیکھے گا اور نہ پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔"

راوی بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے یہ کلمات تین مرتبہ ارشاد فرمائے۔

حضرت ابوذر نے عرض کیا: وہ نامراد ہوئے اور گھاٹے میں رہے، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم! یہ کون لوگ ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والا، احسان کر کے احسان جتلانے والا اور اپنا سامان جھوٹی قسم کے ذریعے سے بیچنے والا۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے۔

"اپنی ازار کو نیچے لٹکانے والا۔" یعنی اپنی شلوار، پاجامے اور کپڑے کو تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والا۔

فوائد و مسائل : 1۔ اس سے واضح ہے کہ شلوار، پاجامہ، پتلون اور تہبند وغیرہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا حرام ہے۔ یہ حکم مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے اس کے برعکس ٹخنے بلکہ پیر تک بھی ڈھکنے ضروری ہیں۔

2۔ مثل مشہور ہے "نیکی کر دریا میں ڈال" یعنی کسی پر احسان کر کے پھر اسے ہرگز نہیں جتلانا چاہیے، کیونکہ اس سے نہ صرف وہ نیکی برباد ہوتی ہے بلکہ انسان عذاب شدید کا بھی مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس لیے کسی پر احسان کرنے سے زیادہ مشکل اس نیکی کی حفاظت کرنا ہے۔

3۔ جھوٹی قسم کھانا مطلقاً" حرام ہے، لیکن سودا بیچنے کے لیے گاہک کو دھوکا دینے کی نیت سے جھوٹی قسم کھانا تو اور زیادہ بڑا جرم ہے کہ اس میں دو جرم اکٹھے ہو جاتے ہیں: جھوٹی قسم اور دھوکا دہی۔

فخر کرنے اور ظلم و زیادتی کے ارتکاب سے ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تم اپنی بابت پاکیزگی کا دعویٰ مت کرو، تم میں سے جو پرہیزگار ہیں ان کو وہ خوب جانتا ہے۔" (النجم۔

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"بے شک ملامت کے لائق وہ لوگ ہیں جو لوگوں ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں' یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔" (الشوریٰ۔42)

عاجزی اختیار کرنا

حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اللہ تعالیٰ نے میری طرف اس بات کی وحی فرمائی ہے کہ تم عاجزی اختیار کرو' یہاں تک کہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور نہ کوئی کسی دوسرے کے مقابلے میں فخر کرے۔" (مسلم)

فائدہ :۔ اللہ نے کسی کو مال و دولت' اور جاہ و منصب یا حسن و جمال یا علم و فضل عطا کیا ہو تو یہ اس پر اللہ کا احسان ہے۔ اس کو اللہ کے حکم کے مطابق تواضع اور عاجزی اختیار کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے' اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ان نعمتوں سے دوسرے لوگوں کو فائدہ پہنچانا چاہیے' نہ کہ فخر و غرور کا اظہار کر کے اللہ کی ناشکری اور لوگوں پر ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرے۔

تباہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب کوئی آدمی یہ کہے کہ لوگ تباہ ہو گئے تو وہ ان میں سب سے زیادہ تباہ ہونے والا ہے۔" (مسلم)

یہ کہنا کہ تباہ ہو گئے' اس شخص کے لیے منع ہے جو اپنے آپ کو سب سے اچھا سمجھے' لوگوں کو حقیر گردانے اور ان پر اپنے آپ کو برتر خیال کرے' یہ حرام ہے۔ لیکن جو شخص یہ اس لیے کہے کہ وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں میں دین داری کم ہو گئی ہے اور اس پر اظہار افسوس کرتے ہوئے (دینی غیرت کی وجہ سے) یہ الفاظ اس کی زبان پر آجائیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ علما نے اسی طرح اس کی وضاحت اور تفصیل بیان کی ہے' اور جن ائمہ اعلام نے یہ تفسیر کی ہے ان میں امام مالک بن انس' امام خطابی' امام حمیدی اور دیگر ائمہ ہیں۔

فائدہ : اس میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے اور دوسروں کو حقیر گرداننے کی ممانعت ہے۔

مسلمانوں کے آپس میں تین دن سے زیادہ بول چال بند رکھنے کے حرام ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"مومن تو بھائی بھائی ہیں' چنانچہ اپنے دو (لڑے ہوئے) بھائیوں میں صلح کرا دو۔" (الحجرات۔10)
نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"گناہ اور زیادتی (کے کاموں) میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔" (المائدہ۔2)

فائدہ آیات : لڑائی اور ترک تعلق' مقتضائے اخوت کے خلاف ہے' اس لیے مسلمانوں کو باہم لڑے ہوئے مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ مومنانہ اخوت برقرار رہے۔ بغیر کسی سبب شرعی کے بول چال بند رکھنا بھی گناہ اور زیادتی ہے' اس لیے اس کی حوصلہ افزائی بھی گناہ پر تعاون ہے' جس سے مسلمانوں کو روک دیا گیا ہے۔ بلکہ ایسے موقعوں پر ضروری ہے کہ صلح کرا دی جائے۔

مغفرت نہیں

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ہر سوموار اور جمعرات کو (بارگاہ الٰہی میں) اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کے گناہ معاف فرما دیتا ہے' جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو' سوائے اس شخص کے کہ اس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی اور کینہ ہو تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ان دونوں کو چھوڑ دو' یہاں تک کہ یہ صلح کر لیں۔" (مسلم)

فائدہ : بغیر کسی سبب شرعی کے آپس میں دشمنی رکھنا مغفرت الٰہی سے محرومی کا باعث ہے۔ اعاذنا اللہ

☆

نئے سال کی دہلیز پر

ادارہ

یہ سال بھی آخر بیت گیا
کچھ ٹیسیں' یادیں' خواب لیے
کچھ کلیاں' چند گلاب لیے
کچھ انکھڑیاں پرآب لیے

گزرتے ماہ و سال' آتی جاتی رتیں' ڈوبتے ابھرتے روز و شب ایک اداسی بھرا احساس دے کر رخصت ہوتے جاتے ہیں۔ سال گزشتہ خوش آئند منظروں کے ساتھ ساتھ بہت سے دکھ اور آنسو بھی دامن میں ڈال گیا۔ انسان حال میں زندہ رہتا ہے لیکن ماضی سے کٹ بھی نہیں پاتا۔ مستقبل کے خواب دیکھتا ہے لیکن مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

ہر نئے سال کی آمد پر چراغ امید نئے سرے سے روشن ہوتا ہے کہ رات کتنی بھی طویل سہی' اس کے اختتام پر سحر ہے۔

نئے سال کی آمد پر حسب روایت قارئین سے سروے شامل ہے۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔

یوں لگا مجھ کو نئے سال کا پہلا لمحہ
زرد شیشے پہ کوئی پھول گرا ہو جیسے

نئے سال کی آمد پر آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟

2

پہلے سے خدوخال ہیں نہ پہلے سے وہ خیال
ہم ایک سال کے اندر کتنے بدل گئے

گزرے سال میں وہ کون سی تبدیلیاں تھیں جو آپ میں اور آپ کی زندگی میں آئیں اور آپ کی خواہشوں سے کتنی ہم آہنگ تھیں؟

3 گزرے سال میں شعاع کی کون سی تحریر' کس شمارے کا سرورق آپ کو پسند آیا؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے ان سوالوں کے کیا جواب دیے ہیں۔

ثوبیہ نور..... کشن گڑھ بھاول نگر

1۔ دسمبر کے مہینے میں
سال نو کی آہٹ پر
میرا دل چونک اٹھا ہے
کیا کوئی بچھڑا آن ملے گا
یا پھر کوئی ہم سے جدا ہو گا

نئے سال کی آمد پر بڑے جامد سے احساسات ہیں بالکل سرد۔ جیسے دسمبر کی شامیں یا پھر جنوری کی صبحیں' بہت اداس۔

دسمبر اور اداسی کا تو گویا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادھر

دسمبر آیا ادھر دل قطرہ قطرہ پگھلنا شروع ہوا، جیسے کوئی بہت اپنا بچھڑتا ہو، اور بچھڑ تو رہے ہیں ہم خود اپنے آپ سے۔ لمحہ لمحہ، قطرہ قطرہ۔ دبے پاؤں زندگی گزرے جاتی ہے۔ زندگی میں کتنی صبحیں مزید آنی ہیں، کتنے سورج ڈھلتے دیکھنے ہیں۔ کبھی اپنے آپ سے ملاقات ہو تو یہ سوچیں۔ بس دنیا کے شور، ہنگامے، بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی خواہش پیچھے مڑ کر دیکھنے سے روکتی ہے۔

نہ جانے کب زندگی کا ساتھ چھوٹے اور ایک نیا سفر شروع ہو جائے۔ انسانوں کے ڈھیر سے ایک انسان سرک جائے اور قافلہ بے خبر سا چلتا جائے۔ وقت کے سودے میں جانے کتنا سود ہو اور کتنا زیاں ــــ بے خبری سی بے خبری ہے، جانے اتنے ماہ و سال کیسے گنوا دیے۔ اور گزرے وقت کو دیکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی لمحہ جیا ہی نہیں، برسوں سے ایک ہی نقطے پر کھڑے ہیں۔ گویا کوئی نیا سال آیا ہی نہیں۔ بقول شاعر

کتنی بے رنگ ہے زندگی
کہ اس میں کتنے ہی سال گزر گئے
کوئی نیا سال آیا ہی نہیں
کئی بہاریں، خزاں کتنی
موسم گزرے تو ہیں مگر
اپنے اندر کا موسم گزرتا ہی نہیں
کتنی خوشیاں، کتنے غم، کتنے ہمدم بچھڑتے تو ہیں مگر
کوئی ملتا ہی نہیں
آنکھوں میں کوئی دیا جلتا ہی نہیں

2۔ سوچا تھا پچھلے دسمبر میں
اگلا سال کٹے گا کیسے

ابھی جنوری میں بیٹھے تھے کہ ماہ پہ ماہ گزرتا گیا
حیرت سے دیکھا کیلنڈر کو
تو دل کو دھچکا لگا
ابھی تو جنوری آئی تھی
ابھی سے دسمبر آ گیا
ابھی تو نئے سال کا ٹائم ٹیبل بنانا تھا
اور ابھی سے سال گزر گیا
بس یہی سوچتے سوچتے اگلا سال گزر گیا۔

گزرے سال میں، مجھ میں تو "میرے خیال کے مطابق" کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اور زندگی بھی اسی ڈھب سے گزر رہی ہے۔ اور اجتماعی طور پر بھی جو تبدیلیاں آئی ہیں قطعاً خوش گوار نہیں۔ دھماکے، خودکش حملے تو اب پرانے ہوئے۔ اب نیا دور آیا ہے جلسے جلوسوں کا۔

ہر بندہ اپنے مفاد کے پیچھے پاگل ہے، باقی جو قومی نقصان ہو وہ جائے بھاڑ میں۔ کون جانے کشتی ڈوبے تو ڈوبتے سب ہی ہیں۔ جانے یہ اندرونی جنگیں کب ہمارا پیچھا چھوڑیں گی کس سے کہیں جا کر کہ

کر اکتفا میرے خون پر
میری نسل کو تو امان دے
ہیں سائباں جلے تو کیا ہوا
میرے سر پہ دھوپ ہی تان دے

3۔ یہ سوال تھوڑا مشکل ہے۔ میں تو لکھتے لکھتے قلم سائیڈ پر رکھوں تو یہ بھول جاتا ہے کہ کہاں رکھا، یہ تو پھر سال بھر کی بات ہے تو جناب اس سوال کے لیے معذرت، کیوں کہ پورے سال کے شعاع میرے دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا، کے مصداق، ادھر ادھر بکھر چکے ہیں کل ملا کر مجھے دو پرچے ملے ہیں وہ بھی ٹائٹل کے بغیر (ٹائٹل کی شہادت سمیرا باجی کے ہاتھوں ہوئی ہے) ہاں البتہ یہ دسمبر کا شمارہ رکھا ہے اور میری ناقص رائے کے مطابق اس کا ٹائٹل کافی زبردست ہے۔ خاص طور پر پس منظر، مدھم سی روشنی والے، ٹمٹماتے دیے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔

مسرت ناز... راولپنڈی

یوں لگا مجھ کو نئے سال کا پہلا لمحہ
زرد شیشے پہ کوئی پھول گرا ہو جیسے

یہ سوال شعر سے شروع ہوا۔ جو بہت ہی اچھا تھا۔ یوں تو میں کافی زیادہ بدذوق واقع ہوئی ہوں۔ شعر و شاعری مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی۔ شاں کر کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے۔ شاعروں کو بھی تو دیکھیے نا۔

اتنی گمبھیر سی شاعری کرتے ہیں۔ بیٹھ کر مطلب پر غور کرتے رہو، مگر ایسا... بھی نہیں ہے۔ سمجھنے والے سمجھ ہی جاتے ہیں۔ چلو میں تو ویسے بھی مانتی ہوں کہ میں بدذوق ہوں۔ چھوڑتے ہیں اس قصے کو، مگر شعر بہت اچھا ہے۔ سمپل سا۔

تو جہاں تک احساسات کی بات ہے تو۔ زندگی کا ایک اور سال گزر گیا اور میں کہاں کھڑی ہوں؟ وہیں جہاں سے چلی تھی یا کچھ آگے بڑھ گئی؟

کیا میں نے اس گزرے سال کو ایسے گزارا جیسے سوچا تھا۔

ایک نئے پن کا احساس بھی ہوتا ہے دل میں خوشی بھی ہوتی ہے نئے سال کی آمد پر۔ بدلتا کچھ نہیں سوائے ایک ہندسے کے، مگر ایک احساس تو ہوتا ہی ہے کہ کچھ بدلاؤ آیا ہے۔ تبدیلی قدرت کا قانون ہے۔ انسانوں کو بھی اچھا لگتا ہے۔ تو یہ خوشی ہی کی بات ہے اور واقعی بقول شاعر

زرد شیشے پہ کوئی پھول گرا ہو جیسے

2۔ گزرے سال میں تبدیلی یہ آئی کہ میری عمر ایک سال زیادہ ہو گئی مارچ میں۔ میری کہانی شائع ہوئی مئی میں۔ اور میرے بھائی کی شادی ہو گئی اکتوبر میں۔ گھر میں دوسری بھابھی بھی آ گئیں۔ اکتوبر میں ہی پہلی بھابھی نے یہ خوش خبری سنائی کہ میں ان شاء اللہ پھپھو بنوں گی۔ یہ پچھلا سال بہت ساری خوشیاں لایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تبدیلیاں اچھی ہی تھیں۔

3۔ گزرے سال میں شعاع کی مجھے تو ایک ہی تحریر سب سے زیادہ اچھی لگی۔ آپ سمجھ ہی سکتی ہیں "وہ کون تھی"

اب زیادہ لوگوں کو چاہے پسند نہ آئی ہو۔ ویسے بھی پسند ناپسند سب کی مختلف ہی ہوتی ہے۔ اور سرورق جولائی کا بھی اچھا تھا اور دسمبر کا بھی بہت اچھا ہے۔

کائنات خالد... کراچی

1۔ سچ کہوں تو میرا نیا سال اسلامی سال ہوتا ہے، اور میں نئے سال کی مبارک باد بھی سب کو تب ہی دیتی ہوں، جب

محرم کا چاند نظر آتا ہے۔ تو جی جناب! جب نیا سال آتا ہے تو حیرانگی ہوتی ہے کہ ایک سال اتنی جلدی گزر گیا۔ پھر سوچتی ہوں کہ جو غلطیاں پچھلے سال ہوئیں' اب کے سال نہیں کروں گی' دعا کرتی ہوں نیا سال ہمارے لیے خوشیوں والا سال ہو۔ (ہر سال' نئے سال کی آمد پہ میں یہ دعا ضرور کرتی ہوں)

2۔ بہت سی ایسی تبدیلیاں ہیں جو مجھ میں آئیں' جیسا کہ پہلے میں ہر ایک کے لیے دعا کرتی تھی (دعا تو اب بھی بہت کرتی ہوں' مگر کچھ فرق کے ساتھ) جیسا کہ جو کوئی مجھ سے دوست' کزن وغیرہ اپنی پڑھائی وغیرہ کے متعلق کچھ چھپائے تو میں اس کے لیے اس کی چھپائی ہوئی بات کے حوالے سے کوئی دعا نہیں کرتی۔ (پتا نہیں یہ فرق اچھا ہے یا غلط' مگر یہ تبدیلی مجھ میں اور میری زندگی میں کچھ مہینوں سے لوگوں کے رویوں سے آئی ہے) مگر مجھ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ میں چاہے لڑکی ہو یا لڑکا' اس کے بہترین نصیب کی دعا ضرور کرتی ہوں اور سب سے اچھی تبدیلی زندگی میں یہ آئی ہے کہ ہاتھ میں ہنر آگیا ہے' "سلائی کا ہنر" اور یہ تبدیلی مجھے میری زندگی سے قریب اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے' کیوں کہ یہ میرے ماں باپ کی خواہش بھی تھی۔

3۔ ویسے تو مجھے تمام پرچے بہت پسند ہیں' سرورق پہ زیادہ دھیان نہیں دیتی' لیکن رمضان کا سرورق بہت پسند آیا' جہاں تک بات تحریروں کی ہے تو یاد نہیں رہتا کہ کون سی تحریر شعاع ... کی ہے' کیوں کہ آپ کے تمام پرچے چار چار دن کے بعد ہاتھ میں ہوتے ہیں' محبت شکن' تیرے سنگ حسین ہے راہ گزر' صنم سے صمد تک اور بھی بہت سارے جو کہ پسندیدہ ہیں' مگر یاد نہیں آرہے ہیں۔ اچھا جی سب کو نیا سال مبارک ہو۔

ثمینہ اکرم.... بہار کالونی لیاری کراچی

یوں لگا مجھ کو نئے سال کا پہلا لمحہ
زرد شیشے پہ کوئی پھول گرا ہو جیسے

1۔ ہر سال نئے سال کی آمد پر میں اس شعر کی عملی تفسیر بنی نظر آتی ہوں۔ اب سے کچھ سال پہلے نئے سال کو جوش و خروش سے ویلکم کہنے والوں کی صف میں' میں بھی اول رہا کرتی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دسمبر کے آخری دنوں میں نیو ایئر کارڈز اور گفٹس کی خریداری کی جاتی' پھر کارڈز اور تحفے تحائف کا تبادلہ کیا جاتا۔ 31 دسمبر کی رات سب کی گیدرنگ ہوتی۔ کبھی چکن سوپ تو کبھی ابواہل انڈے اور گرما گرم کافی سے لطف اندوز ہوتے۔ رات 12 بجے نئے سال کی خوشی میں جب خوب فائرنگ ہوتی تو سب کے ساتھ مل کر اسے بھی خوب انجوائے کرتی تھی.... ایک دوسرے کو میسیجز پروش کیا جاتا اور فون پر نئے سال کی مبارک باد دی جاتی تھی۔ مگر اب نئے سال کی آمد پر میرے احساسات اداسی بھرے ہوتے ہیں۔ اسی لیے اب کسی طرح کا کوئی اہتمام کرنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ پھر ملکی حالات بھی جس طرح کے ہو رہے ہیں' اپنی ذات کی خوشی' خوشی نہیں دیتی۔ سال میں کی گئی غلطیوں پر میں سچے دل سے توبہ کرتی ہوں' اور نئے سال میں انہیں نہ دہرانے کا عزم مصمم بھی کرتی ہوں۔ نئے سال کا سورج طلوع ہونے

سے پہلے سب کے لیے اور خصوصاً" پاکستان کے لیے بہت دعا کرتی ہوں۔ سال کے اختتام پر اپنا احتساب ضرور کرتی ہوں

2۔ تبدیلی اللہ کی طرف سے ہے اور تبدیلی کی خواہش انسانی فطرت کا ایک لازمی جز ہے' مگر یہ تبدیلی مثبت اور راست سوچ کی ہونی چاہیے۔ گزشتہ برس میں وہ تبدیلیاں جو مجھ میں رونما ہوئیں۔ بہت واضح ہیں ان کا تعلق میرے باطن اور ظاہر.... دونوں سے ہے۔

گزشتہ سال کا پورا عرصہ میں نے اپنی بیماری ہیپاٹائٹس "C" سے نبرد آزما ہو کر بہت ہمت حوصلے اور صبر سے گزارا ہے۔ اس بیماری کی آزمائش کی وجہ سے میرے اندر شکر گزاری بہت بڑھ گئی ہے۔ اللہ کی ذات پر یقین اور پختہ ہو گیا ہے۔ پہلے مجھے اپنی غلطی کا احساس اتنی جلدی نہیں ہوا کرتا تھا۔ اب جو مجھ میں تبدیلی آئی تو غلطی کرنے کا احساس اسی وقت ہو جاتا ہے' اور پھر میں فوراً" ہی سامنے والے سے معافی بھی مانگ لیتی ہوں' اور اللہ کے حضور بھی توبہ استغفار کرتی ہوں۔ کسی کی بھی کسی بھی بات کا نہ تو برا مانتی ہوں اور نہ ہی بدگمان ہوتی ہوں۔ جبکہ پہلے یہ عادت مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے رات کی تنہائی میں خدا کے سامنے گریہ وزاری کرنے اور رونے گڑگڑانے سے بہت سکون ملتا ہے۔ اپنی زندگی کو مہلت سمجھتے ہوئے ہر ہر لمحہ اپنے رب کی خوشنودی میں گزارنا ہی میرا مقصد حیات ہے اور یہ تبدیلی میری زندگی میں اپنے بیٹے کی شہادت اور اپنی بیماری کے بعد رونما ہوئی اور آخرت کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ اپنے حضور پاک کی سنت اور شریعت پر چلنے کی بھی طلب گار ہوں۔ آپ سب بھی میرے لیے دعا کیجیے۔ ہر خوشی کے موقع پر شکرانے کے نوافل اور ہر کام شروع کرنے سے پہلے نماز حاجت پڑھنا اب میری عادت بن گئی ہے۔

3۔ میرے سامنے 2014ء کے 12 شمارے پھیلے ہوئے ہیں۔ گزرے برس شعاع نے ہمیں بہت سی بہترین تحاریر پڑھنے کو دیں' جس میں سرفہرست امایہ خان کا ناولٹ "بت شکن" (جنوری) رہا۔ یہ ناولٹ چھ اقساط پر مشتمل تھا اور جون میں اختتام پذیر ہوا' مگر ایک ناقابل فراموش تحریر ہے' جس کا کریڈٹ امایہ خان کو جاتا ہے۔ اپریل + مئی میں شائع ہونے والا مکمل ناول "تعبیر" (مریم عزیز) مجھے بے حد پسند آیا۔ کنیز نبوی کا ناول "صنم سے صمد تک" بھی ایک پر اثر تحریر تھی۔ جس نے دلوں میں انمٹ نقوش چھوڑے۔ جولائی میں شروع ہونے والا سمیرا حمید کا ناول "یارم" بھی میرے پسندیدہ ناولز میں شامل ہے جو کہ تاحال جاری ہے۔ اس کے علاوہ نایاب جیلانی' آسیہ رزاقی اور رخسانہ نگار عدنان کی تحاریر بھی میں شوق سے پڑھتی ہوں۔

اب گزرے سال میں شعاع کا پسندیدہ سرورق کون سا ہے تو اس کا فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہے کیوں کہ 2014ء کے تقریباً" سب ہی سرورق ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ چند ایک تو پسندیدگی کے لحاظ سے سرفہرست ہیں' جس میں درج ذیل ہیں۔

پسندیدہ سرورق: سب سے زیادہ دسمبر 2014ء کا سرورق ہے۔ جنوری کا سرورق جس میں ماڈل براؤن

ڈریس میں ملبوس ہے۔ فروری کا سرورق' مارچ کی یلو ڈریس پہنے ماڈل' جولائی کا ٹائٹل پنک دوپٹا اوڑھے پاکیزہ چہرے والی ماڈل' اگست کا ٹائٹل' بلیو ڈریس میں ملبوس ماڈل اور نومبر کی لمبے بالوں والی ماڈل کا سرورق مجھے بہت پسند آیا۔ باقی سب بھی ٹھیک ہی لگے۔ ناپسند کوئی سرورق نہیں آیا۔

انجل۔ ڈہرکی

1۔

آئینے کی آنکھ میں اب کے برس
کوئی عکس مہماں بھی نہیں

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ تو گزرنے والے برس اور نہ ہی آنے والے سال' ایک خلش' ایک بے نام اداسی کے سوا نہ تو کچھ لے کر آتے ہیں اور نہ ہی کچھ لے کر جاتے ہیں۔ وہی ہمارے یکساں شب و روز ہیں' بقول شاعر کہ

وہی دن' دن کی طرح' وہی رات ہی کی طرح رات
اک شور سنا نیا سال مبارک' نیا سال مبارک

اب آتے ہیں سروے کے تیسرے سوال کی طرف۔

3۔ دو ہزار چودہ میں دسمبر اور مئی کا سرورق پسند آیا' دونوں میں ایک قدر مشترک ہے وہ ہے ریڈ روز۔ سرخ گلاب کی نزاکت و دلکشی بہت انسپائر (Inspire) کرتی ہے مجھے۔ شعاع کی تحریروں میں پتا نہیں کیوں وہ پہلی سی بات نہیں رہی' صرف "رقص بسمل" نے مجھے باندھ رکھا ہے اور اس کی بھی وجہ یہی ہے کہ نبیلہ عزیز میری فیورٹ ہیں۔ ورنہ اس کہانی کا پلاٹ اتنا جاندار نہیں۔ ہاں ایک افسانے کا ذکر ضرور کروں گی "نیلا گلاب" جو مجھے بہت پسند آیا۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ اجازت کہ خدا کرے نیا سال تمام وطن باسیوں کو راس آئے۔ (آمین)

سنبل ملک اعوان۔۔۔ لاہور

1۔ نئے سال کی آمد پر میرے احساسات بہت ہی پرجوش ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی نوعمر لڑکی۔ میرا مطلب جیسے کوئی ٹین ایج لڑکی کے ہوتے ہیں۔ میں باقاعدہ 31 دسمبر کی شام کو غسل لے کر عشاء کی نماز پڑھتی ہوں' ساتھ دو نفل شکرانے کے ادا کرتی ہوں پھر ایک کیک منگوا کر شکرانے کے طور پر سب کو کھلاتی ہوں کہ سب ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا حصہ بن جائیں۔ جب آدھی رات گزرتی ہے تو اپنے گناہوں پر شرمندہ ہو کر آنسو بھی بہاتی ہوں' اور دعا کرتی ہوں اللہ مجھے گناہوں سے بچائے۔ میں اپنے والدین سے گلے ملتی ہوں' جنوری کی پہلی صبح ان کے گالوں پہ بوسہ دیتی ہوں اور اس پیار میں اب تو میرا پیارا اور منا سا بھتیجا بھی شامل ہے۔

2۔ گزرے سال نے میرے اندر بہت سی تبدیلیاں کیں۔ میں پہلے سے زیادہ فرینڈلی ہو گئی ہوں۔ 2014ء میرے لیے کوئی اسپیشل خوشیاں تو لے کر نہیں آیا' مگر میرے لیے اہم ضرور رہا۔ میری ٹرانسفر ہوئی میرے علاقے میں۔ میرے لوگ مجھے جاننے لگے۔ میرے علاقے کے لوگ میری عزت کرنے لگے۔ پھر ڈینگی سروے کے دوران میری ڈیوٹی مختلف علاقوں میں لگی مجھے لوگوں کی پہچان ہوئی۔ لوگوں کی روایات کا پتا چلا۔ لوگوں کے رہن سہن کا پتا چلا۔ پھر لوگوں میں شعور بیدار کیا کہ وہ لوگ گاؤں میں رہتے ہوئے کیسے اپنے آپ کو ڈینگی مچھر سے محفوظ رکھ سکتے ہیں' صاف پانی کو ڈھانپ کر رکھنے کی ترغیب دی۔ میرے بہت سے دوست بنے 2014ء میں۔ میری بہت سے لوگوں سے پہچان بھی ہوئی۔ اور جہاں تک خواہشوں کی بات ہے میری ایک بھی خواہش پوری نہیں ہوئی۔ نہ تعلیم کے مطابق نوکری ملی اور نہ ہی میری شادی کی دعا قبول ہوئی (یہ دعا میری ماما کی ہے)

3۔ کہتے ہیں جو چیز دل کو اچھی لگے اس میں برائی ہو بھی تو وہ بری نہیں لگتی تو جناب یہی حال شعاع کا ہے کہ مجھے شعاع سے اس قدر لگاؤ ہے کہ مجھے اس میں کوئی بھی تحریر بری نہیں لگی' اور سرورق تو مجھے گرمیوں کا اچھا لگا تھا جیسے مارچ سے لے کر اگست تک کا۔ تحریر 2014ء "ایک تھی مثال" باقی دسمبر کا ناول یارم بہت ہی خوب صورت۔ "ایک تھی مثال" پلیز۔ پلیز آنٹی رخسانہ عدنان کا انٹرویو دے دیں۔

عائشہ خان۔۔۔ ٹنڈو محمد خان

1 پہلے سوال کا جواب۔

احساسات حالات و واقعات پر منحصر ہوتے ہیں' اگرچہ پچھلے سال میں کوئی خاص خوشی ملی ہو تو احساسات خوش آئند اور پرامید ہوتے ہیں' جبکہ اگر کوئی دکھ ملا ہو یا کسی اپنے کے بچھڑنے کا غم تازہ ہو' جیسا کہ میری نند شاکرہ باجی جو میرے گھر کے قریب رہائش پذیر تھیں اچانک اس دار فانی سے کوچ کر گئیں۔

2 گزرے سال میں سب سے بڑی تبدیلی یہ آئی ہے کہ میں کافی پوزیٹیو ہو گئی ہوں۔ پہلے میں جن باتوں پر جلتی کڑھتی تھی یا کسی کی زیادتی پر دکھی ہوتی تھی' وہ سب میں نے کہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ اس سال کے اختتام نے مجھے سب سے بڑی خوشی یہ دی ہے کہ میرا افسانہ ڈائجسٹ میں لگا ہے۔

3 تیسرے سوال کا جواب۔

سرورق سب زیادہ اپریل' جون اور اکتوبر کا دل کو بھایا' جبکہ سب سے زیادہ بدمزا جولائی کے سرورق نے کیا۔

تحریریں تو بہت سی دل کو بھائیں' فہرست ذرا طویل ہے۔

افسانوں میں بیسٹ (پکار' قرۃ العین خرم ہاشمی) (تھام لیا ہے' فرحین اظفر) (دل کی عیدی' حیا بخاری) (سرخ جوڑا' شازیہ جمال) (شکریہ' عنیقہ محمد بیگ) (محبت کا ستارہ' یاسمین حنفی) (رحمت قرۃ العین رائے) (کوئلہ) میمونہ صدف (جا کے سسرال گوری' سعدیہ رئیس) (سیماب تھے لفظ' مصباح خادم علی) لگے۔

جبکہ ناولٹ میں

(امید کا ستارہ' سورۃ المنتہیٰ) (انہونی' نگہت مسیحا) (روپ کی روئے صدف آصف) (کہانی ایک گھر کی' راشدہ رفعت) (کمہاری کا گھر وجیہہ احمد) (اور کمہاری کا گھر پورے سال کا بیسٹ عنوان تھا) (دل و نظر کے آئینے صدف آصف) (بند دروازے سدرۃ المنتہیٰ) بہت پسند آئے۔

مکمل ناول میں' ٹاپ آف دی لسٹ (ڈھل گیا ہجر کا دن' صدف آصف) (آہ' سائرہ رضا) (گرد کے پار (نایاب جیلانی) (ڈور آصفہ اعوان) ہے۔

اور قسط وار ناولز کی تو کیا ہی بات ہے۔ یارم' بت شکن' اور دو اقساط پر مشتمل عشق دعا ہے اور تعبیر بہت اعلا رہے۔

نوال افضل گھمن۔ کینال ویو لاہور

1۔ بس خوشی و غم کے ملے جلے احساسات ہوتے ہیں۔ بہرحال نئے سال کی خوشی زیادہ ہوتی ہے بہ نسبت گزرے سال کے غم کے۔

2 گزرے سال تبدیلی

گزرے سال تبدیلی محمد طحہٰ ابراہیم کی آمد نے پوری طرح سے ہمارا لائف اسٹائل تبدیل کر دیا۔ اولاد خداوند قدوس کا بیش بہا قیمتی تحفہ ہے۔ اس کی ہر شرارت' ہر حرکت میرے حوصلے بلند کر دیتی ہے۔

3 شعاع کی تحریر اور ٹائٹل جو زیادہ پسند آیا۔

جی جناب "یارم"

ایسی تحریر جو بڑی ہی پیاری اور متاثر کن رہی' ٹائٹل اکتوبر 2014ء کا بہت اچھا لگا تھا۔

عائشہ جمیل۔ لاہور

1 ویسے نئے سال کے اس آغاز پر میرے کچھ خاص احساسات نہیں ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہم مسلمانوں کا نیا سال تو محرم الحرام سے شروع ہو جاتا ہے۔ پھر بھی اب چونکہ پچھلے سال سے میرے پاس موبائل ہے تو اپنی دوستوں سے معافی کا میسج کرتی ہوں۔ اور ان کو معاف کر دیتی ہوں۔ نئے سال کی مبارکباد بہت کم دیتی ہوں یا دیتی ہی نہیں۔

2 سال 2014 میں کیا تبدیلیاں آئیں؟ تو جناب! تبدیلیاں تو بہت ساری آئی ہیں۔ ویسے بھی انسان لمحہ بہ لمحہ بدلتا ہے۔ خواہش تھی کہ اس سال بھائی کی شادی ہو جائے تو وہ اللہ کے فضل سے مئی میں ہو گئی۔ اس سال چونکہ میں ایم بی بی ایس فرسٹ ایئر میں تھی تو زندگی واقعی بدل گئی تھی۔ پڑھائی' ٹیسٹ' Send ups پھر Prof۔ اللہ سے دعا کی کہ پاس ہو جائیں اور 4 دسمبر کو رزلٹ کا دھماکہ ہوا۔ کسی کو نہیں پتا تھا کہ آج رزلٹ آؤٹ ہونا ہے۔ الحمدللہ پاس ہو گئی۔ امی کہتی ہیں کہ تم اب غصہ زیادہ کرنے لگ گئی ہو۔ تو یہ تبدیلی مجھے پسند نہیں۔ اس کو دور کرنے کی کوشش کروں گی۔ باجی اسماء کہتی ہیں۔ تم دوسروں پہ بہت تنقید کرتی ہو اور خود کو پرفیکٹ سمجھتی ہو۔ یہ بھی اسی سال کی بات ہے۔ کہتی ہیں میڈیکل میں جا کے تمہارا دماغ گھوم گیا ہے۔ ان شاء اللہ اس عادت پہ بھی قابو پانا ہے۔ اور باجی اسماء کہتی ہیں تمہارا لہجہ بہت کرخت ہے۔ حالانکہ مجھے نہیں لگتا ہے۔ پر پھر بھی کوشش تو کرنی ہے اسے درست کرنے کی بھی۔ اور 2014 میں 2nd Tean میں آنا اچھا لگا۔ بھئی ہم سینئر ہو گئے ہیں۔ الحمدللہ ہمارا

99 پرسینٹ رزلٹ رہا اور پنجاب بھر میں ہمارا پیارا کالج امیر الدین میڈیکل کالج اول آیا۔ اس خوشی میں پرنسپل صاحب نے ہمیں کوئی پارٹی دی۔

3 میں ڈائجسٹ کا ٹائٹل بہت غور سے دیکھتی ہوں۔ اور اکثر ٹائٹلز مجھے یاد ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر 2014 کے تقریباً سب ہی ٹائٹلز اچھے تھے۔ مگر کچھ زیادہ اچھے لگے۔ جیسے جنوری کا موہنی سی صورت والا' فروری کا پیاری سی مسکراہٹ' مارچ کا بہت کول کلر کا ڈریس تھا' مئی ماڈل کے ہاتھ اور گلاب کے پھول' جولائی۔ معصوم سا لگا' اگست میں ماڈل کا ڈریس اچھا لگا' ستمبر کا اچھا تھا۔ نومبر۔ ماڈل کے بال' اس کا ڈریس اور وہ خود۔ جون کا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ اکتوبر کا بھی اچھا تھا۔ اگلے شمارے میں کسی نے تیسرے ہاتھ کی طرف توجہ دلائی تو دیکھا۔ واقعی وہ کس کا ہاتھ تھا؟ اور اگر آپ کہیں کہ صرف ایک پسندیدہ ٹائٹل بتائیں۔ تو جناب! وہ ہے دسمبر 2014 کا۔ پیارا ہے۔ بلکہ بہت ہی پیارا ہے ارے بھئی! سمجھا کریں نہ۔ نئی چیز ہی زیادہ پیاری لگتی ہے۔

اب آتے ہیں تحریروں کی طرف۔ بہت سی تحریریں اچھی لگیں۔ عشق دعا ہے' کوئی چاند رکھ میری شام پر' نایاب جیلانی' کہانی ایک گھر کی' راشدہ رفعت' صنم سے صمد تک' کنیز نبوی' کمہاری کا گھر' وجیہہ احمد' آہ سائرہ رضا' روپ نگر کی رام کہانی' نعیمہ ناز' یہ ہنستا ہوا موسم' راشدہ رفعت' شب غم رہی بڑی دیر تک' فرحین اظفر' گرد کی پار' نایاب جیلانی' افسانوں میں بے جوڑ' راشدہ رفعت اور تھام لیا' فرحین اظفر' افسانے یاد نہیں آرہے۔

اور سال 2014 کا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ "صنم سے صمد تک از کنیز نبوی" "یارم" بیک وقت ہنساتا ہوا اور رلاتا ہوا منفرد سا ناول ہے۔ مگر اب کچھ الجھا رہا ہے مجھے۔

ایک تھی مثال از رخسانہ نگار عدنان' شروع میں مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر اب اچھا لگتا ہے اور معذرت کے ساتھ رقص بسمل مجھے اچھا نہیں لگا۔

1 پہلے سالوں کا تو مجھے پتا نہیں' لیکن اس سال کے آنے سے میرے احساسات عجیب قسم کے ہیں۔ سوچتی ہوں کیا اس سال یعنی 2015 میں بابل کا آنگن چھوڑ کر جانا ہوگا اور وہ بھی اس شخص کے سنگ۔ جس کا ساتھ مجھے قبول ہی نہیں۔ کیا میں اس کے ساتھ اچھی ازدواجی زندگی گزار سکوں گی؟ مجھے لگتا ہے نہ میں خود خوش رہ پاؤں گی نہ اسے خوشی دے سکوں گی۔

2 گزرے سال میں وقت کے ساتھ ساتھ ایسے لگتا ہے جیسے میری ساری باتیں ختم ہوگئی ہیں۔ بولنے سے پہلے یہ سوچ کر خاموش ہو جاتی ہوں کہ کون ہے۔ جو میری سنے گا۔ اس سال میں میری ایک خواہش پوری ہوئی' ایک نہیں ہوئی۔ جو پوری ہوئی وہ یہ ہے کہ مجھے ہر ماہ باقاعدگی سے ایک ڈائجسٹ پڑھنے کو مل جاتا ہے' اور جو خواہش پوری نہیں ہوئی' وہ یہ کہ میری زندگی کا فیصلہ میرے پوچھے بغیر کر دیا گیا ہے۔ جس میں میں بالکل خوش نہیں ہوں۔

3 اس سال کی سب سے بہترین تحریر کنیز نبوی کی "صنم سے صمد تک تھی" جو میرے خیال میں بے مثال ہے بس حیا کے مرنے کا بہت زیادہ دکھ ہے۔ جب مئی کا شمارہ ہاتھ میں آیا تو ایسے لگا جیسے ساری سستی دور ہوگئی' ماڈل کے پھولوں کے گجروں نے مجھے سرشار کر دیا۔ مجھے پورے سال میں بس یہی ٹائٹل بہت زیادہ پسند آیا ہے۔

حنا سلیم اعوان۔ گاؤں آخون بانڈی ہری پور ہزارہ

پہلا احساس تو عمر رفتہ سے ایک سال کم ہونے کا ہوتا ہے۔ سال گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا۔ دبے پاؤں۔ چپکے چپکے۔ بغیر کسی آہٹ کے' جیسے مہینہ گزرتا ہے۔ ارے۔ یہ کیا۔ اتنی جلدی گزر گیا سال۔

2 تبدیلیوں سے ہی تو زندگی کا حسن برقرار ہے۔ میری زندگی میں بھی ایک تبدیلی آئی ہے بہار کی صورت۔ اور اس تبدیلی کا سارا کریڈٹ موسٹ فیورٹ نمرہ احمد کو جاتا ہے۔ تھینک یو نمرہ۔ آپ کی کہانی "جنت کے پتے" نے میری زندگی کی ترجیحات کو تبدیل کر دیا ہے۔

3 گزرے سال میں بہت ساری تحریریں پسند آئیں۔ تمام رائٹرز نے بہت عمدہ لکھا' سال کی نمبرون تحریریں بت شکن اور یارم ہیں۔ جنوری کے شمارے میں عظمیٰ افتخار کی۔ "محبت راز ہے ایسا" عارفہ رباب کی "زندگی سے یوں کھیلے" قانتہ رابعہ کی "رکاوٹ" فروری کے شمارے میں ام ایمان کی۔ ابا کی بھتیجی۔

مارچ کے شمارے میں راشدہ رفعت کی۔ کہانی ایک گھر کی' اکتوبر کے شمارے میں۔ عائشہ نصیر احمد کی۔ اک ہاتھ ذرا بڑھا۔ جہاں تک بات ہے پسندیدہ سرورق کی تو میری نظر میں جو سب سے پرفیکٹ' مکمل' حسین سرورق ہے وہ دسمبر 2014 کا ہے۔

اس کے علاوہ اکتوبر کے شمارے کی پنک اور وائٹ کپڑوں والی ماڈل من کو بے حد بھائی ہے۔ اور جولائی کا ٹائٹل بڑا مقدس سا لگا۔ سر پہ دوپٹہ اوڑھے' معصوم سی ماڈل سب سے منفرد تھی۔

فرحت ہاشمی۔ گوجرانوالہ

1 نئے سال کی آمد پہ احساسات؟ نیا سال پرانا سال کچھ پتا نہیں لگ رہا۔ اب تو سب دن' سب راتیں ایک سی ہیں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی لمحہ ہلچل ضرور مچاتا ہے۔ کوئی پل ضدی بچے کی طرح مچل جاتا ہے تو اس کا ہاتھ تھام کے پھر سے پہلے کی طرح ہو جاتی ہوں۔ لیکن یہ جو زندگی سے ناچہ چہ ہاتھ کھینچ کے بلکہ جھانپڑ لگا کے حال میں واپس لے آتی ہے اور "ضدی بچہ" اپنی ضد پہ روتے روتے سو جاتا ہے۔

2 ایک سال کے اندر کتنے بدل گئے؟ ارے صاحب کتنے کیا سر تا پیر بدل گئے اور سے اور ہو گئے۔ شوخ و چنچل لڑکی ذمہ دار گھریلو بیوی بن گئی۔ گھر والوں کی منہ پھٹ بنی منہ سی کے اچھی بہو بن گئی' بقول میری چھوجانی دشمن کے دانت کھٹے کر دینے والی زبان دانتوں میں دبا کے بیٹھ گئی۔

لیکن بدلے میں سسرال سے پیار بھی بہت پایا۔ ساس سسر نے بیٹی سمجھا اور نندوں اور جیٹھ صاحبان نے بہن پھر بلاک بسٹر دھماکہ مابدولت ماں کے مرتبے پہ بھی فائز ہو گئے' کو جی راتوں کی نیندیں اور دن کا آرام تبھی گیا پر "ابراہیم" کو گلے سے لگا کے جو سکون ملتا ہے' ہزار راتوں کی نیند بھی قربان اور دن کی بے آرامی بھی جی جان سے قبول' اور اس سال کی سب سے بڑی تبدیلی کہ سب خوشیاں اچانک ماتمی لباس تلے چھپ گئیں۔ میرے عزیز از جان ڈیڈی چلے گئے اس دنیا کی رونق بڑھانے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ کیا اس سے بڑا اور بھی کوئی غم ہو سکتا ہے؟ اب بھی یقین نہیں آتا حیرانی سی حیرانی ہے کیا ایسی صورتیں بھی مٹی میں مٹی ہو سکتی ہیں؟۔

3 تحریر۔ سیدھا سا ایک جواب "یارم" کیا کہانی ہے ہنسی خوشی زود رنجی' درد' دکھ کا امتزاج لیے ہوئے۔ دل چاہ رہا ہے میں بھی مانچسٹر یونیورسٹی سے ایک ڈگری لے ہی لوں اور کبھی کبھی تھوڑی تھوری جلن بھی ہوئی' روٹھی روٹھی نگاہوں سے "یارم" کو پڑھا۔ یہ کیا اتنا اچھا کیوں لکھا ہے' اتنا اچھا تو صرف میرا حق ہے لکھنے کا (آپ بھی لکھیں فرحت)

مصباح مسکان روف۔ جہلم

نئے سال کے پہلے دن یہ خیال بڑا شدید ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک اور سال بیت گیا۔ دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ یا اللہ اس سال کو سب کے لیے اچھا بنانا' امن و سلامتی کا سال' دکھ و پریشانی سے دور' پرامن اور خوش گوار سال۔

2 گزرے سال میں سب سے بڑی تبدیلی جو میری زندگی میں آئی' وہ میرے خواب کی تعبیر اور خواہش کی تکمیل تھی۔ میں رائٹر بن گئی۔ مئی 2014 اور جولائی 2014 میں میری دو تحریریں شائع ہوئیں۔ یہ سال میرے لیے بہت ہی لکی ثابت ہوا اور میں نے اسٹوڈنٹ لائف سے پریکٹیکل لائف یعنی ٹیچرز لائف میں قدم رکھا۔ وہ بھی اس طرح کہ میں بیک وقت اسٹوڈنٹ بھی ہوں اور ٹیچر بھی۔

3 سرورق تو سب ہی پیارے تھے لیکن سب سے زیادہ اپریل' مئی اور ستمبر کے سرورق نے متاثر کیا۔ تحریریں بھی سب ہی اچھی تھیں۔ ایک کی تعریف کرنا ناانصافی' دگی مگر زیادہ قابل تعریف جو تحریریں لگیں' ان میں امایہ خان کی "بت شکن" مریم عزیز کی "تعبیر" سدرۃ المنتہیٰ کی "کوئی امید کا ستارہ ہے" اور قانتہ رابعہ کی "لیلۃ القدر" شامل ہیں۔ قسط وار بھی سب ہی دلچسپ ہیں۔ اسپیشلی "یارم" یہ سمیرا حمید کی بہت اچھی تحریر ہے۔

سمیعہ سحر قریشی۔ ضلع بھاول نگر

1 ہم وہ ہر ہر لمحہ محسوس کرتے ہیں۔ جو ہم کبھی بھی بھول نہیں سکتے۔ ہم ہوتے تو حال میں ہیں لیکن جانے کیوں ماضی میں چلے جاتے ہیں۔

2 گزرے سال میں تبدیلیاں تو کوئی خاص نہیں آئیں البتہ خواہشیں بہت سی ہیں جیسا کہ میرے بھائی کی شادی جو کہ 2015 کے مارچ میں ہوگی۔ ان شاءاللہ۔

3 تیسرا سوال تو بہت ہی اچھا گیا۔ سارے رسالے لے آئے۔ اور خوب غور سے دیکھا کہ وہ کون سے تحریر ہے' جو ہمیں بہت اچھی لگی۔ "ایک تھی مثال' رقص بسمل' یارم' زندگی سے یوں کھیلے' کوئی چاند رکھ' ابا کی بھتیجی' تم ہی ہو' تعبیر' بڑی آزمائش' صنم سے صمد تک' لیلۃ القدر' آہ'

گرد کے پار' 'اک ذرا ہاتھ بڑھا' 'یہ ہنستا ہوا موسم' 'محبت فاتح عالم' اور یہ کہ جون اور دسمبر کے مکمل ناول مجھے بہت بہت پسند آئے۔

حمیرا اشرف۔عارف والا

پھر سے اک سال ہے گزرا کسی شب کی مانند
پھر سحر بن کے نیا سال آگیا ہے یارو

1۔ نیا سال جب بھی آتا ہے مجھے اس طرح محسوس ہوتا ہے کہ میری عمر اب بڑھی ہے ناکہ میری سالگرہ کے روز یعنی اگست میں۔ مزے کی بات ہے نا؟ دل چاہتا ہے نئے سال کو اپنی سالگرہ کی طرح مناؤں۔ نیا سال آتے ہی خود سے نئے عہد بھی باندھتی ہوں کہ اس سال میں کم بولا کروں گی (میں بولتی بہت ہوں نا) سب کی باتیں مانوں گی (خاص کر اللہ کی) اور زیادہ سے زیادہ عبادت کروں گی۔ 31 دسمبر کی رات 12 بجنے سے پہلے میں خاص کر جاگتی ہوں تاکہ بارہ بجے نئے سال کے نئے لمحوں کو میں ویلکم کرسکوں (یہ میرے ہر سال کی عادت ہے) اور میری خوشی دوبالا ہو جائے اگر اس دن اسکول نہ کھلنے ہوں۔ اس دن یعنی یکم جنوری کو موسم سرما کی تعطیلات ختم ہو جاتی ہیں اور اسکول کھلتے ہیں۔ اور ہم بہت سے بچوں کے استاد محترم ہوتے ہیں تو میری خوشیوں پر چھٹیاں ختم ہونے سے ڈھیروں دھند اور کہرا پڑ جاتا ہے۔

2 ہر گزرتا سال آپ کو نیا سبق اور سوچ کے نئے راستے دکھا جاتا ہے۔ اس گزرے سال نے میری زندگی کو جو سب سے بڑی تبدیلی دی وہ یہ تھی کہ میری دو بہترین دوستوں کی شادیاں ہو گئیں اور میں جو وقت بے وقت ان سے ملنے چلی جاتی یا کال کر لیتی تھی اس عیاشی سے محروم ہو گئی۔ اس کے علاوہ پروفیشنل لائف میں میں نے ہر سال جہاں بچوں کو پڑھاتے ہوئے بہت کچھ سیکھا' وہیں اس سال مجھے ایک دکھ یا نصیحت یہ بھی ملی کہ آپ کسی سے جتنا مرضی مخلص ہو جائیں لوگ آپ کو ضرور "استعمال" کرکے پھر آپ کو ہی برا کر دیتے ہیں اور تیسری تبدیلی میں نے جانا کہ ماں کے بغیر گھر کیسا لگتا ہے۔ ماں واقعی جنت ہے۔ اس سال میری امی بہت بیمار ہوئیں اور ایک' ڈیڑھ ہفتہ اسپتال رہیں تو ہمیں لگا کہ ہمارا گھر کوئی سرائے ہے' خاموش اداس۔ وہ واپس آئیں تو رونق لوٹی۔ اللہ سب کی ماؤں کو سلامتی دے۔ آمین۔

3 شعاع سے وابستگی جتنی پرانی ہے اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ سوچتے ہوئے مجھے شرم آنی چاہیے کہ کون سا شمارہ اچھا ہے۔ تو جناب! سب شمارے سامنے رکھ کر کئی دفعہ خیال بدلے اور پھر بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ "جنوری" کا ٹھنڈا اور بڑا نفیس سا تاثر رکھتا سرورق' اور "جولائی" کا گلابی رنگوں سے آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا انتہائی سادہ سا سرورق سب پہ بازی لے گیا۔ تحریروں کی بات کریں تو جنوری کے شمارے میں "عارفہ رباب" کی تحریر زندگی سے یوں کھیلے سنیعہ عمیر کا "نیلا گلاب" وجیہہ احمد کا "کمہاری کا گھر" اور موسٹ فیورٹ کنیز نبوی کا "صنم سے صمد تک" سمیرا حمید کا "عالم لاہوت" جس نے کئی دن اپنے حصار میں رکھا اور "اک تھا تیتر" رشک حبیبہ کا عمدہ ترین تحریریں تھیں۔ پر اس سال فائزہ افتخار کو بہت مس کیا ہم نے۔

عمارہ رفیق۔فاضل پور

اللہ پاک کا لاکھ شکر ہے کہ پچھلے سال کی طرح یہ سال بھی بخیر و عافیت گزر گیا۔ جہاں تک نئے سال آمد کا سوال ہے تو بس میں اتنا کہوں گی اللہ پاک نئے سال 2015ء میں وطن عزیز پر کوئی مصیبت نہ آئے۔ (آمین)

2 دوسرا سوال' 2014 میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ الحمد اللہ گزرتے سال میں نے بہت کچھ پایا اور کم کھویا۔

3 ارے واہ کیا سوال کیا آپ نے۔ میں انتظار میں تھی کب یہ آئے سوال۔ جہاں تک تحریر کی بات ہے اس میں حمد نعت' سے لے کر ہر تحریر ہی بیسٹ ہے لیکن اس سال کی جو بیسٹ اسٹوری ہے وہ ہے "بازگشت" جو سب سے الگ اسٹوری تھی ویل ڈن سنیعہ عمیر اور "صنم سے صمد تک" کنیز نبوی مبارک بہت ہی زبردست۔

اور سرورق سب اچھے تھے لیکن اگست 2014ء کا اور دسمبر 2014 سب سے بیسٹ لگا۔ آخر میں سب شعاع کی ٹیم کو نیا سال مبارک۔

ہمیں نہیں یاد کہ "ڈاکٹر یونس بٹ" نے کچھ لکھا ہو اور انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ ڈاکٹر یونس بٹ ایک طویل عرصے سے قلم کی دنیا سے وابستہ ہیں ان کی شگفتہ تحریریں ٹینشن زدہ چہروں پہ بھی مسکراہٹ بکھیر دیتی ہیں۔ "ہم سب امید سے ہیں" میں ڈاکٹر صاحب نے طنز و مزاح کو ایک نئے انداز میں روشناس کرایا۔ آج بہت سے چینل ڈاکٹر صاحب کی ہی تقلید کرتے ہیں۔ مگر ان کے قلم کی کاٹ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔

"جی کیسے ہیں ڈاکٹر صاحب؟"

"جی الحمد للہ......"

"مصروف تھے؟"

"جی۔ وہ تو میں ہوتا ہی ہوں..... لیکن آپ پوچھیں کیا پوچھنا چاہتی ہیں آپ کی تحریریں آپ کے انٹرویوز میری نظر سے گزرتے رہتے ہیں۔"

مزاح نگار، مصنف، کالم نگار

یونس بٹ سے ملاقات

شاہین رشید

"بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب! ماشاءاللہ چوبیس پچیس سال سے آپ لکھ رہے ہیں۔ ہر تحریر نے مقبولیت حاصل کی' مگر "ہم سب امید سے ہیں" کی مقبولیت میں کمی نہیں آتی..... کیا آئیڈیا تھا کہ یہ مزاح کی دنیا میں طویل ترین پروگرام بن جائے گا؟"

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں سوچا تھا..... ہم نے تو اس کو الیکشن کے پوائنٹ آف ویو سے بنایا تھا کیونکہ ان دنوں الیکشن ہو رہے تھے اور ابتدا میں اس کی صرف پانچ ہی اقساط تھیں' لیکن پھر یہ اتنا زیادہ پاپولر ہوا کہ اب تو اس کو بارھواں سال لگ چکا ہے۔"

"آپ نے اس کا نام اپنی کتاب "غل دستہ" پر کیوں نہیں رکھا "ہم سب امید سے ہیں" کیوں رکھا؟"

"چونکہ الیکشن کے دن تھے اور ہر سیاست دان کو امید تھی کہ وہ اکثریت میں آجائیں گے تو ان کے پوائنٹ آف ویو سے ہم نے یہ نام رکھا اور یہ نام تو آج تک برافٹ چل رہا ہے کیونکہ عوام کو بھی امید ہے اور لیڈر ان کو بھی امید ہے کہ حالات بدلیں گے۔"

"ویسے لگتا تو نہیں ہے کہ کبھی عوام کے حالات بدلیں گے۔ طنز و مزاح کی طرف رجحان بچپن سے ہی تھا کیا؟"

"جی بالکل' لکھنے کا شوق تو بچپن سے ہی تھا۔ غالباً پانچویں یا چھٹی کلاس میں تھا' تب سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہتا تھا..... اور دلچسپ بات یہ کہ اپنے لکھے پہ اعتبار نہیں تھا۔ اس لیے لکھ کر پھاڑ بھی دیتا تھا۔ اور اپنی

تحریروں میں اپنے دل کی باتیں اور لوگوں کے رویوں کے بارے میں لکھتا تھا۔ کبھی اکیلا پن محسوس کرتا تھا تو لکھنے بیٹھ جاتا تھا۔"

"کب احساس ہوا کہ اچھا خاصا لکھ لیتا ہوں اس کو کہیں چھپوا بھی دوں؟"

"جیسا کہ میں نے کہا، بچپن سے ہی لکھ لیتا تھا لیکن چھپوانے کا عمل اس وقت شروع ہوا، جب میں ایم بی بی ایس کے فرسٹ ائر میں تھا اور حلقہ ادب کی ایک تقریب میں اپنی پہلی تحریر "درد" پڑھی، جس میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ تھوڑا مزاح بھی شامل تھا۔ میری تحریر کو ادبی حلقوں میں بے حد پسند بھی کیا گیا، جس سے میری حوصلہ افزائی ہوئی.... مجھے یاد ہے کہ ایک اخبار نے میری تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی جاننا چاہتا ہے کہ "انشائیہ" کیا ہوتا ہے تو وہ ڈاکٹر یونس بٹ کی اس تحریر کو پڑھ لیں۔"

"بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی آپ کی؟"

"جی بہت زیادہ اور پھر ہمت ہوئی مزید لکھنے کی اور چھپوانے کی۔ اب میں تحریریں لکھ کر پھاڑتا نہیں تھا۔ بلکہ سنبھال کر رکھتا تھا کہ مناسب موقعوں پر چھپواؤں گا اور چھپوائیں بھی۔"

"ڈاکٹر صاحب! آپ کے بارے میں ہی پڑھا ہے کہ آپ کے مضامین کو کوئی کتابی شکل دینے کو تیار ہی نہیں تھا؟"

ہنستے ہوئے "صحیح پڑھا آپ نے۔ دیکھ لیں دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ وہ تحریریں تھیں، جو مختلف اخبارات اور میگزین میں شائع ہو چکی تھیں۔ مگر کوئی ان کو شائع کرنے کے لیے تیار نہیں تھا تو پھر میں نے اسے اپنے طور پر شائع کروایا اور اس کا نام "شناخت پریڈ" رکھا اور آپ یقین کریں اس کتاب کے شائع ہونے کے تین چار دن کے بعد پبلشرز میرے ہسپتال آئے کہ آپ اجازت دیں تو ہم اس کے مزید ایڈیشن شائع کر دیں تو میں بہت حیران ہوا کہ پہلے یہ لوگ کہاں تھے۔"

"کالم نگاری کی طرف کیسے آئے؟"

"جب اللہ تعالیٰ کو کچھ کرنا ہوتا ہے تو وہ راستے کھولتا چلا جاتا ہے۔ اپنی کتاب کے لیے ایک اشتہار چھپوانے کے لیے ایک اخبار کے دفتر گیا تو وہاں، ڈاکٹر اجمل نیازی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے اخبار میں کالم لکھنے کی پیش کش کی اور یوں میں کالم نگار بنا۔ کالم کا نام "عکس بر عکس" تھا۔ پھر مختلف اخبارات میں بھی مضامین اور کالم لکھے اور جب میرے لکھے گئے ایک ڈرامے کی تعریف معروف ڈرامہ و افسانہ نگار اور ادیب اشفاق احمد نے کی تو ایسا لگا کہ جیسے میں واقعی ایک مستند لکھنے والا بن گیا ہوں اور یوں ٹی وی کی دنیا میں بھی متعارف ہوا۔"

"طنز و مزاح میں آپ نے ملک کو سدھارنے کی بہت کوشش کی، کیا سمجھتے ہیں محنت کا صلہ ملا یا مایوسی ہوئی؟"

"مایوسی تو نہیں کہوں گا اور تب تک لکھتا رہوں گا جب تک کچھ اچھا ہو جائے.... محنت کا صلہ ان شاءاللہ کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔ ہمارے معاشرے میں اب تو ایسا لگتا ہے کہ ان سیاست دانوں نے اور یہ جو ڈکٹیٹر آتے ہیں انہوں نے کلچر ہی ایسا بنا دیا ہے کہ جو کرپشن کرتا ہے۔ جرم کرتا ہے وہ اس پہ شرمندہ ہونے کے بجائے اس پر فخر کر رہا ہوتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کسی کو اپنا آپ ٹھیک کرنے کی خواہش نہیں ہے۔ یہاں تو جو جعلی ڈگری میں پکڑا جاتا ہے اسے بھی الیکشن میں سپورٹ کیا جاتا ہے۔ ویلیوز بہت بری طرح ختم ہو رہی ہیں.... ہم اسی امید پہ لگے ہوئے ہیں کہ کچھ بہتر ہو جائے۔"

"ہر انسان کسی نہ کسی سیاسی جماعت کو اپنے طور پر پسند ضرور کرتا ہے۔ یقیناً" آپ بھی کرتے ہوں گے۔ تحریروں میں اس کا اظہار کرتے ہیں؟"

"نہیں کبھی نہیں.... عموماً" لکھنے والوں کو دھمکیاں بھی ملتی ہیں اور برا بھلا بھی کہا جاتا ہے۔ مگر مجھے آج تک اس سچویشن کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اور اس کی

اصل وجہ یہ ہے کہ میں ہمیشہ نیوٹرل ہو کر لکھتا ہوں اور سب کے ساتھ ایک جیسا ہی سلوک کرتا ہوں.... تو جو حکمران ہوتا ہے وہ ہی میرے خلاف ہوتا ہے۔"

"کبھی کسی نے خود سے کہا کہ ہماری پیروڈی کریں؟"

"بالکل کہتے ہیں.... ایک جماعت نے خاص طور پر کہا کہ آپ ہمارے لیڈر کو شاید ایک علاقائی لیڈر سمجھتے ہیں اس لیے ان کا ذکر نہیں کرتے۔ تو پھر جب ان کی پیروڈیز کی گئیں تو انہیں بھی اچھا لگا۔"

"ہمارے لوگوں کے دل بہت چھوٹے ہیں۔ لیڈر بڑے بنتے ہیں، مگر چھوٹی چھوٹی بات کو دل پہ لے لیتے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ دل پہ لے لیتے ہیں۔ برداشت نہیں ہے حالانکہ ہمارا مقصد کسی کی بے عزتی کرنا نہیں۔ ہم تو خوش گوار انداز میں تنقید کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی لوگوں کو اپنے گریبان میں کچھ نہ کچھ نظر آ ہی جاتا ہے۔"

"کبھی ڈر لگا آپ کو کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے؟"

"ارے نہیں۔ اگر ڈرتا تو پھر اتنے عرصے سے لکھ نہ رہا ہوتا اور اگر لکھ بھی رہا ہوتا تو آپ سب میری تحریروں کو بے باک نہ کہتے۔ میں ڈرتا ہوں تو صرف اور صرف اپنے رب سے، جو پوری دنیا کا مالک ہے اور اللہ کا ڈر آپ کو بہت سے خوف۔ اور ڈر سے بچا لیتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ انسان سب سے زیادہ اپنے آپ سے ڈرتا ہے، جب وہ خیانت کرتا ہے یا کسی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوتا ہے، یا کسی کا حق مار رہا ہوتا ہے، تو اسے یہ خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں نہ کسی کی بے عزتی کرتا ہوں اور نہ ہی کسی کو ٹارگٹ کرتا ہوں۔ میں ذاتی طور پر کسی سے ملتا بھی نہیں ہوں کہ مجھے بلند عمارتوں اور بڑے لوگوں سے خوف سا آتا ہے۔ اس طرح کا خوف نہیں کہ یہ کہیں مجھے نقصان نہ پہنچائیں۔ بس میرا دل

نہیں چاہتا۔ ان بڑے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا.... میں اپنے جیسے اور اپنے ہم مزاج لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ ادیبوں شاعروں کے پاس بیٹھنا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ وہ سوچ رکھتے ہیں۔ دماغ رکھتے ہیں اور اچھی طرح ملتے ہیں۔"

"پیسہ ہے اس فیلڈ میں؟"

"جی ہاں.... لیکن میں نے کبھی ہوس نہیں کی پیسے کی۔ ایک واقعہ سناتا ہوں آپ کو.... بزرگوں سے ہمیشہ یہ سنا کہ انسان کے حصے کا رزق اللہ تعالیٰ نے فکس کیا ہوا ہے۔ مگر اسے حاصل کس طرح کرنا ہے اس کی تلاش انسان کو خود کرنی پڑتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں کلاس سکس میں پڑھتا تھا تو ایک دن اسکول کے راستے میں مجھے زمین پہ پڑے ہوئے کچھ پیسے ملے۔ پہلے تو میں اٹھانے لگا پھر خیال آیا کہ جب اللہ نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے تو پھر گرا ہوا پیسہ کیوں اٹھاؤں۔ جب وہ عزت کے ساتھ دے گا، تب ہی لوں گا.... تو وہ مجھے دے رہا ہے عزت کے ساتھ.... اور میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھے اپنی ہر نعمت سے نواز رہا ہے۔"

"بچپن میں بڑے خواب ہوتے ہیں کہ یہ بنیں

گے۔ وہ بنیں گے۔ آپ نے ڈاکٹر بننے کے علاوہ کیا سوچا تھا کہ بہت بڑا رائٹر بھی بن جاؤں گا؟"

"بچپن میں ڈاکٹر بننے کا تو نہیں سوچا تھا، بچپن میں تو صرف اور صرف لکھنے کا شوق تھا اور رائٹر بننے کا ہی میں نے سوچا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد میرے شوق کو تقویت اور میری حوصلہ افزائی میر شکیل الرحمٰن نے کی۔"

"ایک آدھ بار آپ اس ادارے کو چھوڑ کر بھی چلے گئے.... پھر واپس بھی آ گئے.... مسئلہ کیا تھا؟"

"جہاں کام کرو وہاں تھوڑے بہت اختلافات تو ہوتے ہی رہتے ہیں اور جیسا کہ آپ نے کہا کہ میں چھوڑ کر چلا بھی جاتا ہوں، کیونکہ میری مرضی کے بغیر اگر کوئی تبدیلی لانے کی کوشش کرے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ لیکن پھر میں واپس بھی آجاتا ہوں۔ تو ایسا سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ اوپر لیول کے لوگوں سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے، کیونکہ وہ مجھے بہت زیادہ سپورٹ کرتے ہیں میں ان سے کہتا ہوں کہ میں یہ کرنا چاہتا ہوں تو وہ حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ باقی دیگر چینلز سے آفرز تو آتی رہتی ہیں۔"

"اس وقت آپ شہرت کی بلندیوں پر ہیں تو آپ خوش ہیں سب کچھ پا کر؟"

"الحمد للہ.... بہت خوش ہوں۔ لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ میری شہرت کا سب سے اچھا دور وہ تھا جب میں کتابیں لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں مجھے بہت زیادہ شہرت ملی۔ میری کتابیں بہت زیادہ بکتی تھیں اور لوگ مجھے بہت زیادہ پہچانتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے۔ اس کے بعد "فیملی فرنٹ" نے مجھے بہت زیادہ شہرت دی۔"

"کچھ حاصل کرنا زیادہ مشکل ہے یا حاصل کیے کو قائم رکھنا زیادہ مشکل ہے؟"

"حاصل کرنے کے لیے تو انسان بہت محنت کرتا ہے مگر حاصل کر کے اس کو بچانا زیادہ مشکل ہے.... ایک اسٹیج ایسی بھی آجاتی ہے، جب حاصل کیے کو بچانے کے لیے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

"ایک طرف آپ ڈاکٹر، دوسری طرف مزاح نگار.... دونوں کام ایک دوسرے کے متضاد ہیں.... کیا کہیں گے آپ؟"

"ہاں متضاد تو ہیں.... بس بچپن سے ہی مجھ میں مزاح کی حس تھی اور مجھے مزاح لکھنے میں اور بولنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ جو کام آسان ہے، وہ ہی کروں۔"

"مزاح نگار کے دل اندر سے سنجیدہ اور رنجیدہ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے بارے میں کیا کہیں گے؟"

"دوسرے لوگوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن جہاں تک میرا معاملہ ہے تو میں تو اندر سے بہت سنجیدہ ہوں.... اور بس یہ سب قدرتی ہوتا ہے۔

جیسے چپ رہنے والا آدمی پینٹنگ بہت اچھی بنا لیتا ہے، اور ایسا نہیں کہ میں نے سنجیدہ لکھنے پہ توجہ نہیں دی۔ شروع شروع میں، میں نے کچھ سیریلز لکھے ہیں سنجیدہ نوعیت کے، لیکن میں نے محسوس کیا کہ سنجیدہ سین لکھنے کے لیے مجھے بہت کرب سے گزرنا پڑتا تھا۔ تو میں نے سوچا کہ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ کبھی ماں بن کے تو کبھی بیوہ بن کے فیل کرنا اور لکھنا۔"

"کامیابی کا راز؟"

"میرے نزدیک کامیاب انسان وہ ہے، جو وہی کچھ کرے جس میں اس کی دلچسپی ہو۔ میں جو کرنا چاہتا تھا وہ ہی کر رہا ہوں اور جس دن یہ نہیں کرنا چاہوں گا اسی دن چھوڑ دوں گا۔"

"کس تحریر نے سب سے زیادہ ایوارڈز حاصل کیے،

"جب پی ٹی وی ایوارڈ ہوا کرتے تھے تو فیملی فرنٹ کو آٹھ پی ٹی وی ایوارڈز ملے تھے اور یہ ایک ریکارڈ ہے کہ اتنے ایوارڈ آج تک کسی سیریل کو نہیں ملے.... باقی ایوارڈ تو بس ملتے ہی رہتے ہیں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔ کب کہاں پیدا ہوئے وغیرہ وغیرہ؟"

"گجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ 4 جنوری میرا جنم دن ہے۔ سن مجھے یاد نہیں۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی پھر گجرانوالہ جامع ہائی اسکول سے میٹرک کیا۔ گورنمنٹ کالج سے انٹر اور کنگ ایڈورڈ کالج سے ایم بی بی ایس کیا۔ اس وقت اس کالج میں داخلہ ملنا بڑے اعزاز کی بات ہوتی تھی اور اس کالج کے طالب علموں کی معاشرے میں بڑی عزت ہوتی تھی۔ جب ہم شاپنگ کے لیے کہیں جاتے تھے تو ہم سے کم پیسے لیے جاتے تھے کہ یہ کنگ ایڈورڈ کالج کا طالب علم ہے۔ میری ایک بہن ہے اور تین بھائی ہیں۔"

"شادی؟"

"شادی ارینج تھی۔ بعد میں پسند بھی شامل ہو گئی۔ بیگم کا نام آمنہ ہے۔ تین بیٹے ہیں میرے.... اور چونکہ میں کم ملنے جلنے والا بندہ ہوں تو میری کل کائنات میرا گھر اور میری فیملی ہے۔ میرا لکھنا لکھانا میرے گھر پر ہی ہوتا ہے۔ بہت کم وقت کے لیے آفس جاتا ہوں۔"

"کس کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے؟"

"اپنے ساتھ اور پھر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔"

"کوئی بات جو نوجوانوں سے کہنا چاہیں گے؟"

"وقت کی قدر کرنا سیکھیں، اسے ضائع نہیں کریں، جو وقت برباد کر دیتے ہیں، وہ اپنے آپ کو برباد کر دیتے ہیں۔ وقت زندگی کا سرمایہ ہے۔"

"فیصلے اپنی مرضی سے کرتے ہیں؟"

"اپنی مرضی سے ہی کرتا ہوں اور جن فیصلوں کو درست سمجھتا ہوں اسی پر پھر عمل بھی کرتا ہوں۔"

"زندگی میں کس کے احسان مند ہیں؟"

"جس نے مجھے زندگی کی دولت و نعمت سے نوازا ہے۔ جس نے مجھے کامیابیاں عطا کی ہیں، جس کی بدولت آج میں دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہوں، میں اس کا احسان مند ہوں اور وہ میرا رب ہے۔ اس کا تعاون ساتھ نہ ہو تو انسان کچھ بھی نہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے ڈاکٹر یونس بٹ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

✡

دستک دستک دستک

شاہین رشید

منہاج عسکری

"کیسے ہیں منہاج؟"
"جی اللہ کا شکر ہے۔"
"ریڈیو 'ڈرامے اور دیگر ایکٹوٹیز کیسی چل رہی ہیں؟"
"سب کچھ سیٹ چل رہا ہے اور دیگر مصروفیات بھی ٹھیک ٹھاک چل رہی ہیں۔"
"ریڈیو کی دنیا میں کب سے ہیں اور کیسے آئے؟"
"ماشاءاللہ اب تو کافی سال ہو گئے ہیں۔ اب تو ریڈیو میرا دوسرا گھر بن گیا ہے۔ کس طرح آیا تو اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ میرے ایک دوست ریڈیو پہ کام کرتے تھے۔ ایک دن ایسے ہی ریڈیو کی بات ہو رہی تھی تو میں نے انہیں کچھ آئیڈیاز دیے کہ آپ پروگراموں کو اس طرح بھی کر سکتے ہیں۔ انہیں میرے آئیڈیاز پسند آئے کہنے لگے کہ آئیڈیاز دینے کے بجائے تم خود ان آئیڈیاز پہ کام کیوں نہیں کرتے.... میں نے کہا کس طرح؟ تو کہنے لگے کہ ریڈیو جوائن کر لو.... اور ہمارے پروگرام منیجر سے مل لو۔ اگر انہیں تمہارے آئیڈیاز پسند آ گئے تو بس سمجھ لو جگہ بن گئی تمہاری.... پھر میری ملاقات ہوئی۔ میرے آئیڈیاز 'میری باتیں 'میرے بولنے کا انداز پسند آیا اور یوں ایف ایم پہ میری جگہ بن گئی۔"
"گڈ.... کیا شروع سے ایف ایم 105 میں ہیں آپ؟"
"نہیں جی.... میرا سفر ایف ایم 103 سے شروع ہوا.... اپنے آئیڈیاز کے تحت پروگرام شروع کیا اور تقریباً" آٹھ نو ماہ بعد کچھ وجوہات کی بنا پر میں نے اس ایف ایم کو چھوڑ دیا اور ناپا جوائن کر لیا۔ ناپا جوائن کرنے کے بعد میری والدہ اور نانا نے میری بہت حوصلہ افزائی کی جبکہ دیگر لوگوں نے اعتراض کیا۔"
"اچھا اعتراض.... وہ بھی اس دور میں؟ جبکہ آج کا دور تو ہے ہی میڈیا کا دور؟"
"جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جب میں پندرہ سولہ سال کا تھا تو میرے والد کا انتقال ہو گیا اور آپ کو پتا ہی ہے کہ جب والد کا سایہ نہ ہو تو ہر کوئی والد بننے کی کوشش کرتا ہے.... خیر میں نے ناپا جوائن کر کے بہت کچھ سیکھا۔"
"ناپا تو خاصا مہنگا ہے جبکہ آپ کے سر پر والد بھی نہیں تھے؟"
"جی.... ناپا کا تین سال کا کورس تھا.... والدہ کے علاوہ اپنی مدد آپ کے تحت میں نے ٹیوشن پڑھائی اور اپنا خرچ خود اٹھایا.... اللہ کا شکر ہے کہ مشکل دن گزر گئے.... اب یاد نہیں کرنا چاہتا۔"
"اوکے.... پھر ایف ایم 105 میں کیسے آئے؟"
"ناپا سے گریجویشن کے دوران ہی ایف ایم 105 سے آفر آ گئی۔ ادارے والوں سے اجازت لے کر اس کو جوائن کر لیا۔"
"شادی کب کی 'آپ کی پسند کا کتنا عمل دخل ہے اور لائف کیسی گزر رہی ہے؟"
"شادی کو ماشاءاللہ تقریباً" پانچ سال ہو گئے ہیں اور بالکل جناب میری پسند سے میری شادی ہوئی۔ ثنا کو میں 2002ء سے جانتا تھا اور پسند کرتا تھا.... پھر ہماری شادی ہو گئی.... اللہ کا شکر ہے کہ ہماری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔"
"بندھن کے لیے آپ کا انٹرویو کرنا چاہتی ہوں مگر آپ کی بیگم تعاون نہیں کر رہیں؟"
قہقہہ.... "ارے نہیں 'آپ کو دیں گے انٹرویو ضرور۔"
"خیر.... آپ کس ایف ایم کو خالصتاً" پاکستانی چینل کہہ سکتے ہیں؟"
"کسی کو بھی نہیں 'حتیٰ کہ - ریڈیو پاکستان کے چینلز کو بھی نہیں 'کیونکہ ان کے ایف ایم پہ بھی انڈین گانے چل رہے ہوتے ہیں۔ ہماری پہلی ترجیح پاکستانی میوزک ہونا چاہیے۔"
"اس ٹینشن زدہ ماحول میں آپ کے مزاج کی کیا کیفیت رہتی ہے؟"
"ماحول تو کافی زمانے سے ٹینشن زدہ ہے.... مگر میرا مزاج فرینڈلی ہے۔ غصہ صرف غصے والی بات پہ آتا ہے 'ویسے نہیں۔"
چلیں خوش رہیں.... پھر بات کریں گے۔

بینش چوہان

"ہیلو کیا حال ہیں؟"
"بہترین.... آپ سنائیں۔"
"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"
"جس کام میں ہماری روزی بندھی ہے 'وہ ہی کام ہو رہا ہے۔"
"بہت مصروف رہتی ہو؟"
"آج کل دو تین سیریلز اور سوپ آن ایر ہیں۔ نیا سیریل "دیمک" بھی آپ دیکھ رہی ہوں گی۔ کچھ کام انڈر پروڈکشن ہیں۔ تو بس سلسلہ چل ہی رہا ہے۔"
"اچھی بات ہے سلسلہ چلتا ہی رہے۔ "دیمک" کا کیا رسپانس مل رہا ہے؟"
"بہت اچھا.... کیونکہ اس کا موضوع ہی ایسا ہے اور شاید پہلی بار اس موضوع کو لیا گیا ہے۔ 'تھیلیسیمیا" کے موضوع پر ہے 'جو کہ بچوں کو لاحق ہو جاتی ہے بیماری۔"
"بہت حساس موضوع ہے.... کہیں مشکل ہوئی؟"
"نہیں اللہ کا شکر ہے کہ مشکل نہیں ہوئی 'لیکن

ان والدین پہ اور بچوں پہ بہت دکھ ہوا، جو اس بیماری کو جھیل رہے ہیں۔"

"آج کل جو ملک کے حالات ہیں.... کچھ کہیں گی اس کے بارے میں؟"

"مجھے تو معاف ہی رکھیں۔ بس اتنا ہی کہوں گی کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک پر اپنا کرم کرے اور سب سکون کے ساتھ اور محبت کے ساتھ رہیں۔ ملک میں جو آج کل افراتفری ہے اللہ میاں اس سے نجات دے۔"

"کس کو سپورٹ کرتی ہیں.... عمران خان کو یا نواز شریف کو؟"

"کسی کو نہیں.... مجھے کسی سیاست سے دلچسپی نہیں ہے.... مجھے صرف اپنے کام سے دلچسپی ہے اور اس بات سے دلچسپی ہے کہ ہمارے ملک میں امن و سکون رہے۔"

"ایک طویل عرصے سے کام کر رہی ہیں۔ بے شمار ڈرامے کیے.... بہترین کس کو کہیں گی؟"

"مجھے اپنے سارے ڈرامے بہترین لگتے ہیں۔ کیونکہ میں ان ہی ڈراموں میں کام کرتی ہوں، جن میں مجھے اپنا کردار پسند آتا ہے۔ جن کی کہانیوں میں جان ہوتی ہے۔ آپ یقین کریں بہت آفرز آتی ہیں۔ لیکن میں سب آفرز کبھی بھی قبول نہیں کرتی۔ وہی کردار لیتی ہوں جو مجھے پسند آتا ہے۔ اس لیے کسی ایک ڈرامے کا نام لے ہی نہیں سکتی۔"

"بینش! آپ کی ترقی کا راز؟"

"میری دو باتیں یاد رکھیں۔ یہ بات نئے آنے والوں کے لیے بھی کہوں گی کہ کبھی اپنے ماضی کو نہ بھولیں، خواہ وہ کیسا ہی گزرا ہو اور دوسری بات یہ کہ ہمیشہ دوسروں کے ساتھ عجز و انکساری کے ساتھ ملیں۔ پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو کس طرح اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔"

"صبح اٹھ کر پہلا کام کیا کرتی ہیں؟"

"آئینے میں اپنی شکل دیکھتی ہوں اور پھر بال باندھ کر موبائل چیک کرتی ہوں۔"

☼

نبیلہ عزیز

ماورا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ ماورا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔ فارہ کی والدہ منزہ رحیم اپنی بہن ثمینہ یزدانی سے ملنے کراچی جاتی ہیں۔ آفاق انہیں ایر پورٹ لینے نہیں جاتا۔ مجبوراً "ساشا کو جانا پڑتا ہے۔ وہ آفاق کی بد تہذیبی پر خفا ہو کر واپس چلی جاتی ہیں۔

منزہ ثمینہ اور نیرو کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شاندار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرو کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ لیتی ہے۔ عزت بھی ولید کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور ڈھکے چھپے لفظوں میں ولید سے اپنی کیفیت کا اظہار بھی کر دیتی ہے مگر ولید انجان بن جاتا ہے۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ بہت روتی ہے۔ ثمینہ اور اشتیاق یزدانی کو علم ہوتا ہے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا ہے۔ ثمینہ کی طبیعت بگڑنے لگتی ہے۔

اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ عزت' تیمور کے موبائل سے ولید کا نمبر لے کر اسے فون کرتی ہے مگر ولید اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں ماورا کو

بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔ ماورا، عافیہ بیگم کی ناراضی کے باوجود چلی جاتی ہے۔ وہاں تیمور اور ماورا کی ملاقات ہو جاتی ہے۔ عزت اپنے دل کی کیفیات ساشا سے بیان کر دیتی ہے۔ ماورا بی گل کو بتاتی ہے کہ وہ رضا حیدر کے بیٹے تیمور حیدر سے ملی ہے۔ بی گل دم بخود رہ جاتی ہیں۔

شادی میں تیمور حیدر، ماورا کے قریب آنے کی کافی کوشش کرتا ہے مگر ماورا کا سخت اور کھردرا رویہ ہر بار اسے ناکام کر دیتا۔ تیمور، ماورا سے رضا حیدر کو ملواتا ہے۔ رضا حیدر اسے دیکھ کر چونک جاتے ہیں مگر باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہیں پاتے۔ فارہ کی ہی شادی میں عزت کی ملاقات قیام مرزا کے بیٹے مونس مرزا سے ہوتی ہے۔ وہ سخت بیزار ہوتی ہے جبکہ مونس خوب دلچسپی لیتا ہے۔

آفاق آدھی رات کو غائب ہو جاتا ہے۔ فارہ پریشان ہوتی ہے۔ وہ صبح آ کر بتاتا ہے کہ اس کے دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ اس لیے اس کے آرام کا خیال کرتے ہوئے وہ بغیر بتائے چلا گیا تھا۔ مگر فارہ اس کی بات پہ یقین نہیں کرتی۔ تیمور، فارہ کے ذریعے ماورا کو اپنے آفس میں ایک شاندار پیکج پر جاب کی پیشکش کرتا ہے جسے ماورا کافی حیل حجت کرنے کے بعد قبول کر لیتی ہے۔

۱۷
سترہویں قسط

ماورا لب بھینچ کے رہ گئی تھی۔

اور ہاتھ میں پکڑا موبائل صوفے پہ اچھال دیا تھا اور پھر دونوں ہاتھوں میں سر تھامتے ہوئے خود بھی صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

"تم اچھا نہیں کر رہے تیمور حیدر! تم اچھا نہیں کر رہے… تم کھیل رہے ہو اپنے آپ سے… اپنے جذبات سے، تمہیں ماورا مرتضیٰ سے کچھ حاصل نہیں ہو گا… کچھ بھی نہیں… میں نے بارہا چاہا اور بارہا سوچا ہے کہ تمہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال نہ کروں… کئی بار روکا ہے اپنے آپ کو… میں اپنے عہد اور ارادوں سے نہ پھرنے والی لڑکی، صرف تمہاری وجہ سے کئی بار پھر چکی ہوں۔ ڈبل مائنڈڈ ہو کر رہ گئی ہوں… سوچتی کچھ ہوں… کرتی کچھ ہوں… اور… اور ہوتا کچھ ہے… صرف تمہاری ذات کی اچھائی کی وجہ سے… مگر تم ہو کہ خودکشی پہ تلے بیٹھے ہو… میرے بتانے کے باوجود… سب کچھ نظر آنے کے باوجود خودکشی پہ بضد ہو…؟ پلیز تیمور حیدر مت کروایسا… پلیز مت کروایسا… تمہاری تکلیف پہ تکلیف ہو گی مجھے… دکھ ہو گا مجھے۔"

وہ سوچتے سوچتے تھک گئی تھی اور گہری سانس لیتے ہوئے یک دم اپنے سر سے اپنے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے تھے اور اک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی…

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے بڑی خوش نظر آ رہی ہو…؟" ساشا نے یونیورسٹی کی سیڑھیاں اترتے ہوئے عزت کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا…

اور عزت اس کے سوال پہ بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔

"خوش نظر نہیں آ رہی… بلکہ خوش ہوں…" اس نے اپنے خوش ہونے پہ زور دیا تھا جس پہ ساشا نے اسے مزید غور سے دیکھا تھا۔

"اچھا…؟ میں سمجھی کہ نظر آ رہی ہو… خیر… وجہ بھی بتا دو؟" اس نے ایک اور استفسار کیا…

"وجہ… ولید رحمان کے علاوہ… اور کیا ہو سکتی ہے…؟" دونوں ایک ساتھ چلتی لان میں آ گئی تھیں۔

"ولید رحمان… کیا مطلب…؟" ساشا کو اچنبھا ہوا تھا۔

"مطلب کہ اب کچھ بھی یک طرفہ نہیں ہے… اب وہ بھی اسی راہ کا مسافر ہے، جس کی میں ہوں… اس کی محبت کے اظہار کا پیالا لبالب بھرا پڑا ہے اور چھلکنے کو بے تاب ہے۔" وہ کتابیں اور بیگ گھاس پہ رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ گئی تھی اور ساشا بھی۔

"پھر…؟" ساشا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پھر یہ کہ میں ہی میسر نہیں ہو رہی۔" اس نے لاپروائی سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے تھے۔

"کیوں…؟ تم کیوں میسر نہیں ہو رہی ہو؟ اب کیا مسئلہ ہے…؟"

"اب مسئلہ نہیں ہے… مشغلہ ہے… بس اسے تھوڑا ستا کر مزا آ رہا ہے… وہ میرے لیے بے قرار ہو رہا ہے… اور مجھے جیسے سکون آ رہا ہے… میری بے قراریوں کو قرار آ رہا ہے…" عزت بڑے سکون سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تھی اور ساشا نے اس کے چہرے کو ایک بار پھر دیکھا تھا۔

"اور وہ مونس مرزا… اس کا قصہ کیا ہوا بھلا…؟" ساشا جیسے سارے سوال آج ہی پوچھ لینا چاہتی تھی۔

"وہ بھی اس کو ہی ستانے کا اک طریقہ تھا مگر اس طریقے کو آزمانے کے لیے مجھے اپنی برداشت آزمانا پڑ سکتی تھی… اس لیے مونس مرزا کو اسی روز کہہ دیا تھا کہ میں مزید آگے نہیں جا سکتی… مجھے راستے میں ہی ڈراپ کر دے…"

"تو اس نے ڈراپ کر دیا تمہیں…؟" ساشا کا سوال عجیب معنی لیے ہوئے تھا کیونکہ مونس مرزا کے متعلق وہ بھی کافی کچھ سن چکی تھی۔

"آف کورس…!" اس کی لاپروائی ہنوز تھی۔

"مگر عزت… وہ ڈراپ کر دینے والوں میں سے نہیں ہے… تم اس کی ریپوٹیشن اور اس کی نیچر کو نہیں جانتیں۔" ساشا نے اسے بتانا چاہا تھا۔

"وہ بھی میری ریپوٹیشن اور نیچر کو نہیں جانتا…" عزت نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔

"تم اسے راستے میں چھوڑ کر پلٹی ہو… وہ کبھی بھولے گا نہیں… بلکہ تمہارا اپنی منزل پہ پہنچنا مشکل کر دے گا۔"

"پلیز ساشا… ! میں بہت اچھے موڈ میں ہوں… میرا موڈ خراب مت کرو۔" عزت کوفت سے بولی تھی۔

"تم نے بھی اس کا اچھا موڈ خراب کیا ہے… اسی لیے وہ انتظام کر رہا ہے۔" ساشا بڑبڑائی تھی۔

"کیا مطلب… انتظام…؟" عزت چونکی۔

"کچھ نہیں… تمہارا موڈ خراب ہو گا… فی الحال تم انجوائے کرو۔" اب کی بار ساشا نے لاپروائی دکھائی تھی اور عزت نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عزت…!" وہ یونیورسٹی کی پارکنگ سے گاڑی نکال رہی تھی، جب اسے ولید کا میسج موصول ہوا تھا اور اس کا میسج دیکھ کر عزت کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ہوں…؟" اس نے یک لفظی جواب دیا تھا۔

"انتظار۔۔۔!" ولید کا جواب بھی فوراً آیا تھا۔
"کس کا۔۔۔؟" عزت نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔
"عزت کا۔۔۔!" اگلا جواب۔
"وہ تو گھر جا رہی ہے۔۔۔؟" لاپروائی سے میسج سینڈ کیا تھا۔
"اور ولید یہاں ٹیبل ریزرو کروائے بیٹھا ہے۔۔۔" ولید نے جیسے دہائی دی تھی۔
"کہاں۔۔۔؟" عزت بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔
"وہیں۔۔۔ جہاں ملاقات ادھوری رہ گئی تھی۔۔۔" اس کا جواب فوری تھا۔
"اوہ۔۔۔!" عزت سوچ میں پڑ گئی تھی اور پھر یوٹرن لیتے ہوئے گاڑی کا رخ بدل دیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

صبح آفاق کی آنکھ خاصی دیر سے کھلی تھی اور آنکھ کھلتے ہی اس نے فوراً" اپنے بیڈ کی برابر والی سائیڈ کی طرف دیکھا تھا۔۔۔ سائیڈ خالی تھی۔
"فارہ۔۔۔!" وہ زیر لب اس کا نام لیتے ہوئے کہنی کے بل سیدھا ہو بیٹھا تھا۔
اس کے ذہن میں وہی رات والا منظر گھوم رہا تھا' جب فارہ کے جذباتی پن پہ اس نے اس کے چہرے پہ تھپٹر دے مارا تھا۔۔۔ اور اس تھپٹر کا خیال آتے ہی اس کے دل میں پچھتاوے کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی اور وہ فارہ کو دیکھنے اور اس سے بات کرنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا۔

"فارہ۔۔۔!" وہ اسے آواز دیتے ہوئے کمبل ہٹا کر بستر سے اٹھ گیا تھا۔
"فارہ۔۔۔!" وہ اسے بیڈ روم اور واش روم میں کہیں بھی نظر نہ آئی تو وہ کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔
"فارہ۔۔۔ فارہ۔۔۔ امی۔۔۔ فارہ کہاں ہے۔۔۔؟" فارہ کو آواز دیتے دیتے وہ ثمینہ یزدانی کو دیکھ کر رک گیا تھا۔
"تمہیں بہتر پتا ہو گا۔۔۔" ان کا لہجہ سرد تھا مگر آفاق نے نوٹ نہیں کیا تھا۔
"میں ابھی سو کر اٹھا ہوں۔۔۔ مجھے نہیں پتا۔۔۔ آپ اسے بیڈ روم میں بھیج دیں مجھے بات کرنی ہے اس سے۔۔۔" آفاق لاپروائی سے کہتا پلٹ گیا تھا۔
"فارہ یہاں نہیں ہے۔۔۔؟" ثمینہ یزدانی کے سردوسپاٹ سے لہجے پہ آفاق کے آگے بڑھتے قدم رک گئے تھے۔

"فارہ یہاں نہیں ہے۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" وہ ٹھٹک کر دوبارہ ان کی طرف پلٹا تھا۔
"وہ چلی گئی ہے۔۔۔" ان کا انداز ہنوز تھا۔
"چلی گئی ہے۔۔۔؟ مگر کہاں۔۔۔؟" آفاق ناسمجھی سے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"فیصل آباد۔۔۔" ان کا جواب انتہائی سرد اور مختصر تھا مگر آفاق کے لیے کسی زوردار دھماکے سے کم نہیں تھا۔۔۔
"واٹ۔۔۔ فارہ فیصل آباد چلی گئی۔۔۔؟ مم۔۔۔ مگر کیوں۔۔۔؟" آفاق کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل کھینچ کے نکال لیا ہو۔۔۔
"اسی لیے تو کہا ہے کہ تمہیں بہتر پتا ہو گا۔۔۔" ثمینہ یزدانی کہہ کر پلٹ گئی تھیں۔
"مگر مجھے نہیں پتا ممی۔۔۔ وہ' وہ مجھے بتائے بغیر گئی ہے۔۔۔ اس نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" آفاق اس وقت صدمے کی حالت میں تھا اس سے کچھ کہا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"تم بھی تو اکثر اسے بتائے بغیر ہی جاتے ہو۔۔۔ اسے پتا بھی نہیں ہوتا؟" ثمینہ یزدانی تلخی سے کہتی ہوئی چلی گئی تھیں اور آفاق جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔۔۔" ولید اپنے دھیان میں بیٹھا دوسری طرف میں دیکھ رہا تھا' جب اچانک عزت کی آواز پہ چونک کر دیکھنا پڑا تھا۔۔۔ وہ عین اس کے سامنے کھڑی تھی۔۔۔ ولید یکدم گڑبڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
"ہائے۔۔۔!" اس نے فوراً" اپنے آپ کو سنبھالا کیا تھا۔
"ہاؤ آر یو۔۔۔؟ عزت نے بڑے کھنکتے لہجے میں پوچھا تھا۔
"فائن۔۔۔! پلیز۔۔۔" اس نے کہتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا اور عزت مسکراتی ہوئی سر ہلا کر بیٹھ گئی تھی۔

"تھینک یو۔۔۔" ساتھ ہی اس کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ اور ولید اس کے مقابل کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بے ساختہ ہنس دیا تھا۔
"وجہ۔۔۔؟" عزت نے اس کے ہنسنے پہ ذرا تعجب کا اظہار کیا تھا۔
"یہی کہ ہم اگر اس طرح تھینکس وغیرہ سے ملاقات کا آغاز کریں گے تو ملاقات بہت ہی پرتکلف ملاقات ہو گی۔۔۔" اس نے ہنسنے کی وجہ بیان کی۔
"تو۔۔۔؟" عزت نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے بھنویں اچکائیں۔
"تو یہ کہ۔۔۔" ولید بات ادھوری چھوڑتے ہوئے سر کھجانے لگا تھا اور اس کے ہونٹوں تلے دبی مسکراہٹ

صاف دکھائی دے رہی تھی۔

"کہ....؟" عزت کی نظریں سوالیہ تھیں۔

"میں پر تکلف ملاقات نہیں چاہتا...." لہجہ معنی خیز سا ہو رہا تھا۔

"کیوں....؟" عزت کی نظریں ہنوز سوالیہ تھیں۔

"کیوں کہ میں بے تکلف ملاقات چاہتا ہوں.... ایسی ملاقات.... جس سے روٹھی ہوئی گزشتہ ملاقاتیں بھی مسکرا اٹھیں.... اور آئندہ کی ملاقات اس ملاقات کے تصور سے ہی مہک جائیں...." ولید کا لہجہ مسکرا رہا تھا اور مہک بھی رہا تھا، جس سے عزت کا دل بیٹھے بیٹھے بے طرح دھڑکا تھا.... اور اتنا دھڑکا تھا کہ اس جیسی انتہائی بولڈ لڑکی کے رخساروں پہ بھی خفیف سی سرخی دوڑ گئی تھی۔

"میں گھر جارہی تھی.... راستے سے پلٹی ہوں۔" اس نے بات بدل دی۔

"میں بھی راستے سے ہی پلٹا ہوں...." اس کا مفہوم اور تھا۔

"کوئی ضروری کام....؟" عزت اس کی ہر بات سے کترانے کی کوشش کر رہی تھی کیوں کہ اس کی ہر بات ہی آج کچھ معنی لیے ہوئے تھی۔

"اس سے ضروری کام اور کوئی نہیں ہے عزت.... پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے.... زندگی بہت مختصر ہے.... اور بکھیڑے ہزاروں...." ولید کی بات پہ عزت نے یکدم تڑپ کر دیکھا تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو ولید....؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں.... اور میں اپنے بکھیڑوں سے ڈرتا تھا.... بے بسی اچھے بھلے انسان کو بے بس کر دیتی ہے.... خصوصاً" اس وقت جب مجھ جیسا شخص تم جیسی لڑکی سے محبت کی جرات اور جرات کے بعد اعتراف کر لیتا ہے۔" ولید بے حد گہرے لہجے میں بولا تھا اور عزت اس کی بات پہ الجھ الجھ گئی تھی۔

"مجھ جیسا شخص....؟" عزت نے دہرایا۔

"ہاں مجھ جیسا.... جو اپنی اوقات نہیں دیکھتا.... اور عزت حیدر جیسے چاند کی تمنا کر بیٹھتا ہے.... جسے پتا بھی ہے کہ چاند کی تمنا.... لاحاصل ہے.... چاند کسی کو نہیں ملتا.... اور نہ ملے گا...." ولید کافی حقیقت پسندی کا مظاہرہ کر رہا تھا اور عزت نے بڑے اطمینان سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"اپنی اوقات عزت حیدر سے پوچھو...." عزت کا لہجہ حد درجہ مضبوط تھا۔

"وہی تو پوچھنے آیا ہوں...." ولید کا لہجہ بھی بدل چکا تھا۔

"کیا کیا بتاؤں....؟" عزت نے ڈائریکٹ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

"صرف یہ.... کہ میں جو ہوں.... جیسا ہوں.... وہی کافی ہوں۔ یا مجھے اپنا آپ اور اپنی اوقات بدلنی ہوگی....؟ دولت کے پیچھے بھاگنا پڑے گا.... یا گزارا ہو جائے گا....؟" ولید نے عزت کے چہرے پہ نظروں کا لمس ثبت کیا تھا اور عزت کے چہرے کو اک دلفریب مسکراہٹ چھو گئی تھی۔

"گزارا ہو جائے گا...." عزت کا لہجہ بہت شریر تھا، ولید نے بمشکل دل کو سنبھالا دیا۔

"سوچ لو عزت.... مفلسی اور بے روزگاری آئے روز میرے گھر کی مہمان بنی رہتی ہیں۔ آج یہ جاب ہے.... کل نہیں ہوگی.... گزارا کیسے ہوگا....؟" ولید اسے ہر قسم کی مشکل سچویشن سے آگاہ کرنا چاہ رہا تھا۔

"جاب نہ ہوئی.... نہ سہی.... تم تو ہوگے ناں....؟ اور گزارے کے لیے تم کافی ہو میرے لیے.... جاب سے بھلا کیا ہوتا ہے.... جو ہوتا ہے.... وہ تو جناب سے ہوتا ہے۔" عزت کا اشارہ ولید کی طرف تھا اور ولید اس کے اشارے پہ بے ساختہ ٹھہر گیا تھا۔

"کیا اس جناب سے آپ کے گھر والوں کا بھی گزارا ہو جائے گا۔۔۔" اس نے بھی مسکرا کر پوچھا۔
"میرا ہو جائے گا۔۔۔ گھر والوں کا نہ بھی ہوا تو چلے گا۔۔۔" وہ بھی بڑی لاپروائی سے بولی تھی اور اب کی بار ولید قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"رضا حیدر۔۔۔ آپ کے فادر محترم بڑے کاروباری آدمی ہیں' اتنا گھاٹے کا سودا نہیں کریں گے۔۔۔"
"کاروباری آدمی تو میرے برادر محترم بھی ہیں۔۔۔؟" عزت نے تیمور کا ذکر کیا۔
"فکر ناٹ۔۔۔ بی کاز۔۔۔ وہ اپنا فرینڈ محترم بھی ہے۔۔۔ یہ سودا ہنس کے قبول کرے گا۔۔۔" ولید کو تیمور پہ یقین تھا اور عزت کو بھی۔۔۔ اسی لیے اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"تو پھر اب مطلب کی بات کریں۔۔۔؟ سوری۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ محبت کی بات کریں۔۔۔؟" ولید نے جان بوجھ کر کہتے ہوئے تصحیح کی تھی اور عزت بھی ہنس پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

ماورا آج بالآخر آفس آہی گئی تھی۔۔۔
"ہیلو مس ماورا۔۔۔" تیمور کی پی اے سحرش زمان نے اسے دیکھتے ہی خوشگواریت کا اظہار کیا تھا۔
"ہیلو۔۔۔!" ماورا سنجیدگی سے جواب دیتی اس کے پاس سے گزر کے اپنے کیبن میں چلی گئی تھی۔۔۔ اور سحرش زمان راہداری میں کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی اسے کبھی کبھی ماورا مرتضیٰ بڑی عجیب و غریب سی پرسنالٹی لگتی تھی۔۔۔ کبھی بہت ہی سمجھ دار اور سلجھی ہوئی۔۔۔ اور کبھی بہت ہی بدتمیز اور بد دماغ سی نظر آتی تھی۔
"مس سحرش۔۔۔؟" تیمور حیدر کی آواز پہ سحرش زمان یکدم چونک کر متوجہ ہوئی تھی۔
"گڈ مارننگ سر۔۔۔!" سحرش زمان سٹپٹا کر بھی وش کرنا نہیں بھولی تھی۔
"گڈ مارننگ۔۔۔" تیمور نے آہستگی سے سر ہلا کر جواب دیا۔
"آر یو آل رائٹ مس سحرش۔۔۔؟" تیمور نے اسے راستے کے بیچوں بیچ کھڑے دیکھ کر سوال کیا تھا۔
"اوہ سوری سر۔۔۔!" سحرش اس کے سوال کا مفہوم سمجھتے ہی یکدم سامنے سے ہٹ گئی تھی اور تیمور آگے بڑھتے بڑھتے بے ساختہ رک گیا تھا۔
"مس ماورا مرتضیٰ آئیں۔۔۔؟" اس نے پلٹ کر سحرش کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"جی سر۔۔۔ اپنے کیبن میں ہیں۔" سحرش نے اشارہ کیا۔
"انہیں میرے روم میں بھیجیے۔۔۔" تیمور سنجیدگی سے کہتا پلٹ کر اپنے روم میں چلا گیا تھا اور سحرش زمان اس کے بھی تیور دیکھتی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مے آئی کم ان سر۔۔۔؟" وہ گلاس ونڈو کے پاس کھڑا باہر کے مناظر دیکھ رہا تھا' جب ماورا مرتضیٰ کی پرسکون اور پُراعتماد سی آواز سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔
"یس کم ان۔۔۔!" تیمور نے بھی انتہائی سکون سے پلٹتے ہوئے اجازت دی تھی۔
اتنے میں وہ بھی اس کی ٹیبل کے قریب آچکی تھی۔
"تشریف رکھیے۔۔۔!" تیمور نے اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے اشارہ کیا۔
"تھینکس۔۔۔!" ماورا بڑے لیے دیے انداز سے کہتی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔۔۔ اور تیمور نے بھی اپنی کرسی سنبھال لی تھی۔

"بی گل کیسی ہیں؟" تیمور نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔
"ٹھیک ہیں۔۔۔" مختصر سا جواب آیا۔
"اور آپ۔۔۔؟" تیمور نے اس کے چہرے پہ نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔
"آپ نے بلایا تھا۔۔۔؟" وہ بڑے احسن طریقے سے بات بدل گئی تھی' اور تیمور اس کے اس انداز پہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں الجھائے لب بھینچ کر چند لمحوں کے لیے سر جھکا کر جیسے کسی سوچ میں پڑ گیا تھا پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگا۔
"کیا میں امید کر سکتا ہوں کہ میں آج جو بھی سوال کروں گا۔۔۔ آپ مجھے اس کا صاف اور سچ سچ جواب دیں گی؟"
تیمور کا لہجہ 'انداز' الفاظ اور چہرے کے تمام تاثرات سب فیصلہ کن سے ہو رہے تھے' اسی لیے ماورا مرتضیٰ کی طرف بھی سنجیدگی کسی دیوار کی مانند کھڑی نظر آرہی تھی۔
"ہوں۔۔۔ آکر سکتے ہیں۔۔۔" اس کا دو ٹوک جواب اثبات میں تھا۔
"دیکھیں مس ماورا مرتضیٰ۔۔۔ یوں سمجھیں کہ میں نے آپ سے کچھ کہنا ہے تو آج ہی کہنا ہے۔۔۔ اور آپ نے کچھ سننا ہے تو آج ہی سننا ہے۔۔۔ یوں سمجھیں آج فیصلہ ہو گا۔" تیمور نے ایک تمہید باندھی تھی۔۔۔ دو ٹوک تمہید۔۔۔!
"ہوں۔۔۔! سن رہی ہوں۔" وہ اس کے سامنے بڑے اعتماد سے بیٹھی جواب دے رہی تھی۔
"میں نے پہلی بار آپ کو گاڑی میں دیکھا۔۔۔ آپ کو فالو کیا۔۔۔ کیا آپ کو پتا تھا۔۔۔؟" اس نے پہلے روز سے حساب کتاب کا کھاتا کھولا۔۔۔
"ہاں۔۔۔!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"دوسری بار آپ کو فارہ کے گھر دیکھا۔۔۔ آپ سے تعارف ہوا۔۔۔ آپ نے مجھے پہچانا۔۔۔ کیسا فیل ہوا آپ کو۔۔۔؟"
"غصہ آیا تھا۔۔۔ اور حیرت ہوئی تھی کہ آپ رضا حیدر کے بیٹے ہیں۔۔۔" اس نے صاف صاف جواب دیا۔
"غصہ کیوں آیا تھا۔۔۔؟" تیمور کے سوالات کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا۔
"کیوں کہ آپ نے مجھے فالو کیا تھا۔۔۔ اور مجھے آپ کو دیکھ کر آپ کی حرکت پہ حیرت ہوئی تھی۔۔۔"
"پھر فارہ کے گھر پہ اور بھی ملاقاتیں ہوئیں۔۔۔ کیسا لگا آپ کو۔۔۔؟" اگلا سوال۔۔۔
"اے ڈیسنٹ پرسنالٹی۔۔۔" جواب امید افزا تھا۔
"میں نے پھر آپ کو فالو کیا۔۔۔" اس نے بات بڑھائی۔
"مجھے پھر غصہ آیا۔۔۔" وہ بھی لگی لپٹی نہیں رکھنے آئی تھی۔
"اور مجھے آپ کا غصہ پسند آگیا۔۔۔ آپ کے غصے کے باوجود میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔۔۔" وہ اصل بات کی طرف آگیا۔
"یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔۔۔" اس کے پاس لاپروائی اور لاتعلقی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔۔۔
"میں نے آپ کو جاب آفر کی آپ نے انکار کر دیا۔۔۔ کیوں۔۔۔؟"
"کیوں کہ آپ کی جاب میری منزل نہیں تھی۔۔۔ میری منزل اور تھی۔۔۔ میرے ارادے اور تھے۔۔۔ میرا عہد اور تھا۔" ماورا کا لہجہ اب بھی ہنوز تھا۔
"پھر آپ نے یہ آفر قبول کر لی۔۔۔ وجہ؟" وہ بھی بڑے تحمل سے پوچھ رہا تھا۔
"کیونکہ کراچی آنا میرا مقصد تھا۔۔۔ اور کچھ نہ سہی وقتی طور پہ میرا یہ مقصد تو پورا ہو گیا ناں۔۔۔؟"
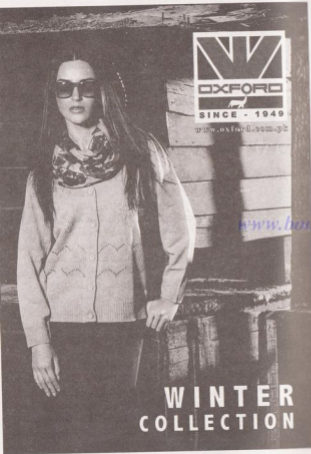
"پھر آپ یہ جاب کیوں چھوڑ رہی ہیں....؟" سوال پہ سوال جاری تھا۔
"اس لیے کہ مقصد وقتی طور پہ پورا ہوا ہے.... ورنہ یہ جاب مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔" وہ مایوس ہوئی۔
"آپ کو کیا چاہیے....؟" تیمور مزید سنجیدہ ہوا تھا۔
"آپ کی سوچ اور آپ کے اختیار سے بہت زیادہ...." اس کا لہجہ گہرا تھا۔
"میری محبت سے بھی زیادہ....؟" تیمور نے بے اختیار پوچھا۔
"محبت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا سوائے دکھ کے...." ماورا نے سر جھٹکا۔
"لیکن مس ماورا... محبت۔" اس نے کچھ کہنا چاہا۔
"محبت، محبت، محبت! مجھے ضرورت نہیں ہے محبت کی.... مجھے کامیابی کی ضرورت ہے، مجھے دولت کی ضرورت ہے.... مجھے پیسے کی ضرورت ہے۔ مجھے آسائشوں کی ضرورت ہے.... میرا بچپن ایک چھوٹے سے گھر میں گزرا ہے میری ماں نے دن رات ایک ایک پائی جمع کر کے مجھے پالا پوسا، مجھے تعلیم دلوائی ہے۔ انہیں امیدیں ہیں مجھ سے.... میں محبتوں کے چکر میں پڑ جاؤں.... اپنے آپ کا سوچنے لگ جاؤں اپنے عزم اور عہد سے ہٹ جاؤں تو ان کی امیدیں کون پوری کرے گا بھلا... ؟ کون....؟" ماورا ایکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی اور تیمور اس کے اس طرح اچانک پھٹ جانے پہ دنگ رہ گیا تھا۔

وہ اچھا ہے تو اچھا ہے، برا ہے تو بھی اچھا ہے
مزاج عشق میں عیب یار نہیں دیکھے جاتے

تیمور حیدر کے آفس روم میں خاموشی چھائی ہوئی۔ اب ماورا صوفے پہ بیٹھی تھی اور سر جھکا ہوا تھا، جبکہ تیمور اس کے سامنے والے صوفے پہ بیٹھا کسی فیصلے پہ پہنچنے کے آخری مراحل میں تھا۔
اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، اس کا موبائل بجنے لگا تھا اور ان دونوں کے درمیان خاموشی کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا... نمبر ولید کا تھا.... تیمور نے کاٹ دیا.... اور پھر اک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بالآخر ڈٹ جانے کا اعلان کر دیا۔
"شادی کریں گی مجھ سے....؟" تیمور نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے اور تحمل آمیز لہجے میں اتنا اہم سوال کر لیا تھا کہ ماورا نے یکدم سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔
"شادی....؟" ماورا کے ہونٹ ذرا سے کپکپائے تھے۔
"ہاں شادی....؟ کیوں کہ اس طرح آپ کے تمام عہد اور تمام ارادے پورے ہو جائیں گے۔" تیمور کا لہجہ مضبوط تھا۔
"لیکن میرے عہد اور ارادوں کو پورا کرنے کے لیے شادی کافی نہیں ہے اس کے لیے مجھے...."
"میں اپنا سب کچھ آپ کے نام لکھ دوں گا.... اپنا بینک بیلنس، اپنا گھر، اپنا بزنس، اپنے تمام اثاثے.... یہاں تک کہ اپنا آپ بھی...." تیمور کی محبت آج انتہا کو جا پہنچی تھی اور وہ ماورا کے نام پہ سب کچھ وار دینے کو تیار ہو گیا تھا... جبکہ ماورا چند لمحوں کے لیے دم بخود سی رہ گئی تھی کیوں کہ اس نے فیصلہ ہی ایسا سنایا تھا کہ....!
"مگر....!" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن تیمور نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔
"اگر مگر کی گنجائش نہیں ہے مس ماورا.... آپ کی ہاں کی ضرورت ہے بس.... باقی میں نے جو کہا ہے، میں اس پہ قائم ہوں.... آج بھی اور کل بھی.... میرے پاس جو کچھ بھی ہے.... اس میں سے ایک پائی بھی اپنے پاس نہیں رکھوں گا.... البتہ میرے بابا ماما اور میری سسٹر کے اکاؤنٹس میں کیا کچھ ہے.... اس کا مجھے کچھ پتا نہیں ہے.... مگر یہ بات طے ہے کہ ان سب سے زیادہ ملکیت میرے پاس ہے، اپنی جائداد کے تمام اثاثے میرے نام ہیں، بابا نے میرے بزنس سنبھالتے ہی سب کچھ میرے نام کر دیا تھا.... اس لیے اب جو کچھ میرے پاس ہے، میں آپ کے نام

کروں گا۔ کیوں کہ مجھے اس دولت سے اس جائیداد سے محبت نہیں ہے... مجھے ماورا مرتضیٰ سے محبت ہے... اور اس محبت کے سامنے یہ سب کوئی معنی نہیں رکھتا...“ تیمور کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا اور ماورا کچھ بھی کہنے سننے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی۔

”آپ جا سکتی ہیں... میں آپ کے جواب کا انتظار کروں گا... آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیجیے... یہ آپ کی زندگی کا سوال ہے...“ تیمور نے پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ پھنساتے ہوئے کہا تھا... اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر یکدم پلٹ کر اپنے کمرے سے نکل گیا تھا۔ لیکن پیچھے ماورا مرتضیٰ کے لیے سوچوں کا اک جہان چھوڑ گیا تھا... کیونکہ اب جو بھی کرنا تھا... ماورا مرتضیٰ نے کرنا تھا... اس کے تمام عزم اور ارادے... اس کے تمام مقصد اور مفاد اس کی ایک ہاں کے فاصلے پہ کھڑے تھے... صرف ایک ہاں کے فاصلے پہ...!

☼ ☼ ☼

تیمور گاڑی سے اترتے ہی پورچ میں چند اور گاڑیاں دیکھ کر چونک گیا۔
اس کا مطلب تھا کہ گھر پہ مہمان آئے ہوئے ہیں اور تیمور مہمانوں کا سوچ کر ہی کوفت میں مبتلا ہو گیا تھا وہ اس وقت تنہائی اور آرام چاہتا تھا... مگر...!

”تیمور...!“ وہ راہداری سے گزر کے آگے بڑھ ہی رہا تھا کہ رضا حیدر نے پکار لیا تھا اور تیمور کے قدم رک گئے تھے اسے مجبوراً ”ڈرائنگ روم میں داخل ہونا پڑا تھا... جہاں قیام مرزا کی فیملی براجمان تھی۔

”السلام علیکم...!“ اس نے اونچی آواز میں سب کو سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام... کیسے ہو تیمور بیٹا...؟“ قیام مرزا اور مونس مرزا اسے دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے...

”آئی ایم فائن... انکل! آپ پلیز تشریف رکھیے...“ تیمور نے فوراً ”انہیں بیٹھنے کا کہا تھا اور مونس مرزا سے ہاتھ ملاتے ہوئے خود بھی اس کے برابر ہی بیٹھ گیا تھا۔

”کیا بات ہے، بہت تھکے ہوئے سے لگ رہے ہو...؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...؟“ رضا حیدر کو بیٹے کے موڈ سے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی ٹینشن ضرور ہے۔

”جی بس آج کام زیادہ تھا...“ اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔

”ہوں... تو پھر تم جا کر آرام کرو...“ رضا حیدر نے اسے بیٹھنے پہ مجبور نہیں کیا تھا۔

”نو... اٹس او کے... مام پلیز ایک کپ چائے منگوا دیں...“ تیمور نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے رابعہ بیگم کی طرف دیکھا تھا اور وہ فوراً ”ملازمہ کو آرڈر دینے کے لیے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”اور سناؤ بیٹا... بزنس کیسا چل رہا ہے آج کل؟“ قیام مرزا کا رخ تیمور کی طرف ہو چکا تھا...

”ہمیشہ کی طرح فنٹاسٹک جا رہا ہے اللہ کی مہربانی سے۔“ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز سے جواب دیا تھا۔

”یہ تو ہے... تمہارے بزنس اور تمہارے کام کا چرچا تو پورے شہر میں ہوتا ہے... رضا حیدر کے کاروبار کو چار چاند لگا دیے ہیں تم نے... اور ادھر ہم ہیں کہ اپنے بیٹوں سے ابھی تک محض امیدیں لگائے بیٹھے ہیں...“ قیام مرزا نے تاسف سے کہتے ہوئے پہلے رضا حیدر کو اور پھر مونس مرزا کو دیکھا تھا جس پہ مونس مرزا مصنوعی خفگی سے پہلو بدل کر رہ گیا تھا اور رضا حیدر اس کی حرکت پہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسے تھے۔

”اب یہ تو نہ کہو قیام مرزا... ابھی سب کچھ تمہارے اختیار میں ہے... تم خود سنبھال رہے ہو... جب اس کے اختیار میں ہو گا... وہ بھی سنبھال لے گا... رضا حیدر نے مونس مرزا کی طرف داری کی تھی اور مونس مرزا کو قدرے ڈھارس مل گئی۔

”تھینک یو انکل... ڈیس پوائنٹ۔“ مونس مرزا کو شہہ ملی تھی۔

”میرے اختیار میں اس لیے ہے کہ مجھے پتا ہے یہ اکیلا ہینڈل نہیں کر سکے گا... جبکہ تمہارا بیٹا تو ماشاء اللہ سو پہ بھاری ہے... اس سے کوئی جیت نہیں سکتا۔“ قیام مرزا نے تیمور کو سراہا تھا۔

لیکن انکل! آپ کو کیا پتا کہ میں ایک لڑکی کے سامنے ہار چکا ہوں... میں اس سے جیت نہیں سکتا۔“ تیمور نے دل ہی دل میں کہتے ہوئے جیسے اپنا مذاق اڑایا تھا۔

”لیکن بھائی صاحب... ! ہمارا بیٹا جیسا بھی ہے... ہم اسے لے کر آپ کے در پہ جھولی پھیلانے آئے ہیں... اسے بھی اپنا بیٹا بنا لیں...“ مسز مرزا نے بات کرنے کے لیے موقع مناسب سمجھا تھا۔

”میں سمجھا نہیں بھابھی...؟“ رضا حیدر صاف بات سننا چاہتے تھے۔

”میں سمجھا دیتا ہوں... ہم دراصل آج عزت بیٹی کے لیے سوالی بن کر آئے ہیں... اور پلیز انکار مت کرنا... تمہاری بیٹی میری بہو بن جائے... اس سے بڑی خوشی میرے لیے اور کیا ہو گی بھلا...؟“ قیام مرزا نے بالآخر اپنے مطلب کی بات کہہ دی تھی جبکہ تیمور بری طرح چونک گیا تھا۔

”عزت کے لیے...؟“ اس نے بے ساختہ زیر لب دہرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

”امی... ! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“ رات کا کھانا کھانے کے بعد اس نے ٹیبل سے اٹھتے ہوئے کہا تھا اور عافیہ بیگم ٹھٹک گئی تھیں انہوں نے بے ساختہ بی گل کی طرف دیکھا تھا' بی گل نظریں چرا گئی تھیں۔

”ہوں... آ رہی ہوں...“ وہ سر ہلا کر کہتے ہوئے برتن سمیٹنے لگیں۔

اور بی گل دل ہی دل میں درود شریف کا ورد کرتی ہوئی اٹھ کر لاؤنج میں آ گئی تھیں... کیوں کہ بی گل کو اندازہ تھا کہ تھوڑی دیر میں یہاں قیامت برپا ہونے والی ہے اور اسی قیامت کو سوچ کر ان کے دل میں ہول اٹھ رہے تھے جس کے خوف کی وجہ سے بی گل کثرت سے درود شریف پڑھ رہی تھیں۔ اتنے میں عافیہ بیگم بھی وہیں آ گئی تھیں۔

”خیریت بی گل...؟ ماورا کیا کہنا چاہتی ہے...؟ سب ٹھیک تو ہے نا...؟“ عافیہ بیگم کو بھی بے چینی ہو رہی تھی اسی لیے ماورا کے کہنے سے پہلے ہی بات جان لینا چاہتی تھیں۔

”اسی کو پتا ہو گا... لو آ گئی ہے وہ بھی...“ انہوں نے ماورا کو دیکھ کر شکر ادا کیا تھا کہ وہ آ گئی ہے اور انہیں زیادہ ٹال مٹول سے کام نہیں لینا پڑا۔

ماورا آ کر عافیہ بیگم کے مقابل صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔

”دیکھیں امی... ! آج میں بھی آپ سے زندگی کی آخری بات کرنے والی ہوں۔ ایسی آخری بات جس میں آپ نے مجھے انڈر اسٹینڈ کرنا ہے اور میرا ساتھ دینا ہے... اگر آپ آج' میرا ساتھ نہیں دیں گی تو مجھے ساری زندگی آپ کے ساتھ کی ضرورت نہیں رہے گی... میں یہی سمجھوں گی کہ میں اکیلی رہ گئی ہوں۔“ ماورا نے آج بھی ہمیشہ کی طرح عافیہ بیگم سے بات کرنے کے لیے پہلے تمہید باندھنا شروع کی تھی...

”تم بات کرو...“ عافیہ بیگم سنجیدگی سے بولیں۔

”امی آپ کو صبر سے اور ہمت سے کام لینا ہو گا...“ اس نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں نے کہا ناں تم بات کرو... میں کھانا کھانے کے بعد ایک گلاس پانی بھی لے کر آئی ہوں... تمہاری بات سن کر گروں گی نہیں... سہ لوں گی... برداشت کرنے کی عادت ڈال رہی ہوں... آخر تمہاری طرف سے روز کچھ

نہ کچھ نیا سننے کو ملے گا...." عافیہ بیگم کے انداز میں تلخی تھی۔
"لیکن آج آپ کو آخری بار سننے کو ملے گا...." وہ بھی فیصلہ کن انداز سے بول رہی تھی۔
"سنائو.... سن رہی ہوں....؟" انہوں نے ہمت مجتمع کر رکھی تھی۔
"میں رضا حیدر کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی ہوں.... اس نے مجھے پرپوز کیا ہے۔" ماورا کے اس ایک جملے نے عافیہ بیگم کے سر پہ اس پوری عمارت کا ملبہ گرا دیا تھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے "اف" کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔ چند ثانیے یونہی گزر گئے تھے۔ خاموشی اور سناٹے کے بیچ.... یہاں تک کہ ان کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی اور بی گل کے درود شریف کی سرگوشیاں....!
"امی....! آپ چپ کیوں ہو گئیں....؟ کچھ بولیں ناں....؟" اس خاموشی اور سناٹے کو ماورا کے سوا اور کوئی بھی توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔
"ہوں....!" عافیہ بیگم نے ماورا اور بی گل کو خالی خالی نظروں سے دیکھا تھا۔
"دیکھیں امی....! یہ شادی کس بنیاد پہ اور کن شرائط پہ ہو رہی ہے.... میں وہ سب آپ کو تفصیل سے بتاتی ہوں.... تاکہ آپ کی تسلی ہو جائے.... تیمور رضا حیدر کا اکلوتا بیٹا ہے.... وہ مجھے پسند کرتا ہے.... محبت کرتا ہے۔ مجھے اس کی محبت پہ پہلے بھی کوئی شک نہیں تھا.... مگر آج تو یقین اور بھی پختہ ہو گیا ہے.... وہ کہتا ہے کہ مجھ سے شادی کر لو.... میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کر دوں گا.... سب کچھ....!" ماورا بہت مضبوط اور نپے تلے سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔
اور عافیہ بیگم کا دل کسی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔
"وہ.... وہ جانتا ہے کہ تت.... تم کون ہو؟" عافیہ بیگم کے منہ سے بمشکل یہ بے ربط سے الفاظ نکلے تھے۔
"نہیں....! وہ نہیں جانتا کہ میں کون ہوں.... بس صرف میں جانتی ہوں کہ وہ کون ہے....؟" ماورا اپنے ازلی ہٹ دھرم اور سرکش انداز میں نظر آ رہی تھی۔
"اور یہی بتانے کے لیے تو شادی کر رہی ہوں کہ میں کون ہوں...." وہ بڑے پر عزم انداز سے کہتی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی تھی.... اور اس سے پہلے کہ ماورا لاؤنج سے باہر نکلتی عافیہ بیگم صوفے پہ بیٹھے بیٹھے نیچے لڑھک گئی تھیں۔
"امی....!" ماورا لپک کے ان کی طرف آئی تھی....!

☼ ☼ ☼

"دیکھو فارہ! تم جب سے یہاں آئی ہو مسلسل چپ ہو.... آخر کچھ بتاتی کیوں نہیں....؟ آفاق نے کچھ کہا ہے؟" منزہ رحیم دو تین بار اس کے بیڈ روم کے چکر لگاتے ہوئے اس سے استفسار بھی کر چکی تھیں لیکن فارہ تھی کہ مسلسل چپ سادھے ہوئے تھی۔
"میں آفاق سے فون کر کے پوچھتی ہوں کہ اس نے تم سے کیا کہا ہے....؟" وہ کہتے ہوئے جانے کے لیے پلٹیں۔
"پلیز ممی....! اس سے کیا پوچھتی ہیں....؟ اس نے بھلا کیا کہنا ہے مجھ سے....؟ اس نے تو مجھے کبھی اس قابل سمجھا ہی نہیں کہ کچھ کہہ دے...." فارہ روہانسی ہو گئی تھی اس کی آواز بھرانے لگی تھی۔
"کیا مطلب....؟" منزہ رحیم پریشان سی اس کے قریب بیٹھ گئیں۔
"مطلب یہ کہ میں اس پہ مسلط کی گئی ہوں.... اور مسلط کی گئی چیز کے ساتھ جیسا برتاؤ ہوتا ہے.... میرے ساتھ

بھی وہی ہوا ہے۔ مگر میں مزید اس کے سر پہ مسلط نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں اسے اس کے حال پہ چھوڑ آئی ہوں۔۔۔ وہ میری ذات سے بھاگنا چاہتا ہے تو بھاگ جائے۔۔۔ میں بھی اس کی واپسی کا انتظار کر کر کے تھک گئی ہوں۔" فارہ کے آنسو بہہ نکلے تھے اور منزہ رحیم کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

"تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا مجھے۔۔۔؟"

"ممی۔۔۔ ! میں ایشو نہیں بنانا چاہتی تھی۔۔۔ میں کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر وہ نہیں بدلا۔۔۔" فارہ کہتے ہوئے رو پڑی تھی۔

اور منزہ بیگم نے اس کے قریب آتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔

"دیکھو بیٹا۔۔۔ اس طرح مت کرو۔۔۔ تمہارے ڈیڈی اور حماد کو پتا چلے گا تو مسئلہ اور بھی بڑھ جائے گا۔۔۔ وہ آفاق سے رابطہ کریں گے۔۔۔ اس طرح تمہیں ہی تکلیف ہوگی۔۔۔ پھر کیا کرو گی۔۔۔؟" منزہ رحیم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور فارہ گھٹ گھٹ کے رونے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

"میں سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں زوبیہ ! اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے۔۔۔ پلیز مجھے کوئی حل بتا دو۔" آفاق دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ اور زوبیہ اس کی ایسی پریشان حالت دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئی تھی۔

"آپ نے بھی تو غلط کیا ناں اسے تھپڑ مار کر۔۔۔ ایک تو وہ پہلے ہی ہرٹ ہوئی بیٹھی تھی اور دوسرے آپ نے تھپڑ مار دیا۔۔۔ یہ نوبت تو آنی ہی تھی۔" زوبیہ اس کی پوری بات سن چکی تھی۔

"تو پھر کیا کرتا۔۔۔؟ اس نے سیدھی طلاق ہی مانگ لی۔۔۔ یوں لگا جیسے دل کھینچ لیا ہو اس نے۔" آفاق کی تو جیسے جان پر بنی ہوئی تھی۔

"تو پھر روز روز ایسی نوبت پہنچنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک ہی بار اسے سب سچ سچ بتا دیں۔۔۔" زوبیہ نے یوں مشورہ دیا جیسے کوئی بڑی بات ہی نہ ہو۔

"سب سچ سچ بتا دوں تو موت سے پہلے مر جائے گی وہ۔۔۔ اور ممی ڈیڈی۔۔۔ او مائی گاڈ۔۔۔" آفاق واقعی جیسے حد سے زیادہ چکرایا ہوا لگ رہا تھا۔

"تو کیا اس طرح نہیں مر رہے وہ لوگ۔۔۔؟ زوبیہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور آفاق بے بسی کے مارے کچھ کہہ ہی نہیں سکا تھا۔

"اب چپ کیوں ہو گئے آپ۔۔۔؟" زوبیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ جبکہ آفاق یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"میں فیصل آباد جا رہا ہوں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے سے کہتے ہوئے اپنا اگلا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

"مگر آفاق۔۔۔ آپ۔" زوبیہ نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر آفاق اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر وہاں سے چلا گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

عزت آج بڑی خوش تھی، ہواؤں میں اڑتی پھر رہی تھی، لیکن گھر آتے ہی جیسے ہی اسے مونس مرزا کے پروپوزل کا پتا چلا وہ یکدم جیسے کرنٹ کھا گئی تھی۔

"مگر میں اس پروپوزل سے خوش نہیں ہوں۔۔۔" تیمور کا جواب رضا حیدر اور رابعہ بیگم کے ساتھ ساتھ عزت کے لیے بھی بالکل غیر متوقع تھا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔۔۔؟" رضا حیدر صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے یکدم سیدھے ہوئے تھے۔

"میں جو کہہ رہا ہوں آپ اچھی طرح سن چکے ہیں۔۔۔ قیام مرزا آپ کے دوست ہیں۔۔۔ آپ یہ رشتہ دوستی تک ہی رکھیں۔۔۔ مزید کسی رشتہ داری میں تبدیل مت کریں۔۔۔ پلیز۔" تیمور نے خاصی سنجیدگی سے کہتے ہوئے انہیں اس رشتے سے منع کیا تھا۔

"لیکن کیا کمی ہے مونس میں۔۔۔؟" رضا حیدر تو اپنی طرف سے یہ رشتہ پکا کیے بیٹھے تھے۔

"اس میں کوئی کمی نہیں ہے بلکہ اس میں خوبیاں ہیں۔۔۔ ایکسٹرا خوبیاں۔۔۔ اور وہ خوبیاں میں عزت کے لیے برداشت نہیں کر سکتا۔" تیمور نے اک نظر عزت کی طرف دیکھا تھا جس کے چہرے پہ اس کے انکار سے بہار آ گئی تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔۔۔" رضا حیدر الجھ کر بولے۔

"میں سمجھا دوں گا۔۔۔ لیکن اکیلے میں۔۔۔ ابھی عزت اور مام کا خیال ہے بس۔" تیمور کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور انہیں گڈ نائٹ کہہ کر لاؤنج سے نکل آیا تھا جبکہ اس کے پیچھے عزت بھی بڑی تیزی سے اٹھ کر گڈ نائٹ کہتی باہر آئی تھی۔

"بھائی۔۔۔" وہ لپک کے سیڑھیاں چڑھتی اس کے قریب پہنچی تھی۔

"ہوں۔۔۔ ! کہو؟" تیمور نے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گردن موڑ کر اپنے برابر سیڑھیاں چڑھتی عزت کی طرف دیکھا۔

"تھینک یو۔۔۔ !" عزت بہت خوش اور مشکور نظر آ رہی تھی۔

"کس لیے۔۔۔؟" تیمور جان بوجھ کر انجان بنا۔

"مجھے بھی یہ پروپوزل پسند نہیں تھا۔۔۔" اس نے بڑے دھڑلے سے بیان جاری کیا۔

"کیوں۔۔۔؟" تیمور مسکرایا۔

"بس ایسے ہی۔۔۔ مونس مرزا اچھا نہیں لگتا۔" اس نے منہ بنا کر کندھے اچکائے۔

"تو کون اچھا لگتا ہے۔۔۔ وہ بتا دو۔۔۔؟" تیمور نے برجستہ سوال کیا۔

"بھائی۔۔۔ !" عزت خفگی سے کہتی ہوئی یکدم رک گئی تھی اور تیمور بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔۔۔

"او کے۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ تو پھر کبھی بتا دینا۔۔۔ گڈ نائٹ۔۔۔" تیمور اس کے بال بکھراتے ہوئے کہہ کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا تھا اور عزت پیچھے کھڑی بڑی محبت پاش نظروں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔۔۔ !

✡ ✡ ✡

عافیہ بیگم کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور ماورا مرتضیٰ ہسپتال کی راہداری میں بولائی ہوئی پھر رہی تھی۔

"جب تمہیں پتا ہے کہ وہ نہیں سہ پاتی۔۔۔ تو کیوں روز اس کی برداشت آزمانے کھڑی ہو جاتی ہو۔۔۔؟" بی گل مسلسل ان کی صحت کے لیے دعا کر رہی تھیں، جب بیٹھے بیٹھے تھک گئیں تو ماورا کی طرف رخ موڑ لیا تھا۔

"یہ ایک آخری آزمائش تھی ان کی برداشت کی۔۔۔ اب سب کچھ سہہ جائیں گی۔۔۔" ماورا ابھی بھی نڈر اور بے خوف دکھائی دے رہی تھی۔

"سہتے سہتے مر گئی تو۔۔۔؟" بی گل جھنجلا کر بولیں۔

"پلیز بی گل۔۔۔ !" ماورا کو بے طرح اذیت ہوئی تھی۔

"تو اور کیا کروں۔۔۔؟ کیا کہوں۔۔۔؟ ایک عمر ہو چلی ہے اس کی کمزوری نہیں گئی اور ایک عمر ہو چلی ہے کہ تمہاری

منہ زوری نہیں گئی..." وہ بے چاری سر تھام چکی تھیں۔
"ان کی کمزوری ہی تو دور کرنا چاہ رہی ہوں..." ماورا کا لہجہ مضبوط تھا۔
"کچھ کام اوپر والے پر چھوڑ دینا چاہئیں۔" بی گل نے شہادت کی انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔
"اوپر والا بھی کہتا ہے کہ تم خود اٹھو... ہمت کرو... میں تمہارے ساتھ ہوں..." ماورا نے اپنی بات پہ زور دیا تھا۔
"یہ بات تمہارے جیسے منہ زور ہی سوچ سکتے ہیں... تمہاری ماں جیسے کمزور نہیں..." وہ خفگی سے بولیں۔
"اب وہ بھی مضبوط ہو جائیں گی... دیکھ لیجئے گا۔" ماورا کے لہجے میں یقین تھا۔
"دیکھ رہی ہوں..." وہ جل کر بولی تھیں ان کا اشارہ آئی سی یو کی طرف تھا!

✡ ✡ ✡

ولید اپنا کام ختم کر کے چینل کے آفس سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس کے چند کولیگز نے اسے گھیر لیا تھا...
"مبارک ہو یار..." "ایک سچ ایک شام" کامیابی کی طرف گامزن ہے... اللہ تمہیں مزید کامیاب کرے..."
سب نے اسے باری باری مبارک باد دی تھی اور ولید اپنے کولیگز کی ایسی حوصلہ افزائی پہ واقعی بے پناہ خوش ہوا تھا۔
"تھینک یو یار... تھینک یو سو مچ..." ولید نے سب سے ہاتھ ملاتے ہوئے شکریہ ادا کیا تھا۔
"ٹھیک ہے پھر کل ملتے ہیں... ابھی کافی ٹائم ہو رہا ہے..." ایک صحافی نے وقت کا احساس دلایا تھا رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔ اس لیے اب سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی بے چینی تھی۔
"اوکے اللہ حافظ...!" ولید بھی خدا حافظ کہہ کر اپنی بائیک کی طرف آ گیا تھا۔
"ولید...!" وہ اپنی بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا جب اندر سے ضمیر انصاری تقریباً "بھاگتا ہوا باہر آیا تھا اور ولید یکدم رک گیا۔
"خیریت...؟" ولید نے تشویش بھرے انداز سے دیکھا۔
"تم آج کہیں مت جاؤ... یہیں رہو... کام کرتے ہیں۔" ضمیر انصاری نے اسے روکنا چاہا تھا۔
"کام کرتے ہیں... مطلب...؟" ولید کو الجھن ہوئی۔
"بس میں نے سوچا کہ آج مل کر کام نبٹاتے ہیں۔" وہ ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔
"مل کر...؟ میں تو اپنا کام ختم کر چکا ہوں... تمہیں ضرورت ہے تو کہو... تمہاری ہیلپ کروا دیتا ہوں..." ولید نے اس کو سوالیہ دیکھا۔
"نہیں... مجھے ہیلپ کی ضرورت نہیں ہے... بلکہ تمہیں ہے... تم ایسا کرو... میرے ساتھ رہو... بعد میں گھر چلیں گے۔" ضمیر انصاری ہر ممکن طریقے سے اسے روک لینا چاہتا تھا۔
"بعد میں کب...؟ یار میں کام کی وجہ سے کل بھی گھر نہیں جا سکا... امی اور چھوٹے بہن بھائی اداس ہوں گے ابھی جانے دو... پھر ملیں گے..." ولید نے اجازت چاہی۔
"تو پھر میرے ساتھ میری گاڑی میں چلو... میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" اس نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کیا... اور ولید ٹھٹک گیا تھا۔
"کیا مسئلہ ہے ضمیر...؟ تم صاف صاف بات کرو..." ولید نے پارکنگ کی لائٹس میں ضمیر کے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش کی تھی۔
"صاف بات یہ ہے کہ تمہیں اکیلے جانے میں خطرہ ہے... یا تو تم یہیں رہو... یا پھر اکیلے مت جاؤ... بلکہ ہو

سکے تو پولیس کو کال کرو۔۔۔" اس نے ولید کو بتاتے ہوئے ساتھ ہی مشورہ بھی دیا تھا۔

"ارے چھوڑو یار۔۔۔ یہ بزدلانہ کام مجھ سے نہیں ہوتے۔۔۔ اگر آج میری آئی (موت) ہے تو مجھے لیے بغیر جائے گی نہیں۔۔۔ بے شک تم مجھے سات کوٹھڑیوں میں چھپا کر بٹھالو۔۔۔" ولید نے لاپروائی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ سے تھپکی دی تھی۔

"لیکن ولید۔۔۔!" ضمیر انصاری نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اتنے میں ولید کا موبائل بج اٹھا تھا' ولید کال دیکھ کر مسکرا دیا۔

"اپنی ڈارلنگ کا فون ہے یار۔۔۔" ولید نے شرارت سے آنکھ دبائی "اور تمہاری ہونے والی بھابھی کا۔۔۔" ولید کال ریسیو کرنے سے پہلے کہہ کر بائیک کو کک لگاتا ہوا ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آج میں بہت خوش ہوں ولید۔۔۔ ایم ریئلی ویری ہیپی۔۔۔" عزت نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"کیوں۔۔۔؟ صرف ایک بار ملنے سے۔۔۔؟" اس نے جان بوجھ کر عزت کو چھیڑا تھا۔

"آج مونس مرزا کا پروپوزل آیا تھا۔۔۔" اس نے ولید کے سر پہ بم پھوڑا۔

"واٹ۔۔۔؟ تم مونس مرزا کے پروپوزل پہ خوش ہو رہی ہو۔۔۔؟" اس نے یکدم بائیک کو بریک لگا دیے تھے۔

"مونس مرزا کے پروپوزل پہ خوش نہیں ہو رہی۔۔۔" وہ جھنجلائی۔

"تو پھر۔۔۔؟" ولید کو بے چینی ہوئی۔۔۔

"تو پھر اس لیے خوش ہو رہی ہوں کہ تیمور بھائی نے اس پروپوزل سے انکار کر دیا ہے۔۔۔ ریجیکٹ کر دیا ہے بابا سے کہا ہے کہ انہیں یہ پروپوزل پسند نہیں ہے۔" عزت بڑے پرجوش لہجے میں بتا رہی تھی۔

"اوئے یارا۔۔۔ یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔۔۔" ولید نے تیمور کے فیصلے پہ نعرہ بلند کیا تھا۔

"یعنی اس کا مطلب ہے کہ اب میں سہرا سجانے کے لیے تیار ہو جاؤں؟" وہ معنی خیزی سے بولا تھا اور عزت اتنے جوش و خروش سے بولتے بولتے چپ ہو گئی تھی۔

"بولو ناں۔۔۔؟" وہ اسے بولنے پہ اکسا رہا تھا۔

"کیا۔۔۔؟" عزت کی آواز مدھم تھی۔

"کچھ بھی۔۔۔!" ولید نے اس کی آواز کا دھیما پن دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل یکدم چونک کر بولا تھا۔

"عزت۔" اس کی آواز میں ایسی انہونی سی پکار تھی کہ عزت دہل گئی تھی۔

"ولید۔۔۔!" ادھر وہ پکاری تھی اور دوسری طرف گولیوں کی آواز بہت دور تک گونجی تھی۔

"ولید۔۔۔! ولید۔۔۔! میری بات سنو ولید۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟" عزت یکدم پاگل ہو اٹھی تھی اور چیخ چیخ کر اسے پکارنے لگی تھی مگر دوسری طرف سناٹا چھا چکا تھا۔

اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ وہ اندھادھند تیمور کے کمرے کی طرف دوڑی تھی اور اس کے بیڈ روم کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا۔

"بھائی۔۔۔ دروازہ کھولیں بھائی۔۔۔ پلیز۔۔۔ دروازہ کھولیں۔" اس طرح دھڑا دھڑ دروازہ پیٹنے کی آواز پہ تیمور بھی

نیند سے ہڑبڑا کے اٹھا تھا اور عزت کی آواز پہ ننگے پیر دروازے کی طرف لپکا تھا۔

"عزت۔۔۔! کیا ہوا ہے۔۔۔؟ سب ٹھیک تو ہے ناں۔۔۔؟" تیمور نے بے اختیار اسے کندھوں سے تھاما تھا' وہ رو رو کر یوں نڈھال ہو رہی تھی جیسے ابھی کھڑے قد سے گر جائے گی۔

"عزت بتاؤ ناں۔۔۔؟ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟"

"بب۔۔۔ بھائی۔۔۔ وہ' وہ۔۔۔ ولید۔۔۔ آپ کا دوست۔" عزت ہکلا رہی تھی۔۔۔ اور اس کے منہ سے ولید کا نام سن کر تیمور کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔

"کک۔۔۔ کیا ہوا ہے ولید کو۔۔۔؟" تیمور کا دل سہم گیا تھا۔

"اسے۔۔۔ اسے۔۔۔ کک۔۔۔ کسی نے گولی مار دی فائرنگ ہوئی ہے وہ۔۔۔ وہ!" عزت تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی اور تیمور حیرت زدہ تھا۔

"تمہیں۔۔۔ تمہیں کس نے بتایا۔۔۔؟" تیمور مرے مرے سے لہجے میں بولا تھا۔

"اس سے بات کر رہی تھی۔۔۔ اچانک فائرنگ ہوئی۔۔۔ اور۔۔۔ اور کال بند ہو گئی۔۔۔ بھائی۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ زخمی ہو گا۔۔۔ اسے۔۔۔ اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔؟ پلیز چلیں ناں اس کے پاس چلیں۔"

عزت روتے ہوئے دوزانو نیچے فرش پہ ہی بیٹھ گئی تھی اور تیمور سنبھلتے ہوئے یکدم اپنی شرٹ وغیرہ پہن کر جانے کی تیاری کرنے لگا۔۔۔!

اسے پانچ منٹ لگے تھے گھر سے نکلنے میں۔۔۔ اور عزت اس کے ساتھ ساتھ تھی۔۔۔!

☼ ☼ ☼

ماورا ہسپتال کے کوریڈور میں بینچ پہ بیٹھی مسلسل جاگ رہی تھی' جب اچانک ایک ایمبولینس کے سائرن کی آواز قریب آتی محسوس ہوئی اور ہسپتال کا سارا اسٹاف ایک دم الرٹ ہو گیا تھا۔

"اللہ خیر۔۔۔!" ماورا ہسپتال کے مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتی پولیس اور مختلف لوگوں کے درمیان گھرے اسٹریچر پہ خون سے لت پت آدمی کو دور سے دیکھ کر ہی دہل گئی تھی۔۔۔ اور یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

اس کی نظر قریب سے اس آدمی کے چہرے پہ پڑی تھی جو اسٹریچر پہ پڑا تھا۔۔۔ پتا نہیں وہ زندہ تھا یا زندگی ہار چکا تھا لیکن جو بھی تھا ماورا کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا۔۔۔

"ولید۔۔۔ ولید پہ حملہ ہوا ہے یار۔ انہوں نے مم۔۔۔ مار دیا اسے۔۔۔" ضمیر انصاری کسی سے فون پہ بات کرتے ہوئے رو پڑا تھا' رنجیدہ سے انداز سے پلٹتی ماورا ایک دم چونک گئی تھی اس کے ذہن کے پردے پہ ولید کا نام اک جھماکے سے چمکا تھا۔

"۔۔۔ ولید۔۔۔؟ ولید رحمان۔۔۔ ایک پج ایک شام۔۔۔ والا۔۔۔؟" اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔۔۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

ملیحہ صدیقی

بیماری دل

"منہ کھولو"۔ میرے کہنے پر سامنے موجود بچے نے بڑا سا منہ کھول دیا۔ میں نے تھرمامیٹر اس کے منہ میں رکھا۔ "زبان کے نیچے رکھو بیٹا۔" اس نے سعادت مندی سے عمل کیا تو میں نسخہ لکھنے لگی۔ ساتھ ساتھ بچے کی ماں کی تسلی بھی کروا رہی تھی جو بچے کی طبیعت کی وجہ سے پریشان تھی۔ اس کے بعد جو اگلی پیشنٹ کمرے میں آئی' اسے دیکھ کر میں نے بے اختیار ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا حال ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟" وہ بیٹھتے ہوئے آہستہ سے بولی۔

"میں تو ٹھیک ہوں' مگر یقیناً" تمہاری طبیعت ناساز ہو گی۔" میں مسکرائی۔

"ہاں یار بس۔ بی پی لو ہے شاید۔ چکر آتے رہتے ہیں۔ میں نے سوچا ڈرپ لگوانا پڑے گی۔" وہ کچھ نقاہت سے بولی۔

"بی پی کیوں لو کر لیا بھئی؟ لگتا ہے ہفتہ بھر سے شاپنگ پر نہیں گئیں۔" میں اس کا بی پی چیک کرنے لگی۔

"ارے ان کو فرصت کہاں ہے۔ ہاں اگر کوئی بہن یا ماں کہہ دیں تو فوراً" وقت نکل آئے گا۔ میری دیورانی کل ہی طارق روڈ سے اتنے خوب صورت سوٹ لے کر آئی ہے اور اس کے شوہر نے تو سلوانے بھی ڈال دیے۔ ہر مہینے دو' تین سوٹ بناتی ہے۔" اس کے لہجے سے کچھ کڑواہٹ چھلکی۔

"یہ فضول خرچی تو آج کل رواج ہی بن گئی ہے۔" میں نے نسخہ لکھتے ہوئے کہا۔ ڈرپ لگانے کا ارادہ نہیں تھا۔

"مگر ہمارے لیے کہاں ہیں یہ رواج۔" اس نے نسخہ ہاتھ میں لیا۔ "اب پھر گھر جا کر کھانا پکانا ہو گا۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ تمہارے مزے ہیں بھئی۔ کام والی آتی ہے۔ آرام سے کلینک پر ہوتی ہو"۔

"ارے نہیں بھئی! کھانا میں خود پکاتی ہوں ہمیشہ۔۔۔ اشعر کو کسی اور کے ہاتھ کا پسند نہیں۔"

میں مسکراتے ہوئے بولی۔ مجھے پتا تھا ابھی باہر جا کر وہ بازار سے کچھ کھانا لے لے گی۔

"چلو' باقی کاموں سے تو نجات ہے۔" اس نے اصرار کیا تو میں بس مسکرا دی اور کیا کرتی۔

☼ ☼ ☼

جب میں ایم بی بی ایس کر رہی تھی۔ تب بابا نے ناظم آباد میں گھر لیا تھا۔ درمیانے سے مڈل کلاس لوگ آباد تھے۔ محلے میں لڑکیوں کی کمی تھی یا تو بہت چھوٹی تھیں یا پھر شادیاں ہو چکی تھیں۔ ہم دو بہنوں نے گھر کی چھت سے سامنے گھر میں موجود لڑکی کو دیکھا۔ وہ چھت پر چائے پی رہی تھی۔ کچھ دیر وہ بیٹھی رہی۔ کبھی ہمیں بھی دیکھ لیتی تھی۔ پھر نیچے چلی گئی۔ ہم بھی نیچے چلے آئے۔

"یار بریرہ! لڑکی تو اچھی ہے' دوستی ہو سکتی ہے۔" زونیو کو گدگدی ہو رہی تھی۔

"بھئی' یہ دوستیاں کرنا تمہارا کام ہے۔ میری تو اسٹڈیز وقت نہیں چھوڑتیں۔" میرا دھیان کتاب کے علاوہ اس موٹی سی چھپکلی پر بھی تھا جو بے خوفی سے الماری کے اوپر دیوار پر مٹر گشت کر رہی تھی۔

"ویسے سنا ہے' ایک ہی اولاد ہے۔ شاید خاندان میں سے لے کر پالا ہے۔" زونیو بولتی رہی۔

اسی وقت دروازہ بجا۔ امی نماز پڑھ رہی تھیں۔ اسد اپنے کمرے میں تھا۔ زونیو نے دروازہ کھولا۔ وہی لڑکی ہاتھ میں پلیٹ لیے کھڑی تھی۔ کل ہی ہم نے بھی محلے میں کھیر بانٹی تھی۔ مجھے اچھا نہ لگا تو میں بھی قریب پہنچ گئی۔

"یہ میری بڑی بہن بریرہ ہیں۔" زونیو نے بتایا۔

"او بریرہ باجی! یہ میں بریانی لائی ہوں۔" اپنے برابر کی لڑکی سے باجی سن کر میں حیران ہوئی اور برا بھی لگا۔ زونیو بھی سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر بیٹھ کر وہ رخصت ہوئی۔

"اصل میں بات یہ ہے کہ محلے میں اس کی طرح کوئی اور لڑکی نہیں تھی جو تھوڑی خوب صورت اور اکلوتی ہو' مگر اب ہم کو دیکھ کر وہ جل گئی ہے۔" زونیو غصے میں الٹا سیدھا بول رہی تھی۔

"اس سے بڑھ کر جو آ گئے ہم۔ میری عمر کی بن رہی تھی۔ یار! میں نے ابھی انٹر کیا ہے اور اسے انٹر کیے عرصہ ہو گیا۔ کب سے ماں' باپ رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ کچن میں جانے لگی۔ چھپکلی صاحبہ گیلری میں رخصت ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں آرام سے بیٹھ گئی۔

"بس یار! کچھ لوگوں کو چھوٹا بننے کا کریز ہوتا ہے۔" میں نے بریانی چکھتے ہوئے کہا۔ "اب تو اکثریت دیوانی نظر آتی ہے۔" اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔ میں

مسکراتے ہوئے بریانی کھانے لگی، بہرحال بریانی اچھی تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر بعد کے دنوں میں زونیو اور رافعہ کا کافی ملنا جلنا ہوگیا۔ کیونکہ وہ ہمارے گھر آجاتی تھی اور زونیو دوستیوں کی شوقین۔ زونیو کی زبانی مجھے اس کے بارے میں پتا چلتا رہتا۔ زونیو کے ٹوکنے پر اس نے مجھے باجی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ زونیو بھی بی کام میں ایڈمیشن لے چکی تھی۔ آتے جاتے اس کی کزنز کے قصے بھی کانوں میں پڑتے رہتے۔

"یار! میں تو حیران ہوں کہ اس کی کزنز ساری کی ساری بری کیوں ہیں۔" ایک دن میں نے ہنستے ہوئے زونیو سے کہا۔

"بعض لوگ کسی کو ذرا سا بھی آگے نہیں دیکھ سکتے۔" اس نے لاپروائی سے کہا۔

"رشک صرف دو آدمیوں جائز ہے۔ ایک وہ جو علم حاصل کرکے آگے پھیلائے اور دوسرا جسے اللہ دولت دے اور وہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرے، مگر لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر حسد، جلن، رشک کے جذبے خود میں بھر لیتے ہیں۔"

"بے وقوف لوگ ہیں۔ انہیں اندازہ نہیں ہے اس طرح وہ خود کو ہی نقصان پہنچاتے ہیں۔" زونیو نے سنجیدگی سے کہا اور میں سرہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ہاؤس جاب پورا ہوتے ہی میری شادی ہوگئی۔ اشعر تعاون کرنے والے شوہر تھے۔ یوں میں اپنا کلینک کھولنے میں بھی کامیاب ہوگئی۔ میں چائلڈ اسپیشلسٹ تھی۔ مگر زیادہ تر عام مریض آتے تھے۔ مجھ سے ایک سال پہلے رافعہ کی شادی ہوئی تھی۔ مگر وہ جب بھی میکے آتی، ہمارے ہاں کا ایک چکر بھی لگاتی۔ زونیو اس کا ذکر کرتی رہتی تھی۔ رافعہ کی چھوٹی نند میری کالج فیلو رہ چکی تھی اور دوست بھی رہی تھی۔ اس لیے میں اس کے سسرال کو جانتی تھی۔

"کیا حال ہیں رافعہ کے؟" ایک بار میں میکے آئی تو پوچھا۔

"بے حال ہیں۔" زونیو کچھ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا مطلب؟" میں الجھی۔

"دو ہفتے سے میکے میں تھی۔ ناراض ہو کر آئی تھی۔ پھر شوہر اور ساس لے کر گئے۔" وہ بولی۔

"کوئی مسئلہ تھا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مسئلے ہی مسئلے تھے۔ جٹھانی کے ذمے آسان کام ہیں۔ اس کے شوہر گھر میں زیادہ خرچ کیوں دیتے ہیں۔ دیورانی میکے زیادہ جاتی ہے۔ نندوں کا قیام طویل ہوتا ہے۔ اس کا جیب خرچ بہت کم ہے۔ کام بے حد زیادہ ہیں وغیرہ وغیرہ۔" وہ کینو چھیلتے ہوئے بولی۔

"مگر رمشا کے گھر والے تو کافی مہذب اور سمجھ دار لوگ ہیں۔" میں تذبذب میں پڑ گئی۔

"تو رافعہ کی سمجھ داری مشکوک ہے؟" زونیو شرارت سے بولی۔

"ارے نہیں بھئی۔ یہ کب کہا میں نے، خیر چھوڑو۔ یہ اسد سموسے نہیں لایا اب تک، بابا آنے والے ہوں گے۔"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ امی ابھی اٹھ کر وضو کرنے گئی تھیں۔

"بیکری ذرا دور ہے۔" زونیو نے کینو کے چھلکے کو دبا کر میری آنکھ میں اسپرے کیا۔

"تمہارا بچپنا نہیں گیا اب تک۔" میں نے اسے ایک ہاتھ لگایا۔ "اچھا اسد کی انٹر کی مارکس شیٹ تو دکھاؤ۔" میں نے کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

کافی مہینوں بعد ایک دن وہ دوبارہ آگئی۔ کچھ کمزور لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے گرد ہلکے سے حلقے بھی ہوگئے تھے۔

"بی پی زیادہ رہتا ہے۔ سر میں بہت درد رہنے لگا ہے۔ راتوں کو نیند بھی نہیں آتی، ڈپریشن ہوتا ہے۔"

وہ بے چارگی سے بولی۔ بہرحال میں نے دوائیں دے کر کل دوبارہ آنے کو کہا۔ وہ بھی آج کل میکے میں تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے بھی امی کی طرف جانا ہے۔ تھوڑی دیر رک جائے، کیونکہ ایک ہی مریضہ بیٹھی تھی۔

بہرحال کچھ دیر بعد وہ کار میں میرے ساتھ تھی۔

"زین کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ ٹھیک ہے۔" اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس کے بیٹے سے ذرا چھوٹی میری بیٹی شمامہ تھی جو گھر میں دادا کے پاس ہوتی تھی۔ آج تھوڑی دیر سے جاؤں گی تو پوچھ پوچھ کر دادا کے کان کھا جائے گی۔" میں مسکرانے لگی اور راستہ پتا ہی نہ چلا۔

گھر میں پہلا سامنا زونیو سے ہی ہوا۔

"لو بھئی سرچ کرلیا تمہارا اسائنمنٹ۔" میں نے اس کے ہاتھ میں فائل تھمائی۔ وہ انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کر رہی تھی۔

"ارے یار! یہ تو ذرا سا مٹیریل ہے۔ پورا اسائنمنٹ کہاں۔ یونی میں تو خواری ہے بس، سر عباس کو مطمئن کرنا آسان تھوڑی ہے۔" وہ تیز تیز صفحے پلٹ رہی تھی۔ امی سے مل کر میں دوبارہ زونیو کے پاس آگئی۔

"آج رافعہ آئی تھی کلینک۔" میں نے بتایا۔

"ہاں۔ وہ تو دو مہینوں سے اپنے میکے میں ہے۔"

اس نے آرام سے بتایا، مگر میں حیران ہوگئی۔

"وہ کیوں؟"

"بس جیٹھانی کے بچے بڑے ہو رہے تھے، جگہ کم تھی، انہوں نے گلشن میں اپنا فلیٹ لیا ہے۔ تب سے اس کی بھی ضد ہے کہ گھر بیچ کر کسی اچھی جگہ جایا جائے۔ ورنہ ان کا حصہ انہیں دے دیا جائے۔" زونیو بولی۔

"زیادہ قصور اسی کا ہوتا ہے، بلکہ سارا قصور اسی کا لگتا ہے۔ وہاں کے حالات جو یہ بے دھیانی میں بتا جاتی ہے اس سے تو یہی لگتا ہے۔"

"ہوں۔۔۔" میں نے پرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا۔

"شمی کو بھی لے آتیں۔" اس نے فائل ایک طرف رکھ دی۔ شمامہ اس کی بہت لاڈلی تھی۔ "بس یار! کلینک سے سیدھا آئی ہوں۔" میں ہنوز رافعہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن رافعہ جلد ہی آگئی تھی۔

"سمجھ نہیں آتا کہ مسئلہ کیا ہے۔ بس سانس پھولتا ہے۔ گھبراہٹ رہتی ہے۔" وہ الجھن زدہ سی بولی۔

"ہر وقت چکر، سر درد، نیند نہ آنے کا بھی مسئلہ ہے۔ بھوک جیسے مر گئی ہے۔" میں نے اس کا کوفت بھرا چہرہ دیکھا۔

"بیماری دل ہے۔" میں نے نسخہ لکھنا شروع کیا۔

"کیا؟" وہ پریشانی سے بولی۔ میری بڑبڑاہٹ اس نے سن لی تھی۔

"ہارٹ کا مسئلہ! کیا کہہ رہی ہو؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"کچھ نہیں بھئی، مذاق کر رہی تھی۔" میں نے بات سنبھالنی چاہی۔

"ایسی باتیں مذاق میں بھی نہیں کہنی چاہئیں۔" وہ کچھ خفگی سے بولی۔ "ارے سوری ڈیر۔۔۔ تم اب نسخہ سمجھ لو۔" میں نے اس کا دھیان نسخے کی طرف کیا۔ کچھ دیر بعد وہ کلینک سے فارغ ہو کر چلی گئی۔ مزید کوئی مریض ــــ نہیں تھا۔

رافعہ میری بات نہیں سمجھی تھی، مگر شاید آپ سمجھ گئے ہوں؟

ہمارے معاشرے کے نوے فیصد لوگ اس بیماری دل کا شکار ہیں۔ کوئی دس فیصد، کوئی بیس، پچاس، اسی اور کوئی تو سو فیصد۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں یہ بیماری کتنے فیصد ہے، کیونکہ ــــ زندگی کے کسی نہ کسی مقام پر ذرا دیر کو ہی ہم اس میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ہم نے اس پر قابو نہ پایا تو پھر اس کی کوئی دوا روئے زمین پر موجود نہیں۔ جی ہاں! حسد لاعلاج ہے۔

☼

سیمابنت عاصم

کچھ لمحے زندگی کا عنوان بدل کر آتی زندگی کا ماحاصل بن جاتے ہیں۔ درنایاب سے میری پہلی ملاقات بھی ایسے ہی کسی لمحے کا شاخسانہ تھی۔ جو میری حیات کا دھارا پلٹ گئی تھی!

وہ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ میں نے کسی کام سے گلی میں جھانکا تھا۔ اگلے ہی پل سرخ ٹویوٹا میری نظروں کے سامنے آکر رکی اور زرد چکن کے سوٹ میں سر کو سیاہ اسکارف سے ڈھانپے' سرو قد' گوری چٹی' باوقار سی ۔۔۔ ایک محترمہ برآمد ہوئیں۔ ساتھ لمبی سی پونی ٹیل بنائے فینسی فراک میں ملبوس گڑیا جیسی بچی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اک بیس بائیس سالہ نوجوان براجمان تھا۔ یہ سامنے والے ممتاز انکل کے مہمان تھے' مگر ممتاز انکل کے گھر کل سے تالا لگا تھا۔ وہ اپنی فیملی سمیت شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے گھر میں لا بٹھایا۔ لائٹ نہیں تھی۔ وہ اے سی والی گاڑی سے اتری تھیں۔ منٹوں میں پسینہ سے تر ہو گئیں۔ میں جھٹ پٹ شربت گھول لائی۔ ایک گلاس باہر گاڑی میں بیٹھے نوجوان کو بھی بھجوا دیا۔

وہ درنایاب تھیں اور یہ درنایاب سے میری پہلی ملاقات تھی!

ممتاز انکل ان کے شوہر کے واقف کار تھے۔ ان کا سارا سسرال و میکہ حیدر آباد میں تھا۔ شوہر کی جاب یہیں تھی۔ گلستان جوہر میں ان کا بنگلہ زیر تعمیر تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے ممتاز انکل کے گھر کا اوپری پورشن کرائے پر درکار تھا۔ درنایاب کی شخصیت کا اعتماد' وقار ان کی مالی آسودگی کا غماز تھا۔ ممتاز انکل کا شمار بھی متمول لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان کا گھر جدید طرز پر تعمیر شدہ تھا' مجھے یقین تھا۔ بات بن جائے گی۔ اور بات بن گئی!

اسی ہفتہ کی ایک صبح بڑا سارا ٹرک ڈھیروں ڈھیر سامان سے لدا ممتاز انکل کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔

میں اسی چند منٹ کی ملاقات کے صدقے دوپہر کے کھانے کی ٹرے سجا کر پہنچ گئی۔ سادہ سے دال چاول۔ اچار چٹنی کے ساتھ۔

درنایاب بجلی کی پھرتی سے سامان سیٹ کروانے میں لگی تھیں۔ دو چار مزدور ساتھ تھے۔ لش لش کرتا قیمتی وجدید ساز و سامان یہاں وہاں دھرا تھا۔ کچن پہلے سیٹ کرلیا تھا تاکہ کھانے پکانے میں جھنجٹ نہ ہو۔ جگمگاتا ہوا جدید اٹالین طرز پر بنا اوپن کچن!

میں نے بچوں کی بابت پوچھا تو ہنس دیں۔ وہ پڑوس کی بچی تھی۔ ان سے کافی اٹیچ تھی۔ اور گاڑی ڈرائیو کرنے والا نوعمر لڑکا ان کا بھانجا تھا۔ ان کی شادی کو پندرہ سال ہوئے تھے' مگر گھر بچوں کی چہکار سے محروم تھا۔ میں شرمسار ہو گئی مگر وہ ہنس دیں۔

میرے سامنے دال چاول چٹخارے لے کر کھائے۔ شاید دل رکھنے کو تعریف بھی کی۔ میں منتظر تھی کہ برتن لے کر ہی لوٹوں گی۔ مگر انہوں نے برتن سمیٹ کر رکھ دیے کہ شام تک بھجوا دوں گی۔ میں سمجھ گئی۔ وہ برتن خالی لوٹانے کی قائل نہیں ہیں خیر' لگے ہاتھوں ان کے ہاتھ کے ذائقے کا بھی ٹیسٹ ہو جائے گا۔ شام میں برتن خوب صورت سرپوش سے ڈھکے لوٹ آئے۔

چکن تندوری اور مزے دار پڈنگ واہ! مزا آگیا۔

انہوں نے ٹیسٹ جیت لیا تھا۔ مانو' سو میں سے سو نمبر مار لیے کچھ ہی وقت میں' میں نے جانچ لیا۔ ان کے گھر میں تنہائی' ویرانی اور سناٹا تھا۔ انہیں یہ تنہائی ڈستی تھی۔ گھر میں توتا پال رکھا تھا جو میٹھی میٹھی باتیں کرتا۔ ایک پالتو بلی' جس کے بچوں کی طرح ناز نخرے اٹھاتیں۔ مگر ان کی تنہائی نہ مٹتی تھی۔

میں نے انہیں انٹرنیٹ پر دوستیاں بنانے کا مشورہ دیا۔ وقت اچھا گزرے گا اور تنہائی مٹے گی۔ وہ نیٹ سے نابلد تھیں۔ میں نے ہفتہ بھر میں ان کے گھر آکر سکھا دینے کا وعدہ کرلیا اور انہوں نے سیکھ بھی لیا۔ مگر اس ہفتہ بھر میں میری ان سے دوستی مضبوط ہو گئی تھی۔

جواباً "میں نے بھی ان سے بہت کچھ سیکھا۔ نت نئی ڈشز۔ کڑھائی کے کئی ٹانکے اور ہاں' رمی بھی! تاش کے پتوں کا کھیل بڑا انوکھا رہا۔ وہ بڑی بڑی تقریبات اٹینڈ کرتی تھیں۔ کچھ ہی دنوں میں' میں نے جانچ لیا۔

وہ ایک ہنر مند عورت تھیں' گھر کے کاموں کے لیے پھرکی کی طرح پھرتی تھیں۔

اپنے شوہر آذر سے انہیں والہانہ عشق تھا۔ ان کی ہربات آذر سے شروع ہو کر آذر پر ختم ہوتی تھی۔ وہ بڑے پیار سے ان کا ذکر کرتیں۔ ان کا انتظار کرتیں۔ ان کی پسندیدہ ڈشز بنانے میں جتی رہتیں۔ وہ آذر کے ساتھ پر نازاں تھیں۔ آذر نے انہیں سکھ بھی بلا کا دے رکھا تھا۔ اور یہ نظر بھی آتا تھا وہ کسٹم میں جاب کرتے تھے۔ یہاں سے وہاں تک فراغت و خوش حالی نظر آتی تھی۔ مگر اس سے قطع نظر بھی' بہت کچھ تھا جو نظر نہ آتا' محسوس ہوتا تھا۔ درنایاب کے لیے آذر کی بے پناہ چاہت!

پندرہ سال سے ان کا آنگن سونا تھا مگر وہ درنایاب کو پوجتے تھے۔ کسی اور عورت کا سایہ بھی انہیں منظور نہ تھا درنایاب کہتیں۔

"آذر کہتے ہیں کہ میری دنیا تم پر ختم ہے۔"

مجھے یقین تھا۔ درنایاب تھیں ہی اسی قابل۔ مگر میرا دل گھٹتا بڑھتا۔ ان کی شان دار زندگی پر نظر ڈالتی تو یہاں سے وہاں تک پھیلی محرومی عود کر آتی۔ ایسی خوشحال زندگی' محبت کرنے والا جیون ساتھی میرا بھی خواب تھا' مگر کچھ خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔ رشتے اول تو آتے نہیں۔ جو آتے وہ میری نکتہ چینی کی نذر ہو جاتے۔ میں نے جو چار حروف پڑھ رکھے تھے' وہ خناس بن کر دماغ میں سما گئے تھے۔ کسی ٹیکسی ڈرائیور یا شاپ کیپر جیسے معمولی آدمی کے لیے دل ہی نہ مانتا۔ امی اس معاملہ میں مجبور تھیں۔ جو رشتہ ہاتھ لگتا' میرے سامنے رکھ دیتیں۔ مگر میں چڑ جاتی۔ جھگڑنے لگتی۔

امی کی نہ چلتی۔ پہلے ان کی بھی ہزار شرائط تھیں۔ ذات پات' خاندان تعلیم... یہ وہ۔ مگر جوں جوں وقت گزر رہا تھا' ان کے معیار کا گراف نیچے آتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتی۔ کیا میں اتنی بخت آور ہوں کہ آذر جیسے کسی شریک سفر کے قدم میری دہلیز کو چھو سکیں پھر میں اس خیال پر بھی توبہ کرتی۔ درنایاب میری بہنوں جیسی تھیں۔ میرا اب تک آذر سے سامنا نہ ہوا تھا۔ ان کی ڈیوٹی ایسی تھی۔ علی الصبح سدھارتے' رات گئے لوٹتے۔ پارکنگ میں سرخ ٹویوٹا نظر آتی تو میں خود ادھر جانے سے ہچکچتی۔ مگر نایاب کا اصرار "ہر شام کی چائے میرے ساتھ پیو۔" بھلا میرے لیے ایسا کہاں ممکن تھا۔ گھر کے سو جھمیلے' پھر بکی گھر گھسنی تھی۔ البتہ کچھ اچھی چیز پکاتی تو انہیں ضرور بھیجتی۔ وہ سراہتیں۔

"تمہارے ہاتھ میں بڑا ذائقہ ہے۔"

اگرچہ میں خود ان کے ذائقے سے مات کھاتی تھی۔ مگر ان کے بغیر نوالہ اٹکنے لگا تھا۔ ہر مزے کی چیز کا ڈونگہ ادھر ضرور جاتا' جواباً" وہی ڈونگہ کسی بڑھیا سی چٹخارے دار چیز سے سجا لوٹتا۔ میں شرم سار ہوتی تو وہ ہنس دیتیں۔

"خالی برتن لوٹانا ہماری روایت نہیں ہے۔"

امی کہتیں۔" ہر کوئی اپنی حیثیت کے مطابق دیتا ہے' اپنی حیثیت پر شرم سار نہیں ہونا چاہیے۔"

مگر سچ تو یہ تھا کہ انہوں نے مجھ پر میری حیثیت کبھی جتائی ہی نہیں۔ اس روز امی نے کڑھی بنائی تھی۔ مجھے کسی کام سے مارکیٹ جانا تھا۔ میں جاتے ہوئے انہیں کڑھی دینے گئی۔ وہ کچن میں کھڑی تھیں۔ لپک کر آئیں۔

"واہ! عبایا تو بہت بڑھیا پہنا ہے۔ نیا ہے؟"

میں بھی خود کو ملمع چڑھا کر پیش کرنے کی قائل نہیں تھی۔ صاف بتا دیا۔ عبایا پرانا ہو گیا تھا۔ میں نے الٹ کر ان ہی سلائیوں پر مشین مار لی۔ کچھ موتی ستارے ٹانک لیے... لو جی بج گیا عبایا! نیا عبایا کوئی سستا پڑتا ہے۔

"واہ! تم تو بڑی استاد ہو' سوچتی ہوں میں بھی...!"

میں ہنس دی۔ انہوں نے یقیناً" میرا دل رکھا تھا۔ مجھے کیا نظر نہ آتا تھا کہ ان کے گھر ہن برستا ہے۔ پھر انہوں نے سلائی کے لیے چند جوڑے مجھے پکڑا دیے۔ مجھے اور کیا درکار تھا۔ اک نیا کام ہاتھ آگیا۔ چار پیسے کا آسرا بھی بنا۔ بہت کم وقت میں وہ میری زندگی کا لازمی جزو بن گئیں۔

مجھے ان کے بغیر چین ہی نہ پڑتا تھا۔ گھڑی بھر کو کھڑے کھڑے بھی جاتی تو سر ہو جاتیں۔ "کچھ نہ کچھ کھا کر جاؤ۔ رات آذر تازہ مٹھائی لائے تھے۔ یا فریج میں فروٹ پڑے ہیں۔ یہ وہ"۔

ان کے بھی ڈھیروں کام میرے لیے رکنے لگے تھے۔ ان کی ایک ہی پکار پر دوڑتی۔ ایک بار بلڈ پریشر گر گیا۔ انہوں نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ مجھے بلایا۔ ٹب بھر کپڑے نتھارنے کو پڑے تھے۔ میں نکال کر بالکونی میں بندھی رسیوں پر پھیلا آئی۔ ایسے ہی ایک بار بیرون ملک مقیم کسی عزیز نے ان کے ہاتھ سے بنے دیسی کھانے کی فرمائش کی تھی۔ وقت کم پڑ رہا تھا۔ کام وقت پر ختم کر کے پیکٹ تیار کرنا تھا۔ مرغی کے کباب' چنے کی دال کا حلوہ۔ نورتن۔

انہوں نے مجھے مدد کے لیے بلایا۔ مقررہ وقت پر سارا کام ہو گیا۔ مگر وہ احسان کبھی نہ رکھتی تھیں۔ اکثر کسی بہانے سے کچھ نہ کچھ لیے آن موجود ہوتیں۔

"کل رات ہم ساحل پر گئے تھے۔ تھوڑی شاپنگ کی تو کومل کیسے نہ یاد آتی۔" سیپیوں سے بنا خوب صورت فوٹو فریم اور بڑی ساری کشتی۔

مجھے برا تو لگتا مگر امی کو ان کی یہی خودداری بھاتی تھی۔ شاید ان کا فرمان بجا تھا کہ احسان بساط بھر چڑھایا یا اتارا جاتا ہے۔ دامے' درمے' سخنے۔ مگر ان سے تعلق اتنا گہرا ہو چلا تھا کہ احسان کا لفظ تاؤ دلاتا۔

اک بار انہوں نے بلاوا بھیجا۔ مگر مجھے ہلکی حرارت تھی۔ امی کسی کے پرسہ کو گئی تھیں۔ انہوں نے ماتھا چھو کر دیکھا۔ پھر کہا۔

"میرے کمرے میں جا کر لیٹ جاؤ۔ میں گرم چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ٹیبلٹ بھی ہے۔"

ان کے بیڈ روم میں اے سی کی ہلکی خنکی تھی۔ کمر ٹکاتے ہی آنکھیں بند ہونے لگیں کہ اک بھاری مردانہ ہاتھ کا لمس میرے بال سہلانے لگا پھر کوئی جھکا۔

"جانم!" گرم سانسیں میرے چہرے سے ٹکرائیں تو محسوس ہوا کوئی میرے بہت قریب بیٹھا ہے۔ میں نیم غنودگی میں تھی۔ ہاتھ کا لمس بالوں کو سہلاتا کندھے پر آٹھہرا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سائیڈ لیمپ آن کیا۔ وہ بھی سٹپٹا گئے۔ پھر کھڑے ہو گئے۔

یہ آذر تھے۔ اونچے' گورے' مردانہ وجاہت کا شاہکار۔ میں اک نظر میں پہچان گئی۔ ان کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر آذر و نایاب کی شادی کی تصویر خوب صورت فریم میں جڑی اب بھی رکھی تھی۔

"سوری! میں سمجھا' نایاب ہے۔"

شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ ان کا انداز ہی اتنا شرم سار تھا۔ مگر شاید غلطی میری ہی تھی۔ سیدھی ان کے بیڈ روم میں جا کے لیٹ گئی۔ وہ نایاب کو پکارتے باہر چلے گئے۔ مگر میرے اندر کی دنیا اتھل پتھل ہو کر رہ گئی تھی۔ نایاب سے بھی اس "خاموش" واردات کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا گیا۔ مگر وہی دور دور تک پھیلا احساس محرومی کئی گنا ہو کر ڈستا رہا۔

نایاب کتنی خوش قسمت ہیں۔ سچ ہی کہا گیا ہے۔ کسی کو منزل گھر سے نکلتے ہی مل جاتی ہے اور کوئی عمر بھر محو سفر ہی رہتا ہے!

یا پھر شاید درنایاب اس عیش و عشرت اور محبت کی مستحق تھیں! طور طریقہ ہی نہیں۔ ان کی شخصیت میں بھی رکھ رکھاؤ تھا۔ نرم' ٹھنڈا' دھیما انداز۔

اک بار کہنے لگیں۔ "وہ شخص لاکھوں میں ایک خوش نصیب ہو گا جسے کومل جیسی لڑکی ملے گی۔"

ہاہ! اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے! اولا" ای بھی میرے لیے آسمان سے اترے کسی شہزادے کی منتظر رہیں ..... مگر گزرتا وقت ان کی ساری خوش گمانیوں کو خاک میں ملا رہا تھا۔ اور اس گزرتے وقت نے مجھے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ چار کاغذوں پر دستخط کی قیمت کتنی بھاری پڑتی ہے اور امی کا خیال تھا کہ اچھا بر اگر نصیب ہوتا تو اب تک جڑ نہ چکا ہوتا! اور یہ کہ شادی سمجھوتے کا نام ہے۔

"زندگی اک بار ملتی ہے، اسے بھی کمپرومائز کی نذر کردوں؟" میں نے کہا۔

یہ وہ وقت تھا، جب امی میری شادی اپنے نکمے، طلاق شدہ بھانجے سے کرنے پر تلی تھیں۔ قریب تھا کہ میں بھی ہتھیار ڈالتی مگر انہیں سن کر اچنبھا ہوا۔

"کیوں کیا کمی ہے تم میں....؟"

جواباً "میرے پاس ایک سو ایک جواب تھے، جو امی کے رٹائے ہوئے تھے۔ یتیم لڑکی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ اک ذرا شکل اچھی ہے تو شکل کو کون چاٹتا ہے۔ ایسی ہزار شکلیں سڑ رہی ہیں۔ اک بی اے کی ڈگری ہے، جو جانے کب سے کونے کھدرے میں پڑی اپنی قسمت کو رو رہی ہے کہ اسے آزمانے گھر سے نکلوں تو دنیا کی انگلیاں اٹھیں گی۔ امی کو زمانے کا خوف کھائے جاتا.... کون ہاتھ دھرے گا اگر جو....؟

مگر انہیں ایک بھی عذر قبول نہ تھا۔

"تم اچھی لڑکی ہو، حالات سے ہار کر کیوں اپنے خوابوں کو قربان کرتی ہو؟"

"زندگی میں انسان کو سب ہی کچھ تو نہیں مل جاتا۔" میں واقعی ہار رہی تھی۔

"مگر زندگی بدلتے دیر بھی کون سی لگتی ہے۔"

"ہاہ! جیسے کوئی جادو کی چھڑی گھما کر پل بھر میں سب کچھ بدل دے گا کوئی انسان صد فی صد اچھا نہیں تو برا بھی نہیں ہوتا۔"

"مگر کسی گمان پر رسک لینا بھی تو بے وقوفی ہی ہے۔"

"امی کہتی ہیں۔ کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔" "لنگڑا لولا عذر۔

"ہاں.... مگر کبھی کبھی اک جزو سارے کُل کو نگل جاتا ہے۔ یہ ناامیدی ہے۔"

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔ تو پھر بولیں۔ "تم از خود اپنے آپ کو ارزاں قرار دے دو گی تو دوسرا کیا خاک سر آنکھوں پر بٹھائے گا؟"

نایاب کی بات کھٹ سے میرے دل میں اتر گئی تھی میں نے صاف انکار کر دیا۔

اسی روز انہوں نے کہا تھا۔ "عورت، مرد کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ بیوی نہ رہے تو مرد کے ہاتھ میں لاٹھی بھی ہو تو اگلی عورت کا ضرور سوچتا ہے۔"

میں نے انکار کیا تو امی کی بڑبڑ جاری ہو گئی۔ تلخ، دل کو چھیدتے جملے!

ایسے میں میری ان سے جھڑپ ہو جاتی۔ اور نایاب کہتیں۔

"اگر تم ان کی باتیں پی جاؤ تو تمہیں دگنا اجر ملے گا۔ ماں کے احترام اور صبر کا۔"

"آپ کو نہیں پتا، وہ کبھی کبھار کتنی تلخ ہو جاتی ہیں۔"

"اور تم دوبدو ہو کر ثواب کھوتی اور گناہ لادتی ہو۔"

میں لاجواب ہو کر رہ گئی۔

وہ اکثر کہتیں "تمہاری آنکھوں میں اضطراب ہے!"

میں ہنس دیتی۔ بات تو سچ تھی مگر بات تھی رسوائی کی۔

اک بار کہا۔ "مجھے لگتا ہے کوئی ہے!" میں ٹھٹک گئی، وہ سنبھل کر مزید بولیں "جو تم پر مرتا ہے یا تم جس کی منتظر ہو۔"

"کاش ایسا ہی ہوتا۔" میرا اضطراب سوا تر ہو گیا تھا اور وہ شاید میری راستی کو جانچ گئیں۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے مجھے ٹٹولا تھا۔

راکھ کے ڈھیر میں چھپی کوئی چنگاری برآمد کرنے کے لیے۔

اک روز وہ علی الصبح آئیں تو آنکھیں متورم

تھیں۔ امی سے گھنٹہ بھر کھسر پھسر چلی۔

بعد ازاں معلوم ہوا کہ وہ آذر کے لیے میرا ہاتھ مانگنے آئی تھیں!

میڈیکل رپورٹس کے مطابق وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھیں۔ ان دونوں ہی کو اولاد کی چاہ تھی۔ درنایاب کا خیال تھا کہ مجھ جیسی لڑکی ہی آذر سمیت ان کے گھر کو سمیٹ سکتی ہے۔ وہ صرف آذر کے قدموں کی دھول بن کر رہ لیں گی۔ ساتھ ہزار وعدے۔ دلاسے۔ مجھے بہن بنا کے رکھیں گی۔ جوہر والا بنگلہ میرے نام کروا دیں گی۔ یہ وہ....

میں دنگ رہ گئی تھی۔ مگر ان کی بات اچھی نہیں تو بری بھی نہیں لگی تھی۔ جیسے کوئی خواب چند قدموں کے فاصلے پر آن کھڑا ہوا تھا۔ درنایاب کی شخصیت و کردار اتنا صاف و شفاف اور مثبت تھا کہ کوئی برا خیال دل کو چھو کر بھی نہ گزرتا تھا اور آذر! ان کا کہنا تھا کہ کومل کا تو بس نام ہی کافی ہے، ورنہ آسمان سے اتری حور بھی انہیں نامنظور رہتی۔ یہ یقیناً" خلوت میں کی گئی میری ان گنت تعریفوں کا نتیجہ تھا۔ مگر میں جیسے ہاں اور ناں کے درمیان معلق تھی!

درنایاب جیسی خوب صورت زندگی میرا خواب تھی مگر کوئی نادیدہ چیز مجھے فیصلے سے روکتی۔ ساری باتیں ٹھیک تھیں مگر....

آذر و نایاب کی والہانہ محبت مجھ پر خوب روشن تھی۔ یہی بات کھٹکتی —— سوت کاٹھ کی بھی بری!

اس بات کے بعد بھی میری درنایاب سے کئی ملاقاتیں رہیں مگر ہم دونوں کے درمیان نہ کوئی کھنچاؤ آیا نہ ذکر۔ وہی پرانی باتیں، ملاقاتیں۔ شاید امی بھی میرے فیصلے کی منتظر تھیں مگر مجھے ان کی دوستی عزیز تھی۔

ان ہی دنوں حیدر آباد سے کسی شادی کا بلاوا آیا تو وہ میرے سر ہو گئیں کہ "تمہیں بھی چلنا ہے" ان کا یہ مطالبہ پرانا تھا۔ وہ حیدر آباد میں مقیم اپنے تمام رشتہ داروں سے مجھے ملوانا چاہتی تھیں۔ گو کہ ان کی بات ٹالنا مجھے منظور نہ تھا۔ مگر بس عجیب سا لگتا۔

شادی والے روز سے ایک دن پہلے امی کو شدید بخار نے آلیا۔ نایاب چلتے سے ملنے آئیں۔ اس روز انہوں نے ہاتھوں کو مہندی کے گل بوٹوں سے سجایا تھا۔ ہاتھ بھر چوڑیاں اور لباس کی ہم رنگ نیل پالش۔ شاکنگ پنک لش لش کرتے لباس میں ان کا سراپا جگمگا رہا تھا۔ انہیں آج شادی بھگتا کر کل لوٹنا تھا۔ مگر میرا عذر راست تھا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے لگیں پھر چلتے چلتے مڑی تھیں۔

"سنو! میرے پرپوزل پر غور ضرور کرنا!" اس بابت پہلا اور آخری جملہ! ان کے لہجے و انداز میں بہت کچھ تھا۔ فریاد۔ گزارش۔ تاکید۔

پھر وہ مڑ گئی تھیں مگر.... ابھی نہ لوٹنے کے لیے!

آج ڈرائیور ان کے ساتھ تھا، جس کی موت ان کے ساتھ ہی لکھی تھی۔ حیدر آباد کو جاتی سڑک پر اک ٹرالر نے ہنستی کھیلتی زندگی کو نگل لیا تھا۔ لمحوں میں سب کچھ فنا ہو گیا۔ ان کا سارا خاندان وہیں تھا۔ تدفین وہیں ہوئی۔ یہاں تو بس خبر آئی۔ مانو کسی بجھتے دیے کا دھواں پھیلا۔ میں نے بمشکل خود کو سنبھالا تھا بس یادیں، آنسو، دور دور تک پھیلی تنہائی ویرانی اور سناٹا! مگر کوئی کب تک کسی کے لیے رو سکتا ہے۔ انکل ممتاز کے گھر کی پارکنگ میں آذر کی گاڑی بھی نظر آنے لگی تھی۔ اور ایک دن آذر کی گاڑی سے سرخ چمکتے کامدار سوٹ میں ملبوس لڑکی اتری تھی۔ جسے خود آذر نے ہاتھ پکڑ کر اتارا تھا اور پھر بڑے پیار سے اندر لے گئے تھے۔ شاید ایسے ہی کسی وقت کے لیے نایاب نے کہا تھا کہ عورت مرد کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ آذر کی تنہائی مٹ گئی لیکن میرا دل جس میں آذر نے بڑی خاموشی سے جگہ بنالی تھی۔ اور وہ کرچی کرچی خواب جو خود بخود آنکھوں میں سج گئے تھے...

کچھ خوابوں کی قیمت کتنی بھاری چکانی پڑتی ہے نا!

☼

انہوں نے اسے سرتا پیر غور سے دیکھا تھا پھر پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"کلی!" اس نے لہک کر بتایا تو ایک بے ساختہ مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کرلیا ــــ بڑے عرصے کے بعد وہ مسکرائے تھے۔

"کچی کلی؟" انداز میں حیرت کے ساتھ ساتھ شرارت سی گھل گئی۔

"نہیں نہیں۔ کھلتی ہوئی کلی۔" بتانے والی کا انداز بڑا بے ساختہ تھا۔

"اس جاب کے لیے تمہاری عمر بہت کم ہے۔" انہوں نے اس کے کامنی سراپے پر نظر ڈال کر پوچھا۔

"دکھتی ہوں مگر ہوں نہیں۔" وہ سنجیدہ ہوگئی۔ "میں تئیس سال کی ہوں۔"

"پہلی بار میرا اندازہ غلط ثابت ہوا کسی کے بارے میں۔" کلی دو قدم ان کے بیڈ کے قریب بڑھ گئی۔

"جو نظر آتا ہے ضروری نہیں وہی حقیقت ہو اور غلطی تو کسی بھی انسان سے ہوسکتی ہے۔"

حشمت زیدی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں حقیقت نہیں جانتا۔"

"نہیں میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ انسان کو ظاہر سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔" اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کھول دیے۔ تازہ ہوا کے ساتھ روشنی سے کمرا

مکمل ناول

بھر گیا۔ ایک ساٹھ سالہ شخص کو جو تجربات کی بھٹی میں جل کر کندن ہو گیا تھا' ایک تیئس برس کی لڑکی زندگی سمجھا رہی تھی۔

"یہ جاب تمہاری ضرورت ہے؟" انہوں نے موضوع بدلا۔

"شوق ہے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"تنخواہ کتنی لوگی؟"

کلی نے ایک نظر انہیں دیکھا اور سر کو نفی میں جنبش دی۔

"تنخواہ نہیں چاہیے۔ اس کے بدلے کچھ اور لوں گی۔" اس نے گہرا سانس بھر کر ایک نظر حشمت زیدی کو دیکھا مگر وہ سوچ میں پڑ گئے تھے کہ ان کے پاس پیسے کے علاوہ کیا تھا' جو اس لڑکی کو درکار تھا اور کیوں؟

"وہ بھول گئے تھے کہ وہ پارس تھے۔!"

☼ ☼ ☼

دوسرے ہی دن وہ صبح صبح اٹھ گئی تھی۔ گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا۔ انداز میں ایسا استحقاق تھا گویا یہ گھر اس کی ملکیت ہو۔ حشمت زیدی کو حیرانی ہوئی' لیکن برا نہیں لگا۔ شاید تنہائی سے ہار گئے تھے۔ تقدیر کا کیا ہیر پھر تھا کہ حشمت زیدی جیسا قابل' ناقابل تسخیر شخصیت کا حامل شخص ایک معمولی سی کیئر ٹیکر کی ذات میں دلچسپی کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا۔

"آپ کا گھر اچھا ہے مگر بہت اچھا نہیں۔" گھوم پھر کر وہ واپس ان کے سامنے آچکی تھی۔

"یہ گھر کہاں ہے' یہ تو مکان ہے۔" ان کے لہجے میں کرب تھا۔ کلی نے چونک کر دیکھا۔

"آپ نے اسے گھر کیوں نہیں بنایا۔" وہ کتنی بڑی بات کر رہی تھی۔ نوکری کے پہلے ہی دن اتنا ذاتی سوال۔ حشمت زیدی کے جاہ وجلال سے کون واقف نہیں تھا۔ وہ نڈر تھی یا ناسمجھ۔ مگر حشمت زیدی کو برا نہیں لگا۔ یہ خود ان کے لیے بھی حیرت کا مقام تھا۔ انہوں نے اس کو ٹوکا بھی نہیں۔ مسکرا کر چپ ہو گئے۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" کلی پاؤں پسارے ان کے سامنے آبیٹھی۔ نیلے سمندر جیسی آنکھوں میں اشتیاق تھا۔ حشمت زیدی کو اس میں ضد اور ہٹیلا پن نظر آیا۔ ان کے اپنے ناولز کی ہیروئن کی طرح جن کی مداح ایک دنیا تھی۔

"گھر تو عورت بناتی ہے۔ اور مجھے عورتیں اچھی نہیں لگتیں۔" انہوں نے کھل کر ٹوٹتی سانس بحال کی۔

"جھوٹ۔" کلی نے حسب عادت کھل کر تردید کی۔ وہ چونک گئے۔ بھلا ان کے سامنے ان کی کہی بات کو جھٹلانا ممکن تھا کسی کے لیے۔ اور یہ چھٹانک بھر کی لڑکی۔

"میں مان ہی نہیں سکتی یہ بات۔" سر کو دائیں بائیں نفی میں حرکت دیتے وہ پُریقین تھی۔

"تم مجھے کتنا جانتی ہو بھلا؟" انہیں برا نہیں لگا۔ انہیں عجیب لگا تھا۔

"جتنا میں آپ کو جانتی ہوں' اتنا تو آپ بھی خود کو نہیں جانتے۔" کلی کا پُراعتماد انداز قطعی تھا۔ اس کی بات سن کے وہ ہولے سے مسکرائے۔

"تم اپنی عمر سے بڑا دعوا کر رہی ہو۔"

"کلی بغیر ثبوت کے دعوا نہیں کرتی؟" اس نے پوری خود اعتمادی سے کہا۔

وہ دل کھول کے ہنسے شاید بہت مدت کے بعد۔ انہیں اس چھوٹی سی لڑکی کی پُراعتماد شخصیت میں اپنی جھلک نظر آئی تھی مگر کلی بُرا مان گئی۔

"آپ میرا مذاق مت اڑائیں۔ یہ بات میں ثابت بھی کر سکتی ہوں۔"

"اچھا۔ مگر کیسے؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں جناب! جتنا میں نے آپ کو پڑھا ہے۔ اتنا کوئی اور نہیں پڑھ پایا ہو گا۔ آپ کے ہر ناول میں مرکزی کردار عورت کا ہی ہوتا ہے۔ آپ عورت کو مضبوط شخصیت کے روپ میں

دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں۔ آپ ہر عورت کو مضبوط و مستحکم اور کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو عورت کی بے بسی' اس کے دکھ دکھی کر دیتے ہیں۔" کلی کا جوش و خروش آخری جملے پر دھیما پڑ گیا۔

"آپ کی ہر تخلیق کردہ عورت کے دکھ پر میں پہروں روتی ہوں اور جانے مجھے ایسا کیوں لگتا تھا ہر بار کہ آپ بھی تحریر کے ساتھ ساتھ روئے ہوں گے۔" کلی کے خاموش ہونے پر وہ ہنس دیے۔ ایسی ہنسی جیسے رو پڑے ہوں۔ انہوں نے سر جھٹک کر موضوع بدلا۔

"تم باتیں بہت کرتی ہو۔ جب سے آئی ہو چائے تک تو پلائی نہیں مجھے تم نے۔ جب کے تمہارا دعوا تھا کہ تم میرا اوروں سے بہتر خیال رکھ سکتی ہو۔" کلی نے سر پر چپت مار کر خود کو اس غلطی کی جیسے سزا دی۔

"میں ابھی آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔ آپ نے اس سے اچھی چائے زندگی میں کبھی نہیں پی ہو گی۔" اس نے حسب عادت پھر دعوا کیا تھا اور کچن کی جانب بھاگ گئی۔

☼ ☼ ☼

"سر! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے!" وہ بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہاتھ میں پانچ سال قبل شائع ہونے والا ناول تھام رکھا تھا۔ جب ہی کلی نے کمرے میں جھانک کر کہا تھا۔

"کون ہے؟" وہ بس ذرا کی ذرا متوجہ ہوئے تھے۔

"معلوم نہیں۔ میں نہیں جانتی۔" اس نے کندھے اچکا کر جواب دیا تھا۔ حشمت زیدی نے ایک ٹھنڈی آہ فضا کے سپرد کی۔ بھلا یہ لڑکی ہے کیا چیز۔ کم از کم اسے آنے والے کا نام تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔ وہ دنیائے ادب کی ایک قد آور شخصیت تھے۔ ایوارڈ یافتہ ڈراما نویس تھے۔ ان سے ملنے والوں کا ایک جم غفیر تھا۔ مگر اپنی بیماری کے باعث اب نہ وہ زیادہ دیر بیٹھ سکتے تھے نہ ہی بات چیت کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ بہت خاص لوگوں سے انتہائی ضرورت کے تحت ہی ملا کرتے تھے۔ انہیں یادداشت کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا تب ہی تو دوا لینا بھول جاتے تھے۔ جس کا نتیجہ ان کے بیمار پڑنے کی صورت میں نکلتا تھا۔ آفاق (بھتیجا) کے جرمنی جانے کے بعد ہی وہ زیادہ بیمار پڑے تھے۔ شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے انہیں بائیں طرف فالج ہوا تھا۔ اور اب وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے یا کبھی کبھار وہیل چیئر پر باہر چلے جاتے' اس لیے انہیں کیئر ٹیکر کی ضرورت پڑی تھی۔ گھر کے کام کاج کے لیے ایک جزوقتی ملازمہ تھی مگر کلی نے آنے کے بعد تمام گھر کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ اوپر کے کاموں اور حشمت زیدی کی ضروریات کے لیے ایک لڑکا رکھا ہوا

تھا۔

"بھیج دوں اندر؟" انہیں سوچ میں گم دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"نام پوچھ لینا تھا ان سے۔" جانے وہ سختی کیوں نہیں کرسکے۔

"نام پوچھنے سے کیا فرق پڑجاتا۔ آپ بتائیں اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو میں انہیں بلالاتی ہوں، ورنہ میں آپ کی خرابی طبیعت کا بتاکران صاحب سے معذرت کرلیتی ہوں۔" اس نے ان کے تھکے تھکے نڈھال چہرے کی طرف دیکھ کروضاحت کی۔ شاید اس نے بھی ان کے غیر مطمئن انداز کو نوٹ کرلیا تھا۔

"سر! آپ کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی۔ آپ اپنے دیرینہ اور خاص دوستوں کو منع نہیں کرپاتے۔ اسی لیے میں نے مفتی صاحب کو ایسا کہا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہہ کر سرجھکالیا تھا۔ لہجہ مضبوط اور قطعی تھا گویا اس نے جو کیا تھا بالکل ٹھیک کیا تھا۔

"مفتی نعیم الدین آئے ہیں؟" بہت بڑے کالم نگار اور ڈراما نویس۔ کلی نے ان کے استفسار پر اثبات میں سرکو جنبش دی تھی۔

"وہ میرے تیس سال پرانے دوست ہیں اور تم نے انہیں باہر بٹھادیا ہے؟" انہیں غصہ کے ساتھ ساتھ رنج بھی ہوا تھا۔

کلی کو دکھ ہوا۔ وہ تو انہیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ دکھ دینا تو پھر دور کی بات۔

"سوری سر! میں تو بس آپ کی خرابی طبیعت کے باعث۔"

"بس۔ انہیں لے آؤ۔" انہوں نے تحکم بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا۔ کلی ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی۔

"سر! آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے مفتی صاحب کو کہا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگے تھے کہ اس کی آواز نے انہیں رک جانے پر مجبور کردیا تھا۔

"سنیں... وہ آپ کے دیرینہ دوست سہی مگر... اب وہ پہلے کی طرح آپ کے ساتھ لمبی لمبی نشستیں نہیں جما سکتے۔ آپ ذرا کام کی بات جلدی کرلیجیے گا۔"

مفتی صاحب بے چارے ہونق ہوگئے۔ حیرت سے منہ کھل گیا۔ "آج بھی کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"یہ بچی رکھی ہے تم نے زیدی؟" اندر آتے ہی انہوں نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال یہی داغا تھا۔

"معاف کرنا یار... عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔ تمہیں اتنی دیر باہر بٹھائے رکھا اور مجھے خبر تک نہ دی۔" انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی تو مفتی صاحب بے ساختہ مسکرائے۔

"مجھے بالکل برا نہیں لگا یار... میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کیوں کہ پہلی بار تم نے کوئی درست فیصلہ کیا ہے۔" وہ ہنس دیے تھے۔ زیدی صاحب کو تعجب سا ہوا۔

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ... تم نے اس لڑکی کو رکھ کر بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ ورنہ سچ پوچھو تو میں خود کو تمہارا لنگوٹیا یار کہتا ہوں مگر جب تم سے ملنے کے لیے آتا ہوں تو اپنی باتوں اور قصوں میں اتنا محو ہوجاتا ہوں کہ یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم نہ زیادہ بیٹھ سکتے ہو نہ ہی زیادہ بات چیت کرسکتے ہو۔ مجھے بہت اچھا لگا کم از کم کوئی تو ہے جو تمہارا اتنا خیال رکھ سکے گا اب۔" زیدی صاحب کو کلی کی تعریف سن کے پتا نہیں کیوں اچھا لگا۔ انہیں کچھ دیر قبل کلی کی کہی ان کی صحت کے حوالے سے بات یاد آگئی تھی۔ بے ساختہ وہ مسکرادیے تھے۔ اس روز مفتی صاحب بھی جلدی اٹھ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

کلی ان کا ناشتا لے کر آئی تھی۔ کارن فلیکس کے ساتھ گرم دودھ اور ابلا ہوا انڈا۔ حشمت زیدی نے دیکھا تو منہ بن گیا تھا۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ انڈا کھانا چھوڑ چکے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کلی کو اپنا ڈائٹ چارٹ اور دواؤں کا استعمال سمجھادیا تھا۔

"پہلے انڈا کھالیں سر... تب تک دودھ تھوڑا ٹھنڈا ہوجائے گا۔ آج میں زیادہ گرم کر بیٹھی۔" وہ ان کی ناگواری سے بے نیاز ہدایات دے رہی تھی۔

"انڈا نہیں کھانا۔" بمشکل تمام اپنے غصے کو قابو کرتے وہ بول پائے، ورنہ دل چاہ رہا تھا کہ وہی انڈا اٹھا کر اس کے سر پہ دے ماریں۔

"ارے... مگر کیوں؟"

"اف!" ان کا جی چاہا، وہ اپنا سر نوچ ڈالیں کیوں کہ بال تو جھڑ چکے تھے۔

"شاید آپ بھول رہی ہیں آنسہ کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور مجھے ڈاکٹر نے انڈا کھانے سے منع کیا ہے۔" وہ غصہ ضبط کرتے ہوئے بولے۔

کہانیوں میں ضدی، ہٹیلی اور منہ پھٹ بے نیاز ہیروئنز کے خودسری و بے وقوفی کے قصے تحریر کرنا بہت آسان تھے حقیقت میں برداشت کرنا بہت مشکل جبکہ وہ مزے سے انڈا چھیل کے کھا رہی تھی۔

"ارے سر... آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ڈاکٹرز کو کیا پتا... وہ تو بس ایویں ہر چیز سے روک دیتے ہیں۔ بتائیں اب بھلا بیمار بندہ کیا کھائے۔ گھی، چینی، نمک تو وہ روک دیتے ہیں۔ خالی ہوا سے پیٹ بھرتا نہیں اور انڈے کے پیچھے تو یہ ڈاکٹرز ویسے ہی پڑے رہتے ہیں۔ بھئی میں تو روز انڈا کھاتی ہوں۔ چاہے سنڈے ہو یا منڈے، روز کھاؤ انڈے..."

وہ بے حد مزے سے انڈا کھاتے ہوئے بول رہی تھی۔ حشمت زیدی نے خاموشی سے اس کے بے فکر انداز کو دیکھا۔ زمانے کی سختیوں سے بے نیاز اس کا چہرہ ہر قسم کے تفکر سے پاک تھا۔ انہیں بے ساختہ اس پر رشک آیا، مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ضروری نہیں کہ جن کے چہرے صاف اور تفکرات سے پاک نظر آئیں، انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا۔ بعض لوگ دکھوں کو ہنسی کی تہہ میں بھی چھپائے رکھتے ہیں۔

"مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ڈاکٹرز کے مشورے سے کوتاہی برتیں۔ میں جانتی ہوں انڈا آپ کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ تو میں نے اپنے لیے بنایا تھا۔" حشمت زیدی نے اس کی اس حرکت پر اسے گھور کے دیکھا۔

"ناشتا کرلیں سر... دس بجے آپ کو دوا بھی لینی ہے۔"

انہوں نے اسی خاموشی سے کارن فلیکس کھانا شروع کردیا۔

اسے ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گزرا تو زیدی صاحب نے اسے کچھ رقم دینا چاہی تھی... وہ بقول اس کے اخبار میں ان کا دیا اشتہار پڑھ کر ان کے پاس نوکری کی درخواست لے کر آئی تھی۔ یہ الگ بات کہ درخواست بس اسی کے بقول تھی، ورنہ عملاً تو وہ طے کرکے آئی تھی یہ جاب کرنے کا اور نہ ملتی، تو وہ قائل کرلیتی جیسا کہ اس نے کیا بھی تھا۔

"مجھے پیسے نہیں چاہئیں سر!" وہ پیسے دیکھ کر یوں بدکی گویا کوئی سانپ دیکھ لیا ہو۔ "میں نے آپ سے کہا تھا مجھے اس خدمت کے پیسے نہیں لینے۔" کلی کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔ زیدی صاحب الجھ گئے۔

"مگر... تم میری اتنی خدمت کرتی ہو اس کا کچھ معاوضہ تو بنتا ہے نا؟" ان کے سادہ سے لہجے پر کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا۔

"میں آپ کی خدمت کسی بھی صلے کی تمنا کے بغیر کرتی ہوں سر... میں آپ کی فین ہوں۔ آپ کی ہر تحریر ہر جملے سے محبت کرنے والی۔ مجھے آپ کے قریب رہنے کا موقع ملا ہے۔ میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

یہ بات حشمت زیدی جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے مصنف کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ ہر عمر کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے۔ ان کی تحریریں قارئین کے دلوں میں روشنی، امید اور محبت کا دیا بن کر جلتی تھیں۔ دھڑکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی جب اپنی بیماری کے باعث انہوں نے اخبار میں کیئر ٹیکر کی تلاش کا اشتہار دیا تو شہر بھر سے موصول ہونے والی کالز کی تعداد سینکڑوں میں تھی۔ ان کے یہ ہی چاہنے والے ان کی زندگی بھر کا حاصل تھے۔ ان کا غرور، ان کا فخر و انبساط...

"مگر یہ غرض تو نہیں ہے... تم میرا اتنا خیال رکھتی

ہو۔کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ تمہارا خیال نہ رکھوں۔" انہوں نے اسے عادت کے برخلاف وضاحت کی۔ کھلتی ہوئی کلی اور کھل گئی۔ مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر ستاروں جیسی جھلملاہٹ بکھیردی تھی۔

"مجھے اس کے عوض جو چاہیے' وہ میں آپ سے خود مانگ لوں گی۔"

"مگر میرے پاس ایسا کیا ہے پیسے کے علاوہ... میں تو خالی ہاتھ ہوں۔ میرے دامن میں سوائے پچھتاووں کے اور ہے ہی کیا... میں تو ایک ہارا ہوا شخص ہوں۔"

"جو آپ مجھے دے سکتے ہیں۔ وہ مجھے اس دنیا میں اور کوئی نہیں دے سکتا سر... کسی کے پاس ہے بھی نہیں۔" اس نے مسکرا کر کہا۔

"مثلاً "کیا؟" انہیں اس پہیلی پر تجسس ہوا۔

"بتادوں گی... ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ پُراسرار مسکراہٹ سجائے ان کے تجسس کو ہوا دے رہی تھی۔

"ابھی کیوں نہیں؟" ان کے لہجے میں بے چینی در آئی۔ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں رہے تھے کہ انتظار کی گھڑیاں گن سکتے۔

"اس لیے کہ فی الحال آپ کے پاس وقت نہیں ہے... میں نے فزیو تھراپسٹ کو فون کردیا ہے' وہ بس آتا ہی ہوگا۔ آپ جلدی سے ناشتا کرلیں۔"

وہ حسب عادت ہدایات دیتی جھپاک سے نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں سر...؟" پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھتے اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔" یک لفظی جواب میں انہوں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔ کلی کا منہ حیرت سے کھل گیا' وہ وہیل چیئر کو روک کر گھوم کے ان کے سامنے آگئی۔ زیدی صاحب جھنجلا گئے۔ انہیں اس کی اسی عدالت سے ڈر لگتا تھا' جو وہ وقت بے وقت جگہ بے جگہ لگا کے کھڑی ہوجاتی تھی۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے سر... آپ کی کہانیوں میں تو ہر مرد کو بچوں سے عشق ہوتا ہے۔"

"مجھے میرے تخلیق کردہ کرداروں کے حوالے سے نہ دیکھو۔ میں اپنی تخلیق کردہ کہانیوں میں کہیں نظر نہیں آتا۔" انہوں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"نہیں سر... ایک تخلیق کار اپنی ہر تخلیق میں سانس لیتا نظر آتا ہے۔"

اس نے بڑی روانی اور جوش سے ان کی تردید کی۔ زیدی صاحب چڑ گئے۔

پتا نہیں یہ لڑکی کیوں اتنا جتاتی ہے کہ وہ انہیں ان سے زیادہ جانتی ہے۔

"تم کتنا جانتی ہو میرے بارے میں؟" وہ ایک دم غصے میں آگئے تھے۔ کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا پھر مضبوط لہجے میں بولی۔

"آپ بچوں کو فرشتوں سے منسوب کرتے ہیں۔ انہیں پھول کہتے ہیں۔ ان کے منہ بسورنے پر آپ دکھی ہوتے ہیں' ان کی شرارتوں پر آپ محظوظ ہوتے ہیں... تو مطلب آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں۔"

مضبوط لہجے میں سمجھاتے گویا وہ انہیں اس حقیقت کو مان لینے پر آمادہ کررہی تھی۔ کیسی پاگل لڑکی تھی جو انہیں ان ہی کی رائے اپنے بارے میں بدلنے کی بات کرتی تھی وہ غلط نہیں تھی۔

"تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی لڑکی... کتابوں کی دنیا سے نکل آؤ۔ حقیقت کچھ اور ہے... ایک تخلیق کار کی تخلیق کردہ دنیا چاہے جتنی بھی حسین و مکمل سہی، مگر ضروری نہیں کہ اس کی اپنی زندگی بھی اسی قدر حسین و مکمل ہو۔ اتنی ہی آسودہ اور خوش حال اور اس کی شخصیت اگر کامل دیکتا محسوس ہو تو یہ بھی ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی وہ تخلیق کار ایسا ہی ہو۔ سوچیں خوب صورت اور مکمل ہوسکتی ہیں مگر انسان نہیں۔"

انہوں نے دور آسمان پر اُڑتے پرندوں کو دیکھتے کسی

غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائی۔ کلی ان کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی۔ ان کے چہرے کے تاثرات میں واضح دکھتے درد نے کلی کی نگاہوں کو جیسے باندھ سا دیا تھا۔ ماضی کا خوف ناک عفریت پھر انہیں ڈس رہا تھا۔ وہ بہت تکلیف میں تھے۔

"تو پھر لکھاری ایسی دنیا تخلیق ہی کیوں کرتے ہیں سر۔۔۔ کہ بندہ ایسی دنیا میں رہنے کے خواب دیکھنے لگے، یہ تو دھوکا دینے والی بات ہوئی نا' راہ سے بھٹکانے والی۔"

اس کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرائے تھے۔ انہیں کسی کی یاد آئی۔

"تخلیق کار اس معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے لڑکی۔۔۔! وہ اپنے تخیل میں ایسی دنیا نہ بسائے تو زمانے کی سختی ایک دن بھی نہ سہ سکے۔ وہ ایسی دنیا کے خواب دیکھتا ہے جہاں زندگی اس کے تابع ہوتی ہے۔"

"تو پھر میرے لیے بھی ایک ایسی دنیا تخلیق کیجیے نا سر۔۔۔ جہاں سب کچھ میری ہی مرضی سے ہو۔۔۔ جہاں میرے ہونٹوں سے ہنسی جدا نہ ہو۔ جہاں کبھی میری آنکھ میں آنسو نہ آئے۔ جہاں میرے درد بانٹنے والے ہوں۔" کلی کی نیلی آنکھوں میں نمی چمکی اور لہجہ بھرا گیا۔ زیدی صاحب چونک گئے۔ وہ ان دو ماہ میں پہلی بار کھلی تھی۔

"بتائیں نا سر۔۔۔ بنائیں گے میرے اردگرد بھی ایسی دنیا۔۔۔ جہاں میرے پاس صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں۔" اس لمحے اس کی چہرے پر اتنا کرب تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکے۔ وہ جانتے تھے اس کی زندگی محرومیوں میں گزری ہے۔

"ہاں' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے ایسی دنیا بناؤں گا' مگر اس سے پہلے میں تمہیں ایک اور کہانی سناؤں گا جسے میں نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا مگر اس کی تلخی میری پوری زندگی پر محیط ہے۔"

"میں تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سناؤں گا۔۔۔" کلی نے ایک دم تحیر سے انہیں دیکھا جنہوں نے نجانے کیوں مگر ایک دم ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں تنہائی سے جنگ لڑتے لڑتے اب تھک گیا ہوں یار۔۔۔!"

کلی دروازے پر ہی ٹھٹک کے رک گئی۔ اندر سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

"مجھے بھیجنے والے بھی تو آپ ہی تھے چچا جان۔۔۔! اب میرے لیے کانٹریکٹ ختم کر کے آنا ممکن نہیں ہے۔ میں خود آپ کے لیے بہت اداس ہوں مگر بہت مجبور بھی۔ پانچ سال مکمل کیے بغیر نہیں آسکتا۔"

دوسری جانب آفاق بہت تڑپ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ حشمت زیدی کے نڈھال دل کو اس کا جواب سن کے ڈھارس ملی کہ وہ بھی ان کے لیے اداس تھا' دنیا میں کوئی تو ان کا اپنا تھا نا۔

"تم اپنا کام تسلی سے کرو۔ میں تو بس ویسے ہی تنہائی سے گھبراتا ہوں تو شکوہ کر بیٹھتا ہوں تم سے۔۔۔ میرے لیے تمہاری ترقی و کامیابی اہم ہے۔ تمہارے لیے بھی یہی ہونی چاہیے۔"

"پھر بھی چچا جان۔۔۔! مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے۔ جانے وہ لڑکی آپ کا صحیح طرح سے دھیان رکھ بھی رہی ہے یا نہیں۔" وہ ان کے لیے پریشان تھا۔

"ارے اس کی تم فکر مت کرو۔۔۔ وہ تو پوری تھانے دارنی ہے۔ بہت ڈانٹتی ہے مجھے۔" کلی کے ذکر نے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکا دی تھی۔ آفاق انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر پر سکون ہو گیا۔

"بہت سختی کرتی ہے وہ مجھ پر اور ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی معصوم بچہ ہوں اس کے سامنے' مگر اپنوں کی کمی وہ بچی پوری نہیں کر سکتی' نہ ہی میں وہ رشتے اس کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"یہ تنہائی آپ نے اپنے لیے خود منتخب کی ہے چچا جان۔۔۔ اگر اس وقت یہ فیصلہ نہ کرتے تو آج کس قدر آسودہ حال ہوتے۔" آفاق نے یہ سب سوچا ضرور' مگر اپنے بیمار چچا سے کہا نہیں۔ ان کا ناتواں دل اب اس کڑوی حقیقت کا سامنا کرنے کا اہل نہیں رہا تھا۔

"پھر تو اس بچی کو شاباشی دینا پڑے گی چچا جان۔۔۔ جو آپ کا اتنا خیال رکھتی ہے اور بدلے میں کچھ لیتی بھی نہیں ہے۔"

"ہاں' بہت بے غرض اور مخلص لڑکی ہے۔ سارا دن میرے ناولز کی ہیروئنز کے ڈائیلاگز بولتی رہتی ہے۔"

"یعنی وہ لڑکی آپ کی فین ہے۔" آفاق ہنستے ہوئے جیسے نتیجے پر پہنچا تھا۔

"ہاں۔۔۔ وہ اس دنیا میں میری سب سے بڑی فین ہونے کا دعوا کرتی ہے۔" وہ کلی کی کہی گئی اس بات سے دوبارہ محظوظ ہوتے مسکرائے۔

"کیا یہ بھی آپ کو اپنے خون سے خط لکھتی رہی ہے۔" آفاق نے انہیں ماضی کی خوش گوار یادوں کا حوالہ دیتے چھیڑا۔

"نہیں۔۔۔ مگر یہ ان سب سے زیادہ میری قدر کرتی ہے۔"

حشمت زیدی کے لہجے میں یقین تھا۔ باہر کھڑی کلی نے بے ساختہ اطمینان محسوس کیا تھا۔ گویا وہ ان کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو چکی تھی اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی اس کے لیے۔

☼ ☼ ☼

وہ دور نہ کمپیوٹر کا تھا نہ ہی انٹرنیٹ کا۔۔۔ لوگوں میں کتب بینی کا ذوق بام عروج تک پہنچا ہوا تھا۔ ہر خاص و عام مطالعے کی اہمیت سے واقف اور اس کا قدردان تھا۔ وہ ایک مقبول ترین ماہنامے میں ناول لکھا کرتے تھے۔ ان کے رومان پرور سنسنی خیز ناول قارئین کے دلوں میں جذبات کا الاؤ دہکا دیا کرتے تھے۔ دنوں میں وہ ایسے مشہور ہوئے جتنی شہرت کسی کو سالوں کی ریاضت سے ملا کرتی ہے۔ محبت' پیار اور وفا کی جو دنیا انہوں نے قارئین کے ذہنوں میں بنائی تھی اس کا تاثر بہت گہرا اور دیرپا ثابت ہوا تھا۔ ہر ماہ انہیں اپنے چاہنے والوں کے سینکڑوں خطوط ملتے جن میں مردوں سے زیادہ خواتین کی تعداد شامل ہوتی تھی۔ فخر و انبساط سے ان کا سر بلند ہو جاتا۔

لڑکیاں انہیں بغیر دیکھے ہی ان کے الفاظ کے سحر میں گرفتار ہو کر ان کی پرستار بن گئی تھیں اور وہ ایک دم سے محبت کے معاملے میں امیر ترین انسان بن گئے تھے۔ مگر محبتیں پانے والا انسان اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا جتنا' محبتوں کو سنبھال کر رکھنے والا انسان خوش نصیب ہوتا ہے۔۔۔ وہ ہر خط کا جواب' بہت محبت و توجہ سے دیتے۔۔۔ ایک اخبار میں ان کا ہفت روزہ کالم لگتا تھا۔ اخبار والوں کی ڈیمانڈ تھی کہ ساتھ وہ اپنی فوٹو بھی دیں۔ یہ پہلی بار تھا جب ان کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ وہ بلاشبہ بلند قد و قامت کے ایک پرکشش انسان تھے۔ ان کی ذہانت سے بھرپور چمکتی ہوئی آنکھیں' تیکھی اور سیدھی ناک' وہ اپنے ارادوں میں کس قدر اٹل ہیں اس بات کو واضح کرتی ہوئی۔۔۔ پتلے ہونٹ' گھنی مونچھیں' کندن کی مانند چمکتی ہوئی گندمی رنگت۔۔۔ گویا ان کے تخلیق کردہ مرکزی کردار ہی خوب صورت نہیں ہوا کرتے تھے' وہ خود بھی دیومالائی حسن رکھنے والے تھے۔

ان کی تصویر شائع ہونے کے بعد ان کی پرستاروں کے خطوط میں شادی کے پیغامات آنے لگے تھے۔ یہ ایک دلچسپ صورت حال تھی ان کے لیے۔۔۔ ایک بار تو دو لڑکیاں ان کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ کئی ایک کی سفارش تو اخبار کے ایڈیٹر کو بھی کرنی پڑی تھی مگر وہ ان کے کیریر بنانے کا وقت تھا۔ بحیثیت تخلیق کار وہ اپنا آپ منوا چکے تھے مگر ابھی ان کا فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا' پھر انہیں شادی اس سے کرنی تھی جس کو وہ پہلی نظر میں پسند کرتے۔۔۔ وہ محبت کی دنیا کے باسی تھے۔ پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے تھے' سو ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شادی جیسا اہم فیصلہ کسی کے کہنے پر کر لیتے۔۔۔ انہیں شادی اس سے کرنی تھی جسے وہ پسند کرتے' لیکن انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا تھا۔۔۔

مال روڈ پر کیتھولک چرچ کے سامنے ایک اچھا بڑا

ریسٹورنٹ بنا ہوا تھا۔ تخلیق کار اور شاعر حضرات یہاں بیٹھا کرتے تھے۔ سگریٹ کے گہرے لمبے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ادب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے لمبی لمبی محفلیں جما کر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ اس کے سامنے تھوڑی دور پاک ٹی ہاؤس تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف غریب طبقے کے مصنف اور شاعر حضرات کے لیے مخصوص تھا۔ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر لی سی تھا۔ یہاں پر امیر طبقے کے شاعروں اور ادیبوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ یہ تینوں عمارتیں طبقاتی فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کچھ فاصلے پر ایستادہ تھیں۔ ادب کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اکثر ہی انہیں پاک ٹی ہاؤس کی طرف رخ کرنے پر مجبور کرتا تھا۔

الحمرا آرٹ کونسل میں ہونے والے مشاعروں میں وہ دل کھول کر داد دیا کرتے۔ انہیں مشاعرے میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھ کے سنانے کو کہا جاتا... کبھی وہ اپنا کالم پڑھ کے سناتے، کبھی کوئی افسانہ یا کبھی کسی مشہور ناول کا فرمائشی اقتباس...

پاک ٹی ہاؤس مال روڈ پر واقع تھا جو کہ انار کلی بازار اور نیلا گنبد کے قریب ہے۔ لاہور کے گم گشتہ چائے خانوں میں سب سے مشہور چائے خانہ پاک ٹی ہاؤس تھا، جو ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا۔ پاک ٹی ہاؤس ادیبوں اور شاعروں کا دوسرا گھر تھا۔ ان دنوں لاہور میں دو بڑی ادبی تنظیمیں حلقہ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین ہوتی تھیں۔ حشمت زیدی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرکردہ افراد میں شمار ہوتے تھے۔ پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں سے سوائے چند ایک کے، باقی کسی کا بھی کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا۔ کسی ادبی پرچے میں کوئی غزل، نظم یا کوئی افسانہ لکھ دیا تو پندرہ بیس روپے مل جاتے تھے، لیکن کبھی بھی کسی کے لب پر تنگی معاش کا شکوہ نہیں آیا۔

اعزازیے کی رقم وہ پاک ٹی ہاؤس میں اپنے دوستوں کو بوتل، چائے اور کیک، سگریٹ پلانے میں صرف کر دیا کرتے... جس روز ان کے ہاتھ میں اعزازیے کی رقم آتی، اس دن ان کے احباب کے فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتے۔ کسی کو قہوہ پینا ہوتا، کسی کو چائے کے ساتھ فروٹ کیک کی طلب ہوتی اور سگریٹ تو پھر سب ہی کو مرغوب تھی۔ وہ دل اور ہاتھ کے بے حد کھلے انسان تھے، تب ہی تو ان کے ہاتھ میں پیسہ ٹک نہیں پاتا تھا۔ احباب میں واہ واہ ہو جایا کرتی، اور ان کی گردن تن جاتی۔ ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا کہ کسی دوست کی جیب خالی ہے تو وہ ٹی ہاؤس کی چائے اور سگریٹوں سے محروم رہے۔ جن کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ نکال کر میز پر رکھ دیتے تھے، جس کی جیب خالی ہوتی، علیم الدین (مالک) صاحب اس کے ساتھ بڑی فراخ دلی سے پیش آتے تھے اور یاروں کے یار حشمت زیدی صاحب تو پھر تھے ہی...!

قیام پاکستان کے بعد حافظ رحیم بخش جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہیں پاک ٹی ہاؤس میں قیام کا موقع ملا۔ حافظ رحیم بخش کے دونوں بیٹوں علیم الدین اور سراج الدین نے بعد میں پاک ٹی ہاؤس کی گدی سنبھالی تھی۔

پاک ٹی ہاؤس کا ماحول بہت دلکش تھا۔ ٹائلوں والا چمک دار فرش جو کہ کڑی محنت و نگرانی کے باعث ہمہ وقت چمکتا دمکتا رہتا تھا۔ وسیع و عریض ہال میں پتھر کی چوکور سفید میزیں بنی تھیں۔ دیواروں پر لگی قائداعظم کی تصاویر... ایک طرف گیلری کو سیڑھیاں جاتی تھیں۔ بازار کے رخ پر شیشے دار لمبی کھڑکیاں نصب تھیں۔ پاک ٹی ہاؤس کی فضا میں سگریٹ اور سگار کا دھواں چکراتا پھرتا... سنہری چائے، قہوہ اور فروٹ کیک کی خوشبو اندر داخل ہونے والوں کو لبھانے لگتی۔

حشمت زیدی سگریٹ کو انگلیوں میں دبائے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے ذرا قریب رکھے ٹی ہاؤس میں

داخل ہوتے تھے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ کیوں کہ صبح کے وقت ہجوم ذرا کم ہوتا تھا، اسی لیے کم دودھ والی تیز پتی کی چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر وہ اپنا تخلیقی کام کرنے میں مگن ہو جایا کرتے۔ وقفے وقفے سے انہیں چائے کی طلب ہوا کرتی۔ وہ کاغذوں کے پلندے سے سر اٹھاتے اور ذرا کی ذرا علیم الدین کی جانب نگاہ بلند کرتے۔ وہ تو جیسے ان کی نگاہ کے منتظر ہوا کرتے "فوراً" سے پیشتر ان کے لیے تیز قہوے والا مگ تیار کر کے لے آتے.... جب سے ان کی تصویر شائع ہوئی تھی۔ اتوار کے روز ناول نگاری کے حوالے سے جو محفل وہ سجایا کرتے، اس میں اضافہ ہو گیا۔ آٹو گراف لینے والی لڑکیوں کا جمگھٹا انہیں اس روز گھیرے رکھتا۔ پاک ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھا ایس ٹی ڈی فون جو کبھی کبھار بجتا تھا، اب کثرت سے بجتا، مگر زیدی صاحب اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے۔ یہاں تک کہ علیم الدین کو گلا کھنکھار کے کہنا پڑتا۔

"حضور.... آپ کے لیے فون ہے انبالے سے؟"

"کہہ دو کہ میں نہیں ہوں۔" وہ مسودے سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر کہہ دیتے۔ علیم الدین کا چہرہ شرارت کی سرخی سے دہکنے لگتا۔

"کہہ چکے ہیں حضور.... مگر جو محترمہ بضد ہیں کہ آپ ادھر ہی تشریف فرما ہیں۔" وہ ریسور پر ہاتھ رکھے سرگوشیانہ انداز میں بے چارگی سے جواب دیا کرتے تو انہیں اٹھ کے ٹیلی فون سیٹ کے قریب آنا ہی پڑتا۔ دوسری جانب منتظر محترمہ کی بے ربط پرجوش آواز و انداز میں کی جانے والی مدح سرائی سننے کے بعد وہ اکثر علیم الدین کو تنبیہہ کرنا نہ بھولتے۔

"حرکتوں سے باز آجائیے محترم....!" وہ شگفتہ سے انداز میں کہتے انہیں جیسے متنبہ کرنے کی کوشش کرتے۔ جواباً" وہ کان پکڑ لیتے۔

"ہماری ایسی کیا مجال حضور.... آپ کے چاہنے والے ہمیں جواباً" ڈانٹ ہی ایسی پلاتے ہیں کہ آپ کو بلانا ہی پڑتا ہے۔"

زیدی صاحب خاموش ہو جایا کرتے۔ کبھی کبھی مسکرا بھی دیا کرتے۔

☼ ☼ ☼

وائلن پر انگریزی گیت کی پرسوز دھن پر اس نے اپنے قدموں کو ہمیشہ کی طرح منجمد ہوتا محسوس کیا۔ وہ اکثر و بیشتر اس جگہ آکر ٹھہر جایا کرتی تھی۔ وائلن کی پرسوز دھن اور پھر ایسی باکمال شاعری... وہ کبھی نہیں فیصلہ کر پائی کہ اسے روکنے اور ٹھہرنے پر کیا چیز مجبور کرتی ہے۔

وہ چند قدموں کا درمیانی فاصلہ عبور کرتے اس تک پہنچ آئی جو ہجوم میں گھرا ہوا تھا مگر آنکھیں موندے سب کی موجودگی سے بے نیاز وہ وائلن کے بکھرتے سروں میں اپنی دنیا میں گم تھا۔ وہ ان کے کالج کا سب سے حسین اور ہونہار اسٹوڈنٹ نہیں تھا۔ وہ کسی برگر فیملی کا بچہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا نہ ہی اس کی سوچ اور افعال اسے انقلابی ذہنیت رکھنے والا جوشیلا نوجوان ظاہر کرتے تھے، مگر اس کے وائلن کے بکھرتے سر اس کے اندر کے اضطراب کو عیاں کر دیا کرتے تھے۔

وہ کیمپس میں نیا آیا تھا مگر اس سے سینئر تھا... وہ سفید یونیفارم میں کاندھے پر بیگ ڈالے بالوں کی اونچی پونی بنائے اس کے سامنے ساکت کھڑی تھی۔ روز ہی کھڑی ہوتی تھی۔ اس کا دل چاہتا وہ یونہی ساری زندگی وائلن بجاتا رہے اور وہ سنتی رہے۔

جس دن اس نے پہلی بار اس نظم کو سنا تھا اسی دن سے وہ اس نظم میں قید ہو کے رہ گئی تھی۔ اس نے گھر آکے ابا میاں کی اسٹڈی سے تمام مغربی شاعروں کے شاعری کے مجموعے کھنگال ڈالے تھے۔

اس نے اس نظم کو جو گانے کی صورت گائی گئی تھی، اس روز ڈھونڈ کے کوئی سو مرتبہ پڑھا تھا۔

اور اب وہ ردھم اور ساز سے پہچان جایا کرتی کہ آج وہ گانے کا کون سا اور کتنا حصہ بجا رہا ہے۔ بلاشبہ وہ اس کے ان چاہنے والوں میں سے تھی، جو روزانہ صرف

اس کا وائلن سننے کے لیے اپنا پوائنٹ مس کر دیا کرتے تھے۔ ہر گزرتا دن اس کے ارد گرد گھیرا کیے ہجوم میں اضافہ کرتا گیا مگر وہ شاید اس سب سے بے نیاز تھا تب ہی تو دھن مکمل ہوتے ہی اپنا بیگ کاندھے پر ڈالتا وائلن کو ایک بیگ میں بند کرتا اور بغیر کسی کا نوٹس لیے آگے بڑھ جاتا۔ اس کے ارد گرد خاموشی اور ویرانی ڈیرہ ڈال لیتی۔ وہ واپس پلٹ جاتی۔

☼ ☼ ☼

بازار کے رخ پر لگی شیشے کی لمبی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ گرمیوں کی ایک سرمئی شام تھی۔ وہ اپنا کاغذ قلم تھامے کھڑکی کے قریب رکھے صوفے پر آکے بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے ململ کا سفید رنگ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا۔ گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف کرکے بنانے سے کشادہ پیشانی واضح ہو رہی تھی۔ سرخی مائل گندمی رنگت پہ پسینہ ہیرے کی کنیوں کی مانند چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک وجیہہ شخصیت کے حامل تھے۔

"چائے نہیں پئیں گے حضور......!" علیم الدین پوچھے بنا نہ رہ سکے۔ وہ کافی دیر سے لکھنا چھوڑے بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کی طرف متوجہ تھے۔

"نہیں محترم......! پہلے ہی اندر الاؤ دہک رہا ہے، مزید تباہی کا سامان کیوں کر کیا جائے۔" علیم الدین نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں لال ڈوروں سے دہک رہی تھیں۔ وہ ان کی کیفیت پر لمحہ بھر کو چپ رہ گئے۔ ہمیشہ کی طرح پوچھ پائے نہ ہی وہ خود بتا پائے۔ ابھی ابھی انہوں نے بازار میں ایک عورت اور اس کے بچے کو دیکھا تھا۔ وہ بچہ چلتے چلتے گر گیا تھا۔ اس کی ماں نے اسے لپک کر اٹھایا تھا۔ وہ روتے ہوئے بچے کو بے تابی سے چوم رہی تھی۔ اگر بھیڑ میں اس بچے کا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور وہ اس سے بچھڑ جاتا تو......؟ اس "تو اور اگر" کا خوف ماں کی ممتا کے چہرے سے ہویدا تھا۔ بچہ ماں کی آغوش میں سہم کر دبکا ہوا تھا۔

انہیں اس ماں کی آغوش میں دبکے ہوئے بچے میں اپنا آپ نظر آیا۔ کالی سیاہ گھنگھور راتیں ان کے ذہن کے پردے پر روشن ہو گئیں، جو وہ برسات کے موسم میں اکیلے ڈرے سہمے گزارا کرتے تھے اور اس وقت تک ان کی والدہ کام سے واپس نہیں لوٹا کرتی تھیں۔

وہ جب دو ماہ کے تھے، ان کے والد کی حادثاتی موت ہو گئی تھی وہ مزدور تھے۔ بلڈنگز میں ساتھی راج کیر کے طور پر کام کیا کرتے تھے۔ ایک روز تیسری منزل تک گارے اور اینٹیں پہنچاتے وقت سیڑھیوں سے ان کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ تیسری منزل سے گرے تھے۔ بے تحاشا خون بہنے اور بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی فوری موت واقع ہو گئی تھی۔ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے ان کی والدہ کو گھر سے باہر نکلنا پڑا تھا۔

ایک بھائی تھا جو ان سے چار سال بڑا تھا۔ انہیں بچپن میں وہ توجہ و محبت نہیں مل سکی، جو ایک بچے کو ماں سے چاہیے ہوتی ہے۔ باپ تقدیر نے چھین لیا اور ماں کو ظالم دنیا کی سفاکی نے...... وہ سارا دن اپنے بڑے بھائی خالق کے پاس رہا کرتے۔ ان حالات نے ان کے مزاج میں عجیب سی تلخی بھر دی تھی۔ وہ بہت جلدی برہم ہو جاتے۔ ضرورت سے زیادہ حساس تھے۔ ایک اور چیز بھی ان کے اندر پیدا ہو گئی تھی، جو دیکھنے والوں کو محسوس نہیں ہوتی تھی مگر اسی چیز نے انہیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

خالق زیدی نے اس مرتبہ رمضان کے سارے روزے رکھے تھے۔ وہ فطرتاً "بہت نیک اور صابر بچہ تھا۔ بہت چھوٹی سی عمر میں اس نے ماں کی مجبوریاں سمجھتے ہوئے ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ اسی لیے ماں کو بھی اس کا بہت خیال رہتا تھا اور پھر اس قدر گرمی اور تنگ دستی میں اس نے اکثر ہی خالی پیٹ روزے کی نیت باندھ کے بھی سارا دن روزہ نبھایا تھا۔ خالدہ بیگم کو اپنے بیٹے پر بہت فخر ہوتا۔ بجلی ابھی ان کے علاقے میں نہیں آئی تھی اور گرمی کے روزے نہایت صبر آزما تھے۔

وہ اکثر ہی شام کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ ٹھنڈا لے آیا کرتی تھیں۔ وہ سیلز گرل کے طور پر کام کرتی تھیں۔ روزانہ پیدل ـــــــــــ گھر گھر جا کے سرف اور دوسری گھریلو اشیا بیچنے کے بعد وہ بس اتنا ہی کر سکتیں کہ مغرب سے پہلے گھر لوٹتے وقت پاؤ دودھ یا کوئی سستا سا پھل خرید لاتیں۔ اس دن جب انہوں نے خالق کو دودھ کا گلاس تھمایا تو پہلے ہی دن ان کے چھوٹے بیٹے نے سوال کر دیا تھا۔

"مجھے دودھ کیوں نہیں دیا۔ کیا میں تمہاری اولاد نہیں ہوں؟" کرخت و غصیلے لہجے میں چیختا وہ اپنے اس سوال سے ماں کو ساکت کر گیا تھا۔ وہ ان سے کس انداز میں بات کر رہا تھا۔

"کیا صرف خالق تمہارا سگا بیٹا ہے؟" وہ چھوٹی سی عمر میں بہت بڑے سوال پوچھ رہا تھا اور وہ خود بہت سادہ لوح خاتون تھیں انہیں اندازہ نہیں تھا۔ ان کا بیٹا کس قدر حساس اور ذہین ہے۔

"تم مجھ سے زیادہ خالق سے پیار کرتی ہو۔ میں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔" اتنا کہہ کے وہ زور زور سے رونے لگا تھا۔ سادہ لوح ماں حیرت میں گھری رہیں، جواب نہیں دے پائیں۔ ان کو تو فکر غم معاش نے اتنا چین لینے ہی نہ دیا تھا کہ وہ جان پاتیں کہ ان کا بیٹا ان سے کس قدر متنفر ہو چکا ہے۔

"حاشو...... مت رو حاشو......" خالق فوراً "اٹھ کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"تم یہ دودھ پی لو حاشو...... میں نہیں پی رہا۔" اس نے پیتل کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا مگر اس نے دودھ کے گلاس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

"میں تمہارا حصہ نہیں لوں گا بھیا...... اگر اماں کو مجھ سے پیار ہوتا تو وہ میرے لیے الگ لے کر آتی۔" اسی اثنا میں مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ خالق نے بسم اللہ پڑھ کے نمک کی چٹکی اور پانی کے ساتھ روزہ افطار کر لیا۔ اس نے دودھ اپنے بھائی کے لیے رکھ دیا تھا مگر اس نے بھی دودھ نہیں پیا۔

"حاشو...... میری جان!" خالدہ بیگم بہت دیر ساکت رہنے کے بعد اس کے پاس آئی تھیں۔ انہوں نے محبت سے اس کے بال سہلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے۔ یہ اس کی ناراضی کا اظہار تھا اور خالدہ بیگم جانتی تھیں۔ وہ اگر ایک بار ناراض ہو جاتا تو بڑی مشکل سے مانتا تھا۔ وہ بہت ضدی تھا۔

"حاشو بیٹا۔" انہوں نے پھر پکارا تھا۔ اس نے دوبارہ ماں کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"میں تمہارا بیٹا نہیں ہوں...... خالق تمہارا بیٹا ہے۔" وہ اس بھائی سے تقابل کر رہا تھا جس نے اسے ہمیشہ اپنے حصے کی چیز کھانے کو دی تھی اور آج ماں اس کے لیے الگ سے افطاری لائی تو اس سے برداشت نہیں ہو پایا۔

اس ساری رات وہ جاگتا رہا۔ ماں کافی دیر اسے چمکارتی رہی، مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ماں کے سامنے آنکھیں موند کے سوتا بن گیا مگر ساری رات جاگتا اور کڑھتا رہا۔ احساس کمتری اسے کوڑے مارتی رہی۔ اس کی ماں اس سے نہیں اس کے بھائی سے پیار کرتی ہے۔ وہ اس کے لیے نہیں اس کے بڑے بھائی کے لیے چیزیں لاتی ہے اور بڑا بھائی محبت سے نہیں، ترحم سے اپنے حصے کی چیز اسے دیتا ہے۔

وہ کل سے ان سے ناراض تھا۔ بات چیت مکمل طور پر بند کر رکھی تھی۔ خالق سے وہ پھر بھی بات کر لیتا تھا کیوں کہ ماں کے بجائے وہ اس سے ہی زیادہ ہلا ہوا تھا۔ بلکہ باپ کی وفات کے بعد اسے ماں کی آغوش تو نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ خالق ہی تھا جس نے اسے ماں اور باپ بن کے پالا تھا۔ وہ اس کی بات مان جایا کرتا تھا، مگر اب کی بار اس نے خالق کی بات بھی نہیں مانی تھی۔

"حاشو...... کیا ابھی تک ناراض ہے یار!" بارہ سالہ خالق ہاتھ میں پلاسٹک کی چنگیر جس میں گھی لگی چپاتی اور دال کی کٹوری رکھی تھی، پاس آکر محبت سے بولا تھا۔ وہ جو آنکھیں موندے بازو آنکھوں پر رکھے بظاہر سو رہا تھا، خالق کے استفسار پر بس لمحہ بھر کے لیے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔
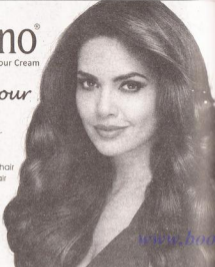
"بھائی... مجھے کھانا نہیں کھانا۔" وہ بازو پھر سے آنکھوں پر رکھ کر اجنبی بن گیا تھا۔

"کھانے سے کیسی ناراضی حاشو...! رزق کی ناقدری نہیں کرتے۔ اللہ گناہ دیتا ہے۔" وہ عمر رسیدہ بان والی جھلنگا چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بازو کو آنکھوں سے ہٹاتے اسے سمجھا رہا تھا۔

"مجھے اس وقت کچھ نہیں سننا... مجھے نیند آ رہی ہے مجھے سونا ہے۔" وہ کروٹ کے بل لیٹ گیا تھا۔

"حاشو... میری جان میری طرف دیکھو بیٹا!" خالق نے اسے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا تھا۔ وہ عمر میں اس سے چار برس بڑا تھا، لیکن اسے اکثر بیٹا کہا کرتا۔ وہ خود بچپن سے ہی بہت سمجھ دار بچہ تھا بن کہے اس نے اپنی ماں کے دکھ اور کام بانٹ لیے تھے۔ اس نے گھر کے ساتھ بھائی کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لی تھی۔ اس نے اپنی خواہشات کو اپنے دل کے قبرستان میں دفن کر لیا تھا۔ کیوں کہ اس کا بھائی بہت چھوٹا تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ وہ اسکول نہیں جاتا تھا، گھر پر ہی تھوڑا بہت یا مدرسے کے مولوی صاحب سے پڑھنا لکھنا سیکھ رہا تھا۔ اس نے ماں سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی، مگر ماں تو ماں تھی اسے خبر ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی کبھار عید وغیرہ پر بونس ملنے یا کبھی زیادہ چیزیں بیچنے پر اسے اضافی رقم ملتی تو وہ اکثر ہی اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز یا کھانے پینے کی اشیا لے آیا کرتی تھی۔

وہ اپنے حصے کی چیزیں بھی حاشو کو دے دیتا۔

"حاشو... دیکھ اگر تو کھانا نہیں کھائے گا تو میں بھی نہیں کھاؤں گا۔" اب کی بار اس نے دھمکی دی تھی اور وہ کارگر بھی ثابت ہوئی تھی۔ حاشو نے کروٹ بدل کر اس کی طرف رخ کر لیا تھا۔

"تو کھانا نہیں کھائے گا تو اماں بھی نہیں کھائیں گی اور وہ صبح کی بھوکی ہیں۔" خالق نے اس کے کروٹ بدلنے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ماں کی طرف سے آیا دل میں میل بھی صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

"تم کھانا کھا لو بھائی... کیوں کہ اگر تم بھوکے سوئے تو ماں کھانا نہیں کھائے گی، ماں مجھ سے پیار نہیں کرتی..." اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ یہی سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو عزیز نہیں، مگر وہ یہ نہیں سوچ پایا کہ ماں مجبور ہے اور غریب بھی... اس نے ہمیشہ یہی غلطی کی، اس نے اپنوں کی محبت کو نہ سمجھا نہ جانچا۔

"ایسا کیوں سوچتا ہے دیکھ... اماں کتنی پریشان ہیں۔ وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہیں تو بہت دل لگا کے پڑھتا ہے نا، کلاس میں اول آتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتی ہیں۔ انہیں یقین ہے تو ایک دن بڑا آدمی بنے گا۔ اب چل اٹھ کھانا کھا لے... ٹھنڈا ہو گیا تو مزا نہیں آئے گا۔"

حاشو خاموش ہی رہا۔ خالق نے پہلا نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالا۔ اس نے خاموشی سے کھا لیا۔ یہ اس کی ناراضی ختم ہونے کا اشارہ تھا، مگر ماں سے وہ ابھی بھی بات نہیں کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جلدی جلدی کرنے کے باوجود اسے اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی، کیمسٹری کے پروفیسر نے ان کو ایک اہم اسائنمنٹ دی تھی جو انہیں جلد مکمل کر کے دینی تھی۔ اسی لیے وہ چھٹی ہو جانے کے بعد بھی کلاس میں تھی۔ اس نے ٹائم دیکھا تو تین بج رہے تھے۔ اس نے لنچ بھی نہیں کیا تھا۔ پیٹ میں چوہے اودھم مچا رہے تھے، مگر اسے پروا نہیں تھی اسے کالج کینٹین کے اس شیڈ تک پہنچنے کی جلدی تھی، جہاں وہ پندرہ دن سے روزانہ چھٹی کے بعد وائلن بجایا کرتا تھا۔ ایک ہی گانے کی دھن تھی جو وہ ہر روز نئے طریقے سے بجایا کرتا تھا۔ وہ پھولی سانسوں کو ہموار کرتی شیڈ کے قریب پہنچی۔ سارے کیمپس کی لڑکیاں اور لڑکے اس کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ وہ آنکھیں بند کیے وائلن کے سر بکھیر رہا تھا۔

زندگی اس قدر حسین اور مکمل بھی لگ سکتی ہے کیا۔ وہ اس کی بند آنکھوں پر نگاہ جمائے لاشعوری طور پر

سوچ رہی تھی۔ وہ اس دنیا کا باسی نہیں لگتا تھا۔ وہ کسی اور راہ کا مسافر تھا محبت جس کا پیرہن تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔ کچھ اس طرح کہ ارد گرد سے بے نیاز اس نے ہجوم کو چیر دیا تھا۔

وہ یک ٹک بغیر جنبش کیے سانس روکے وائلن کے دھیمے سروں میں کھوئی اس کی بند پلکوں پہ نگاہ جمائے کھڑی تھی۔ کالج کے اسٹوڈنٹس نے اس کی اس اضطراری اور بے گانہ کیفیت کو ٹھٹک کے دیکھا تھا۔ چند ایک نے آپس میں سرگوشیاں بھی کیں — مگر وہ بے نیاز اس کے اونچے لمبے وجیہہ سراپے پر نگاہ جمائے کھڑی رہی وہ شان بے نیازی سے وائلن بیگ میں رکھ کر ادھر ادھر دیکھے بنا آگے بڑھ گیا۔ ہجوم تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کر رہا تھا مگر واحد وہ تھی جو تالیاں نہیں بجا رہی تھی۔ وہ اسے نگاہوں سے داد و تحسین پیش کیا کرتی تھی۔

چند دن گزرے۔ وہ کالج میں ایک ہاٹ ایشو بن گئی۔ اڑتی پھرتی کافی باتیں ان دونوں کے کانوں میں بھی پڑیں، مگر دونوں ہی انجان رہے۔ یوں جیسے ان دونوں کو ہی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کر رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

حاشو نے سالن کی کٹوری اٹھا کر پھینکی تھی۔ اس میں موجود واحد بوٹی اور پتلا سا شوربا زمین پر گرتے ہی مٹی میں مل گئے تھے۔ خالق نے حیرت سے حاشو کی اس حرکت کو دیکھ کر روٹی کا لقمہ چنگیر میں رکھ دیا۔ اماں نے بھی تاسف و دکھ سے گہری سانس بھری۔ نہ جانے اب ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا ان سے۔ جو حاشو کا پارہ پھر چڑھ گیا تھا۔ روز بروز اس کی بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے حاشو....." ماں کا راکھ ہوتا چہرہ دیکھ کر خالق نے کچھ ڈپٹ کر پوچھا۔

"مجھے نہیں کھانا یہ پتلا شوربا..... مہینوں بعد گوشت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے اور وہ بھی اماں خراب کر دیتی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں نہ کھایا کروں یہاں کھانا....." وہ بچپن سے ہی ایسا تھا اور اب تو جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا تھا۔ گورنمنٹ سے باقاعدہ وظیفہ ملا اور اچھے اور بہترین کالج میں داخلہ بھی..... مگر بچپن کی خود ساختہ محرومیوں کے دکھ ذہن کے پردے پر بہت واضح اور روشن تھے۔ وہ جب سے مہنگے اور مشہور کالج میں گیا تھا، وہاں کے لڑکوں کے ٹھاٹ اور عیاشیاں اس کا مزید دماغ خراب کر گئی تھیں۔

"تو کہاں سے لاؤں میں تیرے لیے مرغن کھانے؟"

اماں کو یک دم ہی غصہ آیا تھا۔ ورنہ شاید خالق بات۔ سنبھال ہی لیتا۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف آئیں اور زور سے تھپڑ مارا۔ حاشو تو حاشو خالق بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ اماں نے آج تک ان دونوں بھائیوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ پھر مارنے کے بعد کچی زمین پر گری روٹی اور الٹی پڑی کٹوری کے پاس بیٹھ کر زور زور سے رونے لگ گئیں۔ خالق بے ساختہ ماں کی طرف بڑھا۔ اسے ماں کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے کبھی ماں کو یوں بے اختیار روتے اور بلکتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک خاتون تھیں۔ اپنے غم اپنے دکھ اور ان دکھوں کی تھکن چھپائے وہ دن بھر مردوں کی طرح کمایا کرتی تھیں، پاؤں میں پلاسٹک کی جوتی گھس کر ایڑیاں پھاڑنے لگتی، مگر وہ اپنے لیے جوتا نہ خریدتیں۔ سردی، گرمی وہ ایک کالی چادر میں گزار دیتیں۔

"بتا اے خالق..... اس کا باپ مرنے سے پہلے کوئی خزانے نہیں چھوڑ کے گیا تھا ہمارے لیے..... نہ ہی میں کسی رئیس کی بیٹی تھی، جو اس کے ناز نخرے اٹھاؤں۔ دن رات گدھوں کی طرح بار ڈھو ڈھو کے یہ کما پاتی ہوں، تم دونوں کے لیے۔ اس سے زیادہ نہیں کر سکتی..... کہاں سے لاؤں میں اس کے لیے وہ چیزیں جن کی یہ توقع کرتا ہے مجھ سے....."

وہ کٹوری پکڑے بری طرح رو رہی تھیں، سالوں کا غبار تھا جو اس دن نکلا تھا، حاشو نے آگے بڑھ کر ماں

سے معافی مانگی نہ ہی اسے چپ کروایا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے ہی نکل گیا..... خالق نے ٹھنڈی سانس بھر کے ماں کو تسلی دی، جو اس کے اس طرح چلے جانے پر اور بھی شدت سے رونے لگی تھیں۔

"آپ روئیں مت اماں..... میں اسے سمجھا دوں گا۔ بچہ ہے ابھی۔"

"جس رزق کے لیے میں سارا دن دھکے کھاتی ہوں، اس کی یہ ایسے بے حرمتی کرتا ہے۔ مجھے اس کی عادتوں سے ڈر لگتا ہے خالق! یہ کس ڈگر پر چل نکلا ہے۔" وہ پھپھک پھپھک کے خالق کے سینے میں منہ چھپا کے رو دیں۔

"ٹھیک ہو جائے گا اماں..... لاڈ میں ایسی غلطیاں کر جاتا ہے۔ قابل ہے۔ ایسا چھوٹا موٹا نخرہ تو اس کا حق بنتا ہے نا اماں۔"

سادہ لوح ماں ممتا کے جذبے سے مجبور سر کو اثبات میں جنبش دینے پر مجبور ہو گئی.....

گھر سے وہ بہت دکھی ہو کے نکلا تھا اسے دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اس نے ماں کا دل دکھایا ہے بلکہ دکھ اس تھپڑ کا تھا جو ماں نے اسے مارا تھا۔ یعنی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اپنی غلطی کا ادراک اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دوسروں کی زیادتی کا احساس اسے بہت جلدی ہو جایا کرتا تھا۔ اسے غصہ آتا تھا تو وہ کچی بستی سے دور گندے نالے کے پاس..... بیٹھ جایا کرتا تھا۔

روتے کڑھتے اس نے وہیں پر اپنے لیے ایک خیالی دنیا بسائی تھی۔ وہ دنیا جو مکمل اور حسین تھی پرسکون اور پر آسائش تھی..... جہاں وہ اپنے ماں، باپ اور بھائی کے ساتھ ایک بہترین خوش گوار زندگی گزارتا تھا۔ جہاں نوکروں کی فوج ہمہ وقت تیار مودب انداز میں کھڑی رہتی تھی اور ماں نک سک سے تیار اس کے ناز اور لاڈ اٹھانے میں مصروف رہتی تھی۔ اس نے اپنے اسکول و کالج میں کبھی نہیں بتایا کہ وہ مزدور کا بیٹا ہے۔ چھین کر لڑ جھگڑ کر ہی سہی مگر اس نے ہمیشہ اچھا اور بہترین لباس پہنا تھا۔ دوستوں پر پیسہ ویسے ہی لٹایا تھا، جیسے موٹر گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے لڑکے لٹایا کرتے تھے۔ وہ ماں اور بھائی سے لڑ کر اپنا حق وصول کرتا مگر ایک بات کبھی نہیں سمجھ پاتا کہ ماں اور بھائی اس کی محبت میں اس کی کڑوی کسیلی سہ جاتے ہیں۔ وہ اس سے ڈرتے نہیں پیار کرتے ہیں وہ ان کی محبت کو کبھی سمجھ نہیں پایا۔ وہ سارا دن خالق کے پاس رہتا تھا۔ شام کو جب ماں گھر واپس آتی تو اس کا دل چاہتا ماں اس کے لاڈ اٹھائے، مگر وہ گھر آتے ہی اسے کھانے کی کوئی چیز دے کے خود گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑوں وغیرہ کی دھلائی میں مصروف ہو جایا کرتیں۔ اسے کبھی ماں کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوا۔ اسے ہمیشہ یہی لگا کہ ماں اس کے ساتھ زیادتی کرتی ہے..... اگر وہ خالق کو لاشعوری طور پر ہی سہی زیادہ اہمیت دیتیں بھی تو خالق نے بھی تو ان کا ساتھ ویسے ہی دیا تھا جیسا کوئی بھی اچھا بیٹا اپنی ماں کا دیتا ہے..... وہ کبھی اسکول نہیں گیا کہ ماں کما نہیں پائے گی چھوٹا بھائی رل جائے گا گھر میں فاقوں کی نوبت آ جائے گی۔ جبکہ اس کی سوچ ہمیشہ اپنی ذات کے گرد ہی محو سفر رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ میں سے میں تک کا سفر ہی کیا تھا۔

اس روز گندے نالے کے پاس بیٹھ کر پہلی مرتبہ اس نے اپنی تخلیق کردہ دنیا کو صفحہ قرطاس پر موتیوں کی مانند اتارا تھا..... کمال حیرت کی بات اس کہ اندر سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے۔ اس نے ایک ہی نشست میں ساری کہانی لکھ ڈالی تھی۔ یہ وہ کردار تھے جن کے درمیان، وہ رہتا تھا۔ یہ وہ دنیا تھی جس کا وہ باسی تھا۔ یہ اس کے وہ خواب تھے جن کو شرمندہ تعبیر کرنے کی اس کی خواہش تھی۔

اس کی پہلی ہی کہانی نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ وہ ہٹ کر لکھتا تھا۔ چونکا دینے والی بات کہتا تھا وہ کہانی نہیں لکھتا تھا وہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں خواب بنتا تھا۔

☼ ☼ ☼

پاک ٹی ہاؤس ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا۔ شاعروں، ادیبوں اور نقاد کا مسکن..... جسے ادیبوں و

شاعروں کا دوسرا گھر بھی کہا جاتا تھا۔ حشمت زیدی نے بہت جلد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی تھی۔ وہ اپنی تحریر میں پور پور ڈوبے نظر آتے تھے۔ بہت محبت کرنے والے 'باوقار' باکردار' ایثار پسند' فراخ دل' کشادہ ذہن..... جو بھی ایک بار ملتا گرویدہ ہو جاتا۔ انہیں بے پناہ ایسے خطوط بھی ملے جن میں ان کے کسی افسانے کسی ناول کی وجہ سے حاصل ہونے والے سبق سے کسی کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی۔ کئی ایک نے یہ بھی لکھا کہ ان کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ جو کہ غلط ہونے جا رہا تھا صرف ان کی تحریر میں چھپے پیغام اور مشورے کی وجہ سے درست ہو گیا۔ اپنی شخصی خامیوں کو انہوں نے ہمیشہ اپنی خوبیوں کی عظمت اور بڑائی کے پردے میں چھپایا تھا اور بہت زیادہ کامیاب رہے تھے۔ اب وہ بہت مشہور ہو چکے تھے' سو انہوں نے کچی بستی کے ساٹھ ستر گز کے مکان کو خیر آباد کہہ کے نیلے گنبد کے پاس ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ ویسے بھی اپنے تخلیقی کام کے لیے انہیں یکسوئی کی ضرورت تھی۔ اتوار یا جمعے کے دن وہ کھڑے کھڑے بھائی اور ماں سے مل آتے..... ماں زیادہ تر بیمار رہنے لگی تھی۔ خالق کی محلے کی ہی لڑکی سے شادی ہو گئی تھی۔ اماں کی ساری زندگی کی محنت کا جمع جتھا ان دو دکانوں کا حاصل تھا جنہیں خالق بھائی بیک وقت احسن طریقے سے چلا رہے تھے۔ ایک دکان کی آمدنی خود رکھ لیتے اور دوسری کی "امانتا" لا کر حاشو کی ہتھیلی پر دھر دیتے' جس نے کبھی جھوٹے منہ بھی ماں کو پچاس یا سو روپے نہیں پکڑائے تھے۔ خالق نے کبھی مانگے بھی نہیں۔

☼ ☼ ☼

اس روز وہ بہت جلدی میں تھے۔ انہیں الحمرا آرٹ کونسل میں منعقد ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ چائے کی طلب انہیں پاک ٹی ہاوس کھینچ لائی' مگر علیم الدین صاحب وہاں موجود نہیں تھے' انہیں وہاں جلدی پہنچنا تھا اسی اثنا میں کاؤنٹر پر رکھے فون کی مخصوص چنگھاڑتی بیل بجی تھی۔ انہوں نے کوفت و بے زاری سے فون کی جانب دیکھا علیم الدین کی واپسی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے بے دلی سے فون اٹھایا تھا اور بڑے ہی بے زار سے انداز میں ہیلو کہا۔

"السلام علیکم..... کیا میں حشمت زیدی صاحب سے بات کر سکتی ہوں؟" بے حد نرم لہجہ ان کے سماعتوں میں پھول بکھیر گیا تھا۔ اس قدر خوب صورت دلکش و دل آویز آواز انہوں نے آج تک نہیں سنی تھی۔ انہیں اعتراف کرنا پڑا تھا۔

"آپ کو کیا بات کرنی ہے ان سے..... کوئی پیغام ہو تو بتا دیجیے' ان تک پہنچ جائے گا۔" کچھ دیر پہلے والی بے زاری بھاپ بن کے اڑ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے شائستہ انداز میں اس خوب صورت آواز والی لڑکی کو جواب دیا تھا۔

"پیغام نہیں..... مجھے ان سے خود بات کرنی ہے اور بہت اہم بات کرنی ہے..... میں ان کا شکریہ خود ادا کرنا چاہتی ہوں' انجانے میں جو احسان انہوں نے میری ناتواں ذات پر کیا ہے۔ اس کے لیے میں چاہ کر بھی ان کا شکریہ صحیح معنوں میں ادا نہیں کر سکتی۔"

دوسری جانب وہ لڑکی بہت دھیمے نرم لہجے میں ہلکے ہلکے جوش سے کہہ رہی تھی۔ ایسی تعریف و توصیف کے تو وہ عادی تھے' مگر پھر بھی انہیں اس لڑکی کی تفصیل سننے کو دل چاہا تھا' مگر وہ اس لڑکی کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ حشمت زیدی ہی ہیں کیوں کہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے وہ اپنی نفی کر چکے تھے۔ یکایک انہوں نے ایک فیصلے پر پہنچ کر مقابل لڑکی کو آگاہ کیا تھا۔

"آپ کل دوپہر ایک بجے کے بعد فون کر لیجیے گا۔ میں کوشش کروں گا آپ کی ان سے بات کروانے کی' ٹھیک ہے....." انہوں نے نہایت عمدگی سے جواب دے کر اسے خوش کر دیا۔

"مہربانی ہو گی اگر آپ ایک مرتبہ میری ان سے بات کروا دیں گے تو..... میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے' میں کل دوپہر ایک بجے فون کروں گی۔ وہ موجود ہوں گے نا۔" بے ساختہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ اُمڈ آئی تھی۔

"جی محترمہ..... تسلی کے لیے خود بھی تشریف لا سکتی ہیں آپ....." انہوں نے ہنستے ہوئے بس یوں ہی کہہ دیا تھا مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ دوسرے روز سچ مچ ان کے سامنے آ کھڑی ہو گی۔

☼ ☼ ☼

انہوں نے آنے والی دوشیزہ کو ایک نظر دیکھا۔ سفید کلیوں والے کرتے کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجامہ پہنے ہوئے تین گز کا آتشی رنگ کا لمبا دوپٹہ سلیقے اور نفاست سے اوڑھے وہ ایک دیدہ زیب لڑکی تھی۔ نزاکت' حسن اور معصومیت کا حسین امتزاج ہے۔ پیچھے کہیں دھیمے سروں میں ریڈیو بج رہا تھا۔ دائیں جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر وہ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے قریب رکھے گہری سوچ میں تھے۔ شیشے کی کھڑکیوں سے گلابی دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔

انہوں بے مسودے سے نظر ہٹا کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔ ان کی نظر پلٹنے سے انکاری ہو گئی تھی۔ تلے والے کھسے میں مقید نرم گلابی پاؤں پر ان کی نظر پڑی اور وہیں جم گئی۔ کیا کسی کے پاؤں اس قدر حسین اور خوب صورت بھی لگ سکتے ہیں..... انہوں نے لحظہ بھر کے لیے سوچا تھا۔

"آداب!" مترنم آواز میں کہا گیا تو وہ چونکے۔ اس قدر حسین مورت انہوں نے اپنے ناولز میں بھی نہیں لکھی تھی نہ ہی کبھی کسی کتاب میں پڑھی تھی۔ وہ ایک ماورائی داستان کا کوئی سانس لیتا چلتا پھرتا مدہوش کرتا کردار تھی۔

"آداب..... تشریف رکھیے۔" سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر اس کے بیٹھنے کے انداز کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کے ہاتھ اپنی گود میں دھرے تھے۔ لمبی لمبی بے حد سفید انگلیاں۔ جلد کی اوپری تہہ اس قدر باریک اور شفاف کہ ہری رگیں واضح ہو کر اپنا مادہ دکھا رہی تھیں۔ دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں عقیق یمنی نازک سی انگوٹھی میں قید تھا۔

"شکریہ....." وہ انہیں دیکھ کے ہلکے سے مسکرائی تو عنابی ہونٹوں میں سفید موتیوں جیسے دانت سارے پاک ٹی ہاوس کو اپنی جگمگاہٹ سے روشن کر گئے تھے۔

"میرا نام ام کلثوم ہے..... حال ہی میں بی اے کیا ہے لاہور کالج سے..... کل میں نے ہی فون کیا تھا آپ سے بات کرنے کے لیے..... پھر سوچا خود ہی جا کے مل آؤں شاید آپ کو صحیح سے بتا سکوں کہ آپ کی تحریر کی وجہ سے کس طرح میری زندگی بچ گئی۔" توقف کے بعد وہ پھر ہولے سے مسکائی۔ حشمت زیدی کی نگاہیں خیرہ ہوتی گئیں اور من سیراب..... وہ پہلی خوب صورت لڑکی نہیں تھی' جو ان سے ملنے آئی تھی بلکہ یہ وہ پہلی خوب صورت لڑکی تھی جو ان کے دل کو اچھی لگی تھی۔

"بہت نوازش..... مگر پہلے بتا دیجیے کہ کیا لیں گی شربت یا چائے؟"

"چائے پلوا دیجیے..... اور میری یہ خوش نصیبی ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ چائے پینے کا موقع آج مل رہا ہے۔ مجھے آپ سے مل کر جس قدر خوشی ہو رہی ہے۔ میرے پاس بیان کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ لفظوں کے بے تاج بادشاہ ہیں۔"

بات کے اختتام پر وہ پھر مسکرائی تھی۔ اس کا انداز بیاں بہت شائستہ اور دلکش تھا۔ حشمت زیدی بے ساختہ مسکرائے تھے۔

"بہت نوازش محترمہ.....! یہ آپ سب کی محبت اور اوپر والے کا کرم ہے۔ آپ بتائیے کس سلسلے میں ملنا چاہ رہی تھیں؟" انہوں نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد گفتگو کو بڑھانے کی غرض سے پوچھا تھا۔

"میرے ابا ایڈیشنل جج ہیں ہائی کورٹ کے..... ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے۔ بھائی لندن میں کیمبرج یونیورسٹی میں وکالت پڑھ رہا ہے' جبکہ میں نے ابھی ابھی بی اے کیا ہے۔ ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا ہے میرے لیے..... ابا کا اصرار ہے کہ رشتہ وہاں طے کیا جائے اور والدہ میری شادی اپنے بھائی کے بیٹے سے کرنا چاہتی ہیں۔ میں ان دونوں کے

درمیان پنڈولیم بنی تنگ آگئی تھی۔ ابا کے دوست کا بیٹا کسی بھی لحاظ سے قابل اعتبار شخص نہیں۔ میں نے اس کے بارے میں بہت سی کہانیاں سن رکھی ہیں۔"

اس دوران چائے اور کیک کی پلیٹ ان دونوں کے درمیان رکھی میز پر سج گئی۔ ابھی تک وہ اس کی آمد کا مطلب و مقصد نہیں سمجھ پائے تھے۔

"چند روز پہلے اماں اور ابا کے درمیان زوردار معرکہ ہوا میری وجہ سے... ابا بہت جذباتی اور فطرتاً" جھگڑالو ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اماں کا مزاج بھی کسی طور ان سے کم نہیں ہے اور میں ان دونوں جیسی تو نہیں البتہ ان دونوں سے زیادہ جذباتی ضرور ہوں۔ ان دونوں کے کشیدہ تعلقات کا باعث میں ہوں۔ میرے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث تھی۔ میرا دل چاہا میں اپنے آپ کو ختم کرلوں۔ نہ میں ہوں گی نہ میرے والدین کے درمیان اس طرح جھگڑا ہوگا۔ میں سخت اذیت میں تھی اور شاید ایسا کر بھی لیتی اگر میں خودکشی کرنے والی لڑکی کی وہ کہانی نہ پڑھ لیتی، جو پچھلے ماہ چھپی تھی۔ مجھے ایسا لگا انجانے میں آپ نے میرے ہی حالات و جذبات کی عکاسی کردی ہے۔ میں نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا بلکہ میں نے یہ کیا کہ وہ شمارہ جاکر ابا کی اسٹڈی میں رکھ دیا۔"

اس بار وہ پھر ہولے سے مسکرائی تھی۔ وہ جتنے دھیمے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولتی تھی مسکراتی بھی اسی طرح تھی۔ وہ جو "صم بکم" اس کی بات سن رہے تھے یکایک چونکے۔

"اچھا... پھر کیا ہوا؟" کہانی یکایک دلچسپ ہوگئی تھی۔

"پھر... ابا نے وہ کہانی پڑھی اور اس رشتے سے خود ہی انکار کردیا۔ وہ جان گئے تھے کہ زور زبردستی سے کیے جانے والے رشتے پائیدار اور دیرپا ثابت نہیں ہوتے اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میرے دل کی خوشی کیا ہے... حشمت صاحب! آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ میں دن رات کس قدر ٹینشن اور ذہنی اذیت میں تھی۔ میرے پاس تیسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ آگے کا کنواں میرے آگے اور پیچھے کھائی تھی، نہ تو میں اپنے ماموں زاد سے شادی کرنا چاہتی ہوں نہ ہی ابا کے دوست کے اوباش بیٹے سے... اور جس وقت میں ناامید ہوچکی تھی اس وقت انجانے میں آپ میرے مسیحا بنے۔ میں اکثر سوچتی ہوں اگر اس روز میں آپ کی کہانی نہ پڑھتی ٹینشن سے چھٹکارا پانے کے لیے تو آج گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوچکی تھی۔ آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ اپنے قلم سے معاشرے کی اصلاح کررہے ہیں۔ آپ واقعی قلم کا حق ادا کرنا جانتے ہیں... چلتی ہوں۔"

وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی چائے کی آدھی پیالی ویسے ہی رکھی تھی۔

"ارے آپ ایسے نہیں جاسکتیں ام کلثوم...! چائے تو پوری پی لیں اور کیک کو تو چکھا تک نہیں... اور مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا آپ نے..."

وہ اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے مسکرائے تھے۔

انہیں "حقیقتاً" خوشی ہوئی تھی کہ ام کلثوم جیسی خوب صورت سلجھی ہوئی لڑکی ان کی تحریروں کو سراہ رہی تھی۔

"ام کلثوم! میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے میرے لکھے ہوئے لفظوں کو عزت بخشی، ان پر عمل کرکے آپ نے مجھے معتبر کیا ہے۔ میں "یقیناً" بہت خوش نصیب ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لفظوں میں اتنا اثر رکھا ہے..."

انہوں نے نہایت انکساری سے کہتے ام کلثوم کو حیران کیا تھا۔ اتنا نامور لکھاری اور غرور نام کو بھی نہیں تھا۔ اس بات کا اظہار ام کلثوم نے "فوراً" کر بھی دیا تھا۔

"پہلے میں صرف آپ کی تحریروں سے متاثر تھی مگر آج آپ سے مل کر یہ احساس ہوا ہے کہ آپ اپنی تحریروں سے بھی زیادہ اچھے ہیں، بہت پیارے دل کے مالک ہیں۔"

وہ اٹھی تو حشمت زیدی بھی اس کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"مجھے بھی بہت اچھا لگا ام کلثوم! اور میں چاہوں گا کہ آپ سے دوبارہ ملاقات ہو..." انہوں نے دل کی بات کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ ام کلثوم نے یک لخت نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تھا، وہ ایک لمحہ تھا جس میں وہ قید ہوگئے تھے۔ محبت نے انہیں گھائل کردیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس نے اپنی نانی ماں کا چہرہ دیکھا تھا۔ اس نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا، مگر ماں کے پاس ہوتے ہوئے بھی ماں کی ممتا اور اس کی گرم آغوش کبھی نصیب نہیں ہوپائی۔ کس قدر دل خراش بات تھی کہ اسے باپ کا ذکر تک کرنے نہیں دیا گیا۔ کبھی اس کا نام پتا نہیں بتایا گیا۔ اس نے اپنی ماں کو اکثر اکیلے بیٹھے روتے اور چلاتے دیکھا تھا۔ وہ ہذیانی کیفیت میں چیخنے چلانے لگتی تھی۔ اس کی ماں ایک بے حد حسین عورت تھی، مگر اس نے کبھی بھی اپنی ماں کو سجا سنورا اچھے لباس میں نہیں دیکھا تھا جبکہ اس کی نانی ماں بہت باوقار تھیں اور انہیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ ان کی شخصیت بہت متوازن اور دل فریب سی تھی۔ نانی کی آغوش میں رہ کر اسے ہمیشہ ہی ایک سکون اور معطر سا احساس اپنے حصار میں گھیرے رکھتا تھا۔

اسے حسرت تھی کہ وہ ماں کو کبھی ہنستے بولتے یا زندگی کے جھمیلوں میں دلچسپی لیتا دیکھے۔ مگر اس کی یہ حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ اس کے نانا بھی، اس کی ماں کی طرح کم گو تھے۔ نانی کے برعکس نانا کا رویہ اس کے ساتھ قطعی مختلف تھا۔ وہ اس سے پیار نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر اسے جھڑک دیا کرتے تھے۔ اس کا معصوم ذہن اس بات کو سمجھ نہیں پاتا تھا۔

وہ چار برس کی تھی۔ ایک روز وہ آفس سے واپس آئے تھے۔ گرمی زوروں پر تھی اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ آتے ہی صوفے پر بے دم ہو کے لیٹ گئے اور آنکھوں کی بند پتلیوں کو شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے ہولے ہولے دبا کر سہلا رہے تھے۔ انہوں نے دو تین بار ملازم کو آوازیں دیں مگر وہ شاید اپنے کوارٹر میں تھا۔ نانی اماں گھر سے باہر تھیں اور اس کی ماں تو کمرے سے نکلا ہی نہیں کرتی۔ ابا میاں کو شدید پیاس لگی تھی اور وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ ان میں اٹھ کر کچن سے پانی پینے کی سکت تک نہیں تھی۔

"شرفو! پانی لاؤ۔ کہاں مرگئے ہو سارے؟" انہوں نے بمشکل آواز نکالی تھی۔ ان سے بولا نہیں جارہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے ان کا بی پی بہت گر گیا تھا۔ ان کی آنکھیں غنودگی سے بند ہورہی تھیں وہ بلڈ شوگر کے مریض تھے انہیں لگا وہ مر رہے ہیں۔ تب ہی ان کے گھٹنے کو کسی نے بہت آہستگی سے چھوا تھا۔

"نانا! پانی۔" چار سالہ وہ ننھی بچی فریج سے پانی کی بوتل نکال کر لائی تھی۔ اس کے قد سے کچن کاؤنٹر کہیں اونچا تھا اسی لیے وہ گلاس نہیں اٹھا پائی مگر وہ پانی لے آئی تھی۔ وہ بچی جس کی طرف وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بچی جو انہیں اپنی اور اپنی بیٹی کی دشمن محسوس ہوتی تھی۔ وہ بچی جس کا بے ضرر وجود وہ اپنے گھر میں بمشکل تمام برداشت کیے ہوئے تھے۔ وہ بچی انہیں پانی پلا رہی تھی۔

انہوں نے تین سانس میں بوتل خالی کرنے کے بعد باقی بچا پانی منہ اور گردن پر ڈال لیا تھا اور پھر بے دم ہو کے صوفے پر لیٹ گئے تھے۔ وہ ان کے پاس ہی کھڑی رہی تھی اور تفکر سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

"نانا! آپ کو کیا ہوا ہے؟" بہت دیر بعد اس نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے اس کے سوال پر نہیں اس کے انداز تخاطب پر آنکھیں کھولی تھیں۔ یہ لفظ اور یہ رشتہ ان کے لیے ابھی تک انجانا تھا۔

"نانا! آپ جوتے اتار دیں۔"

پھر اس نے از خود ہی ان کے بغیر تسموں والے بوٹ اتار دیے تھے اس کا معصوم بے ضرر لمس ان کے وجود میں سکون بھرتا جارہا تھا۔

بے زاری نفرت، بے اعتنائی، غصہ، کوئی جذبہ اس وقت ان پر حاوی نہیں ہوسکا تھا۔ بس ایک احساس غالب تھا کہ اگر آج یہ بچی انہیں پانی نہ پلاتی تو شاید وہ مرچکے ہوتے۔ وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے ان کے پاؤں

دبا رہی تھی۔

"بس کردو بیٹا! تھک جاؤ گی۔ وہ معصوم سی بچی انہیں اپنی ہمت و طاقت سے بڑھ کے دبا رہی تھی۔ ان کے دل میں پہلے اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا جو آنے والے دنوں میں محبت میں بدل گیا۔

"میں اچھی بچی ہوں۔ میں نہیں تھکتی۔" اس نے اپنے معصوم سے انداز میں شرما کر مسکرا کر کہا تھا۔ انہیں بے ساختہ اس پر پیار آیا۔

"کیا اچھے بچے تھکتے نہیں۔" انہوں نے بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا اس وقت انہیں اس بات کا احساس نہیں ہو سکا کہ انہیں اس کے جواب نے متاثر کیا تھا۔

"نہیں۔!" اس نے فوراً" تردید کی تھی۔ "نانی اماں کہتی ہیں جو بڑوں کا کام کرتے ہیں' وہ کبھی نہیں تھکتے۔"

ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی تھی۔

اس کے بعد اس گھر کی فضا میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی۔ اب نانی اماں کے ساتھ ساتھ نانا بھی اس کے لاڈ اٹھانے لگے تھے۔ وہ ان کی فرمائش پر انہیں ابا میاں کہنے لگی تھی۔ وہ ابا میاں کی چہیتی تھی' نانی کی لاڈلی تھی مگر ماں نے ساری زندگی اس کے وجود سے لاپروائی برتی تھی۔ اپنے غموں میں الجھ کر عمر رائیگاں کردی' پھر بچی کی کیا پروا کرتی۔

☼ ☼ ☼

اس کا پوائنٹ مس ہو گیا تھا۔ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس نے والٹ نکالا تو وہ خالی تھا۔ وہ کسی ٹیکسی یا رکشے کا انتظار کر رہا تھا۔ برگد کے درخت کے پاس کھڑے ہو کر ابھی وہ اپنے کسی دوست کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر اس لڑکی پر پڑی۔ وہ ایک سرو قد' نازک سراپے والی خوب صورت لڑکی تھی۔ اس کے بال بے حد چمک دار اور سیاہ تھے۔ جسے اس نے ہلکی ڈھیلی پونی میں باندھ رکھا تھا۔ یہ وہی لڑکی تھی جو بلاناغہ تواتر کے ساتھ اس کا وائلن سننے آتی تھی مگر وہ اسے آج غور سے دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

"کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں؟" چہرے پر مسکراہٹ سجائے بہت اپنائیت سے پوچھ رہی تھی۔

"آپ میری کیا مدد کر سکتی ہیں؟" وہ دونوں ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے' پھر بھی وہ اس کی مدد کر رہی تھی۔ وہ اس کے سوال پر متانت سے مسکرائی تھی۔

"آج شہر بھر میں ٹریفک کی ہڑتال ہے۔ کیمپس کے چند ایک پوائنٹس بھی کب کے نکل گئے۔ میں نے بھی گھر سے ڈرائیور بلوایا ہے۔ شاید آپ کا بھی پوائنٹ مس ہو گیا ہے اور کسی رکشہ' ٹیکسی کے منتظر ہیں۔ آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتی ہوں۔"

وہ کیش کے چکر میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ خالی سڑک کی طرف دھیان ہی نہ گیا تھا۔ اسے بے ساختہ اس لڑکی کی اچھائی دل کو بھائی۔

"تھینکس مس! مگر آپ کو زحمت ہو گی اگر آپ کا اور میرا روٹ علیحدہ ہوا تو؟" وہ نیم رضا مند سا تامل سے کہہ رہا تھا۔

"اس کی فکر آپ بالکل بھی مت کریں۔ مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔" اتنا کہہ کے وہ فٹ پاتھ کی سمت بڑھ گئی۔ سو اسے بھی اس کے پیچھے چلنا پڑا۔

"آپ وائلن بہت اچھا بجاتے ہیں۔ کہاں سے سیکھا آپ نے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"وائلن بجانا میرا شوق ہے اور میں نے کہیں سے نہیں سیکھا۔ ہاں ابتدائی ٹریننگ ایک بینڈ سے لی تھی' وہ بھی تھوڑی بہت۔ زیادہ نہیں۔" وہ بھی اس کے ملیح چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"مجھے وائلن سننا بہت پسند ہے ان فیکٹ آپ بہت اچھا بجاتے ہیں۔ میں ہر روز سنتی ہوں۔ جب آپ کینٹین کے پاس والے شیڈ کے نیچے بجاتے ہیں۔ کیا یہ سونگ آپ کا بہت پسندیدہ ہے۔ جسے آپ وائلن پر بجاتے ہیں۔"

"جی۔ مجھے یہ بہت زیادہ پسند ہے۔" وہ مسکرا دی۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ کوئی وائلن اس قدر خوب صورت بھی بجا سکتا ہے۔ پتا نہیں اب اس میں کمال کس کا ہے' وائلن کا یا اس گانے کی شاعری کا۔"

وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ وائلن بجانے والے کا کمال بھی ہو سکتا ہے۔

"کیا آپ وائلن سیکھیں گی؟" اچانک ہی اس نے کسی انجانے خیال کے تحت پوچھا۔ وہ خود بھی نہیں جان سکا کہ وہ ایسی آفر کیوں دے رہا ہے۔ ابھی چند منٹوں پہلے جس لڑکی سے اس کی شناسائی ہوئی ہے اور تاحال جس کا وہ نام بھی نہیں جان پایا' وہ اسے وائلن سکھانے کی پیشکش کیوں کر رہا ہے۔

"آپ سکھائیں گے؟" وہ بھی اتنا ہی حیران ہوئی تھی۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ اسے اس شخص کے قریب رہنے کا موقع ملے۔

وہ دم بخود ہو گئی جب اس نے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر نکل رہی تھی کہ اسے امی جان کی آواز نے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو ام کلثوم؟" کاندھے پر موجود بیگ پر اس کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ بے ساختہ اسے پلٹنا پڑا۔

"مائرہ کے گھر امی!" اس نے نگاہیں جھکالی تھیں۔ مبادا آنکھوں میں تحریر غلط بیانی ماں پڑھ لے۔

"مائرہ کے ہاں تمہارے چکر بہت بڑھ گئے ہیں۔ خیریت تو ہے ناں؟" وہ اسے کڑی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ ام کلثوم کی ہتھیلیاں نم ہو گئیں۔

"سب خیر ہے امی! بس آج کل امتحانات سے فارغ ہوں تو اس کی والدہ سلائی کڑھائی سکھا رہی ہیں۔ میں بھی جا کر وہاں تھوڑا بہت سیکھ لیتی ہوں۔" بروقت اسے بہانہ سوجھا تھا۔

"تمہیں کب سے شوق ہو گیا ان سب چیزوں کا۔ تمہیں تو یہ سب خرافات لگتی تھیں۔" وہ ہلکا سا مسکرائیں تو اس کی بھی جان میں جان آئی۔

"بس مائرہ کو دیکھ کر مجھے بھی شوق ہو گیا۔" وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول رہی تھی۔ اور کس قدر مہارت سے بول رہی تھی کہ بیٹی پر اندھا اعتماد رکھنے والی ماں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ بیٹی کسی اور راہ کی مسافر بن گئی ہے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ مائرہ کی امی کا میری طرف سے بھی شکریہ ادا کرنا۔" وہ بیٹی کو امور خانہ داری میں حصہ لیتا دیکھ کے آسودگی سے مسکرائی تھیں۔

"جی۔ جی ضرور امی!" ماں کو یقین دلاتی وہ تیزی سے باہر نکلی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس پہنچتے پہنچتے اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور حشمت زیدی اس کے انتظار میں جیسے تھکنے لگے تھے۔ اتنی دیر پہلے تو کبھی بھی ام کلثوم کو نہیں ہوئی تھی۔ اپنی بے چینی پر انہیں خود بھی حیرت ہوئی۔ انہیں لگتا تھا کہ کوئی لڑکی انہیں متاثر نہیں کر سکتی' مگر ان کی یہ بھول تھی' ام کلثوم نے سیدھا ان کے دل پر وار کرتے انہیں گھائل کر دیا تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں ام کلثوم؟" اسے پاک ٹی وی کے کشادہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے چینی سے اس کی جانب بڑھے تھے۔ ام کلثوم نے رک کر سانسوں کی ترتیب درست کی اور مسکرائی۔

"کچھ نہ پوچھیں۔ آج تو امی جان نے پوچھ لیا کہ کہاں جا رہی ہو۔ بمشکل انہیں مطمئن کر کے آئی ہوں۔" وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولی تو حشمت زیدی ٹھٹک کر رک گئے۔

"ایسا کب تک چلے گا؟" کچھ دیر بعد چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ کمال حیرت یہ سوال بہت جلدی ان دونوں کے درمیان آگیا تھا۔

"مطلب؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"ام کلثوم! کیا ہمارے درمیان ابھی بھی کچھ کہنے سننے کو رہ گیا ہے۔ مجھے تو یہ لگتا تھا کہ تم میرے جذبات

کو نہ صرف سمجھتی ہو بلکہ ان کی قدر بھی کرتی ہو۔"

"حشمت! کچھ باتیں کہنے کی نہیں سمجھنے کی ہوتی ہیں؟ کیا آپ میرے جذبات نہیں سمجھ سکتے۔" حشمت زیدی کے دل پر پھوار سی برسی۔

"میں جانتا ہوں ام کلثوم! لیکن مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔"

"آپ کو ابھی بھی شک ہے کہ ہم ایک نہیں ہوں گے۔" وہ محبت کے رنگوں میں بھیگنے کے بعد دلفریب انداز میں مسکرائی تھی۔

"مجھے اپنے نصیب سے ڈر لگتا ہے ثومی! میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے والدین مجھ جیسے کنگلے آدمی کا رشتہ قبول کریں گے۔"

وہ کسی بھی لحاظ سے ام کلثوم کے خاندانی معیار پر پورا نہیں اترتے تھے۔ وہ لوگ خاندانی رئیس تھے اور اس کے والد ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج تھے۔ روپے پیسے نوکر چاکر اور مراعات کی ریل پیل تھی۔ ام کلثوم بہت لاڈ اور ناز نخرے میں پلی بڑھی تھی انہیں ڈر تھا کہ کہیں ام کلثوم خود ہی انہیں چھوڑ نہ دے، کیونکہ سوائے محبت کے ان کے پاس اس کے لیے کچھ قابل ذکر تھا بھی نہیں۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ!" وہ تو جیسے ایک دم تڑپ اٹھی تھی۔ "مجھے یقین ہے ابا جان آپ کی قابلیت اور عزت شہرت دیکھتے ہماری شادی پر راضی ہو جائیں گے اور پھر ان کے لیے میری خوشی زیادہ مقدم ہوگی۔ میں انہیں منالوں گی۔" وہ اس کی سادگی پر مسکرائے۔

"ایک معمولی لکھاری ان کی بیٹی کے شایان شان نہیں ہوگا ثومی جان! وہ کسی طور بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں گڑی تمہاری محبت نہیں دیکھیں گے۔ ان کی نظر میں صرف دولت کا پیمانہ فٹ ہے۔ اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ پیسہ اس زندگی کی تلخ اور کڑوی سچائی ہے۔" وہ آزردگی سے کہتے بولے تھے۔

"ایسا کچھ نہیں ہوگا حشمت! وہ میرے باپ ہیں اور میری خوشی ان کے لیے اہم ہوگی۔ میں کسی بھی طرح انہیں منالوں گی۔" ام کلثوم خود بھی پریشان سی ہو گئی تھی۔ محبت کی جادو نگری میں قدم رکھتے اس نے ان تلخ حقیقتوں کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ انہیں یہ مسائل بھی درپیش آسکتے ہیں۔

"اللہ کرے کہ ایسا ہی ہو ثومی جان! اگر تم مجھے نہ ملیں تو مجھے نہیں لگتا کہ میں زندہ بھی رہ پاؤں گا یا نہیں تمہارے بغیر زندگی میرے لیے بے معنی ہو کے رہ جائے گی۔"

"اللہ نہ کرے حشمت! آپ ایسی باتیں کیوں کررہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا ساتھ کبھی کسی حال میں نہیں چھوڑوں گی۔ چاہے جتنے بھی طوفان آئیں آپ ہمیشہ مجھے اپنے ہم قدم پائیں گے۔ آزما کے دیکھ لیں۔"

وہ بہت جذباتی لڑکی تھی، ذرا سی محبت ملنے پر دل و جان قربان کردینے والی، پھر اب تو مقابل حشمت زیدی تھے جو اس کی زندگی بن چکے تھے۔ اسی لیے تو اتنا بڑا وعدہ کررہی تھی۔ پاک ٹی ہاؤس کی بلند اور روشن عمارت نے ام کلثوم کا دعوا سنا اور محفوظ کرلیا۔

☼ ☼ ☼

وقت آگے بڑھا تو ایک دوسرے کے ساتھ کا اصرار اور چاہت و خواہش بڑھتی گئی۔

ہر ملاقات ام کلثوم کی محبت میں اضافہ کرتی تو حشمت زیدی کے جنون میں بھی اضافہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ ایک ایسی ساحرہ تھی جس نے انہیں ہر طرح سے اپنے بس میں کرلیا تھا۔ اس کے ساتھ کی چاہ کے علاوہ انہیں اپنی زندگی کا جیسے کوئی اور مقصد ہی نظر نہیں آتا تھا۔

علیم الدین اکثر انہیں خیالوں میں گم بیٹھا دیکھ کر معنی خیز انداز میں کھنکھارتے۔ حشمت زیدی جھینپ جاتے۔ ان کی تحریروں میں پہلے سے زیادہ شدت، طوفانی جذبہ اور رومان پیدا ہو گیا تھا۔ محبت کی

بارش میں جب وہ پور پور بھیگے تو ان کے کردار زیادہ اثر انگیز ہو گئے۔ ان کی ہر تحریر کا انتساب ام کلثوم کے نام ہونے لگا اور ام کلثوم محبت کی فضا میں تتلی بن کر اڑنے لگی۔

"بتائیں ناں۔ آپ کب ملنے آئیں گے ابا جان سے؟" ام کلثوم کئی روز سے مسلسل اصرار کررہی تھی۔

"تھوڑا سا وقت اور دو مجھے۔ خود کو تمہارے ابا جان کے سامنے لانے کے لائق تو بنالوں۔"

"کیا کمی ہے آپ میں۔ جو آپ ایسی باتیں سوچتے ہیں، پھر حتمی فیصلہ تو میرا ہی ہوگا ناں۔"

"اچھا!" وہ دل کھول کے ہنسے۔ "اگر تمہارے ابا نہ مانے تو۔ تم مجھ سے پھر بھی شادی کرلوگی کیا؟" انہوں نے ویسے ہی اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ دیا تھا۔

"ہاں۔ کرلوں گی۔" ترنت جواب ملا تھا۔

"میرے حالات تمہارے ابا جیسے نہیں ہیں۔ ایک سفید پوش بندہ ہوں، جس کے پاس کوئی نوکری اور اپنا مکان تک نہیں۔ اعزازیے کی رقم پر گزارہ کرتا ہوں اور کرائے کے مکان میں رہتا ہوں۔" انہوں نے سچائی بتائی۔

"میں گزارہ کرلوں گی اور ایک کمرے کے مکان میں بھی رہ لوں گی۔ میرے لیے اہم صرف آپ کا ساتھ ہے۔" اس کا لہجہ مضبوط اور قطعی تھا۔ "بتائیں ناں۔ کب بھیج رہے ہیں اپنے گھر والوں کو۔" وہ بہت لاڈ سے ٹھنک کے پوچھ رہی تھی۔

"بہت جلد۔ لیکن اگر انہوں نے انکار کردیا یا میری ماں اور بھائی کو برا بھلا کہا تو۔" وہ جانتے تھے کہ معاملہ اتنا سیدھا بھی ہرگز نہیں جتنا ام کلثوم اسے سمجھے ہوئے ہے اور یہ کوئی کہانی بھی نہیں تھی، جہاں سب کچھ بہت جلد ٹھیک ہو جاتا ہے۔

"کیوں ڈرا رہے ہیں مجھے۔ ابا میرے ساتھ کبھی برا نہیں ہونے دیں گے۔" ام کلثوم کے لہجے میں باپ کے لیے مان اور پیار تھا۔ حشمت زیدی دل ہی دل میں ان کا مان سلامت رکھنے کی دعا کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"حاشو!" اماں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے حشمت زیدی کو خوشبوؤں میں مہکتا کھڑا دیکھا۔ وہ بہت عرصے بعد غالباً" آٹھ نو ماہ پہلے خالق کی شادی پر آیا تھا ماں اور بھائی نے ساری زندگی محنت کرکے تین دکانیں اور ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کرلیا تھا ان کے حالات پہلے سے اچھے ہو گئے تھے لیکن انہوں نے کچی بستی کو نہیں چھوڑا تھا حشمت زیدی کو جی بھر کر کوفت ہوا کرتی۔

"کیسی ہو ماں؟" خالدہ نے اس کا ماتھا چوما تو اس نے بھی نحیف و نزار ماں کا حال پوچھ لیا۔

"اب تجھے دیکھنے کے بعد بالکل بھلی چنگی ہو گئی ہوں۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ محبت سے چور لہجے میں بولیں۔

"بہت یاد کرتی ہوں۔ تیرا انتظار تو دن رات رہتا ہے مجھے۔ تو تو اب بہت بڑا آدمی بن گیا ہے حاشو! ہر روز تیرا اخبار میں فوٹو دیکھتی ہوں۔" حشمت زیدی کے لبوں پر مسکراہٹ دم توڑ گئی۔

"جب میں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چل کے رہو تو پھر آئیں کیوں نہیں میرے ساتھ؟" انہوں نے بہت پرانا شکوہ دہرایا۔ خالدہ بی بی نے سر جھکا، وہ ابھی تک ان سے ناراض تھا۔ خالق کی شادی کے بعد اس نے ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی بلکہ عادت کے برخلاف خاصا اصرار بھی کیا تھا مگر انہوں نے انکار کردیا تھا۔ ساری زندگی خالق نے ان کے ساتھ محنت کی تھی۔ حاشو... تو صرف اپنی تعلیم پوری کرنے میں جتا رہتا تھا اور اب اس وقت جب خالق نئی زندگی کا آغاز کررہا تھا تو وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کچھ لاڈ اٹھانا چاہتی تھیں، سو انہوں نے اسے منع کردیا تھا اور وہ ناراض ہو کے چلا گیا تھا اور اتنے عرصے کے بعد وہ آج آیا تھا۔ ناراض اور روٹھا روٹھا سا۔

انہیں اس وجیہہ نوجوان میں وہی بچپن کا معصوم غصہ ور ضدی حاشو نظر آیا جو چھوٹی چھوٹی بات پر کئی

کئی دن تک ان سے ناراض رہا کرتا تھا۔

"آؤں گی تیرے پاس رہنے کو۔ جب تو بھولے آئے گا۔" اماں کے کہنے پر حاشو بے ساختہ مسکرا دیا۔ ام کلثوم کا خیال موڈ خوش گوار کر گیا تھا۔

"تو پھر تیاری کرو اماں! تمہارا بیٹا بہت جلد بیاہ کر رہا ہے اور تمہاری بہو مکھن ملائی سے بنی ہوئی ہے۔ ام کلثوم اتنی خوب صورت ہے کہ چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے اسے چھپ چھپ کے دیکھتا ہے۔" خالدہ کو استعاروں کی زبان تو کیا سمجھ آنی تھی وہ تو بس اتنا ہی جان پائیں کہ لڑکی کا نام ام کلثوم ہے اور وہ بہت حسین ہے۔

"اچھا تو اس کا نام ام کلثوم ہے۔" بیٹے کے چہرے پر پھیلی مسرت دیکھ کر انہوں نے اسے چھیڑا۔

"کب جاؤں تمہارا رشتہ مانگنے پھر؟" وہ بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولیں، اسی اثنا میں خالق کی بیوی شربت کا جگ بنا لائی۔ سانولی سلونی چھوٹے قد کی قدرے فربہی مائل عام سے نقوش کی مالک لڑکی تھی۔

حشمت زیدی نے بے ساختہ ام کلثوم کے ساتھ اپنی بھابھی کا موازنہ کیا۔ ایک چودھویں کا چاند تھی جبکہ دوسری اماوس کی رات۔ انہیں بے ساختہ برتری کا احساس ہوا۔ جو کہ کہیں نہ کہیں ہمیشہ سے ہی ان کے وجود میں پلتا رہا تھا۔

"ابھی۔ کچھ دن ٹھہر جاؤ اماں! تمہاری بہو بہت اونچے گھر کی ہے۔ ایسے کیسے جا سکتے ہیں اس کے گھر رشتہ مانگنے۔" اماں نے بیٹے کی بات پر بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

"حاشو! بڑے گھر کی لڑکی ہماری بہو بننے پر راضی ہو جائے گی بھلا۔" انہیں حیرت سے زیادہ صدمہ ہوا تھا۔ اپنی مالی حیثیت سے خوب واقفیت رکھتی تھیں وہ۔

"وہ اگر بڑے گھر کی ہے تو تمہارا بیٹا کسی سے کم نہیں ہے اماں! مہینے کے ڈھائی تین سو کما لیتا ہوں ایک کہانی کے۔ زیادہ لکھوں تو پانچ سے سات سو آسانی سے مل جایا کرتے ہیں۔" انہیں ماں کی حیرت سے کہی گئی بات برہم کر گئی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! مگر بڑے لوگ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو خود سے اونچے گھرانوں میں بیاہنا پسند کرتے ہیں۔ ان کے خاندان میں تو تم سے زیادہ قابل لڑکے ہوں گے۔"

ماں نے دنیا دیکھی تھی۔ ان کا فہم ان کی سوچ بہرحال حشمت زیدی کے علم و مشاہدے سے زیادہ پختہ تھی۔ حشمت زیدی کو ان تلخ حقیقتوں کا ادراک تھا۔ مگر یہ بھی طے تھا کہ انہیں ہار نہیں ماننی تھی، نہ دنیا والوں سے نہ اپنے حالات سے۔ انہیں ام کلثوم کو حاصل کرنا تھا کسی بھی حال میں۔ اسی لیے تو انہوں نے وہ فول پروف پلان بنایا تھا تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

☼ ☼ ☼

دوسرے ہی دن وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ وہ کیمسٹری کی کلاس لے کر نکل رہی تھی۔ اسے سیڑھیوں کے قریب کھڑے دیکھ کر بے ساختہ ٹھٹک کے رکی۔

"السلام علیکم کیسے ہیں آپ؟" وہ خود ہی اس کی طرف بڑھی تھی۔

"وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک ہوں۔ کیا میں آپ کا تھوڑا سا وقت لے سکتا ہوں۔" اس نے نہایت ادب سے پوچھا تو وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گئی۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ کینٹین کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

"جی بتائیے۔ کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے۔" اس وقت کینٹین میں غیر معمولی خاموشی تھی۔

"میں اصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کل والی فیور کے لیے۔ کل اگر آپ مجھے ڈراپ نہ کرتیں تو نجانے کیا ہو جاتا۔ میرے انکل کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ کل جب میں گھر پہنچا تو وہ بے ہوش ہوئے تھے۔ مگر صد شکر کہ میں بروقت پہنچ گیا۔ میں کل ساری رات آپ کے بارے میں سوچتا رہا، اگر مجھے تھوڑی سی بھی دیر ہو جاتی تو خدانخواستہ میرے منہ میں خاک۔" گھبراہٹ کے مارے وہ بات مکمل نہیں کر پایا تھا۔

"اٹس او کے۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا جو آپ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ میں نے جو کچھ بھی کیا، انسانیت کے ناتے میرا فرض تھا۔" وہ مبہم سا مسکرائی تو اس نے اس کے گالوں میں پڑے گڑھے کو محبت سے دیکھا۔ پھر اس کی بے پناہ خوب صورت آنکھوں کو۔

"کیا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں؟" اچانک ہی اس نے پوچھا تھا۔ لڑکی مدھم سا مسکرائی۔

"میرے خیال میں تو ہم دوست بن چکے ہیں۔" مسکراہٹ نے ابھی بھی اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا۔

"میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔" وہ جھجک گیا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی تھی۔ سب سے پہلے پوچھا جانے والا سوال وہ اب پوچھ رہا تھا۔

"میرا نام ارسہ ہے۔" اس نے بتایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اب بھی وائلن بجاتا۔ ارسہ دم سادھے اب بھی سنتی مگر اب ایک فرق پیدا ہوا تھا۔ وہ اب وائلن صرف ارسہ کے لیے بجاتا تھا۔

یونیورسٹی میں ان دونوں کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں لیکن انہیں پروا نہیں تھی۔

ارسہ نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ سچ سچ بتا دیا تھا۔ پہلی بار وہ اپنے دکھ کسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ تمام محرومیاں وہ تمام تشنگیاں جو اس نے ابا میاں اور نانی اماں کی بے پناہ محبت کے باوجود بھی محسوس کی تھیں۔ ماں کی بے رخی اور باپ کی کمی کا دکھ۔

اپنے دکھ اسے سنا کر وہ روئی کے گالوں کی مانند ہلکی پھلکی ہو گئی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ مقابل اس کے دکھوں کا بار اٹھا پائے گا کہ نہیں۔ وہ ایسی لڑکی کو اپنا سکے گا یا نہیں جس کا باپ اس کی ماں کو اس کی پیدائش سے پہلے ہی چھوڑ گیا تھا اور جس کی ماں نے بعد کی ساری زندگی نیم دیوانگی کی کیفیت میں گزاری تھی اور اس کی پرورش اس کے نانا اور نانی نے کی تھی مگر اس کے باپ کے متعلق اسے کبھی کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اس نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا اور شاید یہ اس کی بہت بڑی غلطی تھی۔

☼ ☼ ☼

ام کلثوم یہ نہیں جانتی تھی کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوا کرتے۔ غلط بیانی کرتے وقت اسے بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا جھوٹ صرف ڈیڑھ ماہ بعد ہی پکڑا جائے گا۔ اس روز بہت دنوں بعد ان کی مائرہ کی امی سے "اتفاقاً" ملاقات ہوئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ام کلثوم کے بارے میں پوچھا کہ کافی دن ہو گئے وہ ان کے گھر مائرہ سے ملنے نہیں آئی تھی ام کلثوم کی والدہ نے بہت حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ وہ تو روز شام کو آپ سے سلائی کڑھائی سیکھنے جاتی ہے۔"

"میری طرف!" مائرہ کی والدہ کو از حد اچنبھا ہوا تھا۔

"نہیں۔ نہیں بہن! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ میری طرف آئے تو اسے بہت دن ہو گئے ہیں اور میری تو آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے۔ میں تو سلائی کڑھائی کر ہی نہیں سکتی پھر سکھاؤں گی کیسے۔"

انہوں نے تفصیل سے بتا کر امی جان کو شرمندہ کرنے کے ساتھ ساتھ از حد پریشان بھی کر دیا تھا۔ جوان اور خوب صورت بیٹی اگر جھوٹ بولنے لگے تو اس کا مطلب بہت واضح ہوتا ہے۔ ان کے اندر بھی خدشات کے کالے ناگ پھن پھیلانے لگے۔ جیسے تیسے اس وقت بات کو سنبھالا مگر رات کو وہ ام کلثوم کے کمرے میں بہت طیش کے عالم میں آئی تھیں۔ وہ رات کو چپکے سے فون سیٹ اپنے کمرے میں لے آئی تھی اور رات گئے تک حشمت زیدی سے باتوں میں محو رہا کرتی۔ ابھی بھی وہ ان سے بات کر رہی تھی، جب وہ غیظ و غضب کے عالم میں اس کے کمرے میں داخل

ہوئیں۔

"جی امی! آپ اس وقت خیریت؟" اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ آہستگی سے پوچھا تھا۔

"کس سے بات کر رہی ہو اس وقت؟" انہوں نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے اس سے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ ام کلثوم گڑبڑا گئی۔ فی الفور کوئی بہانہ نہیں سوجھا۔ اس لیے فوراً "مائرہ کا نام لے دیا۔

"مائرہ ہے امی جان! اس کی طبیعت خراب تھی تو اس نے مجھے فون کرلیا۔"

"اچھا!" امی جان کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔ "ابھی شام کو ان ہی کے گھر سے تو آئی ہو۔ پھر اتنی جلدی اس کی یاد کیوں آگئی۔" وہ جتاتی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ "خیر! مائرہ سے میری بھی بات کروادو۔ میں بھی اس کی طبیعت کا پوچھ لوں ذرا۔" وہ اس سے فون لینے کے لیے آگے بڑھیں تو مارے گھبراہٹ کے ام کلثوم نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔ سب کچھ واضح ہو تا گیا۔ امی جان نے بیٹی کو نظریں چراتے دیکھا تو کس کے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑا۔

"بے شرم! ماں سے جھوٹ بولتے شرم نہیں آئی تجھے۔ کہاں کمی رہ گئی میری تربیت میں۔"

"پلیز امی جان.... میری بات تو سنیں۔" ام کلثوم خود کو ان کے تھپڑوں سے بچانے کی کوشش میں تھی مگر وہ شدید طیش کے عالم میں تھیں۔

"کیا سنوں میں تمہاری.... پھر کوئی نیا جھوٹ' کوئی نیا ڈراما!" وہ غصے سے چلائیں۔ ام کلثوم کا سر جھک گیا۔

"مجھے معاف کردیں امی جان.... میں آپ کو سب سچ بتانے ہی والی تھی....." ام کلثوم نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے۔ اب چھپانے کا کوئی فائدہ تھا بھی نہیں۔

"امی.... حشمت بہت اچھے انسان ہیں۔" وہ ان کے قدموں میں آکے بیٹھ گئی تھی۔

"آپ ان سے پلیز ایک دفعہ مل لیں.... پلیز امی جان...." وہ بیٹی کے منہ سے ایک غیر مرد کا نام سن کر ہی ساکت رہ گئی تھیں۔ کجا اس کی وکالت کرنا.... وہ لوگ جتنے بھی آزاد خیال سہی' مگر بہت اقدار والے لوگ تھے۔ وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی۔

"امی.... مجھے دولت کا انبار نہیں چاہیے۔ مجھے زندگی میں صرف دلی خوشی اور اطمینان چاہیے اور وہ صرف مجھے حشمت دے سکتے ہیں۔"

"تم جانتی ہو ام کلثوم! تم کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارے ابا کو پتا چل گیا تو کس قدر برگشتہ ہوں گے۔ تم نے تو ہماری ساری زندگی کی بنی بنائی عزت مٹی میں رول دی۔"

"پلیز امی.... میں مر جاؤں گی حشمت کے بغیر.... امی آپ ان سے ایک دفعہ مل کر تو دیکھیں.... وہ اس قدر خوب صورت دل کے انسان ہیں امی کہ....."

"جس قدر عزت دار انسان وہ ہے.... اس کا اندازہ مجھے تمہاری باتوں کو سن کے اچھی طرح ہو رہا ہے ام کلثوم.... ایک شخص جو اس قدر عزت دار اور شریف ہے کسی بھی لڑکی کو محبت کے دام میں پھنسا کے والدین کے سامنے محبت کی جنگ لڑنے کو کھڑا کردیتا ہے' وہ بہت عزت دار اور مہذب ہے ام کلثوم.... وہ واقعی میں بہت باکردار اور شریف انسان ہے۔"

ان کے طنز پر ام کلثوم کا سر جھک گیا۔ وہ بتا نہیں سکی کہ اس میں قصور حشمت زیدی کا نہیں' خود اس کے اپنے دل کا ہے' جو انہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی بے اختیار ہوگیا تھا۔

"امی.... وہ بہت اچھے انسان ہیں۔"

"ام کلثوم! کسی انسان کو پہچاننے کے لیے اس کی تحریر کا پیمانہ کافی نہیں۔ اس کا تحمل' اس کا کردار.... خاندانی پس منظر' مالی حیثیت سب باتیں دیکھنی پڑتی ہیں۔ اس لیے اس بات کو دل سے نکال دو۔ تمہارے ابا کبھی نہیں مانیں گے۔"

"امی....!" ام کلثوم کو لگا' اس کی گردن پر کسی نے برچھی چلادی ہو۔

"ایسا مت کہیں امی جان.... حشمت میری زندگی بن گئے ہیں۔" وہ بے ساختہ تڑپ اٹھی۔ امی جان نے بیٹی کی تڑپ کو دیکھا۔ ان کی لاڈلی پیاری بیٹی رو رہی تھی ایک ایسے شخص کے لیے جو بے حد عام سا لکھاری تھا۔

جس کا معاشرے میں مالی لحاظ سے کوئی مقام نہیں تھا نہ ہی کوئی قابل فخر شجرہ نسب.....

مسز حسینہ انوار نے خود کو لمحوں میں بوڑھا ہوتا محسوس کیا تھا۔ جن ماؤں کی بیٹیاں خود سر ہو جائیں' وہ یونہی لمحوں میں بوڑھی ہو جایا کرتی ہیں۔

"امی پلیز.... میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں.... مجھ سے میرے خواب نہ چھینیں.... میں زندگی میں اور کبھی کچھ نہیں مانگوں گی حشمت کے ساتھ کے سوا...." وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

متورم آنکھیں.... سرخ ناک' کپکپاتے ہونٹ.... وہ خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ انہوں نے ہار تسلیم کرلی تھی۔ ان کا دل گداز ہو کر پگھلا' ممتا کا دل تھا نا۔

"میں بات کروں گی تمہارے ابا جان سے.... انہیں قائل کرنے کی بھی پوری کوشش کروں گی۔ آگے جو تمہارا نصیب.... مگر پھر تم مجھے مجبور نہیں کرو گی۔"

بیٹی کی ضد نے ان کی خاندانی عزت کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ایک ماں ہونے کے ناتے بیٹی کی عزت اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھیں؟

☼ ☼ ☼

"اب کیا ہو گا....؟" یہ وہ سوالیہ نشان تھا۔ جن سے ہمیشہ ہی محبت کرنے والے خوف کھاتے ہیں۔ محبت لکھنا' اس کی باتیں کرنا آسان جبکہ محبت کرنا' اس کے مسائل بھگتنا کہیں زیادہ مشکل امر تھا حشمت زیدی کے لیے۔

کیا کریں کیا نہ کریں کے درمیان پنڈولم کی مانند جھولتے وہ دو نفوس کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔ الفاظ دم توڑ گئے تھے ہمت جواب دے رہی تھی اور سانس بھی رک رک کر آنے لگی تھی۔ جدائی کا سوچا بھی نہیں جا رہا تھا' کجا جدا ہو کر زندگی بتانا.... اس عفریت نما سوال پر ہی دل بند ہو جائے۔ سانس تھم جائے.... ام کلثوم تو لگتا تھا جیتے جی مر گئی ہے۔ حشمت زیدی نے خود کو سنبھالتے اس کی دگرگوں حالت کو پریشانی کی نظر سے دیکھا.... تسلی و تشفی کے روایتی الفاظ جو ام کلثوم کا حوصلہ بندھا پاتے۔ ان کی لغت میں ناپید ہوگئے۔ انہوں نے خود کو اس وقت خالی ذہن اور خالی دل محسوس کیا۔ بہت کرب ناک لمحہ تھا وہ.... ام کلثوم کی آنکھوں میں گلابی ڈورے دیکھنا اور برداشت کرنا.... وہ بے بسی سے بیٹھی لب کاٹ رہی تھی۔

"بس کردو ثومی.... اور کتنا روؤ گی تم...." ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اسے ٹوک بیٹھے۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے حشمت! اگر ابا جان نہ مانے تو؟" اندیشوں کے ناگ پھن پھیلا رہے تھے۔

"تمہیں اپنی محبت پر یقین ہے نا ثوما.... ادھر دیکھو میری طرف۔" انہوں نے اس کے جھکے چہرے کو ٹھوڑی سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنا سوال دہرایا۔ ام کلثوم نے روئی روئی نظر دیکھ کر سر کو اثبات میں جنبش دی۔

"تو بس پھر بے فکر رہو۔ کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا۔" انہوں نے اس کا اجلا گلابی ناخنوں والا ہاتھ اپنے چوڑے بھاری ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"نہیں حشمت.... ابا جان نہیں مانیں گے.... میں ان کی ضد کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر وہ ایک بار انکار کردیں تو پھر دنیا بدل جائے' وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلتے...." ام کلثوم ان کے جذبات سے دہکتے ہاتھوں کی حدت سے بھی مطمئن نہیں ہو پائی۔ اس کے اپنے خدشات تھے اور کچھ غلط بھی نہیں تھے۔

"اچھا سوچو ثوما جان! خود کو ٹینشن دینے سے کیا حاصل.... اس طرح مسئلے مسائل ختم تو نہیں ہوں گے۔" وہ اپنی پریشانی چھپائے اسے تسلی دے رہے تھے مگر ام کلثوم بہلتی تو خاک' الٹا مزید بکھر گئی۔ پھوٹ پھوٹ کے روتے وہ اظہار کی تمام حدیں پار کر گئی۔

"میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر حشمت.... مر جاؤں گی میں اور میں ایسا محاورتاً نہیں کہہ رہی ہوں۔" وہ بے دم ہو کے چلائی۔ حشمت زیدی نے خود کو دار پہ چڑھنے کی اذیت میں گھرا محسوس کیا۔

"ابا جان نے صاف صاف انکار کردیا ہے۔" وہ سسکی۔

"میں ملوں جاکر تمہارے ابا جان سے.... شاید میں انہیں یقین دلا سکوں کہ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا اور تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کروں گا۔ شاید مجھ سے ملنے کے بعد فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے۔" ام کلثوم نے ان کی اس بات پر انہیں چونک کے دیکھا اور بے ساختہ اپنے آنسو پونچھے۔ امید کا جگنو جگمگایا۔ حشمت زیدی ان کے ابا جان کو سمجھا سکتے تھے۔ قائل کر سکتے تھے۔ اس کے اندر سکون اتر آیا۔

"اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو....؟" اس کا اضطراب کم ہوا تھا ختم نہیں۔

"میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور اگر میں پھر بھی ناکام رہا تو.... پھر بھی میرا وعدہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر پائے گی اور تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے نا۔" اس نے بے ساختہ سر ہلا کر تائید کی تو وہ مسکرا دیے۔

"آؤ میرے ساتھ...." انہوں نے اچانک ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ام کلثوم جو آج بہت مشکل سے ایک آخری بار ان سے ملنے آئی تھی۔ ان کے ساتھ گھسیٹتی چلی گئی۔ وہ انہیں کہہ نہیں پائی کہ اسے دیر ہو جائے گی۔ امی جان کی خالہ کے گھر واپسی سے پہلے اسے واپس جانا ہے۔ وہ اسے کورٹ لے جا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے باپ کی عدالت میں سر جھکائے کھڑی تھی، مگر وہ نادم نہیں تھی اور شرمندہ تو بالکل بھی نہیں۔

انہوں نے اسے سر تا پیر آگ برساتی نگاہ سے دیکھا تھا اور لب بھینچ لیے تھے۔ وہ ان کی کس قدر پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی۔ انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی گمان نہیں کیا تھا کہ وہ ان کے بھروسے کو اس طرح چکنا چور کر دے گی۔

"کیا کر رہی تھیں تم کچہری میں....؟" انہوں نے دبنگ لہجے میں پوچھا تھا۔ ان کے منشی نے ام کلثوم کو وہاں ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا۔ ام کلثوم محبت میں سرخروئی کے چکر میں باپ کی پگڑی سر بازار رول آئی تھی۔ حشمت زیدی نے صرف اپنے اندر کے احساس کمتری اور ٹھکرائے جانے کے خوف سے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا۔ انکار کی سہی جانے والی ذلت سے بچنے کے لیے انہوں نے پہلے ہی ایسا قدم اٹھا کے اپنے تئیں انکار کے سارے جواز مسدود کر دیے تھے، مگر ایسا کرنے سے وہ اپنی انا تو بچا گئے تھے، مگر اپنی محبت کو رسوا کر دیا تھا۔ یہ محبت نہیں ان کا گھٹیا پن تھا۔ محبت کو رسوا نہیں کیا جاتا، اسے امر کیا جاتا ہے اور جن سے محبت کی جاتی ہے اس کی عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو ہی سمجھا جاتا ہے اور ان کے بڑوں کی عزت کو یوں پامال نہیں کرتے.... یہ بات ام کلثوم کے علاوہ سب ہی نے سمجھ لی تھی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے گھر کی عزت یوں کچہری میں جائے۔

وہ بہت روایتی سوچ کے حامل شخص تھے۔ اونچا حسب نسب رکھنے والے خاندانی نواب تھے۔ بہو بیٹیوں کو چار دیواری میں رکھنے والے۔ گو کہ ان پر کوئی دباؤ یا روک ٹوک نہیں تھا، مگر پھر بھی ان کے خاندان کی کچھ حدود و قیود تھیں اور اب ان کی بیٹی ام کلثوم کچہری میں کیا گل کھلا آئی تھی۔ ساری زندگی کی بنی بنائی عزت لمحوں میں خاکستر کر گئی تھی۔ وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل بھی نہیں رہے تھے۔ ان کا جی چاہا وہ کھڑے کھڑے اس کے وجود پر مٹی کا تیل ڈال کر اسے آگ لگا دیں۔

"بولو.... جواب دو.... کیا کر رہی تھیں اس دو ٹکے کے لکھاری کے ساتھ...." وہ اس کے سر پہ آ کے گرجے تھے ام کلثوم دہل گئی۔ اس کے باپ کا غصہ تو زمانے میں مشہور تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا کہ وہ سب کچھ بھول کر حشمت زیدی کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔

"ابا جان.... وہ.... وہ!" اس سے جواب نہ بن پڑا نہ ہی زبان نے ساتھ دیا۔ ابا جان نے پوری طاقت سے اس کے پھول جیسے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا۔ وہ چکرا کر نیچے جا گری۔

"یہ دن دکھانے کو پڑھایا لکھایا تھا میں نے کہ تم اٹھو اور میرے چہرے پر کالک پوت دو۔" ان کے لہجے میں ٹوٹے ہوئے مان کی کرچیاں تھیں۔ ایک باپ کا مان ٹوٹا تھا۔ ایک عزت دار شریف اور مہذب انسان کی پگڑی اچھلی تھی۔

"بہت بدنصیب ہے تو ام کلثوم.... تو بہت بدبخت ہے.... تو نے خود اپنے ساتھ جو کیا سو کیا۔ کم سے کم مجھے تو زمانے میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل چھوڑا ہوتا۔"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے۔ مسز حسینہ انوار ان کے نزدیک آئیں۔ ام کلثوم کی طرف انہوں نے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے مجازی خدا کے کندھے پر تسلی آمیز دلاسہ دینے کو ہاتھ اٹھایا وہ اور بکھر سے گئے۔

"اسے کہو حسینہ.... یہاں سے چلی جائے.... میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اس کا گلا گھونٹ سکتا۔" ام کلثوم سن پڑ گئی۔ اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی سب کو خبر ہو جائے گی اور اس کا نتیجہ اس شکل میں نکلے گا۔ کاش وہ جان پاتی تو کبھی بھی ایسا قدم نہ اٹھاتی، مگر اب اس کے لیے ساری راہیں بند ہو چکی تھیں وہ معتوب ٹھہرائی جا چکی تھی۔

"بات ابھی تک آپ کے دوست وکیل اور آپ کے درمیان ہی ہے انوار.... ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"نہیں.... ہرگز نہیں.... میں مزید اپنا تماشا نہیں لگوانا چاہتا۔ اسے کہو جس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے، ابھی کے ابھی اس کے پاس چلی جائے۔ میرے لیے یہ مر چکی ہے۔ خاندان بھر میں منادی کرا دو کہ یہ مر چکی ہے۔"

اتنا کہہ کے وہ اٹھے اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ مسز حسینہ بھی اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئیں۔ وہ اکیلی گم صم حالت میں زمین پر بیٹھی رہ گئی۔ کچھ ہی دیر میں اس کا بہنوئی اور بہن آ گئے تھے۔ کسی نے نہ اس کی طرف دیکھا نہ کلام کیا.... لمحوں میں اسے اپنی اوقات پتا چل گئی۔ بند کمرے میں جانے کیا میٹنگ ہوئی، اسے خبر نہیں۔ اسے وہاں بیٹھے بیٹھے دوپہر سے رات ہو گئی۔ وہ بھوکی پیاسی وہیں بیٹھی رہی، ہاں اسے اپنی غلطی کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کی بہن اس کے پاس آئی، اس کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے.... آج اس کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے نفرت تھی۔

"بلاؤ اپنے شوہر کو.... ابا جان سے آ کے ملے اور رخصتی کی تاریخ لے جائے۔ تم دونوں کو تو شاید اپنے بڑوں کی ضرورت نہیں ہے، مگر ہمیں تو اپنی عزت بچانی ہے جو کہ تمہارے معاشقے کی وجہ سے بچی تو پہلے بھی نہیں، مگر بچی کچھی عزت کا جنازہ نکالنے کے لیے اس سے پہلے کہ تم مزید کوئی سامان کرو.... تمہارا اس گھر سے عزت سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

"آپی.... آپی پلیز میری بات تو سنیں۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیں پلیز...." وہ اٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر بولی مگر بتول نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔ اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ جو کچھ وہ کر چکی تھی، اس کے بعد اس کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں بچی تھی۔ اس نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا، مگر اب مزید کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی، سو اس نے حشمت زیدی کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی تھی۔ وہ تو پہلے سے ہی تیار بیٹھے تھے فوراً چلے آئے۔ پہلی بار وہ اپنے سسرال آ رہے تھے۔ بے حد شان شوکت سے کھڑی ان کی حویلی میں قدم رکھتے وہ تفاخر سے مسکرائے۔ آج وہ اس قابل تھے کہ سر اٹھا کے چل سکتے تھے کیوں کہ آج اس گھر کے مکینوں کی نظریں ان کے لیے جھکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسی دن کے لیے تو اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا۔ محبت اپنی جگہ، مگر محبت میں وہ ذلیل ہونے کے قائل بالکل بھی نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ ہی امیروں کو غریب لوگوں کو رگیدتے دیکھا تھا۔ وہ محبت کے ہاتھوں ان امیر لوگوں کے پیروں میں نہیں لوٹنا چاہتے تھے۔ ان کی خودداری، انا اور عزت نفس انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ان کی خود غرضی

انہیں ہمیشہ اپنے لیے اچھا سوچنے کی ترغیب دیتی رہی تھی۔

وہ ڈرائنگ روم میں بڑی شان کے ساتھ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے سگار سلگا کے بیٹھے تھے۔ وہ کورین سگار تھا۔ جو چند دن پہلے ان کے کسی فین نے انہیں بھجوایا تھا۔

انہوں نے شہر کی معزز ترین شخصیت ایڈیشنل جج مسٹر انوار حسین کو دیکھا' جو لمحوں میں بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ لمحے بھر کو حشمت زیدی کو ان پر ترس آیا۔ پھر ان کا سر فخر سے تن گیا۔ ام کلثوم انہیں پل پل کی خبر دیا کرتی تھیں۔ کس قدر ہتک آمیز اور قابل نفرت لہجہ ہوتا تھا ان کے لیے انوار حسین کا.... وہ اس کا نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ اسے دو ٹکے کا لکھاری کہا کرتے تھے اور آج وہی دو ٹکے کا لکھاری.... ان کے سامنے نظر اور سر اٹھا کر کروفر سے بیٹھا تھا۔

"جو حرکت تم نے کی ہے اس نے تمہاری "اوقات" کو واضح کر دیا ہے' کیوں کہ شریف خاندانوں میں ایسی حرکتیں نہیں کی جاتیں۔ ہماری بیٹی کو ورغلا کے تم نے جو کارنامہ انجام دیا ہے' اس کے لیے ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے' مگر اپنی عزت بچانے کے لیے ہم اپنی بیٹی کو تمہارے ساتھ رخصت ضرور کر دیں گے۔"

حشمت زیدی کے منہ پر زوردار طمانچہ پڑا تھا۔ وہ جو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ انہوں نے اپنی اس حرکت سے اپنے سسرال کو زیر کر لیا ہے تو وہ غلط تھے۔ ان کے سسرال والے زخمی حصے کو ناسور بنا کر ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے نہیں تھے بلکہ اس زخمی حصے کو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کر دینے والوں میں سے تھے۔

"جمعہ کو چار معزز لوگوں کو لے کر آ جانا' اگر تمہارے خاندان میں موجود ہوں تو.... ہم رخصت کر دیں گے۔ جہیز کے نام پر ام کلثوم کو یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔ تم اتنا تو کما ہی سکتے ہو کہ اسے اس کے معیار کے مطابق زندگی فراہم کر سکو۔" انہوں نے بس نہیں کی تھی بلکہ ان پر جوتوں کی بوچھاڑ کر دی تھی' وہ لال بھبھوکا چہرہ لیے وہاں سے اٹھ آئے تھے۔ جس متوقع ہتک و بے عزتی سے انہوں نے بچنے کی کوشش کی تھی' وہ ہو کر ہی رہی تھی۔ حشمت زیدی کے دل میں نفرت کی بنیاد پڑ گئی۔ نئی زندگی کا آغاز کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوا تھا۔ مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ پہل ان کی طرف سے ہوئی ہے۔

انہوں نے اچانک ہی ماں کو کچھ پیسے دے کر ایک سونے کی انگوٹھی' چار جوڑے خریدنے کو کہا تھا۔ اگر ام کلثوم کو جہیز مل رہا ہوتا تو شاید وہ یہ تردد بھی نہ کرتے۔

ماں اور بھائی اس اچانک کی شادی پر حیران رہ گئے تھے' مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات انہیں حشمت زیدی کے قطعی رویے نے نہیں دی تھی۔ ان کی اماں اور بھائی بازار جا کے بری خرید لائے تھے۔ عام سا سرخ رنگ کا ریشمی جوڑا تھا' جس کے ساتھ سرخ رنگ کا گوٹا لگا دوپٹا تھا۔ یہ ام کلثوم کا عروسی لباس تھا' ساتھ بے حد عام سی ہلکی سستی سنہری جوتی.... سستا سا تیز رنگوں والا میک اپ تھا۔

"یہ آئی ہے تمہاری سسرال سے تمہاری بری.... کیا تم یہی سب ڈیزرو کرتی تھیں ثومی؟"

بتول آپی کو دکھ ہوا تھا۔ ام کلثوم خاموش رہی' وہ بہت خوب صورت تھی اسی لیے تو فلیٹ کے عام سے سستے سوٹ اور گوٹے کناری والے دوپٹے میں بھی نظر لگنے کی حد تک حسین لگ رہی تھی۔

بارات میں مسٹر انوار حسین کی خواہش کے مطابق شہر کے معزز ترین لوگ شامل تھے۔ حشمت زیدی کے خاندان سے کوئی شامل نہیں ہوا تھا۔ صرف خالق' اس کی بیوی اور خالدہ بی بی بارات کا انتظام ہوٹل میں کیا گیا تھا اور اس ہوٹل کا انتظام و انصرام دیکھ کر خالدہ بی بی اور خالق کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے۔ کھانے کی اتنی ڈشیں تھیں کہ وہ کچھ بھی پیٹ بھر کے نہیں کھا پائے تھے۔ انہیں حشمت زیدی کے نصیب پر رشک آیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو بڑا آدمی بنا دیکھنا چاہتی تھیں اور وہ آج بن گیا تھا۔ شہر بھر کے معروف ادیب' شعرا کے علاوہ ان کے دوست احباب کی لمبی فہرست تھی۔ کچھ بھرم حشمت زیدی نے انوار حسین کا رکھ ہی لیا تھا۔ رخصتی کے وقت ام کلثوم باپ کے گھٹنوں کو چھو کر معافی مانگ کے روئی تھی۔ وہ آخر باپ تھے۔ سمجھتے تھے کہ ام کلثوم سے غلطی ہوئی ہے اور اگر انہیں کسی بھی لحاظ سے حشمت زیدی اپنی بیٹی کے قابل لگتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے بیٹی بیاہ دیتے۔ انہوں نے اس کے بارے میں پتا کروایا تھا۔ مکمل چھان بین' اس کا فیملی بیک گراؤنڈ' اس کا رہن سہن' اس کی اٹھک بیٹھک.... وہ ایک متکبر اور خود غرض شخص تھا۔ اگر وہ اخلاقی لحاظ سے اتنا گرا ہوا نہ ہوتا تو وہ خود ہی ام کلثوم کا رشتہ حشمت زیدی کے ساتھ کر دیتے۔ انہوں نے ام کلثوم کو اس گھر سے بے شک خالی ہاتھ رخصت کیا تھا' مگر پھر بھی انہوں نے اپنی بیوی کو پچاس ہزار کا چیک لکھ کر چلتے وقت ام کلثوم کو دینے کو کہا تھا' مگر ام کلثوم نے وہ چیک لینے سے انکار کر دیا تھا۔

"مجھے ان پیسوں کی نہیں آپ کی محبت کی ضرورت ہے امی جان.... آپ لوگ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔" وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ بغیر کہے ہی وہ جانتی تھی' کہ اس گھر سے ناتا ہمیشہ کے لیے ٹوٹ رہا ہے' مگر وہ خود کو مضبوط کیے آگے کا سوچ رہی تھی۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ گھر بسا کر دکھائے گی.... اور جب وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی بسر کرے گی تو کبھی نہ کبھی اس کے والدین بھی اسے معاف کر ہی دیں گے۔

اس کی بہن کو تو اس پر اتنا غصہ تھا کہ رخصتی کے وقت وہ اس کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی۔ شاید وہ ایسا نہ کرتی' اگر اس کا شوہر اور ساس قریب نہ کھڑے ہوتے۔ اس کی ساس تو ام کلثوم کو اپنے بھانجے کے لیے مانگ رہی تھیں۔ اب جب سے انہیں ام کلثوم کی حرکت کے بارے میں علم ہوا تھا' وہ اٹھتے بیٹھتے اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں' جس نے انہیں ام کلثوم جیسی لڑکی کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لیا تھا۔ بتول کو یہ سب سن کر کس قدر سبکی محسوس ہوئی۔ اس کا اندازہ سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بازار میں دکانوں کے اوپر بنا ایک کمرہ کچن اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل گھر تھا' جس میں اسے بیاہ کر لایا گیا تھا۔ گھر میں کسی بھی قسم کی آرائش نہیں کی گئی تھی۔ ام کلثوم نے گھونگھٹ اٹھا کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ فرنیچر کے نام پہ اونچے پایوں والی مسہری' ایک' دو کرسیاں اور ایک میز تھی۔ سامنے کی دیوار والی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی جس پر کوئی پردہ نہیں لگا تھا۔ کھڑکی سے اندر آتا ٹریفک اور لوگوں کا بے ہنگم شور کان کے پردے پھاڑ رہا تھا' مگر وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی تھی۔ اس کے لیے کمرا بھی نہیں سجایا گیا تھا۔

اس کی آمد کے ایک گھنٹے بعد حشمت زیدی کے چند دوستوں نے آ کر ٹیبل پر کچھ فروٹس' کیک کے علاوہ گلاب کے پھولوں کی لڑیاں بھی لا رکھی تھیں۔ ام کلثوم کے دل میں حشمت زیدی کے لیے شکوہ نہیں تھا کہ اس کے استقبال کے لیے کچھ اہتمام نہیں کیا' لیکن اگر وہ کچھ اہتمام کرتے تو اسے خوشی ضرور ہوتی' جیسے اس وقت ہو رہی تھی۔ اس کی ساس اسے اٹھا کر باہر برآمدے میں لے گئی تھیں اور حشمت کے دوست اندر کمرا سجانے لگے تھے۔ خالدہ بی بی اپنی بے حد حسین بہو کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھتی خوش ہو رہی تھیں۔ وہ واقعی چاند سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ بے ساختہ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے دس روپے نکال کر اس کے سر پر سے وارے اور کسی ضرورت مند کو دینے کے لیے مٹھی میں دبا لیے۔

"سدا سہاگن رہو.... دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو...." انہوں نے اسے دعا دی تھی۔ ام کلثوم بے ساختہ مسکرائی۔

"جانتی ہے حاشو نے جب تیرے بارے میں مجھے بتایا تو اس نے کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا' ماں تیری بہو کو چاند بھی دیکھ کر شرماتا ہے۔ وہ چاند سے بھی زیادہ پیاری ہے اور اس نے کس قدر سچ کہا تھا ہائے.... اللہ تم

دونوں کی جوڑی سلامت رکھے بس..."

وہ سادہ سے انداز میں تعریف کرتی اور دعائیں دیتی ام کلثوم کو بہت اچھی لگی تھیں۔ چلو کوئی تو تھا جو ان کی نئی زندگی کے لیے دعا گو تھا۔ ورنہ جو اس نے کیا تھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ وہ لوگ کبھی اسے دل سے معاف کرپائیں گے۔ اس کے دل پر بھاری بوجھ تھا' وہ تو پورے دل سے خوش بھی نہ ہوپارہی تھی... کاش وہ یہ قدم نہ اٹھاتی اور حشمت زیدی کی زندگی میں ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ شامل ہوتی۔

"اٹھو بیٹا... کچھ کھالو..." اس کی ساس کچھ دیر بعد اس کے لیے کھانا لے کر آئیں۔ ام کلثوم نے حیرت سے دیکھا۔ شادی کے بعد پہلے ہی دن حشمت کے بغیر کھانا نہیں کھانا چاہتی تھی۔

"رہنے دیجئے خالہ...! مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس نے نہایت آہستگی سے کہا۔ وہ سرہلا کر چلی گئیں۔

دو گھنٹے بعد حشمت زیدی کے دوست کمرا سیٹ کرکے نکلے تو اسے اندر لایا گیا۔ حشمت زیدی کے دیرینہ دوست کیمرہ کرائے پر لائے تھے۔ انہوں نے ہی ان دونوں کی کچھ تصاویر اکٹھی اتاری تھیں ورنہ تو شاید ان کی شادی کا کوئی ثبوت' کوئی یادگار نشانی ان کے پاس نہیں ہوتی۔ چلتے وقت انہوں نے اپنی بھابھی کو سو روپے سلامی دی تھی۔ ام کلثوم کو پہلی بار کسی نے سسرال میں سلامی دی تھی اور وہ اتنی کم تھی کہ ام کلثوم کو لیتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔ وہ لوگ کافی دیر تک بیٹھے ہنسی مذاق کرتے رہے تھے۔

رات گئے کمرا خالی ہوا تو اسے آرام کرنے کا موقع ملا۔ حشمت زیدی اسے پلنگ پر بٹھا کے خود اس کے سامنے کرسی پر آبیٹھے۔ وہ مکمل موڈ میں پورے استحقاق کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے۔ ام کلثوم کے اندر ٹھنڈے میٹھے پانیوں کے جھرنے بہنے لگے۔ جنگل میں موروں کا ناچ شروع ہوگیا۔ کوئل ان کے ملن کے گیت گانے لگ گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی قربت میں مدہوش ہورہے تھے۔ حشمت زیدی نے ام کلثوم کے نازک سفید گلابی ناخنوں والے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنائی جو وزن میں قدرے ہلکی تھی' مگر ڈیزائن خوب صورت تھا۔

"میں تمہیں اس طرح اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا ثوما جان...! مگر تم جانتی ہو نا اگر میں یہ سب نہ کرتا تو ہمارا ملن ناممکن تھا اور یہ میں کسی بھی طور برداشت نہیں کرسکتا تھا اور میں جانتا تھا کہ تم بھی میرے بغیر زندہ نہ رہ پاتیں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے بہت نرمی و محبت سے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم نے ہلکے سے سر کو اثبات میں جنبش دے کے تائید کی۔

"مگر میں تمہارے والدین سے سخت مایوس ہوا ہوں۔ انہیں کم از کم تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بخدا مجھے تو تمہارے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے زندگی میں... مگر تم تو آسائشات کی عادی ہو۔ انہیں تمہارا تو سوچنا چاہیے تھا۔ انہوں نے تمہیں خالی ہاتھ رخصت کرکے بالکل ہی بے وقعت کردیا۔"

ام کلثوم کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"غلطی تو ہم نے بھی کی ہے نا حشمت!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل بول پائی۔

"یہ غلطی نہیں ہمارا شرعی حق تھا ثوما! تم اس بارے میں مزید کچھ مت سوچو۔ ماسوائے اس کے کہ ہماری محبت سچی تھی کہ ہم ہزار رکاوٹوں کے بعد بھی ایک ہوگئے۔ اور تم مسز حشمت زیدی بن گئیں۔ سو ان سب لوگوں سے جنہوں نے تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا ہے یا تمہارا دل دکھایا ہے تو ایسے ہی پیش آنا' جیسے ایک نامور مقبول ادیب کی بیوی کو آنا چاہیے۔ آخر ہزاروں چاہنے والیوں میں سے تمہیں ہی یہ منصب نصیب ہوا ہے۔"

وہ شرارت و تکبر کے ملے جلے تاثرات سے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم کے لبوں پر ایک بے دم مسکراہٹ نے آکے دم توڑ دیا۔

"اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری بیوی"... میری بیوی پر خاصا زور دے کے انہوں نے کہا "اب اس جگہ جائے جہاں سے اسے نہایت بے عزت کرکے نکالا گیا ہے۔ بھلے وہ تمہارا میکہ ہے' مگر اب تمہاری

عزت میری اور میری عزت تمہاری ہوگی... ہے نا ثوما جان! تم پر کوئی روک ٹوک یا دباؤ نہیں' مگر تم مجھے بھی مجبور نہیں کروگی۔"

ام کلثوم محض سرہلا کے رہ گئی۔ شادی کی پہلی رات جب وہ پہلے ہی ذہنی دباؤ میں تھی۔ ایسی باتیں... اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔ اس نے خاموشی اختیار کی تھی' اسی میں اس کی بھلائی تھی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات وہ بے چین رہی تھی۔ کھلی کھڑکی سے ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور اس کے کان کے پردے پھاڑتا رہا۔ اسے بے اختیار اپنا پرسکون و پرآسائش کمرا یاد آیا۔ کل تک وہ اے سی آن کرکے مکمل طور پر مصنوعی سردی کا ماحول بنا کر کمبل اوڑھ کے دن چڑھے تک سوئی رہتی تھی۔ اور آج یہاں اس چھوٹے سے کمرے میں روشنی اور ہوا کے لیے لکڑی کے دروازوں والی ایک کھڑکی تھی' جو پردے سے بھی محروم تھی۔ اگر شیشے کی کھڑکی ہوتی تو شاید اس بے ہنگم شور سے کچھ جان چھوٹ جاتی۔ وہ سو ہی نہ سکی تھی۔ جبکہ حشمت زیدی بڑے مزے سے سو رہے تھے...

ام کلثوم نے خود کو اس نئی زندگی اور اس میں درپیش مسائل کے لیے... تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے محل سے اٹھ کر اس ایک کمرے کے مکان میں آنے کا کوئی افسوس نہیں تھا۔ اسے بس یہ دکھ تھا کہ اس کی جذباتیت اور جلد بازی کی وجہ سے اس کے والدین اس سے ناراض ہوگئے تھے۔

اس نے بے خبر سوئے ہوئے حشمت کی گھنی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھا جو گہری نیند میں ہونے کے باوجود ہولے ہولے لرز رہی تھیں۔ کچھ دیر وہ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر غسل کے لیے اٹھی۔ باتھ روم کا حال بھی کم و بیش ویسا ہی تھا' مگر وہ پریشان نہیں ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ سب کچھ ٹھیک کرلے گی... ویسے بھی حشمت تو مرد ہیں' انہیں کیا پتا کہ گھر کو کیسے سنوارا جاتا ہے' یہ تو خالصتا" عورتوں کے کام ہوتے ہیں۔

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہوکر بال بناتے ہوئے سوچا تھا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو ام کلثوم کو حشمت کو جگانا ہی پڑا... مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

"حشمت! اٹھیے پلیز۔ دروازے پر دستک ہورہی ہے' دیکھیں جاکر کون آیا ہے؟"

"خود ہی دیکھ لو جاکر یار... مجھے سونے دو۔" وہ کروٹ بدل کر پھر سوگئے تو ناچار ام کلثوم کو ہی دروازہ کھولنا پڑا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی دیکھ کر کہ اس کے میکے سے اس کے لیے ناشتا بھیجا گیا تھا۔ بتول آپی اور اس کی دوست مائرہ تھیں۔

"السلام علیکم آپی...!" ام کلثوم نے ہی سلام میں پہل کی تھی ورنہ بتول آپی تو اس کے بھیگے بھیگے روپ کو دیکھنے میں ہی اتنی مگن تھیں کہ حال احوال پوچھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ بے حد سادہ سے ساٹن کے سوٹ میں اس قدر دلکش و حسین لگ رہی تھی کہ نظریں ہٹانا مشکل ہورہا تھا۔ بتول آپی نے بے ساختہ اسے گلے لگا کر پیار کیا اور دعا دی۔ جو بے وقوفی وہ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں کرچکی تھی' اس کی سزا اسے نہ جانے کتنی ملنی تھی۔

"میرا خیال ہے' تم اکیلی ہو یہاں پر... تمہاری ساس اور باقی سسرال والے کدھر ہیں؟" ڈرائیور برآمدے میں رکھی تپائی پر ناشتے کے ڈھیروں لوازمات رکھ گیا تھا۔ حشمت کمرے میں سو رہے تھے۔ ناچار ام کلثوم کو ان لوگوں کو برآمدے میں بٹھانا پڑا تھا۔

"وہ لوگ تو رات کو ہی چلے گئے تھے آپی! ابھی شاید آنے والے ہوں اور حشمت ابھی سو رہے ہیں۔ میں جگاتی ہوں انہیں۔" وہ فورا" ہی اٹھ گئی' حشمت کو جگانے کے لیے۔

وہ جاگ رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ ام کلثوم کو حیرت ہوئی کہ وہ جاگ جانے کے باوجود باہر اس کے میکے والوں سے ملنے کیوں نہیں آئے۔ شادی کے بعد وہ لوگ پہلی دفعہ اس کے گھر آئے تھے۔

"اچھا ہوا... آپ اٹھ گئے۔ باہر بتول آپی اور مائرہ آئی ہیں ناشتا لے کر... آپ جلدی سے فریش ہو کر آجائیں۔"

"کہہ دو ان سے کہ میں سو رہا ہوں... میرا موڈ نہیں ہے ابھی کسی سے ملنے کا۔" انہوں نے صاف انکار کردیا تھا اور ام کلثوم ہکابکا رہ گئی تھی۔

"ایسا اچھا لگے گا کیا؟" ام کلثوم بس اتنا ہی کہہ پائی۔

"ثوما... کیا فرق پڑتا ہے یار... اور پھر میں منافق نہیں ہوں۔ جن لوگوں نے میری بیوی کی انسلٹ کی ہو' میں ان لوگوں کی عزت نہیں کرسکتا۔ آئم سوری۔" انہوں نے ہاتھ اٹھا کے منع کردیا۔

"آہستہ بولیں حشمت... وہ لوگ سن لیں گے۔"

"تم چلو' میں آتا ہوں۔" شاید حشمت زیدی کو احساس ہو ہی گیا تھا کہ شادی کے پہلے ہی دن انہیں ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ سرہلاتی باہر آگئی۔

"میں نے حشمت کو جگایا ہے۔ ابھی آتے ہیں تھوڑی دیر میں۔" وہ باہر آکر بولی۔ بتول آپی کچھ نہیں بولیں۔

"تیار ہو جاؤ ثومی! ہم تمہیں لینے بھی آئے ہیں۔" مائرہ نے کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی کوئی جواب نہیں دے پائی۔

"کہاں رہ گئے دولہا میاں... آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ان کا انتظار کرتے کرتے' تم تو ناشتا کرلو ام کلثوم!" بتول آپی نے بے حد سنجیدگی سے تحکمانہ انداز میں کہا تھا۔

"ابھی بھوک نہیں ہے آپی... بعد میں کھالوں گی۔"

"بعد میں... کیا مطلب' تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہی ہو کیا؟" بتول آپی معاملے کو سمجھ رہی تھیں' پھر بھی اس کے منہ سے سننا چاہتی تھیں۔ ام کلثوم کی آنکھیں یک لخت نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔ وہ بے ساختہ آپی کے پاس آبیٹھی۔

"آپی... پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے گا۔ میں آؤں گی' ضرور آؤں گی' مگر ابھی نہیں۔ جب تک ابا جان کا غصہ و ناراضی ختم نہیں ہو جاتی اور... میں وہاں اکیلی بھی نہیں آنا چاہتی آپی!" موٹے موٹے آنسو اس کے صبیح گالوں پہ بہہ رہے تھے۔ بے ربط انداز' ٹوٹا بکھرا لہجہ... بتول آپی کے دل پر برچھی چلا گیا۔ انہوں نے بے ساختہ اس کے آنسو صاف کرکے اسے تسلی دی تھی۔

"تم فکر نہیں کرو... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چلتے ہوئے انہوں نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھا تھا۔ ام کلثوم نے چونک کے دیکھا۔ سوالیہ نگاہوں سے پوچھا' یہ کیا ہے؟

"رکھ لو... انکار مت کرنا۔ ابا جان نے بھیجا ہے۔ کل بھی امی جان تمہیں دینا چاہ رہی تھیں۔ زیادہ نہیں ہے۔ مگر تمہاری کچھ نہ کچھ ضرورتیں پوری ہو ہی جائیں گی اور نہیں تو کسی اچھے علاقے میں گھر ہی لے لینا' کہا نا رکھ لو۔" اسے بولنے کے لیے پر تولتا دیکھ کر انہوں نے چیک اس کی مٹھی میں رکھ کے دبایا تو اسے خاموش ہونا پڑا۔

دو گھنٹے انتظار کے بعد جب وہ چلی گئیں' تب حشمت زیدی اٹھ کر نہائے۔ ام کلثوم نے ناشتے کا پوچھا تو انکار کردیا۔

"نہ بھئی... میں تو سسرال سے آیا ایک دانہ بھی نہ کھاؤں' جنہوں نے میری بیوی کی قدر نہیں کی۔ اسے اس کے حق سے محروم رکھا۔ میں ان ہی کا بھیجا اناج کھالوں کہ حق کی بات نہ کرسکوں۔ نہ بابا نہ میری غیرت یہ بات گوارا نہیں کرتی۔"

ام کلثوم خاموش ہو رہی۔ پھر انہوں نے واقعی میں ناشتا نہیں کیا تھا' بلکہ اپنی ماں کا لایا ہوا دوپہر کا کھانا ہی کھایا تھا۔ ام کلثوم کے میکے سے آئی مٹھائی اور فروٹس پاک ٹی ہاؤس میں موجود ان کے دوست احباب میں بانٹ دیے گئے۔ دوستوں میں ہمیشہ کی طرح ان کی واہ واہ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

خالق کا بیٹا ہوا تھا... آج صبح ہی اماں نے فون

کرکے بتایا تھا۔ ام کلثوم کی شادی کو دس روز ہو گئے تھے۔ اس دوران ام کلثوم گھر میں ضرورت کی کافی چیزیں لے آئی تھی۔ سب سے پہلے اس نے کھڑکی کے آگے پردہ لگوایا تھا۔ وہ روز شام کو جب گھومنے کے لیے باہر نکلتے تو ام کلثوم روزانہ ہی گھر کی کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی۔ کچن کے لیے برتن خریدے۔ کچھ راشن ڈالا۔ بیڈ شیٹس' کمبل وغیرہ خریدے۔ حشمت زیدی کے اندر کی کمینی شخصیت جاگ اٹھتی۔

"ہک ہا... یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں تھے ثوما جان... یہ سب ضرورتیں تو والدین پوری کیا کرتے ہیں۔ کیا کوئی مان سکتا ہے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی اچھرہ بازار سے گھر کی چیزیں خریدتی ہے۔" وہ اس سے اس انداز سے ہمدردی کرتے کہ وہ جواب میں یا اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ بول پاتی۔ اسے کبھی یہ نہیں لگا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا درپردہ اسے اس کی غلطی کا احساس دلا رہے ہیں۔ وہ جذباتی ضرور تھی' مگر اتنی معاملہ فہم یا ذہین نہیں یا پھر حشمت زیدی ہی زیادہ ہوشیار تھے۔

"ہر کسی کو اپنے نصیب کا ملتا ہے اور میں اپنے نصیب پر خوش ہوں حشمت!" وہ ان کے قریب بڑھ آئی۔ ان کی آنکھوں میں محبت سے دیکھا۔

"میں تمہیں تمہاری قسمت کے مطابق خوش نہیں رکھ پاتا ہوں؟" وہ اپنے احساس کمتری کو نہ چاہتے ہوئے بھی عیاں کر گئے۔ حالانکہ اسی احساس کمتری چھپانے کے لیے وہ ام کلثوم کے والدین پر چوٹ کرتے تھے۔

"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ... میں بہت خوش ہوں آپ کے ساتھ... اور مجھے زندگی میں کچھ بھی نہیں چاہیے۔" جانے حشمت زیدی مطمئن ہوئے یا نہیں' مگر خاموش ضرور ہو گئے تھے۔

"اچھا چلیں تیار ہو جائیں۔ ہمیں خالق بھائی کے بیٹے کو دیکھنے کے لیے جانا ہے۔"

"کیا ضروری ہے یار! کہ ہم ابھی چلیں... ہم بعد میں بھی تو جاسکتے ہیں۔" انہیں ہمیشہ ہی اس محلے میں جانے سے کوفت ہوتی تھی۔

"جی نہیں... ہم ابھی چلیں گے۔ بس جلدی سے تیار ہو جائیں' میں نے آپ کے لیے کپڑے نکال دیے ہیں اور ابھی آپ نے مجھے شاپنگ بھی کروانی ہے بچے کے لیے۔" وہ جانے کے لیے تیار تو ہو گئے' لیکن بچے کے تحائف کے لیے ان کی جیب خالی تھی۔

"آج ویسے ہی ہو آتے ہیں... تحفہ پھر کسی دن لے جائیں گے۔" انہوں نے بازار میں آتے ہی ام کلثوم کے چہرے سے نظریں چراتے کہا۔

"جی نہیں... آج میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی۔ ہم ابھی تحفہ لے کر جائیں گے۔" ام کلثوم کو ضد ہو گئی تھی۔

"مگر ثوما... اس وقت میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے۔ اخبار سے چیک ملنے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کسی دکان میں گھس جاتی انہوں نے اسے اپنی مجبوری بتا کر روکنے کی کوشش کی تھی۔

"آپ چلیں تو اندر... اور فکر نہیں کریں' میرے پاس کچھ پیسے ہیں۔ ہم آرام سے شاپنگ کرلیں گے۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر بڑھ گئی تھی۔ بچے کے تین سوٹ' اس کی ماں' باپ کے علاوہ اس نے اپنی ساس کے لیے بھی سوٹ خریدا تھا۔ حشمت زیدی کی تو آنکھیں ابل کر باہر آگئیں۔ کس قدر فیاضی سے ان کے رشتے داروں کے لیے شاپنگ کر رہی تھی وہ' جبکہ انہیں تو آج تک احساس ہی نہ ہوا تھا' تب ہی وہ کہہ گئے۔

"کیا ضرورت تھی اتنا روپیہ خرچ کرنے کی ثوما جان! ان پیسوں سے ہم اپنی ضروریات بھی تو پوری کرسکتے تھے نا؟" ام کلثوم تو حیران ہی رہ گئی۔

"ان سب پر خرچ کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے نا حشمت۔" وہ دھیمے ٹھہرے لہجے میں جتا گئی' مگر مقابل کو چنداں پروا نہیں تھی۔ "اور پھر آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہمارے ان رشتوں کا ہم پر بہت قرض ہوتا ہے۔ ان کی محبتوں کا قرض... تو پھر ہم عملی زندگی میں اس

قرض سے کوتاہی کیوں برتیں۔" وہ انہیں ان کے مشہور ناول میں لکھے جملے کو یاد کروا رہی تھی۔ حشمت زیدی کو لب بھینچ کر خاموش ہونا پڑا۔ وہ کہہ نہ سکے کہ عملی زندگی اور فکشن میں فرق ہوتا ہے۔

اماں کے گھر ان کا والہانہ استقبال ہوا تھا۔ محلے بھر کی تمام خواتین یک دم ہی ام کلثوم کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی تھیں۔ سب بار بار حشمت زیدی اور خالدہ بی بی سے کہہ رہی تھیں۔

"اوئے حشمت! تو کتنا خوش قسمت ہے پتر... تیری ووہٹی تو دودھ ملائی سے بنی لگتی ہے۔ اتنی سوہنی اور بولتی تو اتنا ہولی (آہستہ) ہے کہ کان لگا کے سننا پڑتا ہے۔ سچ سچ بتا کہاں سے ڈھونڈا ایسا ہیرا۔"

حشمت زیدی بڑائی اور فخر کے تاثرات سجائے ان تعریفوں کو اس طرح سے وصول کر رہے تھے۔

اس روز وہ شام کا کھانا کھا کر وہاں سے نکلے تھے۔ شام کے کھانے کی تیاری ام کلثوم نے خالدہ بی بی کے ساتھ مل کر کروائی تھی۔ وہ تو نہال ہی ہو گئی تھیں۔ انہیں تو اندازہ تک نہیں تھا کہ اتنے بڑے گھر سے آنے والی ان کی بہو اس طرح کام کرے گی' بلکہ انہیں تو اس کے شایان شان جگہ ہی گھر میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ام کلثوم کی عادات انہیں قدم قدم پر چونکا رہی تھیں۔ وہ سب گھر والوں کے قیمتی جوڑے بھی لائی تھی' جبکہ حشمت اپنی ماہوار رقم میں سے بھی ماں کو پانچ' دس روپے تک نہ دیتے تھے۔ بلکہ وہ تو اس قدر گھل مل گئی تھی کہ خود ہی خالق سے فرمائش بھی کر دی کہ بچے کا نام میں رکھوں گی... انہوں نے فوراً اجازت دیتے پوچھا تھا کہ کیا نام رکھو گی۔

"آفاق... کیسا ہے؟" حشمت زیدی کی طرف دیکھتے اس نے نام کے متعلق پوچھا تھا۔

"بہت پیارا ہے... آج سے اس کا نام آفاق ہے۔" خالق بھائی نے اٹھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تھا۔ واپسی پر وہ دونوں بہت خوش تھے۔ کچی بستی سے مین روڈ تک وہ لوگ پیدل چل کر آئے تھے۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ مین روڈ پر رکشا کے لیے وہ سڑک پر کھڑے تھے تب ہی اچانک ایک گاڑی ان کے پاس آ کر رکی تھی۔ چند لمحوں کے لیے ساری کائنات رک گئی۔ کلثوم بھی سانس لینا بھول گئی تھی۔ وہ گاڑی چند لمحے ان کے پاس رکنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی۔ مگر ام کلثوم آگے نہیں بڑھ سکی اور آگے تو حشمت زیدی بھی نہیں بڑھ سکے تھے۔ انہوں نے بھی گاڑی میں بیٹھے اس شخص کو دیکھ لیا تھا... وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے۔

انہیں ام کلثوم کو یوں شام کے وقت فٹ پاتھ پہ کھڑے دیکھ کر دکھ ہوا تھا۔ وہ تو عادی تھی ہمیشہ آرام دہ گاڑی میں سفر کرنے کی۔

☼ ☼ ☼

"آج واپسی پہ میں نے ابا جان کو دیکھا حشمت!" رات کو ان کے چوڑے کشادہ سینے پر سر رکھے اس نے نم لہجے میں ہولے سے سرگوشی کی۔ وہ جو اس کے گھنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے۔'

"کتنے دن کے بعد دیکھا میں نے انہیں... پورے دس دن کے بعد... پہلے اتنے روز میں کبھی ان سے جدا نہیں ہوئی۔ اگر وہ بیرون ملک بھی جاتے تو فون لازمی کرتے تھے مجھے۔" اس کے لہجے میں اداسی تھی۔ رخصتی کے وقت اسے تو باپ کے کندھے پر سر رکھ کر جی بھر کے رونے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔ حشمت زیدی اس کی اداسی کو لب بھینچ کر محسوس کرتے رہے' مگر بولے کچھ نہیں۔

"ان کی آنکھوں میں اس قدر حیرت تھی مجھے فٹ پاتھ پر کھڑا دیکھ کے کہ چند ثانیے کے لیے میں خود دم بخود رہ گئی۔ یقیناً" انہیں دکھ ہوا ہو گا اپنی ام کلثوم کو یوں سڑک پر کھڑے دیکھ کر... میں عادی بھی کہاں تھی' یوں لوکل ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کی۔" وہ تو اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی مگر اس کا اتنا ہی کہنا غضب ہو گیا۔

"پچھتا رہی ہو مجھ سے شادی کر کے۔" حشمت زیدی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ان کی انگلیاں ام کلثوم کے بالوں میں منجمد ہو گئیں۔ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا تھا اپنی مالی حیثیت... میں نے تم سے کوئی دھوکا نہیں کیا' جو تم ایسی باتیں کر رہی ہو۔" ام کلثوم اس قدر سرد اور برفیلے لہجے پر سُن ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا حشمت... میں تو بس ویسے..."

"تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا... میں اغوا کر کے نہیں لایا ہوں تمہیں' تمہاری پوری رضامندی کے ساتھ تمہیں بیاہ کر لایا ہوں میں... بلکہ میں تو عدالتوں میں جا کر ذلیل ہوا ہوں۔ تمہارے باپ سے جوتیاں کھائی ہیں۔ مگر سچ کہا ہے کسی نے عورت ذات کبھی خوش نہیں ہوتی۔" وہ بھڑک اٹھے تھے۔

"حشمت!" ام کلثوم کی آواز بھرا گئی۔ دکھ سے وہ اپنی بات مکمل کرنا ہی بھول گئی۔ "آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔"

"میں غلط سمجھ رہا ہوں۔" وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے غصے سے ان کا سانس پھول رہا تھا۔ "ایک دنیا دیکھی ہے میں نے... میں جانتا ہوں' تم مجھے کیا باور کروانا چاہ رہی ہو۔ تم مجھے جان بوجھ کر میری کم مائیگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔" وہ بات کو طول دے رہے تھے۔ ام کلثوم نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنی جلدی غصے میں آ جاتے ہیں' بلکہ وہ تو ان کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی تھی۔

"حشمت... میں بھلا کیوں کرنے لگی ایسا۔" وہ اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی' مگر حشمت زیدی نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"بس... مجھے کوئی صفائی نہیں چاہیے اور اب مجھے سونے دو' نیند آ رہی ہے مجھے۔" وہ کروٹ بدل کر سو گئے تھے' مگر ام کلثوم ساری رات نہیں سو سکی۔ صرف دس روز ہوئے تھے ان کی شادی کو... پہلا جھگڑا' وہ بھی بے حد معمولی بات پر۔ وہ ساری رات ام کلثوم نے جاگ کر گزاری تھی' مگر اس ادراک کے ساتھ کہ حشمت زیدی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی معاف کرنے والے نہیں۔ اسے محتاط رہنا تھا۔ کیا خبر کس لمحے اس کی کوئی بات حشمت زیدی کے مزاج پر ناگوار گزر جائے۔

دوسری صبح وہ بغیر ناشتا کیے سویرے ہی پاک ٹی ہاؤس چل دیے تھے۔ انہوں نے ام کلثوم کی جانب دیکھا تک نہیں تھا۔ ام کلثوم نے بات کرنے کی کوشش کی' مگر انہوں نے جواب نہیں دیا' وہ ہر روز صبح بیڈ ٹی لینے کے عادی تھے۔ ام کلثوم بنا کر لے گئی' مگر انہوں نے چائے کی طرف نگاہ غلط بھی نہ ڈالی۔ خود ہی اپنے کپڑے نکال کر استری کیے اور تیار ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ام کلثوم پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا اس قدر سخت' اتنی کڑی... اس کی فہم سے بالاتر...

☼ ☼ ☼

تین دن کے بعد ان کا غصہ خود ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ بالکل پہلے والے ٹھنڈے میٹھے' جاں نثار' والہانہ محبت چھڑکنے والے حشمت زیدی بن گئے تھے۔ مگر ان تین دنوں میں ام کلثوم کی جان سوکھ گئی تھی۔ شاید وہ ابھی بھی نہ مانتے۔ وہ اس کو ذہنی طور پر دبا کر مفلوج کر رہے تھے' تاکہ وہ کبھی پچھتا نہ سکے اور اگر پچھتائے تو اس کا اظہار نہ کرے۔ مگر انہیں اس سے بات کرنا پڑی تھی۔ انہیں اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا۔ ان کی خالی جیب انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کرتی تھی۔

"تمہارے پاس اگر پانچ سو کھلا ہو تو دے دو... میری جیب خالی ہے بالکل۔" وہ شرمندہ سے مسکرائے تھے۔ ام کلثوم نے پیسے لا کر دے دیے۔

"نوازش بیگم صاحبہ... جلد ہی لوٹا دوں گا۔"

"میں نے کب آپ سے واپس مانگے ہیں۔ جو ایسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔" ام کلثوم خوشی سے مخمور لہجے میں شکوہ کر رہی تھی۔ اس کے لیے تو آج عید کا دن تھا۔ حشمت کا موڈ اس کے ساتھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔

"پھر بھی... میاں' بیوی میں بھی حساب کتاب تو

ہوتا ہی ہے۔" انہوں نے سگریٹ جلا کر لبوں میں دبالیا۔

"میاں اور بیوی کا ایک دوسرے پر حق بھی تو ہوتا ہے۔"

وہ مسکرائے۔ "ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو۔" انہوں نے شرارت سے اس کی ریشمی لٹ کھینچی۔ "اچھا یہ بتاؤ کیا پکا رہی ہو آج۔"

"جو آپ کا کھانے کا موڈ ہو۔ جلدی سے بنالوں گی۔" ام کلثوم تو انہیں خوش دیکھ کر سب بھول گئی تھی۔

"ایسا کرو جان! کہ اپنے لیے بنالو۔ میں تو آج دوستوں کے ساتھ کھاؤں گا۔ آج پاک ٹی ہاؤس والے دوستوں نے شادی کی خوشی میں عشائیہ مانگا ہے نا۔" ان کے بتانے پر ام کلثوم کا منہ لٹک گیا۔ اب سمجھ میں آگیا تھا کہ حشمت پیسے کیوں مانگ رہے تھے۔

"حشمت.... پھر تو پیسے کم نہیں آپ کے پاس۔" یک دم ہی اسے تشویش بھی ہوئی تھی۔

"نہیں.... بہت ہیں۔ کچھ میں نے علیم الدین سے مانگ لیے تھے۔"

"آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے ساتھ ساتھ۔" ام کلثوم نے عادت کے مطابق مشورہ دیا مگر اگلے ہی لمحے زبان دانتوں میں داب لی، مبادا حشمت کا مزاج پھر بگڑ جائے۔

"پہلی بار مانگے ہیں تم سے اور وہ بھی ادھار اور تم مجھے مشورے دینے لگیں۔" انہوں نے سنجیدگی سے جتلایا تھا۔ ام کلثوم کی جان سولی پر لٹک گئی۔ وہ پھر ناراض ہونے والے تھے مگر اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گئی تھی۔ جب انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"اس کے بارے میں بھی.... کچھ نہ کچھ سوچتے ہیں۔" ام کلثوم نے بے ساختہ شکر کا کلمہ پڑھا۔

☼ ☼ ☼

جونیئر سیکشن میں وہ بھی شامل تھی اور فائنل والوں کے فیرویل فنکشن کی تیاریوں میں پیش پیش بھی.... وہ نئی کلاس میں آنے پر پرجوش بھی تھی، مگر اس کے چلے جانے سے اداس بھی۔ یہ سچ تھا کہ اس ایک سال میں اس نے کبھی بھی اس کے بغیر یونیورسٹی آنے جانے اور یہاں اکیلے وقت بتانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، مگر وہ بہت خوش تھا، اس کا بی اے آنرز مکمل ہو رہا تھا۔ اس کی کامیابی کی سیڑھی پر پہلا قدم پوری طاقت سے پڑ گیا تھا۔ زندگی کے حوالے سے اس کی ترجیحات بہت بلند تھیں۔ اسے بہت آگے جانا تھا۔ خوب ڈھیر سارا پیسہ کمانا تھا اسے اپنے لیے۔ اپنے نام کے ساتھ قابل فخر ڈگریوں کی لمبی فہرست لگانی تھی۔ اسے خود کو کامیاب ترین انسان کہلوانا تھا اور وہ اپنے ارادوں میں اٹل تھا۔ ارسہ کو اس بات کی واضح طور پر خبر تھی، مگر وہ تعین نہیں کرپائی کہ اس کی زندگی کی ترجیحات، ضروریات اور خواہشات میں وہ کس مقام پر کھڑی ہے اور وہ ان سب میں شامل ہے بھی یا نہیں؟

وہ اس سے کبھی بھی پوچھ نہیں سکی اور وہ اسے کبھی بھی بتا نہیں پایا۔

"تمہارے کیا پلانز ہیں فیوچر کے حوالے سے؟" اس روز فیرویل فنکشن سے دو دن پہلے اس نے اس سے پوچھ لیا تھا۔ وہ خود کو روک نہیں سکی اس سوال کو پوچھنے سے۔

"ابھی فی الحال تو اچھے پیپرز کی دعا کر رہا ہوں۔ باقی پلاننگ میں نہیں کیا کرتا، جو بھی قسمت میں لکھا ہوگا وہ ہو کر رہے گا۔" اس کے انداز میں لاپروائی کا عنصر معمول سے کہیں زیادہ تھا یا پھر ارسہ کو محسوس ہوا تھا۔

"شادی کب کرو گے؟" اس نے فضول میں وقت ضائع کرنے کے بجائے صاف سیدھے انداز میں پوچھ لیا تھا۔

"شادی.... آں...." وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزا تھا۔

"کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جسے میرے وائلن سے محبت ہوگی۔ کیونکہ میری پہلی محبت میرا وائلن ہی ہے۔"

اس نے یک دم اظہار کر دیا تھا۔ ارسہ دم بخود بیٹھی

رہ گئی۔ اظہار کا انداز بہت انوکھا اور قدرے مبہم تھا۔

"کیا تم نے ایسی لڑکی ڈھونڈلی ہے جسے تمہارے وائلن سے محبت ہے؟" اس نے یقین دہانی کرنا ضروری سمجھی تھی۔

"تم محبت پر یقین رکھتی ہو ارسہ؟" یک دم اس نے پوچھا تھا۔ ارسہ کا سوال دھرا رہ گیا۔ ارسہ نے ترنت اثبات میں سرہلایا۔

"میں نہیں رکھتا۔ کیونکہ میرا یہ ماننا ہے کہ محبت دکھ کے علاوہ کچھ نہیں دیتی۔" اس نے خود ہی وضاحت کرتے ارسہ پر دکھ کا پہاڑ گرادیا۔ وہ بول نہیں پائی۔

"تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے؟" بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"یہ میرا تجربہ و مشاہدہ ہے۔۔۔ محبت انسان کو زندگی میں صرف دکھ، تنہائی اور پچھتاوے ہی سونپتی ہے۔ یہ سب کو راس نہیں آتی، اسی لیے میں محبت کرنے سے ڈرتا ہوں۔ مگر یہ بہت ظالم شے ہے۔ یہ اسی انسان کا پیچھا کرتی ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے۔" وہ بے بسی سے کراہا تھا اور وہ تو اتنی حیران تھی کہ پوچھ ہی نہیں پائی کہ کیا تمہیں بھی اس ظالم محبت نے ڈس لیا ہے جو تم ایسا کہہ رہے ہو۔

"تو تم شادی نہیں کروگے۔" وہ الٹا سوال کرگئی تھی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ تو کیا تم محبت نہیں کروگے۔۔۔ مگر اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑدیا تھا۔

"میں نے کب کہا کہ میں شادی نہیں کروں گا، بلکہ میں تو محبت بھی کروں گا۔" وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔ ارسہ میں ہمت مفقود ہوگئی کہ وہ پوچھ سکے کہ کب اور کس سے۔۔۔ اور وہ اردگرد دیکھنے میں گم رہا۔

☼ ☼ ☼

"نانی اماں۔۔۔ کیا یہ سچ ہے کہ محبت صرف دکھ دیتی ہے۔" اس روز بہت دنوں کے بعد اسے وقت ملا تھا نانی اماں کے پاس بیٹھنے کا۔ نانی اماں کی گود میں سر رکھے وہ لیٹی ہوئی تھی، جبکہ ابا میاں لاؤنج میں ذرا فاصلے پر ٹی وی پر لگے ٹاک شو میں گم تھے۔

"ہر وہ تعلق جس میں توقعات زیادہ ہوں، وہ دکھ دیتا ہے۔" انہوں نے اسے نرمی سے سمجھایا تھا۔

"تو کیا ہمیں کوئی تعلق قائم نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بھی الجھ گئی تھی۔

"ہمیں کسی بھی تعلق میں بہت زیادہ توقعات نہیں وابستہ کرنا چاہئیں۔ جب ہماری توقعات ٹوٹتی ہیں تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ رشتہ خواہ کوئی بھی ہو، ہمیں دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنا چاہیے۔"

"والدین کا اولاد پر بہت حق ہوتا ہے، ہمیشہ اس کا بھلا چاہتے ہیں۔ اس لیے اولاد کو بھی ان کی مرضی کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔"

نجانے کس وقت ابا میاں اٹھ کے ان کے قریب آئے تھے۔ ان دونوں کو ہی پتا نہیں چلا تھا۔ ارسہ جان گئی، وہ اسے کیا سمجھانا چاہتے ہیں، ویسے بھی وہ بہت حساس اور ذہین لڑکی تھی۔ اس نے جان لیا تھا کہ اسے اپنوں کا دل دکھی نہیں کرنا۔ اسے ان کی خاطر جینا ہے۔ اسے محبت نہیں نبھانی ہے۔

اس روز کے بعد وہ پھر کبھی اس سے نہیں ملی۔ جب تک فائنل والوں کو یونیورسٹی سے فارغ نہیں کردیا گیا وہ یونیورسٹی نہیں گئی۔ جس محبت کا آغاز ہوا تھا وہ انجام سے پہلے ہی بیچ راہ میں کہیں کھو سی گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

پیسے کی اہمیت کا اندازہ ام کلثوم کو اس وقت ہوا جب اس نے عملی زندگی میں قدم رکھا۔ حشمت زیدی کی جیب ہمیشہ خالی ہی رہتی تھی۔ وہ بڑی فراخ دلی سے دوستوں کو کھلانے پلانے کے قائل تھے مگر گھر میں راشن ڈالنا بھول جایا کرتے تھے۔

پہلے وہ کئی رسائل اور اخبار میں پابندی سے لکھتے تھے تو اچھی آمدنی ہوجاتی تھی، مگر اب وہ صرف ڈائجسٹ میں سلسلے وار ناول لکھ رہے تھے اور اس کا

اعزازیہ بہرحال اتنا کسی طور پر بھی نہیں تھا کہ ایک گھر کا خرچ، علاج معالجہ اور دیگر ضروریات کے ساتھ ساتھ دوستوں پر بھی لٹایا جاسکے۔

ان کے کپڑے پہلے دھوبی سے دھل کر آتے، مگر اب ام کلثوم خود ہی دھو کر کلف لگا کر استری کرکے دیا کرتی تھی۔ اس کے اخلاق اور اخلاص کی وجہ سے آئے دن اس کے سسرال والوں سے بھی کوئی نہ کوئی آیا رہتا۔ اس کی شادی کو ایک سال ہوگیا تھا اور اس ایک سال میں اس نے زندگی کے بہت سے رنگ روپ اور اتار چڑھاؤ دیکھ لیے تھے۔ حشمت زیدی کی بے پناہ محبت، غصہ، اہانت۔۔۔ حشمت زیدی بہت روکھے مزاج کے تھے۔ کبھی اتنے نرم جیسے نیم سحر کا جھونکا۔ کبھی ایسے چٹان کہ ام کلثوم کی محبت سر پٹخ پٹخ کر رہ جاتی، مگر اس سب کے باوجود بھی ام کلثوم کی محبت اس تنگ دستی یا تنگ نظری میں بھی ایک دن کے لیے نہیں پچھتائی تھی۔

اس روز جب خالق بھائی اور ان کی بیگم آفاق کی سالگرہ کا کہنے کے لیے آئے تو گھر میں چینی تک نہیں تھی کہ وہ خالی چینی کا شربت ہی بنا کر انہیں پلا سکتی۔ وہ تو اتفاق ایسا تھا کہ وہ لوگ شام کو بازار سے شاپنگ کرکے کھانا کھا کر لوٹے تھے۔ بس کھڑے کھڑے ان دونوں کو دعوت دے کر گھر چلے گئے۔ بلکہ وہ لوگ آتے وقت ام کلثوم کے لیے بھی دو کباب اور دو پراٹھے بھی لے کر آئے تھے۔

ام کلثوم کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسے کباب بہت پسند تھے۔ اکثر ہی امی جان سے فرمائش کرکے بنوایا کرتی تھی، مگر اب تو عرصہ ہوگیا تھا اس نے کباب چکھے تک نہیں تھے۔ حشمت کی محدود آمدنی اسے ایسی شاہ خرچی کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ ویسے تو حشمت دل کے خاصے کھلے انسان تھے، مگر انہوں نے کبھی خود سے لاکر دینے کی زحمت کی تھی، نہ ہی ام کلثوم نے کہنے کی۔

وہ ہر حال میں مطمئن اور خوش تھی۔ مگر اس روز والی صورت حال پر وہ سچ مچ میں پریشان ہوگئی تھی۔ اس نے نوکری کرنے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔

"ایسا کب تک چلے گا۔۔۔ آپ کوئی جاب کیوں نہیں ڈھونڈتے اب تو گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگی ہے۔" پہلی بار وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی تھی۔ حشمت زیدی نے اسے چونک کے دیکھا تھا۔

"بس۔۔۔ عشق کا بخار اتر گیا اتنی جلدی۔" وہ الٹا اس پر طنز کرنے لگے تھے۔

"میں نے تو تمہیں اپنی حیثیت پہلے ہی بتادی تھی۔" ام کلثوم جب بھی کوئی بات کرنے لگتی، وہ اسی طرح کے طعنے دے کر اسے چپ کروادیا کرتے۔ مگر آج وہ چپ نہیں ہوئی تھی۔

"حشمت! میری محبت آج بھی اسی طرح قائم ہے لیکن آپ کچھ سوچیں۔ اس طرح گزارہ نہیں ہوتا۔ کل کو ہمارے بچے ہوں گے ـــــ آپ کوئی جاب کیوں نہیں کرلیتے۔"

"جاب کروں گا تو میری تخلیق مرجائے گی۔ میں اپنی تخلیق کو زندہ رکھ کر خود امر ہونا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کئی دفعہ کی کہی بات دہرائی۔

"تو پھر مجھے اجازت دے دیجیے۔ میں کہیں جاب کرلیتی ہوں۔" اس نے تھک کر کہا تھا۔

"تمہیں باہر کمانے بھیج دوں۔ تاکہ تمہارے نام نہاد عزت دار باپ کو باتیں بنانے کا موقع مل سکے۔" وہ بھڑک اٹھے۔

"حشمت۔۔۔" وہ جیسے تھک کر بولی تھی۔ "کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

"تم جو بھی کہو۔۔۔ مگر میری انا پر یہ بات تازیانہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کما کر لاؤ۔ ابھی اتنا بھی برا وقت نہیں آیا میرے اوپر۔۔۔" ام کلثوم کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

"حشمت! آپ تو صبح کے گئے رات کو لوٹتے ہیں۔ میں سارا دن بولائی بولائی رہتی ہوں۔"

"تو گھر میں مصروف رہنے کے اور بھی تو کئی طریقے نکل سکتے ہیں۔"

"حشمت! میں اپنا گھر بنانا چاہتی ہوں۔ اسے اپنی

پسند سے سجانا سنوارنا چاہتی ہوں۔ اگر ایسے ہی حالات رہے تو یہ خواب خواب ہی رہے گا۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیسے سمجھائے انہیں۔

"میرے حالات کو برا بھلا مت کہو ثوما... اگر تمہارے باپ کو احساس ہوتا تو وہ کبھی بھی تمہیں یوں خالی ہاتھ گھر سے رخصت نہ کرتے۔ میں نہ سہی 'تم تو آسائشات میں پلی بڑھی تھیں۔ وہ تمہاری آئندہ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک گھر تو دے ہی سکتے تھے۔" ان کی تان اس کے والدین پر ہی ٹوٹی تھی' ام کلثوم چڑ گئی۔

"حشمت... مجھے یہ سب میرے والدین کیوں دیتے۔ ہمیں تو اپنا گھر خود بنانا تھا' اپنی محنت اور محبت سے۔"

"تو پھر یہ رونا بند کرو... جب کبھی میرے پاس ہوا تمہیں مل جائے گا۔ ابھی جو ہے اسی پر گزارہ کرو۔" انہوں نے بات ختم کردی تھی مگر ام کلثوم اب اس مسئلے کا حل چاہتی تھی۔

"مگر ہم کسی اچھے علاقے میں شفٹ تو ہو ہی سکتے ہیں حشمت!"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تم جان بوجھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کررہی ہو یا واقعی تمہیں میری بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" وہ لیٹے سے اٹھ بیٹھے تھے۔

"حشمت... میں یہ دونوں کام نہیں کررہی... میرے پاس کچھ پیسے ہیں' آپ وہ لے لیں اور کوئی اچھا سا گھر ڈھونڈ لیں... میں اب یہاں اور نہیں رہ سکتی۔ سارا دن ساری ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور' یہاں کا ماحول' گندگی میری برداشت سے باہر ہوچکی ہے۔" وہ اس کی بات کے جواب میں مبہم سا مسکرائے تھے۔

"میں ابھی لا کے دکھاتی ہوں۔" اسے لگا شاید انہیں یقین نہیں آرہا۔ اس نے جوش میں چیک لاکر حشمت کو دکھایا تھا' جو بتول آپی نے شادی کے دوسرے دن دیا تھا۔

"یہ دیکھیں!" اس نے چیک ان کے سامنے لہرایا۔ وہ حیران رہ گئے۔ اچھی خاصی رقم کا چیک تھا۔

"یہ تمہیں کس نے دیا اور کب؟" وہ حیران ہوئے تھے۔

"بتول آپی دے گئی تھیں۔ ابا جان نے دیا تھا کہ کچھ ضرورت کی چیزیں خرید لوں۔"

"تمہارے ابا جان آئے تھے یا تمہاری بہن۔ تم نے مجھے بتایا نہیں۔" ان کے لہجے میں یک لخت سنجیدگی در آئی تھی۔

"کوئی نہیں آیا حشمت! یہ بتول آپی نے مجھے شادی کے دوسرے دن دیا تھا۔ مجھے کبھی اس کا خیال ہی نہیں آیا۔" وہ سادہ سے لاپروا انداز میں کہہ رہی تھی' مگر حشمت زیدی کو جی بھر کے برا لگا تھا۔

"تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا۔ ہم اتنے دن مشکل حالات میں رہے اور تم احمق عورت... اتنے پر ہی راضی ہوگئیں۔ کیا تمہارا حق ان کی لمبی چوڑی جائیداد میں سے صرف بیس ہزار ہی نکلتا ہے؟"

"حشمت... مجھے ان کی جائیداد میں سے کچھ نہیں چاہیے۔" مگر وہ اور بھی بھڑک گئے۔

"نہیں چاہیے تو پھر یہ احسان لینے کی بھی کیا ضرورت تھی۔" ام کلثوم کو تو یہ خدشہ تھا کہ وہ اس بات پر بگڑیں گے کہ اس نے وہ چیک لیا ہی کیوں' مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس بات پر لڑیں گے کہ اتنے کم پیسوں کا چیک کیوں لیا۔ وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے... میں یہ چیک واپس بھجوا دیتی ہوں۔" اس نے چیک ان سے لینا چاہا' مگر انہوں نے واپس لے کر جیب میں رکھ لیا۔

"رہنے دو... صبح میں کہوں گا علیم الدین سے کہ کسی اچھے علاقے میں مکان ڈھونڈ کردیں۔" انہوں نے اس کی ذات پر احسان عظیم کیا تھا۔

"سچ... آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت! تھینک یو سو مچ۔" وہ خوش ہوگئی تھی۔ اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے۔ وہ ہر روز حشمت سے اپنے گھر کا پوچھتی' مگر وہ کہتے کہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ ابھی گھر نہیں ملا۔ جب تین

ماہ گزر گئے تو اس نے ان سے وہ چیک واپس مانگا تھا۔ اس کے پاس وہی بری کے چند جوڑے تھے۔ شدید گرمی میں بھی اس نے وہی ساٹن کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ مگر وہ بھی اب تو گھس گھس کے بے حال ہوچکے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ پیسے نکلوا کر کپڑے بنالے گی' مگر حشمت نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے وہ چیک تین ماہ پہلے ہی کیش کروالیا تھا۔

"جس انجمن سے میں منسلک ہوں اس کو فنانشنل سپورٹ کی ضرورت تھی تو میں نے کچھ پیسے انہیں دے دیے۔ کچھ گھر کے خرچ میں صرف ہوگئے۔" انہوں نے بے نیازی سے کہا۔

"مگر حشمت... وہ پیسے تو ہمارے گھر کے لیے تھے؟" اسے ازحد دکھ ہوا تھا۔

"تو اتنے سے پیسوں سے گھر آجانا تھا کیا... اپنے باپ سے اور پیسے منگوالو' گھر خرید لیں گے' اچھا اور بڑا سا۔"

"مگر حشمت! آپ نے انجمن کو پیسے کیوں دیے' ہماری اتنی حیثیت کہاں ہے؟"

"میں لیڈر ہوں۔ ترقی پسند مصنفین انجمن کا... اور یہ میرا فرض تھا کہ پہلا دیا میں اپنے گھر سے جلاتا۔" ام کلثوم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ اسے حشمت زیدی کی بے حسی سے شدید دکھ ہوا تھا۔ وہ کچھ نہیں بول پائی تھی اور احساسات و جذبات کا گہرا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے حشمت زیدی اس کی خاموشی کو سمجھے تک نہیں تھے۔

وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی تھی۔ اسے حشمت زیدی سے ایسی توقع بہرحال نہیں تھی۔ انہیں اس بات کا احساس تھا کہ جس انجمن کے وہ لیڈر ہیں اسے سپورٹ کریں' مگر انہیں اپنے گھر کی ضروریات اور دگرگوں حالت نظر نہیں آئی تھی۔ اس اکلوتے کمرے کی پلستر اکھڑی سیلن زدہ دیواروں کی بدبو... فرنیچر پر آندے کا اکھڑا فرش' کچن کی بھربھری ہوکر روز بروز بکھرتی سلیب... انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

"اب اٹھ بھی جاؤ... کس کا سوگ منارہی ہو؟" وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئے تھے۔ بے حد تلخی سے استفسار کرتے ہوئے وہ ام کلثوم کی دلی و ذہنی کیفیت سے قطعی طور پر لاتعلق نظر آرہے تھے۔

"کھانا دو... مجھے بہت بھوک لگی ہے؟" ام کلثوم کو غصہ آگیا تھا' گھر میں تین دن سے راشن ختم تھا اور وہ حشمت سے کہہ کہہ کے تھک چکی تھی۔ اب تو وہ اکثر ہی جلدی چلے جایا کرتے اور رات گئے لوٹا کرتے تھے۔

"کہاں سے لاؤں کھانا... گھر میں ایک چٹکی زہر تک نہیں' جو میں ان حالات سے تنگ آکر پھانک لوں۔" وہ بھی غصے میں آگئی تھی۔ بہت عرصے بعد اس کے اندر کی جذباتی اور ضدی ام کلثوم نے سر ابھارا تھا مگر حشمت زیدی اس کے ایسے رویے کے عادی نہیں تھے۔

"کیا بکواس کررہی ہو۔ اگر اتنی ہی تنگ ہو ان حالات سے تو چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے ماں' باپ کے گھر... وہاں تو روپے پیسے کی کمی نہیں ہوگی تمہیں۔" ام کلثوم تو دم بخود رہ گئی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ حشمت اسے یوں جانے کو کہہ دیں گے۔

"چلی جاؤں؟" اس نے دکھ سے دہرایا۔ "آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ چلی جاؤں' جو کچھ میں آپ کے کہنے میں آکر ان کے ساتھ کرچکی ہوں' اب کوئی گنجائش رہ گئی ہے کیا میرے واپس جانے کی؟"

وہ دکھ سے چور ہوتی کہہ گئی تھی۔ مگر اس کی یہ بات حشمت زیدی کو تازیانے کی مانند پڑی تھی۔ وہ بلبلا اٹھے تھے۔

"میں ورغلا کے نہیں لے گیا تھا تمہیں۔ نہ ہی میں نے تمہاری منت کی تھی۔ تم خود آئی تھیں میرے پاس... تم جیسی امیر گھروں کی لڑکیاں والدین کی عزت کو کیا جانیں۔"

"حشمت... آپ میری محبت کی توہین کررہے ہیں۔ میں نے کب کہا کہ میں تنگ ہوں اور کب شکایت کی آپ سے۔ آپ جن حالات میں رکھ رہے ہیں' میں رہ رہی ہوں' میں نے کب کی آپ سے شکایت... پورا سال گزر گیا مجھے ان چار جوڑوں کو پہنے

ہوئے، اب تو وہ بھی گھس گھس کر بدرنگ ہو چکے ہیں۔" وہ سسک اٹھی تھی۔

"تو جاؤ اور جا کر میری غریبی کے پوسٹر لگوادو زمانے میں۔۔۔ کہ نامور لکھاری کی بیوی بری کے بدرنگ اور گھسے ہوئے چار جوڑوں میں سال بھر سے گزارہ کر رہی ہے۔" وہ بھڑکے تھے۔

"غلط بھی نہیں ہے اور ہاں یہ میری ہی غلطی تھی۔ میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا تھا۔ مجھے اپنی کرنی کو بھرنا تو ہے ہی۔" آج تو ام کلثوم کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا، وہ بھی دوبدو جھگڑا کر رہی تھی۔

"تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے باپ کے گھر۔۔۔ تاکہ مجھے بھی سکون ملے کہو تو میں ہی چلا جاتا ہوں گھر سے۔۔۔ تم راضی ہو جاؤ بس کسی طرح سے۔"

وہ کڑھتے ہوئے گھر سے نکل گئے تھے۔ ام کلثوم بے بسی سے رو دی۔ وہ اس کو ہی غلط کہہ گئے تھے۔ وہ ساری رات گھر نہیں لوٹے تھے۔ ام کلثوم جب رو رو کے تھک چکی تو اسے حشمت کے نہ لوٹنے کی پریشانی لاحق ہونے لگی۔ اس کا جی چاہا وہ ان کے پیچھے جائے۔ ان کا پتا کرے، ان کو جا کر ڈھونڈے، انہیں منا کر لائے، مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکی، کیونکہ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھے۔ ساری رات انہوں نے ٹی ہاؤس میں سگریٹ پھونک پھونک کے گزاری تھی۔ جب غصہ اترا تو احساس ہوا کہ وہ غلط کر آئے ہیں۔

پھر وہ ایک فیصلہ کر کے اٹھے۔

☼ ☼ ☼

گھر واپس آتے ہوئے وہ ازالے کے طور پر نان اور پوریاں لائے تھے۔ دودھ، کیک، پتی، چینی اور دیگر اشیائے خورونوش کا سامان بھی لائے تھے۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازے کی دستک پر بے تابی سے کان لگائے ام کلثوم فوراً" اٹھی تھی۔ حسب توقع حشمت ہی تھے۔ اس کی ویران آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہونے لگا، انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھالیا تھا۔ ام کلثوم کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی لڑیوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے۔

"ناراض ہے میری جان" انہوں نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد حمائل کرتے پوچھا تو ام کلثوم اس التفات پر اور زیادہ بکھر گئی تھی۔

"وہ دن دور نہیں، جب تم پیسے میں کھیلوگی۔ ایک بہترین بنگلہ خرید کر تمہارے نام کروں گا۔ بہت جلد تمہیں ایک خوش خبری سنانے والا ہوں۔ ایک ڈرامہ لکھنے کی آفر ملی ہے ان دنوں۔ اب اٹھو اور جا کر ناشتا لے کر آؤ۔ بہت بھوک لگی ہے مجھے۔" مگر وہ اٹھی نہیں، وہیں جمی رہی۔

حشمت زیدی اٹھ کر خود ہی کچن میں گئے اور نکال کر لائے۔ اس روز خود ہی انہوں نے ام کلثوم کو کھانا کھلایا۔ وہ برستی آنکھوں سے ان کے ہاتھ سے کھاتی رہی اور سوچتی رہی۔

کیا حشمت زیدی کی کہی گئی ان باتوں کی تکلیف کا ازالہ ان کے اس التفات سے ہو سکتا ہے۔ اس کا دل و دماغ نفی کی گردان کر رہا تھا اور وہ برستی آنکھوں سے نوالہ چبانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر ابھی تو آغاز ہوا تھا۔

حشمت زیدی نے کچھ دن اس کا بہت زیادہ خیال رکھا تھا۔ ام کلثوم مطمئن رہنے لگی تھی مگر اس کا اطمینان عارضی ثابت ہوا تھا۔ ام کلثوم اس روز انہیں سرشام ہی گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ ان کے ہمراہ ایک وکیل تھا۔

"جلدی سے دو کپ چائے لے کر آؤ۔" انہوں نے آتے ہی آرڈر جاری کیا۔

جب وہ چائے بنا کر آئی۔ اس وقت وکیل کچھ کاغذات پھیلائے اس کی آمد کا منتظر تھا۔

"تو۔۔۔ ان پر دستخط کر دو۔" انہوں نے ایک فائل اس کے سامنے کر دی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" اس کے ذہن و دل میں یک لخت آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

"یہ تمہارے حق کی جنگ ہے اور یہ جنگ تمہیں لڑنی ہے ام کلثوم! اپنا حق لینا ہے۔" ام کلثوم ان کی بات سمجھ نہیں سکی۔

"تو ما جان۔۔۔ تم اپنے والدین پر کیس کرو گی اپنے حصے کی جائیداد کے حصول کا۔" انہوں نے بے حد نرمی سے اس کے حواسوں پر بم پھوڑا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"میں وکیل صاحب کو ساتھ اسی لیے لے کر آیا ہوں۔ سارے کاغذات مکمل ہیں، ہم اپنا حق لیں گے۔ تمہاری ہر خواہش پوری ہو گی۔ کوئی آرزو تشنہ نہیں رہے گی۔"

ام کلثوم کو اس لمحے ان سے بے حد کراہیت محسوس ہوئی تھی۔ وہ خوشبو بھری مہکتی ہوئی باتیں لکھنے والے کس قدر ذہنی گراوٹ کا شکار تھے۔ ان کے جذب سے بھرپور لہجے میں ام کلثوم کو سانپ کی پھنکار محسوس ہو رہی تھی۔ کیا کوئی کسر باقی تھی جو وہ مزید اپنے والدین کو رسوا کرتی۔ اس نے تو پہلے ہی انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور اب وہ انہیں عدالتوں میں گھسیٹ لے۔ اس کا باپ جس نے ساری زندگی لوگوں کے کیس لڑے تھے۔ ان کے فیصلے کیے تھے۔ آج وہ خود فریق کی حیثیت سے کٹہرے میں کھڑا ہو جائے۔ پہلی بار ام کلثوم کو اپنی محبت پر پچھتاوا، اپنے انتخاب پر شرمندگی ہوئی۔ اس کا سر بے ساختہ نفی میں ہلا اور پھر ہلتا چلا گیا۔

"میں ان کاغذات پر ہرگز سائن نہیں کروں گی۔" اس نے قطعیت سے انکار کیا تھا۔ اپنی اور صرف اپنی عزت کی پروا کرنے والے حشمت زیدی کو اس کے انکار پر بہت سبکی محسوس ہوئی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" وہ ہولے سے اس کے کان کے پاس غرائے۔ وکیل کا خیال نہ ہوتا تو شاید تھپڑ لگا دیتے۔

"نہیں۔۔۔ ان کاغذات۔۔۔ پر دستخط نہیں کروں گی۔" جواباً" ایک مرتبہ پھر اس نے ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کرتے کہا تھا۔

"تو ما جان۔۔۔ یہ میں تمہارے لیے کر رہا ہوں۔" انہوں نے اچانک ہی پینترا بدلا۔ جانتے تھے دال ایسے نہیں گلے گی۔

"آپ جو بھی کہیں حشمت۔۔۔ مگر میں یہ سب نہیں کروں گی، کبھی بھی نہیں۔" وہ مڑ کر اندر چلی گئی۔ حشمت زیدی نے لب بھینچے۔ وکیل اٹھ کر ان کے نزدیک آئے۔

"حشمت صاحب۔۔۔ میں چلتا ہوں۔ آپ نے خوامخواہ میرا اتنا وقت برباد کیا۔ پہلے بیوی کو تو راضی کر لیتے آپ۔" تابوت میں آخری کیل وکیل کے طنز نے ٹھونک دی۔ وہ جیسے تیسے اسے رخصت کر کے اندر آئے، اندر کلثوم بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔

"ہاں اب بول منحوس عورت۔۔۔ ابھی باہر کیا بکواس کر رہی تھی تو۔۔۔" وہ اس کے ان ریشمی بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر کھینچ رہے تھے، جن کی مسحور کن خوشبو کی تعریف میں وہ صفحات بھر دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اس کے پھول جیسے گال پر کس کر تھپڑ مارا تھا۔ جس کی رعنائی و دلکشی بیان کرتے وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیا کرتے تھے۔ خواتین کی اکثریت اپنی اس قدر عزت و تکریم پر اپنے خون سے ستائشی خط لکھا کرتی تھیں۔ اگر وہ اس وقت اس ساحر کے منہ سے آگ اگلتے الفاظ سن لیتیں تو ہمیشہ کے لیے ان پر لعنت بھیج دیتیں۔ وہ اسے مارنے لگے ام کلثوم کی آنکھوں سے بے بسی سے آنسو نکلے، اس کی چیخیں حلق میں ہی گھٹ گئی تھیں۔

"بہت زبان درازی کرنے لگی ہے نا تو۔۔۔ گدی سے کھینچ لوں گا تیری زبان اگر اب بکواس کی تو۔"

"میں اپنے باپ کو مزید رسوا نہیں کروں گی۔ چاہیں آپ مجھے جان سے مار دیں۔" وہ گھٹی گھٹی چیخوں میں بس اتنا ہی بول پائی۔

"جان تو میں تیری نکال ہی دوں گا۔ یہ تیری بھول ہے کہ اب کبھی تو اپنوں سے ملے گی۔ تیری ساری کشتیاں میں اپنے ہاتھوں سے جلا دوں گا۔" وہ اسے ٹھوکر مار کر نیچے گراتے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

آنے والے دنوں میں حالات سلجھنے کے بجائے مزید الجھ گئے تھے۔ حشمت زیدی کئی کئی دن گھر نہ لوٹتے۔ وہ بھوکی پیاسی مہر بہ لب گھر کے کونے کھدرے میں بے حس و حرکت پڑی رہتی دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ چہرے پر زردی کھنڈ گئی اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ وہ سندوری رنگت والی نازک اندام ام کلثوم کہیں کھو سی گئی تھی۔

دروازے پر بہت دیر سے دستک ہو رہی تھی۔ ام کلثوم نے اپنی ہمت مجتمع کر کے خود کو اٹھانے کی سعی کی ٹانگوں میں واضح لرزش اسے کھڑا ہونے نہیں دے رہی تھی۔ وہ کل سے بھوکی تھی اور حشمت زیدی تین دن سے گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا تو ٹھٹک گئی۔ سامنے علیم الدین کھڑے تھے۔ ام کلثوم نے بے ساختہ دوپٹا سر پہ جما کر دایاں گال چھپایا، جس پر نیل پڑا تھا۔ علیم الدین صاحب نے اسے بے حد دکھ سے دیکھا۔ ان کے گھریلو حالات اور حشمت زیدی کی روا ظلم کی داستان کسی طور بھی ان کی نگاہوں سے مخفی نہیں تھی۔ انہوں نے خاموشی سے ایک شاپر ام کلثوم کی جانب بڑھایا۔

"بٹیا..... ایک بات کہیں آپ سے....." وہ جاتے جاتے پلٹ کر آئے تو ام کلثوم نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلا دیا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"کہیے بھائی صاحب!" ام کلثوم نے انہیں چپ بیٹھے دیکھ کر استفسار کیا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئے تھے "تم میری بیٹیوں کی طرح ہو ام کلثوم! اور ایک بڑے بھائی اور باپ ہونے کی حیثیت سے میں یہ بات تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ گھر میں کوئی مسئلہ ہو جائے تو اسے مل بیٹھ کر سلجھا لینا چاہیے۔ اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے' ورنہ باہر کی دنیا کے غاصب گھات لگائے اس گھر کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا میری بات!"

ام کلثوم نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا' مگر بولی کچھ نہیں۔ علیم الدین بھائی اسے کیا سمجھانا چاہ رہے تھے۔ اس کے گھر کو کس سے خدشہ تھا۔ اس کی خوشیوں کا کون غاصب تھا۔ سوالات کا ایک ہجوم تھا جو اس کے ذہن میں شور مچا رہا تھا۔ اس شام وہ خودنی ہاؤس جانے کے ارادے سے تیار ہو کر نکلی تھی۔ اس نے علیم الدین بھائی کی باتوں کا اثر لیا تھا اور اسی لیے وہ حشمت زیدی کو منانے کے لیے جا رہی تھی۔ اسی جگہ جہاں پہلی بار وہ ان سے ملنے گئی تھی۔ جہاں ان دونوں کی محبت کی داستان پروان چڑھی تھی۔ جہاں انہوں نے ایک دوسرے کو جانا تھا اور جہاں ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔

ام کلثوم نے بے ساختہ دروازہ تھام کر سامنے کا دھندلا پڑتا منظر دیکھا۔ وہ ساکت ہو گئی۔ کائنات تھم گئی۔ اس کی سانس رک گئی۔ بس وہ مری نہیں تھی۔ سامنے حشمت زیدی شیشے والی کھڑکی کے پاس ایک طرح دار لڑکی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ شاید وہ اس کا ہاتھ دیکھ رہے تھے اور دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جواباً" وہ شرم سے سرخ پڑ رہی تھی۔ ام کلثوم کا مان، فخر و غرور آن واحد میں بکھر گیا۔ وہ کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ حشمت اس سے بے وفائی کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں' ان کی محبت اتنی جلدی فقط ایک سال میں اپنی کشش کھو سکتی ہے۔ ام کلثوم کو وہیں کھڑے کھڑے علیم الدین بھائی کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں۔ وہ الٹے قدموں وہاں سے لوٹ آئی۔ یہ نظر کا دھوکا نہ تھا۔

حشمت زیدی واقعی آج کل اس عورت کے چکر میں تھے۔ وہ لاہور شہر کی طرح دار ابھرتی ہوئی شاعرہ تھی۔ آج کل اپنے التفات حشمت زیدی پر نچھاور کر رہی تھی۔ وہ ہر جگہ ان کے ساتھ جاتی تھی ان دونوں کی بے تکلفی التفات اور دوستانہ تعلقات کسی

سے بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ ٹی ہاؤس میں حشمت زیدی کے خلاف ہونے والی چہ مگوئیاں ان کے کردار کی دھجیاں بکھیر دینے کو کافی تھیں۔ سب ہی کو معلوم تھا انہوں نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کیسے اور کن حالات میں کی تھی۔ سو اب اتنی جلدی ان کا پہلی شادی سے دل بھر جانا اور دوسری عورتوں کے چکر میں پڑنا ان کو زیب نہیں دیتا تھا۔ ان کی شخصیت کو گرہن لگ رہا تھا۔ مگر انہیں خبر نہیں تھی۔

وہ اردگرد سے بے نیاز آگے کی جانب بڑھ رہی تھی۔ تب ہی اچانک اسے بہت زور کا چکر آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ علیم الدین بھائی اس تک پہنچتے، وہ نیچے گر چکی تھی قریب آتی گاڑی نے یک دم بریک لگائے تھے۔

وہ اپنے ڈرائیور کے نکلنے سے بھی پہلے نکلے تھے۔ وہ اس شہر کے معزز ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج تھے۔ وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے۔ ان کا کلیجہ پھٹ گیا تھا اپنی ام کلثوم کو اس حالت میں دیکھ کر۔ پورے ایک سال بعد وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ انہیں خود پر بے تحاشا غصہ آیا۔ انہوں نے کیوں لاپروائی برتی تھی۔ بچے تو غلطیاں کرتے ہی ہیں والدین کو ہمیشہ اپنا دل اور ظرف وسیع رکھنا پڑتا ہے۔ وہ تو جانتے تھے حشمت زیدی کی فطرت واوقات.....

انہوں نے بے ہوش پڑی ام کلثوم کو بازوؤں میں اٹھا کر دل گرفتی سے گاڑی میں ڈالا۔ علیم الدین واپس لوٹ گئے۔ اب انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ ام کلثوم محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے جب ہوش آیا تو ایک جانا پہچانا روح کو سرشار کرتا لمس اس نے محسوس کیا تھا۔ اس کے اندر یکلخت سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے۔ اس نے خود کو تپتے صحرا سے آن واحد میں نخلستان میں محسوس کیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر بے ساختہ اس مہربان وجود کو دیکھنے کی کوشش کی، جس کے لمس کو وہ کروڑوں میں پہچان سکتی تھی۔ جس کے لیے وہ ترس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا حلیم پُرشفقت چہرہ تھا۔

ام کلثوم کا دل کٹ کٹ کر گرا..... اس کے ابا جان بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی حالت پر غمگین تھے۔ ام کلثوم نے بالکل بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ یہاں کیسے اور کس طرح پہنچی، اسے کچھ کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑی، والدین کو کچھ بتانے کی ضرورت کبھی پڑتی بھی نہیں، وہ دل کی بات جان جایا کرتے ہیں۔ وہ بچوں کی غلطیاں معاف کردیا کرتے ہیں، جیسے ام کلثوم کی غلطی معاف کردی گئی تھی۔

علیم الدین کے بتانے پر حشمت زیدی کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تھی۔ انہیں ندامت نہیں ہوئی کہ ام کلثوم انہیں اس شاعرہ کے ساتھ دیکھ کر دل گرفتہ ہوگئی ہے۔

"حد ہے علیم الدین صاحب! کم از کم آپ کو ہمیں بتانا تو چاہیے تھا۔"

"میں سمجھتا ہوں ام کلثوم بٹیا اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں اور آپ کو جانا چاہیے ان کی خبر گیری کرنے کے لیے۔"

"کیسے جاؤں میاں! اس کے باپ کو آپ جانتے ہیں نا۔ کیسا ہتک آمیز سلوک وہ کرسکتے ہیں ہمارے ساتھ۔" انہیں اپنی عزت وانا بہت عزیز تھی۔ ام کلثوم سے کہیں زیادہ۔

"بٹیا تو ٹوٹ جائیں گی، اگر آپ ان کی خبر گیری کے لیے نہ گئے تو۔"

"اور جو میری عزت کا جنازہ نکلے گا اس کا کیا۔" وہ تن کر کھڑے ہوگئے تھے۔

"تو پھر آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ فیصلہ کرلیجیے کہ آپ کو محبت بچانی ہے یا عزت۔" وہ یہ کہہ کر پلٹ گئے حشمت زیدی سوچوں میں ڈوب گئے۔

کچھ سوچا پھر.....؟" علیم الدین چائے لے کر آئے تو انہیں سوچوں میں ہنوز گم دیکھ کر پوچھ بیٹھے۔

"ام کلثوم ہمارے دل میں بستی ہے علیم الدین صاحب! مگر....." وہ اٹک گئے۔

"محبت میں اگر مگر نہیں چلتے حضور۔" علیم الدین ہولے سے مسکرائے، بڑی عجیب بات تھی محبت لکھنے اور تخلیق کرنے والے انسان کو ایک عام انسان محبت کرنا سمجھا رہا تھا۔

حشمت زیدی شام کو ام کلثوم کو لینے کے چلے لیے گئے۔ وہ ڈرائنگ روم میں ام کلثوم کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے اور یہ حشمت زیدی کی بدقسمتی تھی کہ ام کلثوم نے باپ کی ہمدردی و توجہ ملتے ہی انہیں ساری حقیقت کہہ سنائی تھی۔ یا ام کلثوم کی بے وقوفی تھی جو اس نے گھر کا بھرم توڑ دیا۔

ام کلثوم نے ان کے دل میں حشمت زیدی کے خلاف نفرت میں اضافہ کردیا تھا۔

"وہ تم سے ملنا نہیں چاہتی۔" انوار حسین نے اسے ڈرائنگ روم میں آکے بتایا تھا اور وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم ان سے اپنی محبت سے اس وقت اس قدر دل گرفتہ تھی کہ اس نے ملنے سے انکار کردیا تھا۔ جبکہ حشمت زیدی کو شاک لگا تھا۔

"میں نہیں مان سکتا کہ وہ ایسا کہہ سکتی ہے۔ وہ بیوی ہے میری۔" ان کے لہجے میں مان تھا۔ مسٹر انوار حسین ان کے حد درجہ یقین پر تمسخر سے ہنسے۔

"اچھا....." اچھا لمبا استہزائیہ انداز میں کھینچا۔ "وہی بیوی جو تین دن سے گھر میں فاقے کاٹ رہی تھی اور تم ٹی ہاؤس میں کسی دوسری عورت کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔ وہی بیوی جو بے ہوش ہو کر سڑک پر گر جاتی ہے اور تمہیں پانچ روز کے بعد پتا چلتا ہے۔" وہ حسب عادت انہیں بھگو بھگو کر مار رہے تھے۔ ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا وہ سامنے کھڑے شخص کا خون کردیتے۔

"دیکھیے محترم..... یہ ہم میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے۔ اسے ہم خود مل بیٹھ کر سلجھائیں گے۔" انہوں نے کڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہونہہ..... سلجھائیں گے۔ کیا اس کی حالت کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ معاملات سلجھ جائیں گے۔" انہوں نے اس پر طنز کیا تھا — "چلے جاؤ یہاں سے اور آج کے بعد ادھر کا رخ کبھی مت کرنا، ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ بھول جاؤ کہ کسی ام کلثوم سے کوئی تعلق تھا تمہارا۔ کیونکہ اب میں اپنی بیٹی کو اس کال کوٹھڑی میں کبھی فاقے کاٹنے کو نہیں بھیجوں گا۔ پہلے بھی جو میں کرچکا ہوں۔ اسی پر —— بہت شرمندہ ہوں۔ اب مزید کوئی غلطی نہیں دہرا سکتا۔"

"اگر یہ سب کچھ ام کلثوم میرے سامنے کہہ دے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔" ان کی بلبلاتی انا یک دم ہی انہیں جذباتی کرگئی تھی۔ جو وہ اتنا بڑا دعوا کرگئے تھے۔

"تمہیں جتنا پیسہ چاہیے میں دینے کو تیار ہوں، مگر میری بیٹی کی زندگی سے نکل جاؤ۔" انہوں نے ان کی لالچی فطرت کے پیش نظر دانہ پھینکا تھا۔

"اس بات کا فیصلہ ام کلثوم کرے گی۔ پہلے اس سے پوچھ لیں۔" ام کلثوم کو بلایا گیا، مگر وہ نہیں آئی۔ تین بار بلانے پر وہ مجبوراً آئی۔ حشمت زیدی کو اسے دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی تھی، ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ وہ ام کلثوم نہیں تھی جو کلیوں جیسی شباہت رکھتی تھی۔ حشمت زیدی اس کی طرف بے تابانہ بڑھے تھے اور بس وہ ایک اضطراری لمحہ جس میں زمانہ شناس مسٹر انوار حسین نے سوچا تھا وہ حشمت زیدی کو ام کلثوم کو لے جانے کی اجازت دے دیں گے۔

"کیسی ہو ثوما جان!" وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھے، مگر ام کلثوم نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔

"مرگئی ثوما۔ اسی دن جس دن اس نے آپ کو کسی اور کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھاتے دیکھا۔ مرگئی اس روز ثوما جس دن اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی محبت کا قتل ہوتے دیکھا تھا۔"

وہ ہانپنے لگی تھی۔ وہ بہت زیادہ کمزور ولاچار ہوگئی تھی۔ مسٹر انوار حسین خاموشی سے باہر نکل گئے تھے۔

"میری بات سنو ثوما! تمہیں غلط فہمی....."

"نہیں..... مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی' کم از کم اس مرتبہ..... آپ جیسا خود غرض' سفاک اور لالچی انسان میری محبت کے قابل ہی نہیں تھا' میں ہی غلط ہی تھی۔"

"تم پچھتاؤ گی ثوما..... مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دے کر۔" انہوں نے اپنی طبیعت کے برعکس تحمل کا مظاہرہ کیا تھا' جبکہ وہ چیخ پڑی تھی۔

"میں پچھتا رہی ہوں حشمت زیدی! اور دن میں ہزار بار اس فیصلے پر خود کو کوستی ہوں' جس وقت میں اپنے باپ کی عزت نیلام کرکے آپ کے ساتھ گئی تھی۔" وہ جواباً پھنکاری تھی۔

"اوہ..... تو اب محبت تمہارے لیے پچھتاوا بن گئی ہے؟" ان کے سنجیدہ طنزیہ لہجے کی گہرائی میں کہیں کہیں دکھ کی شدت تھی' مگر ام کلثوم جذبات کی رو میں بہتے محسوس نہیں کرپائی۔

"آپ کی محبت نے مجھے ایک سال کی رفاقت میں سوائے پچھتاووں کے اور کچھ نہیں دیا۔"

"گھر چلو ثوما جان..... ہم اپنے مسائل خود حل کریں گے۔" وہ پھر بھی اس کی طرف بڑھے تھے' مگر ام کلثوم مزید چیخ گئی تھی۔

"کون سا گھر..... وہ گھر جس میں سے آپ مجھے ہمہ وقت نکالنے کے درپے رہتے تھے۔ نکل آئی آپ کے گھر سے..... یہ میرا گھر ہے۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔"

"ثوما..... میں آخری بار کہہ رہا ہوں' میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔" وہ دھمکی دینے والے انداز میں اسے ڈرا رہے تھے۔

"اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھیں مسٹر حشمت زیدی! میں دیکھتی ہوں کہ کون ایسی عورت ہوگی جو آپ جیسے دولت کے پجاری' خود غرض اور سفاک انسان کے ساتھ گزارہ کرتی ہے۔ جائیں ڈھونڈیں پھر کوئی ام کلثوم..... اور ہتھیانے کی کوشش کریں اس کی جائیداد۔ میں کم از کم "اب" کسی بہلاوے میں آنے والی نہیں ہوں۔" وہ روتے روتے چلائی تھی۔

"ٹھیک ہے' تو پھر رہو اپنے ماں' باپ کے گھر میں۔ یاد رکھنا کہ میں دوبارہ نہیں آؤں گا۔ میں دولت کا پجاری ہوں یا نہیں' مگر تم ضرور ہو جو محبت کا دعوا کرکے دولت کے بغیر نہیں رہ پائیں۔" وہ حسب عادت سارے قصور اس کے کھاتے میں ڈال کر چلے گئے تھے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

"ام کلثوم!" مسز حسینہ اس کے رونے کی آواز پر اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

"سب کچھ ختم ہوگیا امی جان..... میرا سب کچھ ختم ہوگیا۔" وہ امی کی گود میں بے ہوش ہوگئی تھی۔ محبت کا سفر آغاز سے ہی انجام کی جانب بڑھ گیا تھا۔ قابل افسوس' قابل مذمت.....

☼ ☼ ☼

"اب کیا ہوگا؟" یہ سوال ایک مرتبہ پھر ام کلثوم کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھا۔ اس وقت جب اسے ماں بننے کی خبر ملی تھی۔ ایک مرتبہ پھر پورے گھرانے پر مردنی چھاگئی تھی۔ ام کلثوم کو جس روز یہ خبر ملی اس کے اندر ایک نئی امید جاگی۔ شاید کہ اب حالات درست سمت پر آجائیں۔ حشمت زیدی باپ بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کرلیں۔ یہ خبر حشمت زیدی کے گھر والوں تک بھی پہنچی۔ انہوں نے بھی حشمت زیدی کو سمجھایا تھا۔ مگر ان کی نہ ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ خالدہ بی بی' خالق اور علیم الدین بھائی سب ہی نے اپنی سی کوشش کرکے دیکھ لی تھی۔

"وہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے اب علیم الدین صاحب! اس کے نزدیک باپ کی دھن دولت کی اہمیت ہے تو پھر ٹھیک ہے نا' رہے اپنے باپ کے ہمراہ۔" ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"ایسا مت کہیں حضور..... ہمیں پورا یقین ہے اگر ہم ام کلثوم بٹیا کو لینے کے لیے جائیں تو وہ ابھی ہمارے ساتھ آنے پر راضی ہوجائیں گی۔" ان کے لہجے میں مان تھا۔

"رہنے دیجیے محترم..... ام کلثوم اب وہ نہیں رہی جسے میں یا آپ جانتے تھے۔ وہ اب بہت بدل چکی ہے اور پھر میں اس سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتا۔" انہوں نے انکار کردیا تھا' مگر علیم الدین نے ہار نہیں مانی تھی۔ وہ اور خالدہ بی بی صلح کی غرض سے ام کلثوم کے پاس گئے تھے اور انہیں ساتھ چلنے کو کہا تھا۔

"آپ کی بات سر آنکھوں پر بھائی..... مگر میں اب اس گھر سے اس طرح نہیں جاسکتی۔ میرے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ میرے ابا جان طے کریں گے اور وہ کبھی بھی مجھے نہیں بھیجیں گے۔ اگر حشمت مجھے خود لینے کے لیے نہ آئے تو....." وہ نیم رضامند تھی' ویسے بھی جب سے اس کی کوکھ میں ایک ننھے وجود نے سانس لینا شروع کیا تھا وہ بہت دھیمی ہوگئی تھی' بلکہ سمجھوتے پر راضی بھی ہوگئی تھی۔

"ضد مت کریں بٹیا..... آپ جانتی ہیں حشمت کتنے ضدی ہیں۔"

"نہیں ضد زیادہ عزیز ہے یا اپنا گھر اور ہونے والا بچہ..... وہ فیصلہ کرلیں۔ میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ خود لینے کے لیے نہیں آئیں گے۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر چلی گئی تھی۔

پھر علیم الدین کے باربار کہنے پر ام کلثوم گھر واپس آئی بھی' مگر حشمت زیدی نے اسے اپنانے سے انکار کردیا تھا۔ انہوں نے اسے ایک مرتبہ پھر بے عزت کرکے نکالا تھا۔ درپردہ اس بے عزتی کا بدلہ لیا' جیسا ام کلثوم نے ان کے ساتھ اپنے گھر پر کیا تھا۔

حشمت زیدی نے پھر کبھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ انہوں نے میدان ادب میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑدیے تھے۔ انہوں نے زندگی میں ادب کے حوالے سے بے تحاشا کام کیا تھا۔ ان کے کئی عورتوں سے مراسم بھی رہے' مگر کوئی بھی ام کلثوم کی جگہ نہیں لے سکی۔ بلکہ انہیں ان عورتوں سے گھن محسوس ہوتی تھی جو اپنے باپ' بھائیوں اور شوہروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کے ساتھ مراسم رکھتی تھیں۔

کچھ وقت سرکا تو ان کے اکیلے پن کے خیال سے خالق بھائی آفاق کو ان کے پاس چھوڑ گئے تھے۔ دوسری شادی کے لیے راضی کرتے کرتے ان کی ماں قبر میں جا سوئیں۔ دوسراہٹ کے احساس کے لیے انہوں نے بھی آفاق کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ اس کی تمام نجی و تعلیمی ضروریات کا خرچا انہوں نے اٹھالیا تھا۔ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود انہیں پھر کبھی بھی ام کلثوم کی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ نہ ہی انہوں نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔

2000ء میں جب علیم الدین نے پاک ٹی ہاؤس بند کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے وہاں جانا ہی چھوڑدیا۔ وہ اب ویران ہوگیا تھا بالکل۔ ان کی بے جا ضد' ہٹ دھرمی اور انانیت پسندی نے انہیں بالکل تنہا کردیا تھا۔ کاش وہ اس وقت اتنے سفاک نہ بنتے تو آج ام کلثوم ان کے ساتھ ہوتی' یہ پچھتاوا انہیں دن رات ڈستا رہتا تھا۔

انہوں نے غصے میں آکر اپنی اولاد کو بھی اپنانے سے بھی انکار کردیا تھا۔ وہ تنہائی کے عفریت میں گھرے اکثر سوچا کرتے..... جانے ان کا بیٹا ہوا ہوگا یا بیٹی..... اور جانے اب اس کی عمر کتنی ہوگی.....

☼ ☼ ☼

صبح سے شام ہوگئی تھی۔ وہ دم بخود یک ٹک بیٹھے دیکھ رہی تھی۔ حشمت زیدی کے زرد چہرے پر ان گنت پچھتاوے رقصاں تھے۔ کھلی ہوئی کلی کا چہرہ کملا گیا تھا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میری بے جا ضد نے میری زندگی کی خوشیوں کو کھالیا۔ میں تہی دست تہی داماں ہوگیا۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ام کلثوم کے ساتھ

بہیمانہ سلوک روا رکھا۔ اس کی محبت کو خود اسی کے لیے سزا بنا دیا۔" ان کے چہرے پر آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے۔ کلی ان کے پاس آ بیٹھی۔ ان کے ہاتھ پہ نرمی سے ہاتھ رکھا۔

"میں بہت بدقسمت انسان ہوں۔ میری تحریروں سے ایک دنیا نے فیض پایا مگر میں خود کوئی سبق حاصل نہیں کر پایا۔ میں نے لوگوں کو محبت کرنا سکھائی مگر مجھے خود محبت کرنے کا ڈھنگ کبھی نہ آیا۔ میں نے دنیا کو سمجھوتا، قربانی اور درگزر کا درس دیا۔ مگر خود اس ڈھب کو کبھی اپنا نہیں پایا۔ میں نے زندگی میں کبھی شکر کرنا نہیں سیکھا۔ کبھی اپنوں کو خوشی نہیں دے پایا۔ مجموعی طور پر میں ایک ناکام انسان ہوں، جو زندگی میں کسی ایک رشتے کو بھی ڈھنگ سے نبھا نہیں پایا۔ میری زندگی میں فقط ایک بات کا سکون ہے کہ میرا ادبی سفر ناکام نہیں رہا۔ زیادہ نہ سہی، مگر کچھ لوگوں نے ضرور میری تحریروں سے اپنی زندگی کی روشن اور واضح راہیں متعین کی ہیں۔ ورنہ میرے دامن میں ماسوائے پچھتاوں اور حسرتوں کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ صرف خسارہ ہے اور دکھ ہیں۔"

وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر روتے اعتراف کر رہے تھے۔ کلی ان کا ہاتھ سہلاتی رہی بہت دیر گزر گئی۔ اس نے خود کو فقط ایک سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا۔ وہ سوال جو شاید اس کے وہاں آنے کا سبب بنا تھا۔

"سر... ایک بات بتائیں... کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں جاگی کہ آپ اپنے بچے سے ملیں... بیٹا ہے یا بیٹی، یہ جانیں... اسے اپنا نام دیں اور کیا آپ کو یہ بھی کبھی نہیں لگا کہ آپ کی اولاد کو آپ کی محبت، شفقت اور نام کی ضرورت بھی ہوگی، آپ کی اولاد نے کتنی حسرت زدہ زندگی گزاری ہوگی یا گزار رہی ہوگی۔ اس کا معصوم بچپن کتنی محرومیوں کا شکار رہا ہوگا۔ آپ کو کبھی خیال آیا۔" وہ سراپا سوال بنی ان کے سامنے کھڑی تھی۔ حشمت زیدی نے یک لخت اسے پہچانا... اس کی نیلی روئی روئی آنکھیں ان سے سوال کر رہی تھیں۔

"اس بچی کا وہ معصوم بچپن جب وہ پہروں باپ کو کرکے روتی رہی تھی اور اس کی ماں جس نے ساری زندگی اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتے بیٹی کی تربیت و پرورش سے پہلو تہی کرتے گزاری، جسے زندگی بھر اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ حشمت زیدی اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ کیا مداوا ہے آپ کے پاس بچی کے دکھوں کا؟" وہ زار زار روتے ان سے سوال نہیں کر رہی تھی، بلکہ وہ ان کے سامنے کھڑی ان کی ہستی ہلا رہی تھی۔

"تم... تم... میری بیٹی ہو۔" شدت جذبات سے ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

"ہاں..." کلی استہزائیہ ہنسی۔ "اور آپ کی بیٹی ہونے کی سزا میں نے ہر لمحہ پائی ہے۔" اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی چبھن تھی، درد تھا، اذیت تھی۔

"میں سمجھا نہیں۔" وہ واقعی نہیں سمجھ پائے تھے۔

"باپ کے کیے کی سزا بیٹی نے تو پانی ہی تھی نا... بیٹی نے تو ان محبتوں کا خراج ادا کرنا تھا، جن کی قدر آپ نے زندگی میں کبھی نہیں کی۔" وہ سسکی تھی۔

"میرے پاس آؤ میری بیٹی... مجھے بتاؤ تمہارے دکھ کیا ہیں؟" وہ پدرانہ شفقت سے لبریز لہجے میں بے تابی سے اس کو چھونے کے خواہش مند تھے۔ وہ اسے پیار کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان کے وجود کا حصہ ہے۔

"مجھے اپنے دکھ کسی سے کہنے کی عادت نہیں ہے سر... آپ دوا لے لیں... آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے؟" وہ فوراً ہی پیشہ وارانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی مگر انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا۔

"میں چاہتے ہوئے بھی کبھی آپ سے نفرت نہیں کر سکی۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب اس نے میری محبت کو ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ میرے باپ کے نام کی جگہ میرے ابا میاں کا نام درج ہے۔ ہو سکتا ہے غلطی میری ماں کی بھی رہی ہو۔ لیکن اس نے مجھے اٹھا کر پھینکا نہیں۔ میری پرورش کی۔ میرے نانا اور نانی نے شفقت سے پروان چڑھایا۔ آپ نے تو کبھی پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔ تیئس سال کے عرصے میں آپ کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کی بیٹی ہے یا بیٹا... آپ کے لیے کیا مشکل تھا مما کو ڈھونڈنا۔"

"میں مانتا ہوں میری بچی! میں قصوروار ہوں تم ماں، بیٹی کا۔ میں نے ظلم کیا تمہارے ساتھ اور تمہاری ماں کے ساتھ۔ میں گناہ گار ہوں تم لوگوں کا۔" وہ اس کا سر تھپتھپا کر اعتراف کر رہے تھے۔ "میں چاہوں تو بھی میں اس گزرے وقت کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام دکھوں کی اذیت، تپش جو تم نے ان تیئس برسوں میں سہی، برداشت کی۔ میری بدقسمتی کہ میں عمر کے اس دوراہے پر کھڑا ہوں، جب میرے پاس عمر کی نقدی ختم ہو چکی ہے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی مانند رو رہے تھے۔ کلی بھی رو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

جس روز ام کلثوم نے بیٹی کو جنم دیا۔ انوار حسین کے گھر وہ مرگ کا دن تھا۔ کتنی بدقسمتی کی بات تھی، ان کی بیٹی نہ مطلقہ تھی، نہ بیوہ، پھر بھی ان کی بیٹی ان کے گھر پر تھی بغیر کسی حیثیت کے۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ گزشتہ مہینوں میں انہیں بھی کہیں یہ امید تھی کہ حشمت زیدی صلح کی کوشش ضرور کرے گا اور نہیں تو اپنی اولاد کا سن کر تو ضرور ہی آئے گا، مگر ان کی یہ خام خیالی ثابت ہوئی تھی۔ جو سیاہی ام کلثوم نے کورٹ میرج کرکے ان کے چہرے پر پوت دی تھی وہ شاید کبھی نہ کبھی دھل جاتی، مگر جو سیاہی اب کی بار حشمت زیدی نے ان کے چہرے پر ملی تھی۔ انہیں دنیا کا کوئی سمندر نہیں دھو سکتا تھا۔ انہوں نے خود کو بوڑھا ہوتے محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ سچ مچ بوڑھے ہو گئے تھے۔ وہ اگر چاہتے تو اس کے سارے کس بل چٹکیوں میں نکال سکتے تھے۔ مگر انہیں ام کلثوم کے ترلے اور واسطے یاد آئے تھے۔ جب انہوں نے خلع کی بات کی تھی اور ام کلثوم نے خلع لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس رات وہ ان کے پیروں پر سر رکھ کے روئی تھی۔ اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے اس نے بمشکل تمام باپ کو حشمت زیدی کی بیوی رہنے کے لیے راضی کیا تھا۔

ارسہ کا وجود بہت بے ضرر اور معصوم تھا۔ مگر اسے ایک عرصے تک اس لیے ان کی نفرت سہنا پڑی، کیونکہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون خود غرض، سفاک، بے حس اور لالچی حشمت زیدی کا تھا۔ مگر اس روز جب وہ پیاس کی شدت سے نڈھال تھے، تب اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے انہیں پانی پلایا تھا اور انہیں دبایا تھا۔ اس روز ان کے دل پر جمی نفرت ہمیشہ کے لیے دھل گئی تھی۔ انہیں لگا، وہ اس بچی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ جس کی بدقسمتی کہ اسے کبھی باپ کا پیار نہیں ملا... ماں نے اپنے دکھوں اور غموں میں گھر کر کبھی توجہ نہیں دی۔ انہوں نے اس کی ولدیت کے خانے میں بھی اپنا نام لکھوایا، صرف اس لیے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں سوال کرے اور کسی محرومی کا شکار ہو... مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ ارسہ حشمت زیدی تھی جو اپنے باپ کی طرح ہی ذہین تھی۔ بہت کم عمری میں ہی وہ ان ساری باتوں اور حقیقتوں کو جان گئی تھی۔ جو اگر وہ بتانا چاہتے تو بہت مشکل میں گھر کر بتا پاتے، مگر ارسہ زیدی بہت سمجھ دار تھی۔ اس نے اپنوں کی محبت کو ہمیشہ احسان سمجھا تھا۔ اس نے کبھی بھی انہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالا تھا۔

وہ ان کی لاڈلی بٹیا تھی، جس نے ہمیشہ ہی ان کی لاج رکھی تھی۔ جس نے کم عمری میں ہی اپنے باپ کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی سعی کی تھی۔ انہیں اس کے دکھ اور محرومیاں ادھ موا کر دیا کرتی تھیں اور جب اس نے فقط ان کی خاطر اپنی زندگی کی واحد خوشی سے دست برداری اختیار کی تھی، اس روز وہ تہجد کے وقت خون کے آنسو روئے تھے۔ وہ جانتے تھے ارسہ کے دل کی خوشی وہ لڑکا ہے۔ مگر وہ اپنے خدشات سے خوف زدہ تھے۔ اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ایک اور ام کلثوم کا دکھ سہہ پاتے۔ انہوں نے ارسہ زیدی کو فقط دو

لفظوں میں سمجھایا تھا اور ان کے لیے مقام حیرت کہ ارسہ سمجھ گئی تھی ان کی ارسہ... ان کی کلی ان کی ام کلثوم سے زیادہ سمجھ دار تھی۔ اس نے ان کا بھرم رکھ لیا تھا اور اس روز انہوں نے خود سے عہد کیا تھا' وہ ارسہ کو ساری حقیقت بتائیں گے۔ وہ جانتے تھے' وہ اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں۔ ان کا بلاوا کسی بھی وقت آسکتا ہے۔ سو انہوں نے ارسہ کو بہت محتاط الفاظ میں اس کے باپ کی خوبیاں اور خامیاں بتائی تھیں۔ انہوں نے اپنی بیٹی اور داماد کی زندگی کا تجزیہ بہت غیر جانب داری سے کیا تھا۔ انہوں نے ارسہ انوار حسین کو اپنے باپ کے پاس ایک کیئر ٹیکر کی حیثیت سے جانے کی اجازت خود دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ بہت اچھا وائلن بجاتا تھا اور اس وقت اور بھی اچھا لگتا جب وہ خاص الخاص میرے لیے بجاتا تھا۔" کلی نے چہرے پر زبردستی کی بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرتے حشمت زیدی کو بتایا۔ وہ اسے بہت محبت اور توجہ سے سن رہے تھے' چونک اٹھے۔

"میں گھنٹوں سانس روکے اس کا وائلن سن سکتی تھی اور وہ بجاتا بھی تھا۔ مگر..."

وہ اپنا دکھ کہتے کہتے اٹک گئی تھی۔ "میری قسمت میں محبت نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنانے سے انکار کردیا۔ صرف اس لیے کہ میرے ولدیت کے خانے میں میرے ابا میاں کا نام درج ہے۔ اس نے بہت ظلم کیا ڈیڈی! اس نے تو محبت کے وجود سے ہی انکار کردیا۔"

وہ رونے لگی تھی۔ مگر حشمت زیدی نہیں روئے۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ انہیں جیسے بیٹی کے آنسو نظر ہی نہیں آرہے تھے۔

"اس کے لیے آزردہ نہ ہو' جسے تمہاری محبت کی قدر نہ ہو اس کے لیے تمہیں رونا نہیں چاہیے۔ اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ ایک دن لوٹ آئے۔ وہ خود کو تمہارے قابل بنانے کی سعی میں جتا ہو۔" انہوں نے اس کے ریشمی بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ کلی نے چونک کے سر اٹھایا۔

"آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں۔" وہ چونک اٹھی تھی' وہ مبہم سا مسکرائے۔

"تم نے وراثت میں مجھ سے صرف بدگمانی ہی کیوں لی میری بچی۔ ساری زندگی میں بھی خود ساختہ سوچوں میں گھرا بدگمان ہی رہا۔ کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ میں بھی غلط ہو سکتا ہوں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

"ابھی تم نے خود ہی تو بتایا کہ جب تمہارے ابا میاں کو لگا کہ تم بھی ماں والے راستے پر چل نکلی ہو تو انہوں نے تمہیں روک دیا اور تم اس لیے رک گئیں' کیونکہ تمہیں اپنے ابا میاں کو دکھی نہیں کرنا تھا۔ تم نے اپنی محبت کو قربان کردیا۔"

"ہاں... یہ تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔" کلی نے اعتراف کیا۔

وہ مسکرا دیے تھے۔ انہوں نے بھی ایک فیصلہ کیا تھا اپنی بیٹی کے لیے۔ اس کی خوشیوں کے لیے۔

ابھی انہوں نے اپنے پیارے بھتیجے کو فون کرنا تھا جو جرمنی میں بیٹھا واپسی کے دن گن رہا تھا۔ چند دن پہلے جب وہ اس سے اسکائپ پر بات کررہے تھے۔ کلی نے اسے نہیں دیکھا تھا' مگر اس نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا۔ جب وہ کسی کام سے کمرے میں آئی تھی۔ اس کا دھیان اسکائپ کی طرف نہیں گیا تھا' ورنہ وہ بھی آفاق کو پہچان جاتی۔ آفاق نے ساری کہانی انہیں بتا دی تھی۔ حشمت زیدی کو حیرت ہوئی تھی۔ انہیں آفاق سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ کسی لڑکی کو اتنا آگے لے جاکر بنا کچھ کہے' بغیر کسی وجہ کے چھوڑ سکتا ہے۔ انہوں نے اسے ڈانٹا بھی تھا' مگر جو کچھ اس نے کہا وہ انہیں منجمد کر گیا تھا۔

"میں صرف محبت پر یقین نہیں رکھتا چچا جان! محبت ہمیں سوائے دکھوں کے اور کچھ بھی نہیں دیتی اور میں اسے ایسے کسی عہد یا ڈور میں نہیں باندھنا چاہتا تھا جس سے بندھ کے وہ مجھ سے توقعات وابستہ

کرلیتی جنہیں میں پوری نہ کرپاتا' تو ناکام زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں محبت سے دستبرداری قبول کرلیتا۔ میں آپ والی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا۔"

وہ رنجیدہ ہوا تھا۔ حشمت زیدی بول نہیں سکے۔ انہیں ساری رات نیند نہیں آسکی۔ ان کی غلطیاں' خسارے' پچھتاوے اور ناکامیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ اب ان کے بچے محبت کرنے سے ڈرنے لگے تھے۔ وہ کس قدر حرماں نصیب تھے کہ نادانستہ طور پر اپنے بچوں کی خوشیوں کے بھی قاتل تھے۔ مگر اب انہوں نے ازالہ کرنا تھا۔ انہیں آفاق کو واپس بلانا تھا۔ ایک چچا کی حیثیت سے نہیں' ایک باپ کی حیثیت سے۔ انہیں اب انوار حسین کے گھر جانا تھا اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کے لیے اور انہوں نے سوچ لیا تھا اب انہیں اپنی انا کو درمیان میں نہیں لانا تھا۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ابا میاں اور ام کلثوم سے معافی مانگنی تھی' ان کی غلطیاں بہت تھیں' مگر وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم کی محبت کا ظرف اس سے بھی زیادہ بڑا ہے۔ وہ انہیں معاف کردے گی اور اگر اس نے انہیں معاف نہ بھی کیا تب بھی انہیں برا نہیں لگے گا۔

وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم حق بجانب ہوگی' انہوں نے اس کی زندگی کے تیئس چوبیس برس ضائع کیے تھے۔ انہیں گرہن لگا دیا تھا۔ یہ ایک دن کی معافی تلافی کا کام نہیں تھا۔ وہ اگلے تیئس' چوبیس برس مزید اس کی نفرت سہتے تو بھی ان کی معافی تلافی ممکن نہیں تھی۔ ہاں مگر انہوں نے سوچ لیا تھا وہ آفاق اور ارسہ کی محبت کے لیے اب کی بار کچھ بھی کر گزریں گے۔ وہ آہوں اور سسکیوں کو اس کی زندگی کا حصہ نہیں بننے دیں گے۔

اور کائنات کا نظام تو ممکنات پر ہی چلتا ہے۔

کیا خبر... کیا معلوم ام کلثوم مان ہی جائے اور عمر کی بقیہ نقدی وہ ایک ساتھ بتائیں اور چاہے ام کلثوم صرف اور صرف نفرت ہی جتائے' مگر وہ سہ لیں گے۔ وہ معافی اور صرف معافی ہی مانگیں گے۔ ام کلثوم

معاف نہ بھی کرے تو بھی وہ بقیہ کی زندگی معافی مانگتے رہیں گے۔ ان کے لیے یہ احساس ہی باعث اطمینان تھا کہ زندگی انہیں معافی کی مہلت دے رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

"تمہیں یہ کیوں اور کب لگا کہ میں نے تمہاری محبت کو اس لیے ٹھکرا دیا' کیونکہ تمہارے ولدیت کے خانے میں تمہارے ابا میاں کا نام درج ہے۔"

وہ بالکل اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔ کلی نے اسے حیرت سے دیکھا تو کیا وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آیا تھا؟ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"تو اور کیا سمجھتی میں' وہ آخری سچائی تھی جو بچھڑنے سے دو روز پہلے میں نے تمہیں بتائی تھی۔" اس نے بھی برملا اعتراف کیا۔ حشمت زیدی نے ٹھیک ہی کہا تھا' اس نے ورثے میں ان سے صرف بدگمانی ہی لی تھی۔

"واہ... اور آپ جناب اتنی سمجھ دار ہیں کہ کچھ جانے بغیر خود ہی فیصلہ کر بیٹھیں۔ اذیت میں تو میں رہا۔ بے اعتنائی کا شکار تو میں ہوا' پریشانی تو میرے حصے میں آئی جب تم بغیر بتائے کیمپس آنا چھوڑ گئی تھیں۔"

وہ پانچ سال بعد اس کے سامنے کھڑا اپنے دکھ کہہ رہا تھا۔ کلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ دن پوری جزئیات سے یاد آگیا تھا جب اس نے محبت کے وجود سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس کی محبت کی کہانی تو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس اذیت میں وہ بھی پچھلے پانچ برس سے مقید تھی۔

"تو جانے سے پہلے کچھ تو کہا ہوتا۔ کوئی بھی ایسی بات جس سے میں خوش امیدی کا دامن تھامے رکھ سکتی۔" اس کی نیلی آنکھوں میں درد تھا' لہجہ بھرایا ہوا۔ آفاق درد سے ہنسا۔

"آیا تو تھا... کچھ لے کر تمہارے لیے' مگر تم یونیورسٹی آنا چھوڑ چکی تھیں۔ میں تین بار وہاں گیا' مگر تم نہیں آئیں' دسویں روز تو میری فلائٹ تھی' میں جرمنی چلا گیا تھا۔" کلی کو اچھی طرح یاد تھا وہ جان بوجھ کر تب تک کیمپس نہیں گئی تھی جب تک اسے اس کے چلے جانے کا یقین نہیں ہو گیا تھا۔

"میں اس روز تمہیں پرپوز کرنے گیا تھا۔ مجھے اس بات سے کبھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم کون ہو یا تمہارا باپ کون تھا۔ میرے لیے اہم تم اور تمہاری ذات سے وابستہ دکھ اور خوشیاں تھیں۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ میں خود کو تمہارے قابل بنانے کے لیے باہر جا رہا ہوں' تاکہ جس وقت میں لوٹوں... مجھے تمہارے والدین انکار نہ کر سکیں۔ میں تمہیں بہترین معیار زندگی دینا چاہتا تھا۔ میں حشمت چچا کی طرح اپنی محبت کو غم دوراں میں پڑ کے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا... ارے..." وہ دو قدم اس کے قریب بڑھ آیا۔

"محبت ایک بہت خوب صورت جذبہ ہے' اس کی قدر نہ کی جائے تو یہ مرجھانے لگتا ہے... اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری محبت مرجھائے یا وقت کی گرد پڑنے سے یہ دھندلا جائے' ہم ایک دوسرے سے زندگی کی آخری سانسوں تک پیار کریں' اپنی محبت کو نبھائیں' ہمیں یہ عہد کر کے اپنی زندگی کی شروعات کرنی ہے' ایک دوسرے کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی۔

"یہ دیکھو' یہ میں نے تمہارے لیے لیا تھا۔"

اس نے جیب سے ایک مخملی کیس نکالا تھا۔ کلی نے حیرت سے دیکھا۔ وہ لاکٹ چین تھا۔ اس پر کندہ تھا

"زندگی کی آخری سانسوں تک کا ساتھ۔" اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کے وہ لاکٹ تھام لیا۔ اسے ان الفاظ میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوئی تھی۔ کس قدر خوب صورت منظر تھا۔ دو محبت کرنے والوں کا ملن ہو رہا تھا۔ نیلی آنکھوں میں محبت کا خمار اترنے لگا۔ آفاق نے مسکرا کر ان آنکھوں کی روشنی دیکھی۔

"ویسے تم نے میرے چچا کی بہت خدمت کی۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ کلی نے نہیں پوچھا۔ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

"میں نے اپنے باپ کی خدمت کی ہے' تمہارے چچا کی نہیں اور اگر مجھے خبر ہوتی کہ یہ تمہارے چچا ہیں تو..." اس کی زبان کو یک دم بریک لگا۔ آفاق نے اسے بولنے پر اکسایا۔

"ہاں... ہاں... بولو... بولو خاموش کیوں ہو گئی ہو... تو کیا تم پھر سسر ہونے کی حیثیت سے دہری خدمت کرتیں چچا جان کی... ہے نا..." وہ شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا۔ کلی کا سر شرم سے جھک گیا۔

"اچھا اب جلدی سے بتاؤ... کب بھیجوں اپنے چچا جان کو... تمہاری مما سے تمہارا ہاتھ مانگنے کو..." وہ جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔

"اس کا فیصلہ تو ڈیڈی ہی کریں گے۔ ویسے وہ کل ابا میاں سے ملنے گئے تھے بلکہ روز ہی جاتے ہیں اب تو..." آفاق نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔

"ہاں انہیں جانا بھی چاہیے۔ آخر کو ام کلثوم چچی کا حق بنتا ہے کہ انہیں منایا جائے۔ ویسے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں تمہیں روٹھنے ہی نہیں دیا کروں گا۔" وہ پھر پیشے پٹری سے اترا تھا۔

"تم اس مار سے ڈرتے ہو نا... جو تمہیں ڈیڈی سے پڑے گی۔ مجھ سے لڑائی کی صورت۔" وہ مزے سے بولی تھی۔

"جی نہیں... میں ان آنسوؤں سے ڈرتا ہوں جو مجھ سے ناراضی کے بعد تمہاری آنکھوں میں جمع ہوں گے۔" وہ جذب سے اظہار محبت کر رہا تھا۔ کلی چلتے چلتے رک گئی۔

آفاق... مجھ سے وعدہ کرو... محبت کو میرے لیے پچھتاوا نہیں بناؤ گے۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مجھے ام کلثوم نہیں بننا۔"

آفاق مسکرا دیا تھا۔ اس نے جواب نہیں دیا تھا' بلکہ اس کے اور اپنے پسندیدہ گانے کے چند مصرعے گنگنائے تھے۔

اس کے بعد اس نے وائلن اٹھا لیا تھا۔ وہی وائلن جو کلی سانس روک کے سنتی تھی۔ انہوں نے عہد لیا تھا ایک دوسرے سے... اب کی بار انہیں محبت کو سرخرو کرنا تھا۔ انہیں بڑوں کی غلطی نہیں دہرانی تھی' محبت کو انا' ضد اور ہٹ دھرمی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا تھا۔ بھلے ایک عمر کی ریاضت کے بعد ہی سہی' مگر سب کچھ ٹھیک ہو رہا تھا اور جو نہیں ہوا تھا کلی کو امید تھی وہ بھی ہو جائے گا۔ ہاں اسے دکھ تھا اس کے والد نے... اپنی انا کے خول میں مقید ہو کے اپنی عمر رائیگاں کر دی تھی۔ اسے اپنی ماں کی تنہائی' ڈپریشن دکھ دیتا تھا اور اب سب جاننے کے بعد حشمت زیدی کے پچھتاوے' خسارے اور ذہنی اذیت تکلیف دیتی تھی۔

یہ ان دونوں کی بدقسمتی کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد بھی محبت کے حصار سے نکلنے میں ناکام رہے تھے۔ ایک عالم کو محبت کا درس دینے والے حشمت زیدی کا دامن ہمیشہ محبت سے خالی رہا' نہ انہیں محبت کرنا آئی' نہ ہی محبت کو سنبھالنا' قدر کرنا تو دور کی بات ٹھہری۔

اس کی ماں نے اپنے جذبات کے ہاتھوں ہمیشہ خسارے کا سودا کیا' مگر محبت کا خسارہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا' کم از کم انہیں اس بات پر سمجھوتا ساری زندگی کرنا نہ آسکا کہ محبت ان کے نصیب میں نہیں تھی۔ کلی اپنے والدین کے دکھ میں اپنی محرومیاں بھول گئی' انہیں ان پر ترس آتا۔ وہ محبت کے مارے نہیں انا کے مارے لوگ تھے۔

اور انا رشتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے' ضد رشتوں کو بھربھرا کرتی ہے اور ہٹ دھرمی انسانوں کو مار دیتی ہے۔ حشمت زیدی اور ام کلثوم اب عمر کے اس حصے میں نہیں تھے کہ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر سکتے' ہاں مگر کلی کو پھر بھی امید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور یہ گمان کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

کنیز نور علی

سب حیران تھے کہ آخر میں نے زارا کو بہو کے طور پر کیوں چنا۔ کیونکہ زارا عام سی شکل و صورت کی تھی، جبکہ میری دوسری بھتیجی فرحین نہ صرف خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھی، بی اے فائنل کی طالبہ تھی۔ جبکہ زارا نے انٹر کے بعد گھر کے مسائل کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔ پھر آخر زارا کیوں؟

ہاں تو بات کچھ یوں ہے کہ میں تو گزشتہ ڈھائی دہائیوں سے یعنی گزشتہ پچیس سال سے کھاریاں سے بیاہ کر کراچی آن بسی، سالوں بعد میکے جانا ہوتا تھا۔ اس بار جب میں میکے گئی تو خاندان میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ ضرور بیٹے کا رشتہ کرنے کا ارادہ ہے، ساری جوان بیٹیوں کی مائیں چوکنا ہو گئیں۔

میکے میں دونوں بھائیوں کی بیٹیاں بھی جوان تھیں تو بھابھیاں بھی آس لگا کر بیٹھ گئیں۔ بلکہ صفیہ بھابھی نے تو کمر کس لی۔ ان سے فرحین کی شان میں قصیدے سن سن کر میرے تو کان پک گئے تھے۔

"میری فرحین کی کوکنگ بہت اچھی ہے۔"

"میری فرحین پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔"

"میری فرحین کی چوائس بہت اعلیٰ ہے۔"

"میری فرحین بہت سمجھ دار ہے۔"

صفیہ بھابھی کا پسندیدہ موضوع "میری فرحین" تھا۔

ندیم بھائی اور صدیق بھائی دونوں کی کویت میں ملازمت تھی۔ اور دونوں ایک سال بعد چھٹی لے کر آتے ہیں۔ دونوں کی فیملیز اوپر نیچے کے پورشنز میں رہتی تھیں۔

نیچے ندیم بھائی کی بیگم صفیہ اور ان کے دو بچے ہیں فرحین اور عمیر۔ صدیق بھائی کی بیگم ثمینہ اور تین بچے اسد، زارا اور عمرا اوپر۔

مجھے میکے آئے دوسرا دن تھا کہ گاؤں سے خاندان میں فوتگی کی خبر آگئی۔ ہم تینوں اسد کے ہمراہ روانہ ہو گئیں۔ اسد تو اپنی ملازمت کی وجہ سے واپس آگیا۔ ہم تینوں کو وہاں رکنا پڑا۔ چوتھے دن میں اور صفیہ بھابھی تو آگئیں۔ مگر ثمینہ بھابھی کچھ معاملات کی وجہ سے رک گئی تھیں۔

ہم گھر آئے تو ظہر کا وقت تھا۔ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں لاؤنج میں بیٹھ گئی۔ صبح کا ناشتا کیا تھا اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ اور صفیہ بھابھی نہ جانے کہاں تھیں۔ فرحین بھی ملنے کے بعد اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نے کچن میں جھانکا، وہاں کھانا پکنے کے کوئی آثار نہ تھے۔ ہاں سنک میں گندے برتنوں کا ڈھیر ضرور تھا۔ لاؤنج میں واپس آئی تو نوٹ کیا کہ فرش تو صاف تھا کہ یقیناً "کام والی آئی رہی تھی، لیکن فرنیچر پر گرد چمک رہی تھی۔ ایک صوفے پر دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ گندے کپڑے میں نے واش روم کے باہر لگی واشنگ مشین پر الٹے سیدھے پڑے ملاحظہ کر لیے تھے۔ گھر کی حالت بتا رہی تھی کہ جو توجہ عام طور پر اسے ملتی ہے وہ نہیں ملی۔

مجھے فرحین کی اس نالائقی پر سخت افسوس ہوا تھا۔ ماں گھر نہیں تھی تو بیٹی نے کوئی انتظام نہیں سنبھالا تھا۔ میں ان ہی سوچوں میں گم بیٹھی تھی کہ زارا سیڑھیوں سے نیچے آتی دکھائی دی۔

"فرحین! کیا پکایا ہے۔ کھانا لگاؤ نا بیٹا۔" صفیہ بھابھی نے شہد آگیں لہجے میں بیٹی سے کہا تھا۔

"امی! میں نے کچھ نہیں بنایا۔ آپ کے لاڈلے کو کہا بھی تھا کہ گوشت لا دے ختم ہو گیا ہے۔ لیکن اس نے ایک نہیں سنی میری۔ الٹا مجھ سے بدتمیزی کی اور کالج چلا گیا۔ آپ نے اس کی کلاس لینا ہے آج!"

فرحین کا شکایتوں کا دفتر کھل چکا تھا۔ صفیہ کے اندر غصے کی ایک شدید لہر اٹھی تھی "کچھ بھی نہیں پکایا تم نے۔ کیا کرتی رہی ہو سارا دن؟" سخت لہجے میں آواز دباتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔

"امی! کیا پکاتی میں..... گوشت تھا نہیں اب پھپھو کی خاطر کرنا ہے تو ظاہر ہے۔ کوئی اچھی چیز ہی ہونا چاہیے نا۔ میں قریبی ریسٹورنٹ فون کرتی ہوں۔ ہوم ڈلیوری کروالیتے ہیں۔" فرحین نے مسئلہ چٹکیوں میں حل کیا تھا۔

صفیہ کا پارہ چڑھ گیا تھا "ہاں، جوان لڑکی کے گھر میں ہوتے ہوئے ہوٹل سے منگوا کر کھلاؤں۔ ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے تمہارے، حد ہے ہڈ حرامی کی۔ گھر کی حالت دیکھو اور پکایا بھی کچھ نہیں میں کہاں جاؤں۔ اس اولاد نے ذلیل کرنے کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔"

وہ سخت طیش میں فرحین کو کھری کھری سنا رہی تھیں۔ کہاں وہ زاہدہ کو بیٹی کے سگھڑاپے کے قصے سناتی رہی تھیں اور بیٹی نے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔

"چاچی!" زارا انہیں آواز دیتی اندر آئی تھی۔ سخت غصے میں بولتی صفیہ کو دیکھ کر اسے کچھ سنگین صورت حال کا احساس ہوا تھا۔ ایک پل کے لیے وہ خاموش ہوئی۔ پھر وہی نظر انداز کرنے کی بہترین پالیسی۔

"پھپھو بلا رہی ہیں آپ کو باہر۔" اس نے سرسری انداز میں اطلاع دی تھی۔

صفیہ نے زارا کو سخت نظروں سے دیکھا اور فرحین کو غصے سے گھورتے ہوئے باہر نکل گئی تھیں۔ زارا کے لیے صورت حال ناقابل فہم تھی۔

"کیا ہوا ہے، چاچی غصے میں کیوں ہیں۔"

"بس جی کھانا نہیں بنایا تو بہت بڑا گناہ کر دیا ہے میں نے۔" فرحین کو اپنی کلاس سخت گراں گزری تھی۔

"اچھا کوئی بات نہیں، میں نے بنایا ہوا ہے نا کھانا اسی لیے بلانے آئی تھی۔ آجاؤ باہر۔"

فرحین کا بگڑا ہوا موڈ اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی وہ سرسری انداز میں کہتی باہر جانے کے لیے مڑی تھی۔ ناچار فرحین اٹھ گئی تھی۔

"یہ تم ماں بیٹی کہاں چلی گئی تھیں؟" میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں صفیہ سے استفسار کیا تھا۔ صفیہ بھابھی مسکرا کر رہ گئیں۔

"ارے بس آپا! آپ اندر کمرے میں چل کر لیٹیں آرام کرلیں۔ میں کھانا بناتی ہوں۔ اصل میں فرحین پیپرز کی تیاری کر رہی ہے، آج کل بس پڑھائی کی طرف دھیان ہے تو۔ میں کرتی ہوں کھانا تیار۔"

"ارے نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ لاؤ میں سبزی بنا دیتی ہوں۔" میں وہیں صوفے پر بیٹھی تھی۔ صفیہ فوراً کچن کی طرف جانے کو مڑی تھیں۔

"ارے نہیں چاچی آپ رہنے دیں کھانا تو میں نے بنایا ہوا ہے۔ اسی لیے تو بلانے آئی تھی آپ کو۔" زارا نے صفیہ کو کچن میں جانے سے روکا تھا۔

"بنا لیتی ہوں میں تھوڑی دیر میں تیار ہو جاتا ہے کھانا۔ کھانے کا کیا ہے۔" صفیہ نے قدرے سخت لہجے میں جواب دیا تھا۔ انہیں زارا کی پیش کش سخت کھلی تھی۔

"ارے تو بچی نے جو بنایا ہوا ہے وہ بھی تو کھانا ہی ہے۔ تم شام کو بنا لینا۔ چلو مجھے بھوک بھی لگی ہے۔" میں نے بات ختم کردی تھی اور جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی، ناچار صفیہ اور فرحین کو بھی میرے ساتھ جانا ہی پڑا۔

سفید چنوں کا پلاؤ، آلو کی بھجیا، رائتہ، چٹنی، سلاد اور گرم گرم پھلکے۔

کھانے کے لوازمات دیکھ کر صفیہ کو از سرنو غصہ آیا تھا۔ یہ سب چیزیں تو ان کے کچن میں بھی موجود تھیں۔ اچھا بھلا کھانا بن سکتا تھا۔ لیکن یہ نکمی بیٹی۔ ادھر میں کھانا دیکھ کر جیسے تازہ دم ہو گئی تھیں۔

"ارے واہ! میری بیٹی نے تو پوری دعوت کردی ہے میری۔" میں نے مسکرا کر کہا تھا۔

"پھپھو! میں تو شرمندہ ہو رہی ہوں کچھ بھی خاص نہیں بنایا، بس جو کچھ گھر میں تھا۔ میں نے سوچا وہ ہی بنالوں۔" اس نے جھجکتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

"ارے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا۔ شکر ہے گھر کا کھانا میسر آیا ——— ورنہ یہ چکن مٹن جب سے آئی ہوں کھا کھا کر اکتا گئی ہوں اور پھر وہاں فوتگی پہ بھی روز دیگی تیز مسالے کا سالن کھا کر میرا تو دل تنگ پڑ گیا تھا۔

آج سوچا تھا گھر چل کر کہوں گی۔ دال سبزی پکاؤ۔ تاکہ جی بھر کے کھاؤں۔ میری تو پسند کا کھانا بنا دیا تم نے۔" اپنی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے میں نے بتایا تھا۔

"تو بتائیں کیسا ہے یہ پلاؤ۔ مجھے ابو نے بتایا تھا کہ آپ کو چنوں کا پلاؤ پسند ہے۔" زارا نے پرجوش انداز سے کہا تھا۔ میں تو بھائی کے ذکر سے ہی خوش ہو گئی۔

"ہاں بھائی جان بہت چڑتے تھے اس سے، انہیں چکن، مٹن، بیف یا چاہیے ہوتا تھا روز بلکہ اب بھی۔" مجھے بھائی کی پسند یاد آگئی تھی۔

"اچھا پھپھو! آپ کا سبزی دال کا موڈ تھا، مجھے پتا ہوتا تو بنا لیتی، میرا تو چائنیز بنانے کا ارادہ تھا مگر چکن ختم ہو گیا تھا۔ امی لا کر فریز کردیتی ہیں۔ اب اتنے دن سے وہ گھر نہیں تھیں تو آخری پیکٹ بھی میں نے پکا لیا تھا۔ اب گوشت کے بغیر آپ کے لیے دال یا سبزی بنانا مجھے تو اکورڈ سا لگا، دالیں اور سبزیاں مجھے ویسے بھی نہیں پسند ہیں۔"

فرحین نے نخوت سے کہا۔ صفیہ نے بتیرا آنکھوں کے اشاروں سے روکا لیکن وہ اپنی جون میں بولتی گئی تھی۔

میں نے بہت غور سے اسے سنا تھا اور ایک استہزائیہ "اچھا" بھی کہا تھا۔ میں بھی آخر اس کی پھوپھی تھی۔ نخوت کا جواب نخوت سے دینا اچھی طرح جانتی تھی۔

"یعنی میرے لیے اہتمام کرنے کے چکر میں تم نے مجھے بھوکا ہی مار دینا تھا۔" میں نے صفیہ کو جتایا تھا "یہ تو بھلا ہو میری زارا کا۔ سمجھ دار بچی ہے۔"

صفیہ بھابھی حسب عادت بے تاثر چہرے کے ساتھ کھانے میں مگن ہو گئی تھیں جو یقیناً "لذیذ تھا۔

کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میں نے گھر کا ناقدانہ جائزہ لیا تھا۔ نیچے صفیہ کے گھر کی حالت دیکھنے کے بعد میں لاشعوری طور پر دونوں کا موازنہ کر رہی تھی کہ یہاں سب کچھ صاف اور سمٹا ہوا تھا۔ جیسے ثمینہ کی موجودگی میں گھر ہوتا تھا۔

گھر کی صفائی ستھرائی ایک طرف، اسے میں ایک لڑکی کا لاابالی پن سمجھ کر نظر انداز کردوں، لیکن صرف گوشت نہ ملنے کی بنا پر کھانا ہی نہ بنانا، بات سبزی گوشت یا دال کی نہیں، لیکن میرا ماننا ہے کہ کھانے کے وقت پر چاہے چٹنی کے لوازمات ہی کیوں نہ میسر ہوں۔ عورت کو چاہیے کہ وہ ہی تیار کرے۔ لیکن گھر والوں کو بھوکا نہ رکھے، ایک بہترین شے پیش کرنے کے چکر میں فرحین کچھ بھی فراہم نہ کر سکی۔ اور جن لوازمات کو فرحین نے غیر اہم جان کر نظر انداز کردیا تھا، زارا نے ان سے مزے دار کھانا تیار کر کے دستر خوان سجا دیا۔

مجھے فرق نظر آگیا تھا۔ سلیقہ، سمجھ داری، اعتماد اور حالات کے مطابق گزارہ کرنے کی صلاحیت ....

مجھے زارا میں وہ خوبیاں نظر آئیں جو مجھے چاہیے تھیں، سو میں نے اسے چن لیا۔ آپ بتائیے میرا انتخاب غلط تو نہیں نا!

☼

سحر ساجد

غرقِ رحمت

ساری زندگی وہ اس بات کے لیے ترستا رہا کہ کاش۔۔۔ کاش وہ زینب آپا کو دیکھ سکے۔ ایک دفعہ ہی سہی، خواب میں ہی سہی، اس نے ماں سے بڑھ کر زینب آپا سے پیار کیا تھا اور زینب آپا نے بھی ماں سے بڑھ کر ہی اسے سنبھالا تھا اور اس نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی تھی، بلکہ وہ کر ہی نہیں سکا تھا۔ اس نے زندگی میں صرف اور صرف زینب آپا سے ہی محبت کی تھی۔

یا تو وہ محبت کے قابل نہیں تھا یا پھر محبت اس کے قابل نہیں تھی۔

ناولٹ

ہوتے ہیں نا کچھ دل بہت اسپیشل۔۔۔ خاص الخاص ایسے لوگ کہ جن کے دلوں میں محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی جاتی ہے اور وہ فیاضی سے اسے لٹاتے پھرتے ہیں۔ ہر خاص و عام پہ۔۔۔ غیروں پہ۔۔۔ اپنوں پہ۔۔۔ جیسے کہ زینب آپا۔ تھا تو اس کا دل بھی بہت اسپیشل۔۔۔ وہ اس طرح کہ اس کے دل میں خود غرضی، بے حسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور یہ خود غرضی اور بے حسی وہ ہر کسی پہ۔۔۔ چاہے وہ عام ہو کہ خاص، اپنا ہو یا غیر، بڑی فیاضی سے لٹاتا رہتا تھا۔ حتی کہ زینب آپا پر بھی۔۔۔

وہ زینب آپا جنہیں وہ بہت چاہتا تھا اور وہ زینب آپا کہ صرف انہیں ہی وہ بہت چاہتا تھا۔ مگر ایسے لوگ مجبور ہوتے ہیں بالکل اسی طرح سے جس طرح سانپ مجبور ہوتا ہے ڈسنے پہ۔

تو بات شروع ہوئی تھی زینب آپا کو دیکھنے سے۔۔۔ مگر وہ کیسے اب انہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیوں کر اب ایسی خواہش کر سکتا تھا کہ انہیں مرے ہوئے بھی دس سال گزر چکے تھے۔ وہ انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ کتنا پیار کرتا تھا ان سے، مگر یہ بات حارث قیوم کو تب ہی معلوم ہوئی تھی، جب زینب قیوم مر چکی تھیں اور ان کے مرنے کی اطلاع بھی حارث قیوم کو قریب دس سال بعد ملی تھی اور اس کے بعد حارث قیوم ساری عمر ترستا رہا۔ ایڑیاں رگڑتا رہا، بلکتا رہا، رو رو کر تڑپا اور تڑپ تڑپ کر رویا کہ کاش۔۔۔ اے کاش کہ وہ زینب آپا کو دیکھ سکے۔ خواب میں ہی سہی، مگر اے کاش۔۔۔ کہ وہ انہیں دیکھ سکے۔

☼ ☼ ☼

قیوم صاحب کی آل اولاد اتنی زیادہ تھی کہ بعض اوقات وہ خود بھول جاتے تھے کہ کون کس سے کتنا بڑا اور کون کس سے کتنا چھوٹا ہے۔ خیر سے چودہ بچوں کے باپ تھے وہ اور چودھویں بچے کی پیدائش پر ان کی بیوی انتقال کر گئی تھیں۔

اور وہ چودھواں بچہ حارث تھا۔ جس نے آنکھیں کھولنے اور شعور سنبھالنے پہ ماں کی جگہ زینب آپا کو

پکارا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ زینب آپا سب سے بڑی تھیں، مگر یہ ضرور تھا کہ وہ سب سے مختلف تھیں۔ پہلی پانچ بڑی بہنوں کے بعد چار بھائی تھے اور باقی پانچ بہن، بھائیوں میں زینب آپا سب سے بڑی اور حارث سب سے چھوٹا تھا۔ حارث کو سنبھالنا اس طرح سے ان کے حصے میں آیا تھا کہ پانچوں بڑی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔

جب حارث پیدا ہوا تو زینب آپا سولہ سال کی تھیں وہ عمر کہ جس میں خواب دیکھے جاتے ہیں، خواب تو زینب آپا بھی دیکھتیں، مگر زینب آپا کو خوابوں میں بھی حارث روتا ہوا دکھائی دیتا یا پھر انہیں یہ وہم ستاتا رہتا کہ حارث سوتے میں چارپائی سے نہ گر جائے یا پھر ان کے نیچے آکر دب ہی نہ جائے۔ ایسی صورت حال میں کون سے خواب اور کہاں کے سپنے، کئی کئی دن تک وہ کنگھی ہی نہیں کر پاتی تھیں۔ کپڑے بدلنا تک یاد نہیں رہتا تھا انہیں۔ ان کی زندگی حارث سے شروع ہو کر حارث پہ ہی ختم ہو جاتی تھی۔

گھر میں خوش حالی نہیں، تو غربت بھی نہیں تھی۔ بیٹا ہو یا بیٹی ان کے گھر میں پڑھنے لکھنے کو انتہائی غیر ضروری سمجھا جاتا تھا۔ نوشہرو میں قیوم صاحب کا اپنا کپڑے کا کاروبار تھا جو، جو بیٹا بڑا ہوتا گیا وہ باپ کے ساتھ جاکر کاروبار سنبھالتا گیا اور جو، جو بیٹی بڑی ہوتی گئی۔ اس کی شادی ہوتی رہی۔ رہی بات زینب آپا کی... کمال بات تھی، مگر پھر بھی تھی۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ اور یہ لکھنا پڑھنا انہوں نے اس باجی سے سیکھا تھا جن کے پاس وہ قرآن پڑھنے جایا کرتی تھیں۔ گھر بھر میں ایک واحد وہ ہی تھیں کہ جنہوں نے پورا قرآن سیکھ اور پڑھ رکھا تھا اور تو باقی سب....

وہ حارث کو بھی قرآن مکمل پڑھانا چاہتی تھیں، مگر وہ بھی اپنے دوسرے بہن، بھائیوں جیسا نکلا تھا۔ زینب آپا کی سر توڑ کوشش کے باوجود وہ پہلے سیپارے سے آگے نہیں پڑھ پایا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں زینب آپا کا نکاح اٹھائیس سال کے شخص کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ سعودی عرب کی کسی کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتا تھا۔ رخصتی البتہ اس وجہ سے نہیں کی گئی تھی کہ حارث ابھی بہت چھوٹا تھا۔ زینب آپا کی ساری جوانی کو حارث کھا گیا تھا اور بعد میں ان کو بھی... وہ ایک نرم دل... سلجھی ہوئی طبیعت کی مالک تھیں اور حارث... کوئی بچہ ماں کو جتنا تنگ کر سکتا ہے۔ زچ کر سکتا ہے۔ حارث نے اس سے کہیں زیادہ زینب آپا کو کیا تھا۔ باوجود اس کے کہ زینب آپا اس سے پورے سولہ سال بڑی تھیں۔ اس نے شاید ہی کبھی ان سے تمیز سے بات کی ہو۔ شاید ہی کبھی ان کا ادب... لحاظ کیا ہو۔

اور اب جبکہ حارث تیس سال کا ہو چکا تھا، تو اس کی زندگی کاش سے اٹی پڑی تھی، اور ہر کاش کے بعد زینب آپا کا نام آتا تھا اور ہر دفعہ زینب آپا کے نام کے بعد "میں کر لیتا" کا استعمال کیا کرتا تھا۔ زندگی ماضی یا مستقبل کا نام نہیں... زندگی حال کا نام ہے، اور ہم حال میں بیٹھ کر یا تو ماضی میں جیتے ہیں یا پھر مستقبل کے بارے میں ہلکان ہوتے رہتے ہیں اور وہ حارث قیوم... وہ... اس کا تو کوئی مستقبل تھا ہی نہیں اور نہ ہی وہ اس کے بارے میں ہلکان ہوتا تھا۔ وہ تو بس ماضی میں جیتا تھا اور پچھتاتا تھا اور ہلکان ہوتا رہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دھڑام..." اور اسی زوردار دھڑام کی آواز کے ساتھ ایک اور آواز بھی آئی تھی آواز نہیں... چیخ... وہ بھی زینب آپا کی... دیکھے اور سوچے بنا وہ جانتی تھیں کہ کون تھا جو سیڑھیوں سے نیچے گرا تھا۔ ایسے کارنامے وہ ہی سرانجام دیا کرتا تھا، گھر میں اور کوئی ایسا نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت ہوئیں اور دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے حرکت میں آئی تھیں باقی سب تو اسے معمول کا حصہ سمجھتے تھے۔

"حارث..." ان کے پہنچنے تک حارث اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون نکل رہا تھا۔ مگر وہ خون کی طرف متوجہ نہیں تھیں۔ انہوں نے دہل کر جو حارث کہا تھا وہ اس کے بائیں بازو کو دیکھ کر کہا تھا جو کہ لٹک رہا تھا۔ ابھی دو ماہ پہلے ہی کی بات تھی کہ وہ چھت سے پتنگیں پکڑتے ہوئے گرا تھا اور بازو تڑوا بیٹھا تھا۔ سخت جان اتنا کہ چھت سے گرنے کے بعد بھی وہ ہوش میں تھا اور رویا تک نہیں تھا۔ آج بھی پتنگ پکڑنے کے لیے وہ اندھا دھند بھاگ کر سیڑھیوں سے اتر رہا تھا اور گر کر پھر سے وہ ہی بازو تڑوا بیٹھا تھا ہوش میں تھا اور رویا تک نہیں تھا۔ تھا ہی اتنا ڈھیٹ۔

"حارث... یا اللہ خیر۔" زینب آپا اس کے ماتھے پہ اپنا دوپٹا رکھتے اسے گود میں لیتے ہوئے اس کا بازو دیکھ کر بولی تھیں۔ حارث کو گر گر کر عادت ہو چکی تھی، مگر زینب آپا کو عادت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ اب بھی ویسے ہی ہولتی رہتیں۔

"انعام بھائی... انعام بھائی..." انہوں نے چیخ کر بڑے بھائی کو پکارا اور وہ بڑے بے زار سے انداز میں آئے تھے۔ زینب آپا کی طرح وہ بھی بنا دیکھے جانتے تھے کہ کیا ہوا تھا۔

"انعام بھائی اتنا خون نکل رہا ہے، لے جائیں نا اسے۔" انہوں نے التجا کی تھی۔ اپنے سرخ ہوتے دوپٹے کو دیکھ کر وہ ہول رہی تھیں۔

"سکون تو آتا ہی نہیں اسے... کبھی ادھر بھاگ، کبھی ادھر... نکما کہیں کا... آئے روز..."

"انعام بھائی خون بہہ رہا ہے۔" انعام بھائی کی زبان کو زینب آپا کے پریشان لہجے نے روکا تھا۔ وہ جھنجلائے بڑے انداز میں اسے اٹھا کر لے گئے تھے۔ محلے کے ڈاکٹر سے ماتھے کی پٹی کروانے کے بعد وہ اسے جراح کے پاس لے کر گئے تھے اور جتنی دیر تک پہلوان حارث کی ہڈی جوڑتا رہا وہ باہر کھڑے فون پر اپنی گرل فرینڈ سے گپیں لگاتے رہے تھے۔

حارث میں تکلیف برداشت کرنے کی بڑی برداشت تھی۔ تکلیف چاہے جذباتی ہو یا جسمانی... ہڈی جوڑتے وقت اچھے خاصے انسان کو بھی نانی یاد آجاتی ہے، مگر اسے تو زینب آپا یاد آئی تھیں اور بہت بری طرح سے یاد آئی تھیں۔ اس کا دل چاہا تھا کہ اس وقت وہاں زینب آپا موجود ہوتیں تو وہ آرام سے ان کی گود میں...

بے اختیار اس کے منہ سے سسکی نکلی تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ کیونکہ ایک جھٹکے سے پہلوان اس کی ہڈی کو صحیح جگہ پر لے آیا تھا اس کے بعد حارث خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ اس سسکی کے بعد اس نے تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جب تک وہ واپس نہیں آیا، زینب آپا تسبیح پکڑے ادھر سے ادھر چکراتی رہی تھیں۔ اور جب انعام بھائی اسے لے کر آئے تو... کندھے سے پکڑ کر ایک ہلکے سے جھٹکے سے انہوں نے حارث کو زینب آپا کی طرف دھکیلا تھا۔

"سنبھالو اسے..." بے زاری سی بے زاری تھی۔

اور زینب آپا دکھ کے ایک احساس کے ساتھ حارث کو لے کر وہاں سے ہٹ گئی تھیں۔ اسے لٹا کر وہ اس کے لیے دودھ میں ہلدی ڈال کر لائی تھیں۔

"حارث! یہ پی لو۔" انہوں نے پیار بھرے لہجے میں حارث کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے نہیں پینا۔" جواباً" بدتمیزی سے بھرا ہوا لہجہ، مگر اثر کس پہ تھا۔

"حارث! میرا پیارا بھائی، پی لو نا... درد کم ہو گا۔" انہوں نے پہلے سے بھی زیادہ پیار سے کہا تھا۔

"مجھے درد نہیں ہو رہا۔" وہی ضدی اور اگلے کو تپا دینے والا لہجہ... مگر سامنے کون تھا۔ زینب آپا... ایک گہرا سانس لے کر انہوں نے حارث کو دیکھا اور دودھ کا گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگایا تھا۔

"اگر تم پی لو گے تو میں تمہیں بڑی والی پتنگ لے کر دوں گی۔" اس نے مشکوک نظروں سے دیکھا، مگر ان کی نظروں میں کچھ تھا کہ اس نے آرام سے دودھ پی لیا۔ زینب آپا نے اس کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔

"بہت درد ہوا تھا حارث۔" اس کا سر نرم اور ہلکے دباؤ سے دباتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"بہت نہیں... مگر درد ہوا تھا۔" آنکھیں بند کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"دھیان سے کیوں نہیں...."

"آپا تم چلی جاؤ یہاں سے۔" بات کو کاٹ کر ترخ کر جواب دیا گیا تھا۔ اس کے بعد زینب آپا خاموشی سے اس کا سر دبانے لگی تھیں۔

اور جب رات کو ابا آئے تو... یہ دیکھے بغیر کہ دوسری دفعہ اس کا بازو ٹوٹا تھا۔ سر پھٹا تھا اور وہ تکلیف میں تھا۔ انہوں نے اتنا ڈانٹا تھا اسے اتنا کہ... شاید ہی کبھی اتنا ڈانٹا ہو وہ زبان کے بجائے ہاتھ کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔ آج زبان کا استعمال اس لحاظ میں کیا تھا کہ وہ چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ ٹھیک ہے وہ لاپروا تھا' بچے لاپروا ہوتے ہیں۔ چلو وہ تھوڑا زیادہ ہی سہی... مگر تھا تو بچہ ہی نا' وہ بھی محض سات سال کا... اور وہ سر جھکائے خاموشی سے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے ایک ہاتھ ہی سے سہی 'مگر نوالے توڑ توڑ کر کھاتا رہا تھا۔ حالانکہ زینب آپا نے اسے کھلانے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ تو حارث قیوم تھا۔ کیوں کھاتا بھلا؟ دستر خوان پہ اس وقت گھر کے سارے افراد موجود ہوتے تھے 'اور سب ہی ابا کی اس ڈانٹ پھٹکار کو لے کر کوفت کا شکار ہو رہے تھے اور اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ مگر وہاں پہ پروا کسے تھی۔ وہ بدستور ایک ہاتھ سے نوالے توڑ توڑ کر بڑی رغبت سے کھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

حارث زندگی میں کل ملا کر دو دفعہ رویا تھا۔ ایک جب زینب آپا کی رخصتی ہوئی تھی اور دوسری دفعہ کے رونے کے بعد وہ ساری عمر روتا ہی رہا تھا۔ زینب آپا رخصت ہو کر جا چکی تھیں۔ سارے گھر والے تھکے ہارے سو رہے تھے' جبکہ وہ چھت پہ بیٹھا رو رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اتنا رونا اسے کیوں آ رہا تھا 'اور وہ کیوں روئے ہی چلا جا رہا تھا حالانکہ وہ چپ ہونا چاہتا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ جیسے آنکھوں کے پانی کا بند ٹوٹ گیا تھا' سو وہ بہے ہی جا رہا تھا۔

وہ بچپن سے ہی انتہائی سخت دل واقع ہوا تھا۔ یوں رونا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ البتہ یوں رلانا اس کی فطرت میں ضرور تھا۔ زینب آپا جب رخصت ہوئی تھیں تو انہیں گھر چھوڑنے کا افسوس نہیں تھا اور نہ ہی اس بات پہ وہ روئی تھیں۔ انہیں حارث کی فکر تھی اور یہ ہی رونے کی وجہ بھی تھی۔

بیٹیاں نصیحتوں کے ٹوکرے بھر بھر کے سسرال لے کر جاتی ہیں اور زینب آپا نصیحتوں کے ٹوکرے دے کر جا رہی تھیں۔ وہ بھی بھر بھر کر۔ وہ جانتی تھیں کہ ابا جب حارث کو مارنے پہ آتے تھے تو جان سے مار دینے کا ارادہ رکھ کر ہی مارتے تھے۔ اسے ابا سے کیسے بچانا ہے۔ بھائیوں سے اس کی حرکتوں کو کیسے چھپانا ہے۔ وہ سارے گر خود سے چھوٹی بہن کو سمجھا کر آئی تھیں 'مگر آمنہ' زینب نہیں۔ وہ آمنہ تھی۔ سسرال میں رہ کر بھی زینب آپا کو میکے کے نام پہ صرف حارث یاد آیا کرتا تھا۔

وہ اس کے پل پل کی خبر رکھتی تھیں۔ سسرال بھی کون سا دور تھا۔ دو گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں زینب آپا کا سسرال تھا۔ سو پل پل کی خبر رکھنا کچھ اتنا بھی مشکل نہیں تھا۔ تب ہی تو جب حارث کی لڑائی ساتھ والوں کے لڑکے سے ہوئی اور اس نے بیٹ سے اس لڑکے کا سر پھاڑا تو... ابا سے پہلے زینب آپا پہنچ چکی تھیں۔ مگر اس دفعہ زینب آپا کے آنے سے بھی کام نہیں بنا تھا۔ حارث کا کارنامہ اب کی بار کچھ زیادہ ہی بڑا تھا۔ ابا نے پانی والا پائپ لے کر اسے مارا تھا اور اس طرح سے مارا تھا کہ اس کا بے ہوش ہونا تو بنتا تھا' مگر وہ تو پورے ہوش و حواس میں تھا۔ تھانے اور تھانے دار کا ڈر بھول گیا تھا۔ زینب آپا اس کی کمر پہ ٹکور کرتے ہوئے روئے جا رہی تھیں اور حارث وہ چارپائی پہ اوندھے منہ بے پروا لیٹا زمین پہ انگلی کی مدد سے نہ جانے کیا نقش و نگار بناتا رہا تھا۔ ہر دفعہ ٹکور کرتے ہوئے "سی" کی آواز زینب آپا کے منہ سے نکلتی تھی۔ وہ پتا نہیں کس مٹی سے بنا تھا۔ وہ پتھر جس پر قطرہ قطرہ پانی بھی اثر نہ کرتا ہو۔

زینب آپا کے ابھی کچھ کاغذات اور کچھ ان کے سسرال والوں کا مسئلہ تھا۔ اس لیے وہ اپنے میاں کے ساتھ سعودیہ نہ جا سکی تھیں۔ عورتیں میاں کے ساتھ جانے پر شکر ادا کرتی ہیں اور انہوں نے نہ جانے پہ نوافل پڑھے تھے۔

اور وجہ... وہ ہی... حارث... حارث نے کبھی زینب آپا کی محبت کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔

اسے اپنے بھائیوں اور بہنوں سے نفرت تھی اور اسی نفرت کے دائرے میں اس کے ابا بھی آتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ سارا گھر اس سے بے زار تھا اور وہ سارے گھر سے 'مگر اک زینب آپا تھیں جن کے نام پر اس کا دل "خالی" ہو جاتا تھا۔

وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر پاتا۔ محبت نہ نفرت... ایک دم خالی... بالکل خالی...

☆ ☆ ☆

اس گھر کے سامنے کھڑے ہو کر اسے یاد آیا تھا کہ محض چند سال صرف چند سال پہلے وہ یہاں زینب آپا کے گھر میں کھڑے ہو کر ان ہی کے منہ پہ تھوک کر گیا تھا اور یہ کہہ کر گیا تھا کہ۔

"تم جیسی کوئی بہن نہیں ہو سکتی کوئی (گالی) ہی ہو سکتی ہے۔"

اسے یاد تھا... بہت اچھی طرح سے یاد تھا اور یہ یاد ہی تھی جو آج عذاب بن کر اس پر نازل ہوئی تھی اور ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ وہ یہاں ان سے ملنے آیا تھا۔ معافی مانگنے آیا تھا سارے کفارے ادا کرنے آیا تھا۔ ازالے کرنے آیا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ ڈور بیل پہ ہاتھ رکھے' مگر اسے یک دم پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پہ گرا تھا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا تھا۔ اسے رونا نہیں آیا تھا کسی چیز نے اس کے اندر ابل ابل کر اتنا دھواں پیدا کر دیا تھا کہ اس کا سانس جیسے بند ہونے لگا تھا۔

"زینب آپا۔" اس کے لب کپکپائے وہ کچھ دیر وہیں انتظار کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا اور زینب آپا تو ہمیشہ جان لیا کرتی تھیں یوں جیسے وہ ٹیلی پیتھی کی ماہر ہوں 'مگر اب کافی دیر بعد بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو حیران ہوتے ہوئے اس نے بیل بجائی تھی' سامنے شفیق بھائی تھے۔ شفیق بھائی اپنے نام سے بڑھ کر شفیق تھے' اسے دیکھ کر وہ چونکے نہیں تھے۔ غصہ نہیں ہوئے تھے بلکہ ایک گہرا سانس بھرا تھا یوں جیسے اسے وہاں ہی آنا ہو۔ یوں جیسے انہیں اسی کا انتظار ہو۔

"آجاؤ حارث" مدھم سی آواز میں کہتے ہوئے وہ مڑ گئے تھے۔ وہ یک دم ان کے پیچھے اندر نہیں جا سکا تھا کچھ دیر وہیں منجمد کر دینے والی کیفیت کا شکار ہو کر کھڑا رہا تھا۔

دراصل وہ سوچ رہا تھا کہ زینب آپا کا سامنا کیسے کرے گا۔ زندگی میں کبھی بھی... کبھی بھی... اس نے یہ بات تو نہیں سوچی تھی بڑے سے بڑا کارنامہ سر انجام دینے کے بعد بھی نہیں 'مگر ہوتے ہیں نا زندگی کے کچھ لمحات... ایسے کچھ لمحات جو اپنے اندر کسی بڑھے ہوئے پانی یا پھر جادو کی سی تاثیر رکھتے ہیں۔ اک پل... اک ساعت میں آپ کو بدل کر رکھ دیتے ہیں اور اس طرح بدلتے ہیں کہ آپ خود... خود کو ہی پہچان نہیں پاتے اور اگر کبھی مڑ کر حال میں کھڑے ہو کر ماضی کو دیکھیں تو وہ سب کچھ خواب لگتا ہے اور اس وقت کبھی اگر انسان اس قابل ہو جائے دوبارہ ماضی میں جا کر حال کو دیکھ سکے تو اسے "حال" کبھی بھی مذاق کے علاوہ کچھ نہ لگے۔ یہ سب لمحوں کا کرشماتی اثر ہوتا ہے ساعتیں ہوتی ہیں کچھ جس میں سب کچھ ونڈر لینڈ جیسا انوکھا اور طلسم کدے جیسا حیران کن لگتا ہے۔ یہ کرشماتی لمحات نہیں ہوتے یہ پارس پتھر ہوتے ہیں جن سے انسان انجانے میں چھو کر "سونا" بن جاتا ہے

اور اگر "سونا" نہ بھی بنے تو نایاب ضرور ہو جاتا ہے جیسے کہ حارث قیوم۔۔۔

☼ ☼ ☼

حارث اب بارہ سال کا ہو چکا تھا اور اب اس کی چوٹوں کی شکل بھی بدل چکی تھی۔ اب وہ چھت سے گر کر، سیڑھیوں پہ اندھا دھند بھاگ کر چوٹ نہیں لگاتا۔ وہ اب محلے کے لڑکوں سے لڑ جھگڑ کر، لڑکیوں کو چھیڑنے پر لڑکوں کے دیے گئے خطوط نہ پہنچانے پہ اور ابا کی بات نہ ماننے پہ مار پٹس چوٹیں کھاتا تھا، مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔ مار کے علاوہ شاید کوئی چیز اس پہ اثر کر سکتی تھی مگر مار نہیں، کبھی بھی نہیں۔

زینب آپا کی کوئی اولاد نہیں ہو سکی تھی، سو حارث کے لیے ممتا کچھ اور بڑھ چکی تھی، فکروں کی شدت کا گراف کچھ اور بلند ہو چکا تھا۔ اپنے سارے بھائیوں میں واحد وہ ہی تھا جس نے دھڑلے سے ابا کے منہ پہ ان کے ساتھ دکان پر بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ تب ہی قیوم صاحب کو احساس ہوا تھا۔ وہ واقعی ان ہی کا بیٹا تھا۔ مگر وہ بھی باپ تھے انہوں نے بھی اس کا جیب خرچ بند کر دیا۔ جیب خرچ بند ہوا تھا تو کیا ہوا؟ لوگوں کی جیبیں زندہ باد۔۔۔ دو سال اور گزرے تو حارث نے موبائل اسنیچنگ بھی شروع کر دی تھی۔ سو اپنا خرچ چلانا کبھی بھی اس کے لیے مشکل نہیں رہا تھا اور ہاں!

زینب آپا بھی تو تھیں اس کی ضروریات پوری کرنے کو۔۔۔ اس کی ہر فکر کی پروا کرنے کو۔۔۔ تو بھلا وہ کیوں فکر کرتا۔۔۔ اور جہاں تک بات تھی سگریٹ پان وغیرہ کی تو وہ تو اس نے بہت پہلے ہی شروع کر دیا تھا۔ محلے کے چھوٹے کیا بڑے بھی اس سے ڈرتے تھے نہیں ڈرتے تھے تو بس قیوم صاحب۔۔۔ اور حارث کی زندگی کا مقصد بھی صرف ایک تھا صرف اور صرف ایک۔۔۔

قیوم صاحب کو سکون کی نیند اور چین کا سانس نہ لینے دینا کچھ ایسی ہی ڈسل چلتی تھی اس کی اپنے باپ سے کئی بار وہ تھانے جا چکا تھا کئی بار چھوٹ کر آ چکا تھا۔ تھانے کے دس نمبر چھتر کا ڈر تو وہ اسی روز بھول گیا تھا جس روز ابا نے اسے پائپ سے مارا تھا تو حارث قیوم۔۔۔ حارث قیوم نہیں رہا تھا۔ اسٹریٹ گینگسٹر بن چکا تھا۔

یہ تب ہی کی بات تھی، جب حارث پہ نیا نیا سولھواں سال چڑھا تھا۔ زینب آپا کا ویزا آ گیا تھا اور وہ کس دل سے گئی تھیں۔۔۔ کیسے جبر کیا تھا خود پہ۔۔۔ یہ زینب آپا کا خدا ہی جانتا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ اسے ساتھ لگائے روتی رہی تھیں۔

"آپا بس بھی کرو۔" ایک بے زار سی آواز انہوں نے سنی تھی۔ آنسو پونچھتے وہ اس سے الگ ہوئی تھیں اور پھر زینب آپا چلی گئی تھیں، دور۔۔۔ بہت دور۔۔۔ اتنی دور کہ وہ چاہ کر بھی اس کی چوٹوں کو سہلا نہیں سکتی تھیں اس کے لیے مرہم نہیں ہو سکتی تھیں۔

اور زینب قیوم کسی عورت کا نام نہیں تھا یہ نام حارث کے لیے کسی کرامت کی طرح تھا۔ کسی دعا کی طرح تھا کوئی بخشی ہوئی دعا وہ جب تک پاکستان میں رہیں وہ کرامت وہ دعا اسے مصیبتوں سے بچاتی رہی، مگر جیسے ہی وہ سعودیہ گئی تھیں مصیبتوں نے نہ صرف چاروں طرف سے بلکہ اوپر نیچے سے بھی حارث کو گھیر لیا تھا۔ اب کہ کارنامہ ہی ایسا انجام دیا تھا اس نے لڑکی لے کر بھاگا تھا وہ محض سولہ سال کی عمر میں اور لڑکی بھی وہ جو چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور وہ چار بھائی وہ بلائیں ہی تھے جو اس پہ ہر طرف سے نازل ہوئے تھے وہ بھی محلے کی نہ صرف لڑکی لے کر بھاگا تھا بلکہ ریپ کیس میں بھی ملوث ہو گیا تھا۔

"تمہارا لاڈلا لڑکی اٹھا کر لایا ہے" سعودیہ فون کر کے زینب آپا کو طعنہ دیا گیا تھا۔

"یا اللہ" وہ اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکی تھیں اور ایسی صورت حال میں اس کے علاوہ کچھ اور کہا بھی نہیں جا سکتا۔

"کہاں ہے وہ؟ کون سی لڑکی؟" چند لمحوں کی خاموشی اور پھر گھبرائے لہجے میں پوچھے جانے والے سوال۔

اور جب زینب آپا کو معلوم ہوا تھا کہ وہ محلے کی لڑکی لے کر بھاگا تھا، تو سجدے کر کے۔ دعائیں مانگ مانگ کر انہوں نے دن رات ایک کر دیے۔

یہ بڑی سنگین صورت حال تھی۔ زینب آپا کا تو کلیجہ منہ کو آتا تھا۔ دل پھٹنے کو تیار بیٹھا تھا کہ جیسے ابھی زینب حوصلہ چھوڑے اور وہ اپنا کام دکھا چھوڑے۔ مگر کیا ہے کہ زینب آپا کا "ایمان" اس کم بخت دل سے بہت بڑا اور بہت مضبوط بھی تو تھا۔ وہ دن رات روتی تھیں۔ حارث کے لیے کم۔ اس لڑکی کے لیے زیادہ۔ یہ سب حارث نے کیا تھا۔

"یا اللہ" وہ رو رو کر اسے پکارتی تھیں۔ یہ حارث نے کیا کر دیا تھا۔ وہ شرمندہ تھیں۔ انسانوں سے نہیں۔ اللہ سے۔ ایک وجود کی ذمہ داری انہیں سونپی گئی تھی اور وہ بھی وہ پورا نہ کر سکیں۔

مگر وہ بھی کیا کرتیں۔ آخر سولہ سال کی عمر میں ماں بننا پڑ گیا تھا جب ۔۔۔ خود انہیں تربیت کی ضرورت تھی۔ حارث کو بچانے کے لیے صرف دو ہاتھ تھے اور اسے خراب کرنے کو پورا زمانہ سمیت گھر والوں کے اور ان ہی مانگی جانے والی دعاؤں میں۔ شرمندگی اور ندامت کے آنسوؤں کے کہیں بیچ میں۔ کوئی بھولی بھٹکی۔ یوں جیسے غلطی سے۔ بے ساختہ مانگ لی جانے والی دعا۔ اس گمراہ کے لیے بھی ہوتی تھی۔ یوں جیسے بے اختیار۔ ضبط کے باوجود۔ بے دھیانی میں اچانک گر پڑنے والے چند آنسو۔ حارث کے نام کے بھی ہوتے تھے۔ وہ مجبور تھیں۔ آخر کو "ماں" بن کر پالا تھا۔ وہ بے بس تھیں۔ آخر "بہن" جیسا رشتہ تھا۔

☼ ☼ ☼

دعائیں موبائل فون کے سگنل نہیں ہوتیں کہ صرف مخصوص ایریا میں کام کریں۔ کوئی ایسا نیٹ ورک تو نہیں جو حد سے باہر گئے تو رابطہ ناممکن ہو گیا۔ یہ Wi-Fi کنکشن بھی نہیں ہوتیں کہ پاس ورڈ ملنے کے بعد کام کریں۔ انہیں صرف اور صرف ایک ہی تعلق ایک ہی رابطے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور رابطہ کام دکھا گیا تھا۔ چند آنسو۔ کچھ دعائیں کام کر گئی تھیں۔ اور حارث کو "کشمیریوں" سے بچا گئی تھیں۔ پولیس نے چھاپا مارا تھا اور لڑکی کو بازیاب جبکہ لڑکوں کو زیر حراست لے لیا گیا تھا۔ لڑکی کی حالت بہت نازک تھی اسے سیدھا اسپتال پہنچایا گیا تھا۔ اور حارث سمیت پورے گینگ کو سیدھا حوالات۔ جہاں پہ جاتے ہی ان کی "چھتروں" سے تواضع کی گئی تھی۔ حارث کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

☼ ☼ ☼

شفیق بھائی نے اس کی جانچتی۔ کچھ تلاش کرتی نظروں کو دیکھا اور بے اختیار ان کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کسے ڈھونڈ رہا تھا۔ کس کی تلاش میں تھا۔ اس کی نظریں انتہائی بے قراری سے کسے ڈھونڈتی تھیں۔

"شفیق بھائی۔ زینب آپا۔۔۔"

"آؤ۔ چلو مل کر آتے ہیں اس سے۔" شفیق بھائی نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ اور گھٹنوں پہ دباؤ ڈال کر اٹھتے ہوئے بولے۔

"آپا کہاں ہیں؟"

وہ انہیں یوں اٹھتا دیکھ کر گھبرایا تھا۔

"بڑے آرام میں ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائے۔

"کیا ہوا ہے انہیں؟" وہ بے طرح بوکھلایا تھا۔

"اسے کیا ہونا ہے برخوردار! اب تو جو ہونا ہے ہمیں ہی ہونا ہے۔" ان کی مسکراہٹ بہت مشکل سے چہرے کی اداسی کو کم کر سکی تھی۔

"شفیق بھائی؟" وہ عجیب بے بسی سے بولا تھا۔

وہ کچھ بولے نہیں۔ بس آگے بڑھ کر تسلی کے سے انداز میں اس کے کندھے کو تھپتھپایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سخت محنت کیا کرتا تھا۔ یہ اسے کام کرتے دیکھنے والوں کا خیال تھا، مگر اسے لگتا تھا کہ اسے اس سے بھی بڑھ کر محنت کرنی چاہیے۔ وہ جیسی اور جتنی محنت اب کررہا ہے، وہ اس کے مقابلے میں کچھ کم تھی جتنی "محنت" اسے کرنی چاہیے تھی یا جتنی کہ وہ کرسکتا تھا۔

وہ دن رات... شفٹس میں مختلف چھوٹی موٹی جابز کیا کرتا۔ ڈش واشنگ سے لے کر پزا ہوم ڈیلیوری تک ہر وہ جاب جو وہ کرسکتا تھا اور جو اس کی دسترس میں تھی۔ چوبیس گھنٹوں میں اک نارمل انسان کو سات، آٹھ گھنٹے کی نیند چاہیے ہوتی ہے، مگر اس نے نارمل انسانوں سے جڑی میڈیکل سائنس کی اس حقیقت کو غلط ثابت کردیا تھا۔ وہ گدھوں کی طرح کام کرتا اور گدھے بھی تھک کر سوجاتے ہوں گے مگر وہ نہیں سویا کرتا تھا۔

"آخر کیا کرتا تھا اس نے ڈالرز کا؟"

اتنی محنت کہ ہفتے کے پانچ دنوں میں اسے کبھی بھی تین وقت کا کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف دو وقت کا کھانا ہی کھایا کرتا تھا۔ کیوں؟

دولت کمانے کے لیے۔

وہ پیسے کے لیے جنونی تھا۔

اور "پیسے" کے لیے اس سے جو بن پڑتا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ کوشش کیا کرتا تھا، وہ اپنی ہمت اور گنجائش سے کہیں زیادہ محنت کیا کرتا تھا۔ وہ اس معاملے میں "خبطی" واقع ہوا تھا۔ دیکھنے والے کہا کرتے تھے کہ وہ پیسے کے معاملے میں اتنا خبطی ہے کہ خود — کو بھی بیچ دے اور اتنا بخیل ہے کہ کسی فقیر کو ایک پینی تک نہ دے۔

"آخر کیوں؟"

☼ ☼ ☼

معجزے ایسے ہی رونما نہیں ہوجایا کرتے۔ یوں ہی بیٹھے بٹھائے وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ معجزوں کے پیچھے کسی کی عمر بھر کی ریاضت کام کررہی ہوتی ہے۔ ایک رات میں سالوں جتنی کی گئی "عبادت" اور سالوں میں صدیوں جتنی "عبادت" کار فرما ہوتی ہے۔ آنسوؤں سے بھیگی دعاؤں کا کرشمہ ہوتے ہیں یہ معجزے۔ اور وہ حارث قیوم وہ تو بچپن سے معجزوں کی "زد" میں تھا۔ اور اب اتنی سنگین صورت حال میں اس کے ساتھ کوئی "معجزہ" نہ ہوتا تو یہ حیرانی کی بات تھی عدالت میں پیشی کے لیے جاتے ہوئے احاطہ عدالت کے اندر ان چاروں پہ فائرنگ کی گئی تھی۔ ان چاروں میں ایک لڑکا موقع پہ دم توڑ گیا تھا۔ دوسرے کی حالت تشویش ناک تھی۔ تیسرے کو ٹانگ میں گولی لگی تھی، ایک کانسٹیبل بھی جاں بحق ہوا تھا اور دو زخمی... مارنے والوں کے پاس — بندوقیں تھیں — اور بچ جانے والے کے پاس... پس کیا تھا؟

"کیا اب بھی یہ بتانا باقی ہے کہ اس کے پاس کیا تھا؟" زندگی میں پہلی دفعہ اس نے بارش کی بوچھاڑ کی طرح برستی گولیوں کو دیکھا تھا۔ تڑتڑتڑ... یک دم وہ خوف زدہ ہوا تھا اور اسی خوف کے باعث وہ اپنی جگہ پہ ساکت ہوگیا تھا۔

"جھک جاؤ!" اچانک اسے پیچھے سے کسی نے دھکا دیا تھا اور وہ کمر کے بل دہرا ہو کر لڑکھڑایا تھا اور اک گولی اس کے بازو کے قریب سے بنا چھوئے گزر گئی۔ دھکا دینے والا اب اسے گھسیٹ کر دوڑتے ہوئے وہاں کھڑی ایک گاڑی کی اوٹ میں ہوا تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے یک دم گاڑی کے پیچھے جا کر منہ کے بل گرا تھا۔

حارث کو منہ کے بل گرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کا ماتھا کتنی شدت کے ساتھ زمین سے ٹکرایا تھا اور اسے کہاں کہاں چوٹ لگی تھی، اک "خوف" نے جیسے ساری حسیات کو چھو کر پتھر کا کردیا تھا۔ "موت کا خوف..." وہ پہلا موقع تھا موت سے سامنے کا... تو ایسا تو ہونا ہی تھا موت اسی طرح انسان کو بدحواس کرتی ہے جس طرح سے حارث قیوم ہوا بیٹھا تھا۔

مگر پلٹ گئی۔ یہ کہہ کر "حارث قیوم چار دن اور جی لو کہ تم مہلت دیے گئے لوگوں میں سے ہو۔" اور وہ حارث قیوم... وہ ہی حارث قیوم جو کسی "معجزے" کی زد میں تھا وہ اوندھے منہ گرا اور خاک بھرے منہ کے ساتھ زندگی کی آواز اپنے کانوں میں سنتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نا سمجھی سے شفیق بھائی کو گاڑی سڑک پر دوڑاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ شفیق بھائی اسے کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ ایک دو دفعہ پوچھنے پر بھی وہ خاموشی سے سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلاتے رہے۔ تھک کر اس نے نظریں باہر گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگنے والے مناظر پہ جما دی تھیں۔

"زینب آپا آخر کہاں ہیں؟ کیا ہوا ہے۔ آخر اس طرح کیوں ہم ان سے ملنے جارہے ہیں۔" وہ محض سوچ سکتا تھا سو سوچ رہا تھا جواب تب ہی ملنا تھا جب گاڑی رکنی تھی

اور یہ "چلنے" سے "رکنے" تک کا سفر اک عذاب کا سفر تھا۔ اک گہرا سانس بھر کر اس نے نظریں باہر سے ہٹا کر اپنے دونوں ہاتھوں پہ جمادیں۔ تھوڑی دیر بعد اس نے چند قطرے اپنے ہاتھوں پر گرتے دیکھے تھے۔

ایسا ہمیشہ ہوتا تھا وہ "زینب آپا" کے نام پہ ہمیشہ ہی "موم" ہوجایا کرتا تھا، اور پھر قطرہ قطرہ پگھلتا تھا۔ گاڑی اک جھٹکے سے رکی تھی۔ بے ساختہ اس نے شفیق بھائی کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ اب تک ذہن بنا چکا تھا کہ زینب آپا شدید بیمار ہوسکتی ہیں اور شفیق بھائی اسے کسی اسپتال میں لے کر جارہے تھے۔

مگر... لاشعوری طور پر اس نے سامنے دیکھا اک قیامت تھی جو اس کی منتظر تھی۔ سامنے اک بڑا سا میدان تھا جس کی باؤنڈری وال کے اندر مٹی کے ڈھیر تھے جن کے سرہانے نشان دہی کے لیے پتھر عمودی شکل میں رکھے گئے تھے کسی شک... کوئی شبہ... کوئی بے یقینی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ دم بخود اس جگہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپائے اس نے انہیں بھینچ لیا، ہاتھ لرزے، اس نے ہاتھوں کی مٹھیاں کس لیں مگر پھر بھی وہ جسم کی لرزش پہ قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ کانپ رہا تھا اور یہ کپکپی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ شفیق بھائی کو اس پہ بے طرح سے ترس آیا اور پہلی دفعہ انہیں محسوس ہوا کہ انہیں حارث کو اس طرح سے آگاہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بالکل ساکت ہو کر ٹکٹکی باندھ کر سامنے دیکھ رہا تھا اور پھر یک دم اس نے آنکھیں زور سے بند کی تھیں۔

"حوصلہ کرو یار۔" شفیق بھائی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی کے سے انداز میں کہا۔ وہ وہ آواز نہیں سن سکتا تھا۔ آواز کیا وہ اس وقت ہر احساس سے عاری تھا۔

"حارث؟" شفیق بھائی نے اس کا کندھا ہلایا۔

اب کہ بھی اس کی حالت میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ "وہاں" تھا ہی کب؟ وہ تو "عالم برزخ" میں تھا۔ جہاں کسی چیز کا احساس باقی نہیں رہتا کوئی چیز معنی نہیں رکھتی... وجود... لاوجود بن جاتا ہے۔

ذات... بے شناخت ہوجاتی ہے... اور یہ سب آسان تو نہیں ہوتا۔

یہ اس کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

شفیق بھائی کو اب تشویش ہونے لگی تھی اور انہیں رہ رہ کر اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا، اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ کہتے یا کچھ کرتے اس نے اک عجیب حرکت کی تھی۔ شفیق بھائی نے اک شاک کے سے عالم میں اسے دیکھا تھا۔ وہ یک دم سیٹ سے نیچے پھسلا تھا اور رخ موڑ کر دونوں ہاتھوں سے کسی بچے کی طرح سیٹ میں چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ یوں جیسے وہ فرار چاہ رہا تھا۔ مگر کس سے؟ وہ کانپ رہا تھا۔ سسک رہا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

کیا؟ یہ سمجھ سے باہر تھا۔

"حارث!" شفیق بھائی تیزی سے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر آئے اور اس کی طرف کا دروازہ کھول کر

پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھے تھے۔
"حارث!" انہوں نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اٹھانا چاہا تھا اور تب ہی ان پہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ تو پسینے سے اس بری طرح سے بھیگا ہوا تھا کہ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر حارث کو سیدھا کرنا چاہا اور اسے سیدھا کرنے کے لیے انہیں کوئی قوت صرف نہیں کرنی پڑی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے کسی بے جان چیز کی طرح ان کے ہاتھوں میں آگیا تھا۔ اور شفیق بھائی فق چہرے کے ساتھ اس کے بے سدھ وجود کو دیکھ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ ابھی تک دہشت زدہ تھا ابھی تک بے یقین تھا۔ بے یقین ہونے کی وجہ بھی تھی۔ ان چاروں میں سے تین مارے گئے تھے اور وہ... وہ بچ گیا تھا۔ اسے سزا سنائی جا چکی تھی ملزم سے مجرم تک کا سفر مکمل ہو چکا تھا۔ وہ چونکہ ابھی اٹھارہ سال کا نہیں ہوا تھا سو اس کو سزا بھی نابالغ کیٹیگری والی دی گئی تھی۔ یعنی کہ حارث قیوم کی زندگی اب زندگی نہیں تھی قید تھی... صرف قید... قید مسلسل... اور تنہائی۔ باپ نے تو اسی دن اسے عاق کر دیا تھا جس دن اسے لڑکی اٹھانے والے کا نام پتا معلوم ہوا تھا بہن بھائی پہلے بھی اس سے زیادہ روابط نہیں رکھنا پسند کرتے تھے اور اب تو... نوشہرہ میں بیٹھے بہن بھائی اس سے یوں قطع تعلق ہوئے تھے جیسے وہ سعودی عرب میں ہو اور وہ... زینب آپا... وہ یوں اس سے رابطے میں تھیں جیسے کہ خراب تک تو آپ زینب آپا کو جان ہی چکے ہیں۔ اس کی ملاقات نہیں آتی تھی... فون آتا تھا۔ وہ بھی سعودیہ سے...
"آپا مجھے یہاں سے نکلوا دو۔" ہر دفعہ وہ بلک بلک کر کہتا تھا۔
"حارث... میری جان گناہ کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ تب چھوٹ ملتی ہے۔ بھگت لو چھوٹ مل جائے گی۔"
وہی شستہ، ملائم، نرم مگر نم لہجہ۔
"گناہ نہیں تھا آپا... غلطی ہو گئی تھی۔" وہ تصحیح کرتا۔ "ہر غلطی... غلطی نہیں ہوتی... کچھ غلطیاں اتنی سنگین ہوتی ہیں کہ جرم بن جاتی ہیں۔" وہ دکھ سے جواب دیتیں۔ وہ زچ ہوتا... فون کو گھورتا... منہ ہی منہ میں زینب آپا کو گالیاں دیتا۔
"آپا دیکھو... ایک دفعہ چھڑوا لو... قرآن پہ ہاتھ رکھوا لینا پھر سے ایسا کام نہیں کروں گا۔" اس بات پہ زینب آپا کرب سے آنکھیں بند کر لیتیں۔ وہ اس کے لہجے میں موجود فریب کو جان جاتی تھیں۔
"میں کچھ نہیں کر سکتی۔" کمزور سا لہجہ۔
"تمہارے پاس اتنا پیسہ ہے۔"
"تو پیسے سے کیا ہوتا ہے؟"
"پاکستان میں سب پیسے سے ہوتا ہے۔"
"مثلاً؟"
"تم آج ان کو دو چار لاکھ بھجواؤ کل کیا... شام کو میں جیل سے باہر ہوں گا۔" اور اس بات پہ زینب آپا کا دکھی دل مزید دکھ سے بھر جاتا۔ یہ ان کا بھائی تھا؟
"سنو حارث!" زندگی میں پہلی بار ان کی آواز میں، لہجے میں حارث کے لیے سختی آئی تھی۔
"اچھے رویے اور کردار والے قیدیوں کی سزائیں عیدین پہ کم یا معاف کر دی جاتی ہیں۔ اس بار تم خود کو اچھا ثابت کرو۔ میں وعدہ کرتی ہوں جس دن تم جیل سے باہر آئے میں تمہیں سعودیہ بلا لوں گی۔" اور وہ حیرت سے بند فون کو دیکھتا رہ گیا تھا۔
یہ زینب آپا تھیں۔

☼ ☼ ☼

جب اس نے جدہ ایرپورٹ پہ قدم رکھا تھا تو وہ پورے چھبیس سال سات ماہ کا ہو چکا تھا۔ تقریباً ساڑھے دس سال کا عرصہ اس نے جیل میں گزارا تھا اس نے اچھا بن کر دکھایا تھا۔ عمدہ اخلاق کا مظاہرہ کیا تھا مگر پھر بھی اسے دس سال لگ گئے تھے دس سال...

ان دس سالوں میں اس نے کسی اپنے کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ ایک کے علاوہ کسی کی آواز تک نہیں سنی تھی۔ وہ لوگ اسے مار چکے تھے۔
دس سال بہت ہوتے ہیں اتنے کہ انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ بہت کچھ بھلا سکتا ہے۔ حارث نے بھی ان دس سالوں میں بہت کچھ بھلایا تھا اور بہت کچھ سیکھا بھی تھا۔ دس سال اس نے اپنی فطرت کے خلاف جا کر گزارے تھے اور اب اگلے دس سال اس نے اپنی مرضی کے گزارنے تھے۔ زینب آپا نے وعدہ پورا کیا تھا اور اب ان کی "قسم" پوری ہونے کا وقت تھا۔ وہ اک نیا حارث تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس کا باپ کون تھا۔ بہن بھائی تھے کہ نہیں... اسے ان دس سالوں میں صرف زینب آپا یاد تھیں۔ صرف اور صرف زینب آپا... زینب آپا کے "عمل" نے اسے کچھ اور یاد رہنے ہی نہیں دیا تھا۔ ان سالوں میں گو کہ اس نے اچھا بن کر دکھایا تھا مگر وہ بس "دکھانے" تک ہی محدود تھا۔ اصلاح اسیران کے ایک پروگرام کے تحت اس نے جیل میں رہ کر ہنر سیکھا تھا۔ اور یہ ثابت کیا کہ یہ حارث قیوم وہ نہیں ہے جس کی بنا پہ اسے جیل ہوئی تھی۔ حارث قیوم تو وہ تھا جس کی بنا پہ وہ آج جیل سے باہر تھا۔
ایرپورٹ سے باہر آ کر اس نے گہرا سانس لے کر اس "نئی" دنیا کو دیکھا تھا۔ شفیق بھائی اسے دیکھتے ہی اس کی طرف آئے تھے اور جوش سے اسے گلے لگایا تھا۔
"تمہاری آپا تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی آج حارث! ان دس سالوں میں اس نے اللہ سے تمہارے سوا کچھ نہیں مانگا۔" وہ اب اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر بولے تھے۔
بے اختیار اس کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ آئی تھی۔
"جو میں نے اس سے مانگا تھا۔ وہ تو اس نے مجھے دیا نہیں شفیق بھائی... اب ایسا کیا ہے، جو وہ میرے لیے اللہ سے مانگتی ہے۔" اور اس نے طنزیہ لہجے کو چھپایا بھی نہیں تھا۔ شفیق بھائی ہلکا سا مسکرائے۔
"چلو چلتے ہیں۔" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا تھا۔
"آپا آئی کیوں نہیں؟" اسے زینب آپا کی غیر موجودگی بری طرح کھلی تھی۔
"آٹھ گھنٹوں کا سفر ہے الخرج کا یہاں سے اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتی تھی وہ۔" وہ خموشی سے گاڑی سے باہر دیکھنے لگا تھا یوں جیسے وہ اس جواب سے مطمئن نہ ہوا تھا۔
اور اس آٹھ گھنٹوں کے سفر میں زینب آپا نے آٹھ سو دفعہ فون کیا تھا۔ اور ہر بار اس کی آواز سننے کے بعد وہ "اللہ" کا شکر بڑے بے ساختہ انداز میں ادا کرتی رہی تھیں اللہ نے انہیں ان کے دس سالوں کی محنت کا اجر دے دیا تھا۔ ان کا "حارث" آج ان کے پاس آ رہا تھا۔ ان دونوں کو گھنٹی نہیں بجانی پڑی تھی۔ زینب آپا پہلے سے دروازے کے پاس موجود تھیں اور یوں دروازہ کھولا تھا جیسے کہ وہ ٹیلی پیتھی کی ماہر ہو۔ شفیق بھائی کی گھنٹی بجانے کے لیے اٹھتا ہاتھ فضا میں ہی ساکت ہو گیا تھا وہ اک لمحے کے لیے حیران ہوئے اور پھر بے ساختہ ہنس پڑے تھے۔
"حارث!" نم آنکھوں، مسکراتے لبوں کے ساتھ انہوں نے والہانہ انداز میں حارث کو گلے سے لگایا تھا۔ اور جواب میں ہمیشہ کی طرح کا سرد تاثر تھا مگر ہمیشہ کی طرح پروا کسے تھی۔ خوشی سے ان کا چہرہ دمک رہا تھا بہت گرم جوشی سے... وارفتگی سے انہوں نے حارث کا ماتھا چوما تھا۔ اور وہ کسی بت کی مانند کھڑا رہا تھا۔ انہوں نے حارث کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے تھے۔ بے اختیار وہ ان ہاتھوں کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگی تھیں۔ "وہ کیوں رو رہی تھیں؟" یہ حارث نہیں جانتا تھا۔ شفیق بھائی جانتے تھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر انہیں حارث سے نرمی سے الگ کیا تھا۔
"بس کرو زینب۔ تھکا ہوا آیا ہے۔ آرام کرنے دو

اسے۔" اور وہ آنسو صاف کرتے ہوئے مڑی تھیں۔

"آپا!" وہ اس پکار پہ جی جان سے پلٹی تھیں۔

"کیوں میری زندگی کے دس سال برباد کر دیے تم نے ہم چاہتیں تو میں اس گھر میں دس سال پہلے بالکل اسی طرح سے آسکتا تھا جس طرح آج آیا ہوں۔ کیوں کیا ایسا تم نے؟ کیا حارث کے لیے تمہارے پاس چند لاکھ نہیں تھے؟"

اس شکوے پہ زینب آپا کا چمکتا ہوا چہرہ تیزی سے تاریک ہونے لگا تھا۔ اور اس تاریک ہوتے چہرے کو دیکھ کر شفیق بھائی کا چہرہ اتنی ہی تیزی سے سرخ ہوا تھا۔

"تم!" وہ کچھ سخت کہنا چاہتے تھے۔ زینب آپا نے اشارے سے منع کر دیا۔

"جاؤ فریش ہو جاؤ حارث!" سامنے بنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔ شفیق بھائی کو زینب سے محبت تھی اور زینب کو حارث سے۔۔۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مجبور تھے۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں پہلی مرتبہ وہ "موت" سے تب خوف زدہ ہوا تھا' جب اس پہ حملہ ہوا تھا۔ اس کے بعد جیسے وہ سین اس کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن چکا تھا۔ گو کہ پچھلے دس سالوں میں اس کی شدت میں کمی آچکی تھی' مگر پھر بھی وہ پوری طرح سے ختم نہیں ہوا تھا۔ اور اب۔۔۔ کافی عرصے بعد۔۔۔ زینب آپا کے گھر گزاری جانے والی پہلی رات۔۔۔ وہ سو نہیں سکا تھا۔ وہ بالکل نارمل حالت میں۔۔۔ کسی بھی ذہنی دباؤ۔۔۔ ذہنی پریشانی کے بغیر سویا تھا اور آدھی رات کو وہی خواب۔۔۔ یوں جیسے وقت دس سال پیچھے احاطہ عدالت میں چلا گیا ہو۔ وہ ہمیشہ اس خواب میں خود کو مرتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ وہ گولی جو اس کے بازو کو چھو کر گزری تھی خواب میں سیدھی اس کے دل کے مقام میں پیوست ہو جاتی' وہ گولی لگنے کی تکلیف۔۔۔ موت کی اذیت کو پوری طرح سے محسوس کرتا تھا اور جب آنکھ کھلتی تو۔۔۔

تو وہ خود کو پسینے میں بری طرح سے بھیگا ہوا پاتا تھا۔ جیسے ہی اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین ہوتا بے اختیار وہ خود کو ایک سکون کی سی حالت میں پاتا' اس کے دل کی دھڑکن آہستہ آہستہ معمول پہ آنی شروع ہو جایا کرتی تھی۔ اپنے زندہ ہونے پہ اس کی جو حالت ہوتی وہ بیان سے باہر تھی۔

اب بھی اس کے ساتھ یہ ہی ہوا تھا۔ گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھلی تھی' اور اس کا پورا جسم اکڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک ہے' یک دم اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑا تھا چت ڈھیلے جسم کے ساتھ لیٹے وہ چند لمحے چھت کو گھورتا رہا تھا اور پھر گہرے گہرے سانس لینے کے بعد وہ اٹھ بیٹھ گیا تھا۔

بے بسی کی سی کیفیت میں بیڈ کراؤن کے ساتھ سر ٹکا کر کچھ بڑبڑایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب کتنی ہی راتوں کو صحیح نیند نہیں لے سکتا تھا۔ ماتھے سے پسینہ صاف کر کے اس نے سائیڈ ٹیبل سے سگریٹ اور لائٹر نکالا تھا اور اب وہ سلیپرز پہن رہا تھا۔

وہ ہمیشہ اس بات پہ حیران ہوا کرتا تھا کہ جتنی مضبوط قوت ارادی کا وہ مالک تھا اب تک تو اسے اس خوف پہ قابو پالینا چاہیے تھا جتنا وہ سخت جان اور نڈر تھا اس کے لیے تو ایسی چیزیں لایعنی ہونی چاہیے مگر ہمیشہ ہی یہ خواب اسے چاروں شانے چت کر دیا کرتا تھا۔

وہ حارث قیوم۔۔۔ جو کسی سے نہیں ڈرتا تھا وہ اس "خواب" سے بری طرح خوف کھایا کرتا تھا اور اس بری طرح سے کہ کئی دنوں تک وہ خوف کی سی کیفیت میں مبتلا ہو جایا کرتا تھا اور ساری رات سگریٹ پھونکنے کے بعد اسے صبح فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی نیند آجایا کرتی تھی۔ گویا فجر کی اذان اس کے لیے گرین سگنل کی طرح تھی کہ "اب وہ آرام سے سو سکتا ہے۔"

☼ ☼ ☼

رات وہ جلدی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ زینب آپا نے قریب بارہ بجے اسے دیکھا تو وہ سو رہا تھا۔ انہوں نے اس کے سونے کو تھکن سمجھا' مگر جب ظہر کے وقت بھی وہ نہ اٹھا تو انہیں اس کو جگانا پڑا تھا۔

"حارث! اٹھ جاؤ۔۔۔ کتنا سوؤ گے؟" وہ پیار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی تھیں۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھولی تھیں۔ سرخ نیند سے بوجھل آنکھیں۔۔۔

"رات کو ٹھیک سے نہیں سوئے حارث؟" وہ فکر مند ہوئی تھیں۔

"ہوں۔۔۔" اوندھا ہو کر اس نے منہ تکیے میں دے لیا تھا۔

"حارث! ایسے نہیں سوتے۔ اٹھو نہا لو فریش ہو گے تو آنکھیں بھی کھل جائیں گی۔ اٹھو شاباش۔ ظہر کا بھی ٹائم ہو رہا ہے۔ شفیق تو نماز پڑھنے چلے گئے ہیں تم اٹھ جاؤ۔"

"اچھا!" تکیے میں سے آواز آئی تھی۔ وہ اٹھ کر چلی گئی تھیں۔ جب وہ کافی دیر تک نہیں اٹھا تو مجبوراً انہیں پھر سے آنا پڑا تھا۔ اب کی بار وہ اٹھ چکا تھا اور ڈریسنگ کے سامنے کھڑا بال بنا رہا تھا۔

"تھوڑا پہلے اٹھ جاتے تو ظہر بھی پڑھ لیتے۔ اب تو وقت ہی نکل چکا ہے۔"

حارث کو افسوس تھا یا نہیں۔۔۔ مگر زینب آپا جی بھر کر ملال زدہ تھیں۔ اس نے شیشے میں سے زینب آپا کو دیکھا۔ ایک تیز نظر سے چند لمحے وہ پلکیں جھپکائے بنا انہیں دیکھتا رہا۔

وہ پردے ٹھیک کرتے ہوئے اپنے دھیان میں بول رہی تھیں۔ اور پھر برش کو ڈریسنگ پہ پھینک کر وہ زینب آپا کے پاس آیا تھا جو کہ دروازے کے وسط میں کھڑی تھیں۔

"آپا! اپنے پاس بلانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہیں میرے ہر کام۔۔۔ ہر چیز میں دخل اندازی کی اجازت ہے۔ یہ نمازیں و مازیں اپنے تک ہی محدود رکھو تو اچھا ہے۔ میری یہ ٹائپ نہیں ہے۔ دس سال جیسے تم نے چاہا۔۔۔ ویسا جی لیا۔۔۔ اب میری باری ہے۔۔۔ کون سی بہن تم جیسی ہو گی جو چاہے گی کہ اس کا بھائی جیل میں سڑتا رہے۔۔۔ بہنیں تو بھائیوں کے لیے جان تک دے دیتی ہیں تم سے چند لاکھ نہ دیے گئے۔" وہ ان کے عین سامنے کھڑا بول رہا تھا۔ وہ خاموشی سے نظریں جھکائے۔۔۔ سپاٹ چہرہ لیے کھڑی رہیں۔ وہ "اتنے سال برباد کروا دیے اور دعوے ہیں محبت کے۔" بڑبڑاتا ہوا ان کی سائیڈ سے نکلا تھا۔

"اتنے سال میری وجہ سے برباد نہیں ہوئے حارث!" اور حارث نے اس لہجے پہ مڑ کر حیرت سے ان کی پشت کو دیکھا تھا۔ یہ زندگی میں دوسری دفعہ تھا کہ زینب آپا نے اس سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی اور دوسری دفعہ اسے حیران کیا تھا۔ اسے شدید غصہ آیا تھا۔

"تو یہ کس کی وجہ سے ہوا آپا!" ان کا بازو کھینچ کر رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے وہ بھڑک کر بولا تھا۔

"تمہاری خود کی وجہ سے۔۔۔" انہوں نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نرمی سے جواب دیا۔ چند لمحے تک وہ سن ہو کر لاجواب سا کھڑا رہا۔

"ہو گئی تھی نا غلطی۔۔۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ تم اپنے بھائی کے ساتھ اس طرح کرتیں۔" وہ پہلے سے بھی زیادہ مشتعل ہو کر بولا تھا۔ ان کا بازو ابھی تک حارث کی گرفت میں تھا جسے بات کرتے ہوئے اس نے ایک اور جھٹکا دیا تھا۔

زینب آپا نے آنکھیں بند کر کے "کسی چیز" کو اندر اتارا تھا۔ کوئی تکلیف تھی یا پھر شاید آنسو یا پھر ضبط کرنے کا انداز۔۔۔

"کھانا کھا لو آ کے۔۔۔ رات بھی تم نے ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ تمہاری پسند کا کھانا بنایا ہے میں نے۔" اپنا بازو نرمی سے چھڑوا کر' انہوں نے حارث کے بالوں کو سنوارتے ہوئے مدہم مگر ملائم لہجے میں کہا تھا۔

حارث ایک لمحے کے لیے سکتے میں آیا تھا اور دوسرے ہی لمحے دروازے کو ٹھوکر مار کر اس نے گالی بکی تھی۔ شفیق بھائی گھر پہ نہیں تھے ورنہ اس گالی کا جواب تو وہ ضرور دیتے۔

☼ ☼ ☼

ایک سال میں تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں اور دس سالوں میں تین ہزار چھ سو پچاس۔۔۔ فرق صرف ایک صفر کا ہے مگر یہ کتنا بڑا فرق ہے۔۔۔ یہ کوئی حارث قیوم سے پوچھتا۔

ان تین ہزار چھ سو پچاس دنوں میں گزاری جانے والی ہر ساعت' ہر لمحہ' ہر پل میں۔۔۔ اور ان ساعتوں' لمحوں سے مل کر بننے والے ہر اک نئے دن میں۔۔۔ ہر دفعہ جب وہ طلوع ہونے والے سورج کی روشنی اپنے چہرے پر پڑتے ہوئے محسوس کرتا۔۔۔ ہر دفعہ جب گھڑی کی سیکنڈ کی سوئیاں حرکت میں آتیں۔ ہر دفعہ تپش دینے والا سورج نرم گرم سی گرمائش دینے لگتا اور راتوں کا حبس۔۔۔ ٹھنڈک میں بدلتا تو اس ہر ہر پل میں اس نے زینب آپا کو یاد کیا تھا۔ اک اک ساعت کے ساتھ اس نے زینب آپا کے لیے اپنے دل میں نفرت کو شدید اور پختہ ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ ہر دفعہ وہ زینب کا چہرہ یاد آنے پہ تھوک دیا کرتا تھا اور ہر دفعہ وہ قسم کھاتا کہ وہ زینب آپا سے ضرور انتقام لے گا۔ جو کچھ زینب آپا نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ ضرور ان کو اس کا بدلہ مع سود کے چکا کر رہے گا۔

یہ تھا زینب کا لاڈلا۔۔۔ پیارا۔۔۔ بیٹوں جیسا بھائی۔۔۔ اور یہ تھا وہ۔۔۔ جس کے لیے زینب آپا نے دس سال۔۔۔ اٹھتے بیٹھتے۔۔۔ چلتے پھرتے ہر لمحہ "سجدے" کی سی حالت میں گزارا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اک دن آئے گا جب وہ سورج کو جیل کی سلاخوں کے باہر۔۔۔ کھلے آسمان پہ دیکھے گا جب وہ خواب میں نہیں حقیقت میں زینب آپا کے پاس۔۔۔ سعودیہ ہوگا۔ تب وہ اپنے تین ہزار چھ سو پچاس دنوں کی ساعتوں' لمحات اور گزارے جانے والے ہر پل کا بدلہ زینب سے لے گا۔ اور وہ دن آچکا تھا۔ اس کا انتقام شروع ہو چکا تھا اور زینب کی اذیت۔۔۔ مگر وہ عورت۔۔۔ عورت نہیں تھی سراپا رحم تھی۔۔۔

اور حارث قیوم ابھی زینب قیوم کو نہیں جانتا تھا اور جب جانتا تو۔۔۔؟

☼ ☼ ☼

جب اسے سزا ہوئی تھی تو اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ اتنا لمبا عرصہ وہ کیسے گزارے گا۔۔۔ کس طرح سے یہ "عذاب" سہہ پائے گا۔ تب ہی اسے معلوم ہوا تھا کہ چند لاکھ روپے دے دینے سے اس کی زندگی "آسان" ہو سکتی تھی۔ جیلر نے خود اس سے یہ بات کہی تھی اور اس نے زینب آپا سے۔۔۔ زینب کے انکار پہ اس نے بھی وہ ہی سوچا تھا جو کوئی بھی روایتی "بھائی" سوچتا۔ آپا نے اپنے "پیسے" بچائے۔۔۔ بھائی نہیں۔ تب ہی اسے زینب آپا سے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ محبت کے مظاہرے۔۔۔ وہ سب اسے "دکھاوا" لگنے لگے تھے۔

جس کی "گود" میں اچھے دن گزارے تھے۔ برے دنوں میں اس نے "گود" میں لینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ جسے "چھاؤں" سمجھتا رہا تھا وہ تو کیکر نکلا تھا' مگر اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی جب زینب آپا نے پھر اسے فون کیا تھا اس کا حال۔۔۔ اسی توجہ و محبت سے پوچھا تھا جیسا کہ وہ پوچھا کرتی تھیں۔

اس کے لیے ویسے ہی جیل میں آئے روز کپڑے جوتے' کھانے' پھل' جوس وغیرہ آتے رہے تھے جیسے کہ زینب کے انکار سے پہلے آتے تھے۔ (زینب آپا یہ سب اپنی ایک دوست کے توسط سے کیا کرتی تھیں) اور تب ہی اس کی حیرت بھی نفرت میں بدل گئی تھی۔ "وہ یہ سب خاندان بھر کو دکھانے کے لیے کرتی ہوگی۔" وہ سوچتا اسے زینب نامی عورت سے بڑا منافق اور کوئی نہیں نظر آتا تھا اور تب وہ خود کو زینب قیوم سے بہتر سمجھتا۔۔۔ وہ برا تھا تو ڈنکے کی چوٹ پہ' کم از کم اس نے زینب کی طرح کا "ملمع" خود پہ نہیں چڑھا رکھا تھا۔

زینب آپا فون پہ اسے اچھے کردار و اخلاق اپنانے کی بہت تاکید کیا کرتی تھیں۔ "اور جب وہ پوچھتا ایسا کیوں کرے وہ؟" وہ جواب دیتیں کہ "سزا معاف ہوگی" اور پھر وہ ایک زہر بھری طنزیہ ہنسی ہنس دیتا اور کہتا۔

"بہت ہی اچھا طریقہ ڈھونڈا ہے سزا معاف کروانے کا تم نے آپا۔۔۔ یقیناً بڑھاپے میں ضرور سزا معاف ہو جائے گی میری۔" اور زینب اک لمحے کے لیے چپ ہوتیں اور دوسرے ہی لمحے وہ کوئی اور بات شروع کر دیتی تھیں۔ تب اسے اس بات کا بھی یقین نہیں تھا کہ زینب کبھی بھی سزا معاف یا جیل سے چھوٹنے پہ اسے سعودیہ نہیں بلائیں گی۔ وہ یہیں ٹھوکریں کھاتا رہے گا اور رہا ہونے پر کشمیری لڑکی کے بھائی اسے "ہڑپ" کر جائیں گے۔ (کیوں کہ باقی تینوں کو بھی انہوں نے نہیں چھوڑا تھا) جو عورت چند لاکھ نہیں دے سکتی تھی وہ کیوں اس پہ اتنا پیسا لگائے گی؟ اور انسان بھی وہ جو کسی کام کا نہیں تھا۔۔۔ بدنام تھا۔۔۔ خاندان سے خارج شدہ تھا۔ دھتکارا ہوا تھا وہ کیوں اسے اپنے پاس بلائے گی۔

مگر۔۔۔! ہر بات۔۔۔ ہر اندازے کی طرح اس کا یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اگر ساری دنیا بھی اسے دھتکار دیتی تو صرف اور صرف زینب تھیں جو اسے دھتکار نہیں سکتی تھیں۔ وہ زینب قیوم۔۔۔ بنی ہی حارث قیوم کے لیے تھیں۔ دنیا میں سارے بچے اتنے خوش قسمت واقع نہیں ہوتے کہ اگر ان کی ماں نہ ہو تو پھر بھی وہ ماں کی کمی کو محسوس نہ کر سکیں۔ انہیں ویسی ہی ممتا' ویسا ہی پیار ملے۔

مگر حارث قیوم تھا۔۔۔ ہاں وہ شخص انتہائی خوش قسمت تھا۔

☼ ☼ ☼

انسان کی زندگی میں بہت سی چھوٹی بڑی۔۔۔ آسان سخت۔۔۔ مشکلات' پریشانیاں۔۔۔ مصیبتیں آزمائشیں آتی رہتی ہیں۔ اور زینب کے لیے یہ چیزیں معنی نہیں رکھتی تھیں۔ وہ عادی تھیں سہ جانے کی۔ صبر کرنے کی' مگر۔۔۔ "حارث۔۔۔" یہ ان کی زندگی کی سب سے بڑی اور وہ "مشکل" بن کر آیا تھا جس پہ چاہنے کے باوجود وہ صبر نہیں کر پا رہی تھیں۔ ان کی اولاد نہیں تھی۔۔۔ انہوں نے حارث کو اولاد مان لیا۔ حارث وہ "نقطہ" تھا جس کے گرد وہ گھومتی رہتی تھیں اسی حارث سے امتیازی سلوک کے باعث وہ سسرال والوں سے طعنے سنتی تھیں۔ ان کے سسرال والے شفیق بھائی کی دوسری شادی کرنا چاہتے تھے۔ شفیق بھائی دوسری شادی کر لیتے۔۔۔ اگر زینب کے بجائے کوئی دوسری عورت ہوتی۔ وہ زینب سے "محبت" کرتے تھے۔ اتنی کہ زینب ان کے لیے وہ "نقطہ" تھی جس کے گرد وہ ساری عمر گھوم سکتے تھے' حارث کبھی بھی شفیق بھائی کے لیے مسئلہ نہیں رہا تھا وہ کیا ہے کہ جن سے محبت ہو۔۔۔ ان سے وابستہ ہر چیز پیاری ہو جاتی ہے اور حارث چیز تو نہیں تھا۔۔۔ بھائی تھا۔ انہوں نے حارث کے لیے کیا کیا نہیں سوچ رکھا تھا' مگر حارث نے ان کے ہر خواب۔۔۔ ہر سوچ کو ملیامیٹ کر دیا تھا' مگر پھر بھی وہ مایوس نہیں تھیں۔ پھر بھی وہ اس سے لاتعلق نہیں رہی تھیں۔ وہ رہ ہی نہیں سکتی تھیں وہ نہیں جانتی تھیں کہ حارث کیسا "کھوٹا سکہ" تھا۔ ساری دنیا کے ناممکنات "ممکن" ہو سکتے تھے' مگر وہ نہیں ہو سکتا تھا جو وہ چاہتی تھیں۔ حارث قیوم۔۔۔ زینب قیوم کے لیے نہیں بنا تھا۔ حارث! ان کے دل کا سکون نہیں۔۔۔ کانٹا تھا۔۔۔ وہ کانٹا جس کے نکل جانے پہ بھی تکلیف ساری عمر باقی رہتی ہے اور پھر یہ تکلیف آپ کو کھا جاتی ہے۔۔۔ نگل جاتی ہے۔

وہ زینب کو بھی "نگل" گئی تھی۔ دنیا میں بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جن کو ویسی ہی محبت صلے میں ملتی ہے جیسی محبت وہ کسی سے کرتے ہیں۔ اور زینب قیوم اتنی خوش قسمت واقع نہیں ہوتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

حارث کے سعودیہ آنے کے چند ماہ بعد رمضان

شریف آگیا تھا۔ شفیق اور زینب رمضان کے آخری عشرہ میں عمرہ ادا کرنا چاہتے تھے۔ حارث کوئی بچہ نہیں تھا جسے گھر میں اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا' مگر وہ دونوں اسے پھر بھی اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ شفیق بھائی حارث سے بات کرنا چاہتے تھے مگر زینب آپا نے منع کردیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ خود اس سے بات کریں گی اور یہ ہی بہتر بھی تھا۔ گو کہ وہ حارث سے بہت پیار کرتی تھیں۔

مگر وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھیں کہ حارث ان کے شوہر سے بدتمیزی کرتا وہ اس کی بدتمیزی برداشت کرلیتی تھیں کوئی دوسرا مشکل سے کرتا۔

"حارث! تم بھی چلو گے نا ہمارے ساتھ....." دوپہر کا کھانا اسے دیتے ہوئے زینب آپا نے پوچھا تھا۔

"کہاں؟"

"عمرہ ادا کرنے..."

اس جواب پہ وہ ساکت ہوا۔ کھانے سے ہاتھ روک کر حیرت بھرے انداز میں زینب آپا کو دیکھا اور پھر یک دم قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"آپا! تم سا بھی کوئی نہیں ہو گا۔ میں یہاں رمضان میں تمہارے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا ہوں اور تم مجھے عمرے کے مشورے دے رہی ہو۔" وہ دوبارہ مذاق اڑاتے لہجے میں ہنسا۔ زینب خاموش رہیں۔۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ کچھ کہیں گی تو وہ پھر مذاق اڑائے گا' اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ ایسا کرے ہر چیز کا مذاق نہیں بنایا جا سکتا اور کچھ چیزیں اس قابل ہوتی بھی نہیں کہ ان کا مذاق اڑایا جا سکے۔ وہ نہیں جانتا تھا..... زینب جانتی تھیں۔

"ویسے تم کیوں مجھے وہاں لے جانا چاہتی ہو؟" زینب آپا کو خاموش ہوتے دیکھ کر اس نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔ زینب نے اک خاموش نظر سے اسے دیکھا۔

"میرے گناہ بخشوانے.....؟" اس کے چہرے پہ ابھی بھی مذاق اڑاتی ہنسی تھی۔

"کوئی اس قابل نہیں ہوتا حارث کہ وہ کسی کے گناہ بخشوا سکے..... یہ خود ہی کرنا پڑتا ہے..... یہ ہر ایک کو خود ہی کرنا پڑتا ہے۔" دھیمے لہجے میں وہ نرمی سے' مگر دکھ سے بولی تھیں۔

"پھر بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم دونوں جاؤ انجوائے کرو..... اگر خود ہی کرنا ہے تو تمہیں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ ایک دفعہ پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

اور زینب آپا نم آنکھوں سے کتنی ہی دیر اسے دیکھتی رہی تھیں۔ ان کے دل پہ کیا گزری تھی..... یہ کوئی ان سے پوچھتا۔

☼ ☼ ☼

"حارث! کیسا محسوس کر رہے ہو اب؟" اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر شفیق بھائی نے نہایت ہی شفقت سے پوچھا۔ اس نے نقاہت سے انہیں دیکھتے ہوئے سر کو جنبش دی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ مجھے تمہیں اس طرح سے نہیں بتانا چاہیے تھا..... تب تمہیں اتنے بڑے شاک سے نہ گزرنا پڑتا۔" گو کہ اس نے آنکھیں پھر سے بند کرلی تھیں' مگر وہ شفیق بھائی کی آواز سن بھی رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا' حالانکہ اس وقت اس کا ذہن مسکن ادویات کے زیر اثر تھا' مگر ابھی ادویات مکمل طور پر حاوی نہیں ہوئی تھیں۔

وہ شفیق بھائی کو جواب میں کہنا چاہتا تھا کہ ان کی کوئی غلطی نہیں تھی اور نہ ہی اس کی یہ حالت "شاک" کے باعث ہوئی تھی ۔ اس نے آنکھیں بھی کھولی تھیں اور ہونٹ بھی ہلائے تھے' مگر اس کے گلے سے آواز نہیں نکل سکی تھی۔ کچھ دیر پہلے تک وہ نیند کو شکست دینے میں کامیاب رہا تھا مگر اب ایسا نہیں ہو سکا تھا اور وہ دوبارہ سے غنودگی میں چلا گیا تھا۔

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی کہ زینب آپا نے ایک فلپائنی عورت کو ملازمہ رکھا تھا۔ وہ تقریباً" تینتالیس

سال کے لگ بھگ تھی اور زینب کو حارث سے کسی بھی قسم کا خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ حارث سے کافی بڑی عمر کی تھی۔

زینب آپا کا گھر دو منزلہ تھا اور گھر کا بیسمنٹ بھی تھا۔ بیسمنٹ کو بطور لانڈری اور اسٹور روم کے استعمال کیا جاتا ہے۔ بیسمنٹ کا راستہ گھر کے اندر ہی تھا جیسا کہ عموماً" ہوا کرتا ہے اور نہ ہی اسے لاک کیا جاتا تھا۔ زینب آپا اگر چاہتیں تو ملازمہ کو چھوڑ کر جا سکتی تھیں' مگر پھر بھی انہوں نے احتیاط کی تھی اور ملازمہ کو ان دنوں کے لیے چھٹی دے دی تھی۔ جن دنوں کے لیے وہ عمرے پہ جانے والی تھیں۔

ان دونوں کو رات میں نکلنا تھا۔ زینب آپا پیکنگ کر رہی تھیں ۔ انہوں نے اقامے والا پاؤچ احتیاط سے سوٹ کیس میں رکھا پھر انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنا صرف ایک عبایا رکھا تھا' حالانکہ انہیں ایک سے زیادہ رکھنا چاہیے تھا وہ دوبارہ وارڈ روب کی طرف مڑی تھیں اور دوسرا عبایا سوٹ کیس میں سیٹ کرنے کے لیے انہوں نے کچھ چیزیں بیگ سے باہر نکال کر رکھی تھیں۔

اسی لمحے شفیق بھائی واش روم سے باہر نکلے اور انہوں نے عادتاً" تولیہ بیڈ پہ پھینکا تھا۔ زینب ایک دفعہ پھر سے وارڈ روب میں سے کوئی چیز لینے کے لیے گئی تھیں۔ اپنی مطلوبہ اشیا بیگ میں سیٹ کر کے ایک دفعہ پھر سے اپنے دماغ میں ان چیزوں کو دہرایا تھا جو انہیں لے کر جانی تھیں اور پھر انہوں نے بیگ پیک کردیا تھا۔ ان کے سفر کی تیاری مکمل تھی اور اب انہیں افطار کی تیاری کرنی تھی کیوں کہ انہیں افطار کر کے نکلنا تھا۔

"زینب آپ نے اقامے رکھ لیے تھے؟" وہ تقریباً" شہر سے اٹھارہ کلو میٹر دور آچکے تھے جب اچانک شفیق بھائی نے پوچھا تھا۔

"ہاں! میں نے....." وہ فوراً" جواب دیتے دیتے الجھی تھیں۔ لاشعوری طور پر شفیق بھائی کا پاؤں بریک پر پڑا تھا۔

"زینب؟"

"مجھے یہ تو یاد ہے کہ میں نے اقامے والا پاؤچ بیگ سے باہر نکالا تھا' کچھ اور چیزیں رکھنی تھیں' مگر یہ یاد نہیں آرہا کہ میں نے وہ پاؤچ دوبارہ بیگ میں رکھا تھا یا نہیں۔ آپ چیک کرلیں۔" وہ بے بسی سے بولی تھیں۔

ایک گہرا سانس بھر کے شفیق بھائی نے گاڑی بند کی تھی۔ جانتے تھے کہ زینب کی یہ بھولنے والی عادت نئی نہیں تھی۔ انہوں نے ڈگی کھول کر سارا سوٹ کیس چھان مارا پاؤچ وہاں تھا ہی نہیں تو ملتا کہاں سے؟ اور وہ اقامے کے بغیر سفر نہیں کر سکتے تھے' اب گھر واپس جا کر وہ پاؤچ لانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ان دنوں سعودیہ میں ایک عربی کے قتل کی وجہ سے حالات بہت نازک تھے۔ اب اگر چیکنگ ہو جاتی تو وہ دونوں یقیناً" ڈی پورٹ کردیے جاتے۔ بہر حال انہیں واپسی کا سفر تو کرنا ہی تھا' اور واپسی کا سفر کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔

مگر وہ دونوں یہ نہیں جانتے تھے کہ "واپسی" اتنی تکلیف دہ' شرمناک اور ہوش اڑا دینے والی بھی ہو سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

حارث دروازے کے پاس کھڑا تھا اس عورت نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم سے کہا نا کہ اس دفعہ میں زیادہ لوں گی۔"

"اور میں نے تم سے کہا تھا کہ میں اتنا ہی ادا کر سکتا ہوں..... جتنا میں پہلے کرتا تھا۔"

"تو پھر تم میری طرف سے جواب سمجھو۔" چند لمحے اسے گھورنے کے بعد فلپائنی عورت رکھائی سے بولی تھی۔ وہ دونوں ہی ٹوٹی پھوٹی آدھی ادھوری انگلش اور اشاروں سے بات کر رہے تھے۔ حارث نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"اچھا!" بڑے غرور سے کہا گیا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ وہ عورت کچھ ۔ سمجھتی یا کرتی..... حارث نے

اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اسے بیسمنٹ کے اندرونی حصے کی طرف کھینچنا شروع کردیا تھا۔ وہ دونوں وہاں بیسمنٹ کے دروازے کے پاس اندرونی سمت میں کھڑے تھے اور یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں تھا کہ وہ وہاں ایسے موجود تھے' یہ ہر اس روز ہوتا تھا جب کبھی زینب اور شفیق دونوں گھر سے باہر ہوتے۔ حارث کے پاس اس عورت کا نمبر تھا اور وہ عورت قریب ہی کہیں رہتی تھی۔

اس سے پہلے ان دونوں کا کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا آج ہی جھگڑا ہوا تھا اور آج ہی حارث نے فلپائنی عورت کو دھکا دے کر تیزی سے اندرونی طرف سے دروازہ لاک کیا تھا' یہاں سے ناممکن تھا کہ کوئی آواز باہر جاتی۔

اس مرد نے اپنی شرٹ اتار کر دور پھینکی تھی وہ مڑا اور پاس رکھی کرسی پہ پاؤں رکھ کر جاگرز کے تسمے کھولنے لگا۔ یہ ویک اینڈ تھا اسے یک دم اپنی پشت پہ سما نتھا کی انگلیوں کا لمس محسوس ہوا تھا۔ وہ محسوس کرسکتا تھا کہ اس کی انگلیاں اس کی پشت پہ موجود "داغوں" پہ پھسل رہی تھی۔

"یہ داغ کیسے ہیں؟" اس نے اب اس کا حیران آواز میں پوچھا جانے والا سوال سنا تھا۔ اس نے کبھی کسی عورت کو اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا مگر آج معلوم نہیں وہ کس موڈ میں تھا۔

"یہ داغ؟" وہ طنزیہ انداز میں بولا تھا اور پھر بے ساختہ وہ اسے تفصیل بتانے لگا تھا۔

گاڑی دروازے کے سامنے آکر رکی۔ زینب اور شفیق ڈپلیکیٹ چابی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے۔ وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ حارث اس طرح سے سوتا تھا کہ سر پہ کھڑا ڈھول بجانے والا شرمندہ ہوجائے' مگر وہ نہیں اٹھ سکتا تھا۔

"اور غافلوں کی نیند ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔"

وہ دونوں اپنے بیڈ روم کی طرف گئے تھے' زینب آپا کو تولیے کے نیچے سے اقامے والا لال پاؤچ مل گیا تھا' بے ساختہ انہوں نے شکر بھرا سانس لیا تھا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ زینب آپا نے عادتاً" حارث کے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر اندر جھانکا وہ بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔

"کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ ایسے نہ سویا کرو مگر یہ بھی نا..." وہ اسے پیٹ کے بل لیٹا دیکھ کر بڑبڑائی تھیں اور پھر تمام لاکس ڈپلیکیٹ چابیوں سے بند کرتے ہوئے وہ اندرونی حصے سے باہر آئے تھے۔ جیسے ہی وہ بیرونی گیٹ کے پاس پہنچے تھے زینب آپا کو یک دم کسی کھٹکے کی آواز آئی تھی۔ وہ بری طرح سے چونکی تھیں۔

"شفیق ادھر کوئی ہے۔" انہوں نے خوف زدہ ہو کر بیسمنٹ کی طرف اشارہ کیا تھا۔

اسی دوران کھٹکے کی آواز زیادہ شدت سے اور دوبارہ آئی تھی اب کہ شفیق بھائی بھی پوری طرح چونکے تھے۔

"شفیق! پولیس کو بلالیں... ایسے مت جائیں۔" انہوں نے آگے بڑھتے شوہر کو بازو سے پکڑ کر روکا تھا۔

"دیکھنے تو دو... ہوسکتا ہے کوئی جانور ہو۔"

اور دروازے کو دیکھ کر ان کی بھی وہ ہی حالت ہوئی تھی جو شفیق بھائی کی تھی۔ دروازے کی باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی حالانکہ اسے کبھی بھی اس طرح سے لاک نہیں کیا جاتا تھا۔

شفیق بھائی نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی تھی۔

"یااللہ"

وہ دونوں ہاتھ منہ پہ رکھ کر پلٹے تھے اندر نیم برہنہ حالت میں فلپائنی عورت تھی جس کے دونوں ہاتھ کمر کے پیچھے کرکے باندھے گئے تھے۔ منہ پہ ٹیپ لگی تھی اور پاؤں بھی بندھے ہوئے تھے۔ حارث سے یہ غلطی ہوئی تھی کہ اس نے اسے کسی چیز سے نہیں باندھا تھا۔ وہ کسی طرح لڑھکتے ہوئے دروازے تک پہنچ گئی تھی اور خود کو دروازے سے ٹکرا ٹکرا کر شور پیدا کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ زینب آپا ششدر کھڑی... آنکھیں پھاڑے اس کے وجود کو دیکھ رہی تھیں۔ بات کو سمجھنے کے لیے دماغ پہ زور دینے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ سب کچھ ایک دم صاف تھا۔ صاف و شفاف...

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے زمین پہ بیٹھی تھیں اور اس حالت میں انہیں تقریباً" پون گھنٹہ ہونے والا تھا۔

تب سے اب تک انہوں نے ایک واحد کام کیا تھا۔ آگے بڑھ کر بیسمنٹ کا دروازہ دوبارہ بند کردیا تھا۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ دوسری نظر اس عورت کے وجود پہ ڈالتیں اور وہ عورت بھی ان دونوں کو وہاں موجود دیکھ کر خوف زدہ ہو کر خاموش ہوگئی تھی۔

شفیق بھائی ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے بری طرح سے ٹینشن کا شکار نظر آرہے تھے' کبھی ان کا خون اتنا کھولنے لگتا کہ دل چاہتا حارث کو شوٹ کر آئیں اور پھر انہیں زینب کا خیال آتا... اس محبت کا خیال آتا جو زینب کو حارث سے تھی۔ اور ان کی نظر گھوم کر زینب پہ جا پڑتی' جو یوں شکستہ بیٹھی تھیں جیسے آج کے بعد وہاں سے اٹھ نہیں سکیں گی۔

"زینب!" چند لمحوں بعد انہوں نے زینب آپا کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر پکارا تھا۔ انہوں نے خالی نظروں سے شفیق کو دیکھا۔

"میں پولیس کو کال..." اور ابھی ان کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ زینب آپا کی خالی آنکھوں میں کوئی تاثر بے حد تیزی سے ابھرا تھا۔ شفیق بھائی نے بے ساختہ ہونٹ بھینچ لیے۔

"کیا چاہتی ہو تم؟" کچھ لمحوں کے توقف کے بعد دوبارہ انہوں نے پوچھا تھا۔

یہ پاکستان نہیں سعودی عرب تھا یہاں بات کو دبا دینا اتنا آسان نہیں تھا۔ مگر ناممکن بھی نہیں تھا تب ہی وہ زینب سے پوچھ رہے تھے کہ کیا چاہتی ہیں وہ۔ ابھی تو صرف وہ دونوں باخبر تھے۔ بات دب سکتی تھی۔

زینب قیوم... پچھلے پون گھنٹے سے یہ ہی تو نہیں سمجھ پا رہی تھیں کہ وہ کیا چاہتی تھیں۔ کیا وہ چاہتی تھیں کہ اپنے "پیارے" بھائی کو ایک ایسے ملک کی پولیس کے حوالے کردیا جائے جہاں ٹھیک ٹھیک شرعی سزاؤں کا نفاذ تھا یا پھر وہ یہ چاہتی تھیں کہ وہ اپنے پیارے بھائی کو بچالیں۔

وہ بہن بن کر نہیں سوچ سکتی تھیں۔ وہ ماں بن کر سوچتی تھیں اور جب وہ ماں ہوتی تھیں تو چاہتی تھیں کہ زمین پھٹے اور وہ حارث کو لے کر اس میں اس طرح سمائیں کہ کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پاسکے مگر زمین پھٹنے کے خیال سے انہیں ایک اور خیال آیا انہیں بھی تو زمین میں جانا تھا اور جب وہ یہ سوچتیں کہ انہیں زمین میں جانا تھا تو انہیں ایک اور تعلق کی سوچ آتی تھی۔ اس تعلق کی جو روئے زمین پہ کسی بھی تعلق سے پہلے تھا۔ وہ "عبد" کے رستے پہ سرفراز تھیں۔

تو کیا وہ سب نمازوں تک تھا آج جب... راتوں کو جاگ کر اس وقت "اللہ" کو پکارتیں جب وہ ساتویں عرش پہ تخت نشین ہوتا تھا۔

تو کیا وہ سب صرف "پکارنے" تک محدود تھا آج جب؟ ساری زندگی زینب قیوم نے خود کو اللہ کا شکر گزار پایا تھا کہ اس نے زینب قیوم کو "ایمان" سے نوازا تھا۔ پختہ ایمان سے... اور آج جب ایمان آزمائش لینے کو کھڑا تھا تو ان کے قدم زمین پہ جمتے ہی نہیں تھے۔

دل چاہتا تھا کہ ساری عمر کی پارسائی... عبادت گزاری کے بدلے وہ ایک "گناہ" کرلیں۔ گناہ کے داغ کو ندامت کے اشکوں سے دھونے کے لیے تو کیوں نا وہ ویسا ہی کریں جیسا کہ ان کا دل چاہتا تھا۔

"کیا کوئی اس طرح سے بھی آزمایا جاتا ہے؟" انہوں نے منہ اٹھا کر آسمان کی طرف نظریں کرکے پوچھا تھا۔ جواب وہاں سے نہیں آیا تھا' جواب "دل" سے آیا تھا۔ زینب نے کرب سے آنکھیں میچ کر سر جھکا لیا تھا۔ آج تو وہ رونے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔ وہ چند لمحے یوں ہی سر جھکائے بیٹھی رہی تھیں۔

"پولیس کو کال کریں شفیق" ایمان ابھی تک لڑکھڑا رہا تھا مگر مدھم سی شکستہ... بکھری ہوئی آواز میں کہہ کر وہ گھٹنوں پہ دباؤ ڈال کر بہت مشکل سے اٹھی تھیں۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حمیرا نوشین

ممّا

یا اللہ! میں کیا کروں کہاں جاؤں، دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے میرا تو اس اولاد نے، صبح سے شام تک اپنے ہی کاموں میں الجھا کے رکھتے ہیں، نہ کھانا سکون کا رہا، نہ بیٹھنا، ہر وقت ذلیل کر کے رکھتے ہیں۔

پوری پلیٹ منحوس نے نیچے گرادی۔ چین تو ان کی ہڈی میں ہے ہی نہیں۔" میں نے دہی بھلوں کو کارپٹ سے اٹھایا اور کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتے ہوئے غصے میں ایک اور دھمو کا شایان کے جڑا تو اس کے راگوں میں مزید سروں کا اضافہ ہو گیا۔

"اب بس بھی کرو ایک بات کے پیچھے ہی پڑ جاتی ہو بچہ ہے پلیٹ ہاتھ سے چھوٹ گئی مار مار کے برا حال کردیا۔"

"یہ.... یہ بچہ ہے.... یہ بچہ ہے؟" میں پھنکارتے ہوئے اس کی طرف بڑھی جو باپ کی گود میں چھپ گیا تھا۔ صارم نے میرے بڑھتے ہاتھوں کو روک کر مجھے پیچھے دھکیلا.... شایان سے بڑا ریان بھی دہی بھلے کھانا چھوڑ کر ایک طرف سہم کر بیٹھ گیا۔

"دنیا جہان کی باتیں کروالو اس سے۔ ہر بات کا پتا ہے۔ بس اگر کسی بات کا علم نہیں ہے تو یہی نہیں ہے کہ ماں کو نہ ستائیں، مجھے ستانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔" میں نان اسٹاپ بولے چلی جارہی تھی۔ صارم نے جب دیکھا میرا غصہ عروج پر ہے تو بچوں کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی جانب چل دیے۔ "چلو بچو! اپنی مما کو تقریر کرنے دو ہم باہر چل کر آئس کریم کھا کر آتے ہیں۔"

"ہاں ہاں جاؤ.... میری جان چھوڑو کچھ دیر تو سکون ملے۔" میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دی اور دھڑاک سے گیٹ بند کردیا۔

یہ کوئی آج کی بات نہیں تھی، روز کا یہی معمول تھا، دو بچے دس کے برابر تھے۔ بڑا تو چلو پھر بھی کچھ قابل برداشت تھا۔ مگر چھوٹے نے وہ ناکوں چنے چبوار کھے تھے کہ میری توبہ۔

کھانا کھانے بیٹھو تو ایسے مستی میں کھائیں گے کہ شاید ہی کوئی دن ایسا ہو جس دن کھانے کی ٹیبل سے کوئی چیز نیچے نہ گری ہو یا خود دکھانے کے اوپر نہ گرے ہوں۔

دہی کے چھینٹے، سالن کے داغ دیواروں پر، چیئرز پر جابجا پڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ صفائی کر کر کے میرے تو ہاتھ بھی رہ گئے ہیں۔

امی اور بہنوں کے آگے دکھڑا روتی تو وہ بھی یہی کہتیں کہ شمرو بچے ہیں۔ سارے بچوں کا یہی حال ہے اور لڑکے تو فطرتاً ہی شرارتی ہوتے ہیں۔ اللہ کرے گا تھوڑے بڑے ہوں گے، تو ٹھیک ہو جائیں گے۔ امی تسلی دیتیں اور بڑی آپا تو باقاعدہ مجھے ڈانٹ پلا دیتیں۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا تو.... اتنے اتنے سے بچوں سے بڑوں جیسا رویہ رکھنے کی امید کرتی ہو۔ ہر وقت بچوں پر روک ٹوک 'یہ نہ کرو' 'وہ نہ کرو' 'شور نہ کرو چیخو نہ' 'ایسے بیٹھو' 'اس طرح کھاؤ' 'یہ چل کیسے رہے ہو' 'یہ بول کیسے رہے ہو' حد ہو گئی۔ بچے نہ ہوئے کوئی روبوٹ ہو گئے۔" ان کے اس طرح باتیں سنانے پر بڑی بہن کا لحاظ کر کے خاموش ہو جاتی، مگر اتنا ضرور سنا دیتی۔

"ہاں اپنے بچے ایسے ہوتے نا تو میں دیکھتی۔ مار مار کے بھرکس نکال دیتیں وہ تو بچے ہی شریف تھے۔"

"بچے تو سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں، شروع سے تربیت کی بات ہوتی ہے۔ ہر وقت بچوں کو ڈانٹنا ان پر چیخنا چلانا ان کو باغی کر دیتا ہے، یہ بھی میری بات کانوں میں رکھ لو۔" وہ مزید لتے لیتیں میں تو جل کر فون ہی بند کر دیتی۔

ایک بات جس سے میں نالاں رہتی، جب کھانا کھانے بیٹھو باتھ روم کے درشن ضرور کروائیں گے۔ تنگ آ کے میں نے ان کے ساتھ کھانا کھانا ہی چھوڑ دیا۔ کھانے کا ٹائم بھی تبدیل کر کے دیکھ لیا۔ مگر ہائے ری قسمت۔ جب میرے پیٹ بھرنے کا ٹائم ہوتا ہے۔ تب ہی میرے لخت جگر کے پیٹ میں مروڑ شروع ہو جاتے اور میں بھی دھمو کے جڑتی ہوئی باتھ روم میں لے کے جاتی۔

"ایک طرف کھانے کی دلفریب خوشبو اور دوسری طرف باتھ روم کی مہکار.... امی آپ ہی بتائیں کہ کیا پھر کھانا کھانے کو دل کرتا ہے۔" میری آنکھوں میں آنسو ابھر آتے۔

"میری بچی دل نہ جلایا کر سب ماؤں کے ساتھ ایسا ہی ہے، کسی سے بھی پوچھ کر دیکھ لو۔ تمہارے تو دو بچے ہیں تو تم تنگ آگئی ہو، ہمیں دیکھو چھ چھ بچے پالے ہیں۔ ایک نوالہ منہ میں اور پاؤں باتھ روم میں۔ دوسرا لقمہ توڑا تو تمہارے دوسرے بھائی نے امی دھودو.... کی آواز لگادی۔ اس طرح کھانا نصیب ہوتا تھا۔ یوں ہی تو ماں کے قدموں کے نیچے جنت نہیں رکھ دی میرے رب نے.... بہت کچھ سہنا پڑتا ہے۔ ان بچوں کی خاطر۔" امی اپنے تجربات بیان کرنے لگتیں اور میں خاموش ہو جاتی۔

میں بیڈ پہ نیم دراز مزے سے اپنا پسندیدہ ڈرامہ نشرِ مکرر ـــــ میں دیکھ رہی تھی۔ رات کو تو بچوں کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ہوتی تھی۔

ہائے... یہ رائٹرز بھی کتنی اچھی ترجمانی کرتی ہیں ہمارے دلوں کی‘ شادی کے کچھ مہینوں بعد ہی شوہر کے ہمیشہ ناز برداریاں کرنے کے دعوے پتا نہیں کون سی مٹی میں سما جاتے ہیں۔ ساری عمر اپنے ہی نخرے اٹھواتے ہیں میں دلچسپی سے ڈرامہ دیکھنے میں مگن تھی۔

آف... میری دلخراش چیخ نکلی اور میں اپنا پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔ تین سالہ شایان نے میرے پھیلے ہوئے پیٹ کو کھیل کا میدان سمجھ کر اتنے زور سے چھلانگ لگائی کہ میری آنکھوں سے تکلیف کے مارے آنسو نکل پڑے اور میں نے درد سے بے حال ہوتے ہوئے بے دردی سے اسے پیٹ ڈالا۔

"کم بخت... ذلیل‘ جان کے دشمن‘ مجھے نہ کبھی چین لینے دینا۔ میرا سکون غارت کرکے رکھ دیا۔" میں تھپڑوں سے بری طرح پیٹ رہی تھی اور وہ بجائے رونے کے میرے ہر وار کو روکنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

"منحوس مار کھا کھا کے ڈھیٹ ہو گیا ہے۔ اثر ہی نہیں ہوتا۔" میں اسے پیچھے دھکیل کر بیڈ سے نیچے اترنے لگی تو میری قمیص کا کونا پکڑ کر کھینچ لیا اور وہ چرر کی آواز سے چرتا چلا گیا... ہائے میرے نصیب‘ نئی قمیص کا بیڑہ غرق کر دیا۔ کل جمعے کو ہی تو نیا سوٹ اتنے شوق سے پہنا تھا۔ میں نے غصے سے تلملاتے ہوئے اس کے بال نوچے اور کچن میں چلی آئی‘ رات کے کھانے کی تیاری بھی تو کرنی تھی۔

چکن جلدی جلدی فرائی کرکے فرائی پان میں نے سائیڈ پہ رکھا اور مسالا بھوننے لگی سارے موڈ کا ستیاناس کر دیا۔ غصے میں کیا خاک اچھا کھانا بنے گا۔ کھانے کی لذت میں ذرہ برابر فرق آگیا تو باپ کی سننی پڑے گی۔

دن میں اولاد ستا کے رکھے گی تو رات کو باپ کی ڈانٹ پھٹکار سنو۔ زندگی نہ ہوئی کوئی قید بامشقت ہو گئی۔

کھانا بناتے ہوئے میں مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

"پیچھے ہٹ دفعہ ہو۔" میں نے جھنجلاہٹ میں چیزیں چھیڑتے ہوئے شایان کو دھکا دیا تو اس کا سر دیوار میں جا کے لگا اور اس کا راگ بھیرویں شروع ہو گیا۔ میں بھی پروا کیے بغیر اپنے کام میں لگی رہی۔

"ریا... ن..." میں حلق کے بل چلائی اور ریموٹ اس کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ سیکڑوں مرتبہ کے دیکھے ہوئے کارٹون اتنے انہماک سے دیکھ رہا ہے‘ نواب جیسے آج ہی نئی قسط آئی ہے۔

"اٹھ کھڑا ہو۔ ہوم ورک تمہارا باپ کرے گا۔" میں نے اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹا اور اسٹڈی روم میں لے جا کر بیگ اس کے سامنے پٹخا اور وہ منہ کے زاویے بناتا ہوا ہوم ورک کرنے لگا۔

میں کمرے میں آکر شایان کے برابر لیٹ گئی‘ جو کہ سویا ہوا تھا اور گھر میں ایک سکون کی سی کیفیت تھی۔

صارم جو کچھ دیر پہلے تک سو رہے تھے اب انہوں نے ٹی وی آن کر لیا اور خاموشی سے خبرنامہ سننے لگے۔

"آج رات کو کھانے میں چکن جلفریزی بنا لوں؟" میں نے انہیں مخاطب کیا۔ مگر ان کی طرف سے جواب ندارد۔

"صارم میں آپ سے کچھ پوچھ رہی ہوں‘ جواب کیوں نہیں دیتے..." میں نے جھنجھلا کر غصے میں ان کے ہاتھ سے ریموٹ چھین کر ٹی وی آف کر دیا۔

"کیسے سنوں کانوں کے پردے تو تم نے اپنی ہولناک چیخوں سے پھاڑ دیے ہیں‘ پھر کیا خاک سنائی دے گا۔" وہ درپردہ میرے چیخنے پر طنز کر گئے اور میں بجائے شرمندہ ہونے کے شروع ہو گئی۔

"ہاں سارا دن آپ کو ان کے ساتھ گزارنا پڑے نا تو پتا چلے‘ کتنا خوار کرکے رکھتے ہیں مجال ہے، جو کوئی بات مان لیں۔"

"کبھی پیار سے بھی بچوں سے بات منوالیا کرو ڈانٹ ڈپٹ‘ چیخ و پکار سے ہی بچوں کے کام نہیں ہوتے‘ نرمی والفت کا رویہ بھی ان سے ہر کام کروا سکتا ہے۔

کبھی تم نے اپنے لفظوں اور چلانے پر غور کیا ہے۔ کہیں سے بھی نہیں لگتا کہ تم پڑھی لکھی بی اے پاس ہو۔ جب تم اپنی جاہلانہ زبان استعمال کر رہی ہوتی ہو تو یوں لگتا ہے کہ اسکول کا تو تم نے کبھی منہ بھی نہیں دیکھا ہو گا۔" وہ آج مجھے جی بھر کر شرمسار کرنے پر آمادہ تھے۔ مگر میں بھی بڑی ڈھیٹ تھی۔

"ہاں تو آپ کی اولاد نے ہی مجھے جاہل بنایا ہے ان ہی کی وجہ سے میں چیخنے پہ مجبور ہوتی ہوں۔ بچوں سے پہلے کیا آپ نے کبھی مجھے اس طرح سے گفتگو کرتے یا چلاتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے میرے شائستہ لب و لہجے کا گلا گھونٹا ہے۔"

میں تیزی سے بولتی ہوئی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر صارم کے الفاظ میرے کانوں کا پیچھا کرتے رہے۔

کیا ایسے تیز سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل چیخوں سے سماعتوں کو لہو کرے

اور میں ان کے شعر کی ٹانگیں‘ بازو توڑنے پر باوجود غصے کے زیر لب مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"شایان چل اٹھ ہزار مرتبہ کی دیکھی ہوئی قسطیں ایسے شوق سے دیکھ رہا ہے جیسے آج پہلی بار دیکھنی نصیب ہوئی ہے۔ اٹھ کھڑا ہو۔ ہوم ورک تیرا باپ کرے گا۔" ایک تیز ناگوار چیخنے کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی‘ میں جو گہری نیند میں تھی کچھ پل تو سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ کیا ہو رہا ہے۔ مگر اگلے ہی پل میری آنکھیں کان سب پوری طرح بیدار ہو گئے

"بھائی آپ تو بالکل مما کی طرح چیخ رہے ہو‘ جیسے مما جاہلوں کی طرح چیختی ہیں۔" شایان ریان کے ہو بہو میری نقالی کرنے پر تالیاں بجا رہا تھا۔

"ہاں جب مما چیختی ہیں تو لگتا ہے ہمارے کان ہی پھٹ جائیں گے اور دل اتنی زور سے دھڑکتا ہے کہ لگتا ہے کہ بند ہی ہو جائے گا۔" ریان جو ٹو کلاس میں پڑھتا تھا اس کے الفاظ سن کر میرا سر چکرا کر رہ گیا۔

"بھائی‘ مما ہمیں ہر وقت کیوں ڈانٹتی ہیں‘ آپ تو اسکول چلے جاتے ہو‘ مما مجھے سارا دن مارتی ہیں‘ مجھے مما بہت گندی لگتی ہیں۔ گندی مما‘ ہم بابا سے کہیں گے کہ ہمیں ایک اچھی سی مما لا دیں جو نہ ہمیں ڈانٹے اور نہ ہمیں مارے‘ بس ہم سے بہت زیادہ پیار کرے۔" شایان کچھ زیادہ ہی ستایا ہوا لگ رہا تھا۔

"ہاں مجھے بھی مما بہت بری لگتی ہیں‘ جب وہ ہم پہ غصہ ہوتی ہیں اور کارٹون بھی نہیں دیکھنے دیتیں‘ ہم آج ہی بابا سے کہیں گے کہ اس مما کو نانو کے گھر بھیج دیں اور ہمارے لیے نئی مما لے آئیں۔"

ریان اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا اور میں جہاں کی تہاں رہ گئی‘ میں جو ہر کام پرفیکٹ دیکھنے کی خواہش میں بچوں سے الجھتی رہتی تھی۔ یہی بچوں کی مجھ سے دوری کا سبب بن رہی تھی۔

میرے بچے میرے نامناسب رویے پر میرے بارے میں کس قسم کے خیالات رکھتے تھے یہ جان کر میں شرمندگی کے گڑھے میں گر گئی۔

آج ان کی گفتگو نے میری آنکھیں کھول دی تھیں اور میری عقل نے یہ بات تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہ کیا کہ ہر کام ڈانٹ ڈپٹ اور غصے سے نہیں ہوتا‘ بچوں کے لیے نرمی اور پیار کا رویہ سب سے بہتر ہوتا ہے۔

ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن والدین کے رویے اسے شریر اور بدتمیز بنا دیتے ہیں۔ ڈانٹ پھٹکار پر وہ وقتی طور پر آپ سے ڈر کر خاموش ہو جائے گا۔ مگر اندر ہی اندر گھٹن سی محسوس کرے گا اور نتیجے میں وہ آپ سے نفرت کرنے لگے گا۔

اور میں اسی نفرت سے بچنے اور دل میں اچھی مما بننے کا عزم لیے باہر اپنے بچوں کے پاس چلی آئی اور ان کو ساتھ لگا کر ڈھیروں پیار کرنے لگی۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چمکنے لگے۔ بچے میرے اس طرح پیار کرنے پر کھل اٹھے اور چھوٹا شایان میرے گرد گول گول گھومتے ہوئے مسلسل کہہ رہا تھا۔ "میری مما میری پیاری مما۔" میں اپنے بچوں کو خوش دیکھ کر نم آنکھوں سے مسکرا دی۔

☆

سمیرا حمید

امرحہ کی پیدائش کے وقت اتفاقی طور پر رونما ہونے والے چند ناگوار اور نقصان دہ واقعات کے سبب وہ اپنے خاندان میں "منحوس" مشہور ہو جاتی ہے۔ اس کے بابا، اماں، دادی اور تینوں بہن بھائی دانیہ، حماد اور علی اسے اکثر جنم جلی، منحوس، کالی نظر اور کالی زبان کہتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی منگنی بھی ان ہی افواہوں کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے۔ اپنی نحوست کے صبح شام قصے سن کر امرحہ خود ترسی کا شکار ہو کر روتی رہتی ہے۔

پورے گھر میں صرف دادا ہی اس کی دل جوئی کرتے ہیں اور گھر والوں کی باتوں کو لغو قرار دیتے ہوئے امرحہ کو بھی ان پر کان دھرنے سے منع کرتے ہیں۔ امرحہ کی اپنے دادا سے خوب بنتی ہے۔ وہ سارا دن ان کے ساتھ پنجاب لائبریری میں گزارتی ہے۔ جہاں وہ لائبریرین تھے دادا اسے سمجھاتے ہیں کہ تم پڑھائی پر دھیان دو اور اسکالر شپ لے کر باہر ملک چلی جاؤ۔ امرحہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی طرح پڑھائی میں کمزور ہے، مگر دادا کی بات پر وہ ٹاپ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے، مگر پھر بھی بہت اچھے نمبر حاصل نہیں کر پاتی۔ اسی دوران اس کی شادی کا سلسلہ چلتا ہے، مگر پندرہ روز قبل دولہا کی جوان بہن کے بیوہ ہو جانے پر اس کی شادی رہ جاتی ہے اور اس کی نحوست پر ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ امرحہ دل برداشتہ ہو کر نیند کی گولیاں کھا کر خود کشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد امرحہ کی زندگی مزید تلخ ہو جاتی ہے۔ وہ مختلف بیرون ملک کالج و یونیورسٹیوں کے ہزاروں آن لائن اسکالر شپ فارم بھرتی ہے، مگر ہر جگہ سے انکار ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر مانچسٹر یونیورسٹی سے اسے اسکالر شپ مل جاتا ہے جو اس یونیورسٹی کی طلبا سوسائٹی اپنے ذاتی فنڈ سے دیتی ہے۔ جس کی رو سے امرحہ کو تیس فیصد ادا کرنا ہوتا ہے باقی ستر فیصد کی ادائی ان کی طرف سے ہو گی۔ اس کے علاوہ دو دن کی میزبانی کے

مکمل ناول

بعد امرحہ کو اپنی رہائش اور اخراجات کا خود بندوبست کرنا ہو گا۔ یہ سب باتیں اسے برطانیہ پہنچنے کے بعد دائم بتاتا ہے۔ دادا جی امرحہ کے لیے پیسے اکٹھے کرکے اسے برطانیہ بھجوا دیتے ہیں۔ باقی اسے خود اپنے بل بوتے پر کرنا ہو گا۔ عذرا' شرلی' بینی لو اور للی کول سے اس کی ابتدائی ملاقات ہوتی ہے۔

امرحہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ایک کافی شاپ میں جاب کرنے لگتی ہے اور لیڈی مہر کے گھر اس کی رہائش کا بندوبست بھی ہو جاتا ہے۔ لیڈی مہر بے اولاد خاتون ہیں۔ انہوں نے شٹل کاک نامی اپنے ہاسٹل نما گھر میں مختلف بچوں کو اولاد کی طرح رکھا ہے۔ ان ہی میں ایک عالیان مارگریٹ ہوتا ہے۔ وہیں سادھنا' ویرا اور این اون سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ جاب کے دوران وہ ڈیرک کے ساتھ مل کر ڈاکومنٹریز فلم بنانے لگتی ہے۔

اسی دوران امرحہ کے بابا جن کی اعظم مارکیٹ میں قالین کی دکان ہوتی ہے' آگ لگ جاتی ہے جس سے ان کا بیس پچیس لاکھ کا نقصان ہو جاتا ہے۔ انہیں اٹیک ہو جاتا ہے۔ امرحہ انہیں تسلی دیتی ہے اور ڈاکومنٹری فلم سے ملنے والے پیسے ان کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ لیڈی مہر بھی اسے ایک چیک دیتی ہیں۔ امرحہ وہ رقم بھی پاکستان بھجوا دیتی ہے۔ امرحہ کے والد بہت خوش ہوتے ہیں۔ امرحہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے جب عالیان مارگریٹ کسی اسپائیڈر مین کی طرح اس کی کھڑکی میں جھانکتا ہے۔ امرحہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔

عالیان بتاتا ہے' یہ اس کا گھر ہے' وہ اس کے کمرے کی کھڑکی سے کود کر باہر نکل گیا' تھوڑی دیر بعد گھر میں آوازیں گونجنے لگیں تو سادھنا نے بتایا کہ لیڈی مہر کا بیٹا آیا ہے۔ وہ لیڈی مہر کے کمرے میں گئی تو دیکھا کہ وہ لیڈی مہر کے بیڈ پر بیٹھا انہیں کیک کھلا رہا تھا۔ اسے یاد آیا کہ لیڈی مہر نے ایک بار بتایا تھا کہ ان کا بیٹا بھی اس کی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور بہت قابل ہے۔

امرحہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا نام عالیان تھا اور اس کی ماں کا نام مارگریٹ۔ اسے عجیب سا لگا' ناجائز؟

دوسرے دن لیڈی مہر کی سالگرہ تھی' جو ان کے بچوں نے بڑے اہتمام سے منائی۔ انہوں نے امرحہ کو عالیان کے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اسے ایک ادارے سے لیا تھا اور بڑی تن دہی سے اس کی تربیت کی ہے۔ امرحہ کو افسوس ہوا کہ اس کی اماں نے کبھی بیٹوں کی تربیت پر توجہ نہیں دی تھی۔

ویرا کا ساتھ امرحہ کو احساس دلا رہا تھا کہ عورت بھی بہادر ہو سکتی ہے۔ عالیان کی توجہ نے امرحہ کو ایک عجیب احساس سے دوچار کر دیا' وہ لاشعوری طور پر عالیان سے متاثر ہو رہی تھی۔

ہارٹ راک میں امرحہ اور ویرا کی باتیں ریکارڈ کرکے چلانے پر امرحہ ویرا سے ناراض ہو جاتی ہے۔ امرحہ کو شدت سے احساس ہوتا ہے کہ عالیان کے بارے میں یہ سب کہہ کر اس نے اچھا نہیں کیا۔ ہارٹ راک کیفے کے باہر امرحہ' عالیان کا انتظار کرتی ہے' مگر وہ اس سے صحیح سے بات نہیں کرتا۔ رات کو عالیان ویرا کو شٹل کاک چھوڑ کر جاتا ہے امرحہ کو یہ بات بری لگتی ہے کہ عالیان اپنی سائیکل پہ ویرا کو چھوڑنے آیا۔ ویرا امرحہ کو بتاتی ہے کہ وہ گر گئی تھی۔ اس کے پیر پر چوٹ آئی تھی اس لیے عالیان اسے گھر تک چھوڑنے آیا تھا۔

امرحہ ہمت کرکے عالیان سے ملنے دوبارہ جاتی ہے۔ وہ اسے ٹوئیٹ میں چاکلیٹ دیتی ہے۔ عالیان حیران ہوتا ہے' مگر پھر اس کی ٹوئیٹ لینے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس پر امرحہ کہتی ہے کہ اگر تم ٹوئیٹ دو تو میں ابھی بھی تیار ہے۔ عالیان لاجواب ہو جاتا ہے۔

ساتویں قسط

اس کے بیگ بیڈ پر رکھے تھے اور وہ بری طرح سے ہانپ رہی تھی۔ تیاری ہو چکی تھی... خود کو یہاں سے لے جانے کی۔

وہ اپنے کمرے کی اس کھڑکی کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی' جہاں سے کبھی وہ کودا تھا۔ وہ جذبات کے اس کنارے پر کھڑی تھی' جہاں سے سب کچھ ٹوٹتا پھوٹتا ہی نظر آتا ہے۔ ایک دیوانے کی سی کیفیت جو اپنے وجود کے پاتال میں اتر کر ایڑیاں رگڑنے لگتا ہے۔ دہن سے کرب انگیز آوازیں نکالتا ہے اور عالم دیوانگی میں خود کو ادھر ادھر پٹختا ہے۔

خود پر حملہ آور ہو چکی' کپکپی کو ناتواں کرنے کے لیے اس نے اپنے گرد بازو لپیٹے۔

یہ انتہا تھی جانکاری کی... عروج کہیں پیچھے رہ چکا تھا۔ محبت اس سے بہت آگے نکل چکی تھی۔

وہ عالم فنا میں تھی... دنیا میں بہت کچھ ضروری ہو گا' لیکن عالیان سے پہلے نہیں... اس سے پہلے سب فنا ہی ہو گا اور اس کے بغیر بھی... عالم یقین کے پٹ اس پر وا ہوئے اور اس نے جانا کہ وہ اس سے جدا ہونے کی متحمل ہو سکتی ہے' اگر زندہ ہی نہ رہے۔

ہاں یہ ہی وہ بات تھی جو بہت پہلے طے ہو چکی تھی اور منکشف اب ہوئی تھی کہ اب جو اس کے بغیر ہو گی وہ زندگی نہیں ہو گی۔ اب پھول کھلیں گے' نہ بہار آئے گی۔ خوشیوں کا منتظر رہا جائے گا نہ مسکراہٹوں کو خوش آمدید کہا جائے گا۔ کائنات کی اس حد سے اس حد تک پھیلاؤ ہو گا' لیکن ٹھہراؤ نہیں... کوئی گیت سہانا نہیں لگے گا اور کسی داستان میں جی نہیں اٹکے گا۔ اب موت کی نشانیوں کا انتظار کیا جائے گا اور بینائی کو جزدان کر دیا جائے گا۔ اب نہ بولنے کی غرض رہے گی' نہ سننے کی چاہت۔

اب... ساری دنیا کے اہرام اپنی بلندیوں سے گر جائیں گے اور پانی کے ذخیرے اپنا پانی الٹ دیں گے... تو بھی قیامت کا گمان نہ ہو گا۔

صبح تک وہ فیصلے کے پنڈولم پر جھولتی رہی۔

وہ مرنے کا ارادہ نہیں رکھتی اور مر مر کر زندہ رہنے کا بھی۔

ویرا گھر آ چکی تھی اور این بھی... ویرا کو نیویارک جانا تھا' جس ٹیکسی میں وہ گھر آئی تھی اسی ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ ایئرپورٹ چلی گئی۔ این اس کا دروازہ بجاتی رہی' لیکن اس نے کھولا ہی نہیں۔

"تم نہ صرف خود پاگل ہو' بلکہ دوسروں کو پاگل کر دینے کی طاقت بھی رکھتی ہو۔" دروازے کے باہر این تیز آواز میں بڑبڑا کر چلی گئی۔ وہ رات بھر اسے فون کرتی رہی تھی' لیکن اس نے اٹھایا نہیں تھا۔ وہ سمجھی وہ وہیں کہیں ہے' لیکن وہ گھر پہ تھی۔

بہت صبح وہ شٹل کاک میں کسی کے بھی اٹھنے سے پہلے یونی آ گئی اور باہر سے ہی اس کے گرد چکر لگاتی رہی... سڑکیں سنسان تھیں اور یونی بھی... وہ حسرت سے اس عمارت کو دیکھ رہی تھی جس کی یاد آنے پر وہ سختی سے آنکھیں میچ لیا کرے گی... اپنی سانس کو متوازن رکھنے کے لیے اسے خود سے گہری گہری سانسیں لینی پڑ رہی تھیں۔

اس عمارت کے اندر جاتے ہی اس کی نئی زندگی نے سانسیں لینی شروع کر دی تھیں اور اس عمارت سے باہر ہوتے ہی وہ نئی سانسیں آخری سانسیں لینے لگیں گی۔ ادھر ادھر کسی پارک میں بیٹھے' فٹ پاتھ پر چلتے' کافی شاپس کی شیشوں کی دیواروں سے اندر جھانکتے اور مانچسٹر پر آخری اڑان بھرتے جیسے پرندوں کو دیکھتے اس نے کافی وقت گزار لیا اور پھر وہ اپنے اسٹور آ گئی۔

"تمہاری ڈیوٹی تو شام میں نہیں؟" مینجر نے پوچھا۔

"اسٹور روم میں کچھ جوتے ہیں' وہ مجھے خریدنے ہیں۔" وہ ذرا اٹک کر بولی۔

"ٹھیک ہے خرید لو..."

وہ اسٹور روم میں آ گئی اور وہ جوتے اٹھا لائی' جسے عالیان نے پہن کر دیکھا تھا اور جو بعد ازاں اس نے ایسی جگہ چھپا دیے تھے کہ کوئی اور ور کر انہیں دیکھ کر خرید ہی نہیں سکے۔

جوتوں کے وہ تین عدد جوڑے تھے۔
مینجر نے انہیں دیکھا تو شرارت سے مسکرانے لگا۔ بے شک ان میں نقص معمولی ہے، لیکن میں پھر بھی تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس شاہی خاندان کے فرد کے لیے تم انہیں بھی معمولی سمجھو اور ان تین کے بجائے تم ایک وہ لے لو جسے میں نے ایک میگزین میں پرنس ہیری کو پہنے دیکھا ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا، لیکن اس کی تحریک سنجیدہ تھی۔
وہ مسکرا نہیں سکی اور بتا بھی نہیں سکی کہ جوتے عالیان کے لیے معمولی ہی ہوں گے، لیکن اس کے لیے بہت خاص ہیں، وہ انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتی ہے۔ وہ ان باقیات کو اکٹھا کر رہی ہے جو پورا عالیان نہیں بنا سکتیں۔
"پھر کیا ارادہ ہے پرنس ہیری کے جوتے کے بارے میں۔"
جس انداز سے عالیان اسٹور آتا تھا سب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ جوتے لینے تو ہرگز نہیں آتا، بلکہ ایک بار مینجر نے شیشے کے پار سڑک کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔
"دیکھو..... کیا یہ وہی ہے جس نے آج تک ہمارے اسٹور سے کچھ نہیں لیا، سوائے تمہارے قیمتی وقت کے۔"
امرحہ چڑ جاتی۔ "پتا نہیں۔"
"اس کی آئس کریم ختم ہو چکی ہے اور تمہاری جاب ٹائمنگ بھی..... ویسے وہ تم سے کیا کہتا ہے کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے ہائے ہیلو کرتا جاؤں..... یا وہ یہ کہتا ہے کہ میں نے مانچسٹر کے فلاں کونے میں واقع فلاں ریسٹورنٹ دریافت کر لیا ہے، جہاں ملنے والا فش سوپ اتنے مزے کا ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ اس کے شیف نے اس پر کوئی جادو پڑھ کر پھونکا ہے اور سنو وہ پچھلے پندرہ منٹ سے ادھر ادھر ٹہل رہا ہے جو گزر رہے ہوتے ہیں۔ وہ ایسے پندرہ منٹ تک انتظار نہیں کرتے۔" اگر وہ تمہارے سامنے یہ جھوٹ گھڑے تو تم مسٹری سے مسکرا سکتی ہو۔"
اب وہ اداسی سے مسکرا دی اور نفی میں سر ہلایا کہ ہیری کے جوتے نہیں چاہئیں..... جوتے اسٹور میں ہی رکھوا کر وہ باہر آ گئی۔ وہ اپنے واجبات لینے آئی تھی، لیکن فی الحال اس نے واجبات کو چند گھنٹوں پر ٹال دیا..... اس نے خود کو بھی چند گھنٹوں کے لیے ٹال دیا۔
اسے شکوہ ہونے لگا کہ مانچسٹر پر جو دھند اتر رہی ہے وہ اس کی آنکھوں میں کیوں گھس رہی ہے کہ اسے چلنے پھرنے میں دشواری ہو رہی ہے، اگر ایسا نہ ہو تو وہ تیزی سے اپنے کام سمیٹ لے۔ بلکہ بہت تیزی اور پھرتی سے..... اور وہ جو بار بار اپنے وجود پر کسی چیز کے قائم ہونے کا پتا معلوم کر رہی ہے تو اس سے بھی اسے فرصت ملے اور اس کے کالے کوٹ کے اندر کیا چیز پاش پاش ہو چکی ہے۔ ذرا دم لے کر اس کا بھی حال چال پوچھے۔
اس نے خود کو مانچسٹر کو کھوجتے پایا..... اچھا خیال تھا کہ وہ مانچسٹر کو کھوج رہی ہے..... کئی لوگوں نے اس کے گلابی گالوں اور سرخ نم آنکھوں کو ٹھٹک کر دیکھا۔ اس پر ترس کھایا جا سکتا تھا اور اس نے خود کو قابل رحم ہی بنا لیا تھا۔
اس کے اندر ایک جذبہ بار بار سر اٹھا رہا تھا کہ وہ دنیا کو آگ لگا دے اور سب سے پہلے خود کو۔ اس نے نفرت سے اپنے خاندان کے بارے میں سوچا۔ اور پھر آخری نقطے پر ٹھہر کر وہ خود سے نفرت کرنے میں مشغول ہو چکی تھی۔ اس نے دبے دبے غصے سے دادا کے بارے میں سوچا اور چاہا کہ انہیں اپنے ساتھ کھڑا کر لے اور اس شخص کی طرف دیکھتے رہنے کا حکم دے جو برننگ مین کے ساتھ جل کر راکھ ہو چکا ہے اور کیا پھر بھی دادا یہ کہنے کا حوصلہ کر پائیں گے۔
"حسب نسب لاؤ۔" اس کی راکھ کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر بھی وہ اپنا سوال نہیں بدل پائیں گے.....
کیا تب بھی وہ اس کی دل کے بات مان لینے پر مجبور نہیں ہو جائیں گے۔ ٹھنڈی پھوار اس کا سر بھگو رہی تھی اور وہ ان قصے، کہانیوں میں غلطاں ہو چکی تھی جو معاشرے میں، کتابوں میں، ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ وہی جن میں سب ہوتا ہے، بس ملن نہیں ہوتا۔
داستان امرحہ کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا، بہت کچھ اس نے الٹا پلٹا کر دیا تھا۔ اور باقی حالات نے۔ وہ کسی کو راضی نہ رکھ سکی، خود کو نہ عالیان کو، دونوں ایک ہی راستے پر چلتے چلتے ایک دوسرے کی پشت پر آ گئے۔ وہ اپنی وجوہات کی وجہ سے پلٹ کر نہیں دیکھ رہا تھا اور یہ اپنی..... پانی کی دھار بنے وہ پانی کے کنارے بن گئے۔
گھوم پھر کر وہ پھر اسٹور آ گئی، اپنے واجبات لینے، واجبات سے زیادہ مقصد جاب چھوڑ دینے کا عندیہ دینا تھا۔
"تمہارا کوئی پوچھنے آیا تھا۔" اسے دیکھتے ہی مینجر نے اسے بتایا۔
"عالیان....." سانس سے بھی پہلے نام اس کے حلق سے نکلا۔
"کوئی سائی تھا، میں نے کہہ دیا، تم آئی تھیں اور چلی گئیں۔"
"سائی!" وہ بڑبڑائی..... وہ کافی بار اسے کال کر چکا تھا، لیکن اس نے کوئی کال ریسیو نہیں کی تھی۔ اس نے اپنے اندر سائی کے لیے بھی نفرت محسوس کی اور غصہ بھی۔
"مجھے میرے بقایا جات چاہئیں۔" ہاتھ مسلتے اس نے کہہ دیا۔
"تم جاب چھوڑ رہی ہو؟"
"ہاں....." اس نے نظریں چرا کر کہا۔
"کہیں اور جاب مل گئی ہے؟"
"مجھے جاب کی ضرورت نہیں رہی اب۔"
"تم ٹھیک ہو امرحہ؟"
"ہاں..... بالکل....."
"بیٹھ جاؤ امرحہ....." مینجر نے نرمی سے کہا۔
وہ شیشے کی دیوار کے پاس رکھے اسٹول پر بیٹھ گئی اور گیلی سڑک کو دیکھنے لگی۔
"کہیں جا رہی ہو؟"
دونوں ہتھیلیوں کو مسلتے امرحہ نے چونک کر گیلی سڑک پر سے نظریں اٹھائیں۔ اسے یہ کس نے بتایا کہ وہ جا رہی ہے..... تو کیا اسے واقعی جانا ہو گا..... اس کے رخصت کے استعارے اکٹھے ہونا شروع ہو گئے ہیں اور اس کے قیام کی علامتیں روپوش ہو گئی ہیں۔
"اتنا وقت تمہارے ساتھ گزارا ہے اور تم کیسے جذبات سے عاری، خاموش سی جا رہی ہو۔ اگر تمہارا جانا ضروری ہے تو اچھے انداز سے بائے کہہ کر جاؤ، ورنہ مجھے موقع دو کہ میں تمہیں اس انداز میں الوداع کہوں، جس انداز میں میں نے تمہیں خوش آمدید کہا تھا۔"
اور صرف اتنی سی بات پر وہ پھر سے رونے لگی..... اور آنکھوں کو رگڑ کر مینجر کو دیکھا۔
"میں نہیں جا رہی..... کہیں نہیں جا رہی۔"
"پھر جاب کیوں چھوڑی۔"
"یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ میں سب چھوڑ سکتی ہوں، لیکن اسے نہیں..... پوری شدت سے جانے کا فیصلہ کرنے کے باوجود میں ساری قوتیں لگا کر خود کو روک لینا چاہتی ہوں..... مجھے روک لیں..... پلیز....."
"رک جاؤ امرحہ....."
"میں یہاں رہنا چاہتی ہوں۔"
"رہ جاؤ یہاں....."
"دنیا کے کسی اور کونے میں، میں کیسے رہ سکتی ہوں اب بھلا؟"
"دنیا کے اس کونے کے علاوہ تمہیں کہیں اور رہنے کی ضرورت نہیں۔"
"یہاں بھی اب میری ضرورت نہیں رہی، یہاں بھی نہیں رہ سکتی، یہاں سے جا بھی نہیں سکتی..... اسے اتنی جلدی کیوں تھی..... مجھے ہنسانے اور رلانے کے کام اس نے اتنی جلدی جلدی کیوں کیے؟" اس نے مینجر کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔
وکسن ہمدردی سے اسے دیکھنے لگا۔
"وہ جوتوں والا؟" بہت کچھ وہ پہلے سمجھ چکا تھا، اب مکمل سمجھ رہا تھا۔
"میں اپنے جانے کے سامان کر رہی ہوں اور خود کو روک لینے کے بھی..... میں بری طرح سے منتشر ہوں۔

میرا ایک حصہ میری مٹھی میں ہے اور ایک اس کے وجود میں... میں خود کو کہاں کھڑا کروں اور کہاں سے چلتا کروں' میں فیصلہ نہیں کر پا رہی... ولسن! میں نے اسے کھیل نہیں سمجھا تھا' لیکن کھیل کی طرح ہی کھیل گئی... اسی لیے تو محبت میں ہار جیت ہوتی ہے۔ اگر ہم اس سے نہ کھیلیں تو ایسا تو نہ ہوتا... صرف جیت ہی ہو... بس جیت..."

ولسن میز کے کنارے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ امرحہ اردو میں بول رہی تھی' اسے الفاظ سمجھنے میں دقت تھی۔ محسوسات سمجھنے میں ہرگز نہیں۔

"میں نے ہر خوب صورت شے کی طرف سر اٹھا کر دیکھا ہے... آنکھیں گاڑ کر... دل جما کر... پھر بھی میں یہ یقین حاصل نہیں کر پائی کہ میں ان کے سہارے جی لوں گی وہ میرے لیے کچھ تو سہارا بن جائیں گی... دیکھو یہ سڑک پر چلتے لوگ' ہنستے مسکراتے لوگ مجھے کتنے ہیبت ناک لگ رہے ہیں اور یہ آسمان سے برستی پھوار مجھے اس پر ترس بھی آ رہا ہے مجھے یہ کیسی حقیر بھی لگ رہی ہے... یہ میرے آنسوؤں سے مقابلہ کر رہی ہے... اور میں نے ساری بڑی نعمتوں کو گن کر دیکھ لیا ہے۔ ان کے انبار بھی مجھے دیے گئے تو میرے لیے رائی برابر خوشی کا سامان نہ ہو سکے گا... میں کبھی حساب میں اچھی نہیں رہی اور دیکھو' آج ہر غم کے جواب میں وہ نکلتا ہے اور ہر خوشی کے سوال میں بھی... میرا حساب اچھا ہو گیا ہے۔"

میز پر رکھے ٹشو باکس کو ولسن نے اس کے آگے کرنا قابل تحقیر جانا... وہ بچوں کی طرح اپنے کسی پیارے کھلونے کے ٹوٹ جانے پر رو رہی تھی... اسے لاڈ سے چپ کروایا جا سکتا تھا یا تسلی سے' صرف اس کی آنکھیں خشک کر دینا کافی نہیں ہو گا۔

"میں سوچتی ہوں اگر اپنی ہتھیلیوں پر آنسو بہاتی رہوں تو شاید میری قسمت بدل جائے۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ اسے سننے کے لیے کان اس کے منہ کے پاس لے جانے پڑتے تو ثابت ہوا کہ وہ خود اپنے آپ سے بات کر رہی تھی۔

"میں اسے کبھی یہ بتا نہیں سکی کہ وہ مجھے کتنا اچھا لگتا ہے... اب اسے کون بتائے گا کہ امرحہ نے اسے کتنا پسند کیا' اتنا کہ میں نے اس کے پلٹ جانے پر اس کی پشت کو اوجھل ہو جانے تک دیکھا اور اس کے سامنے آنے پر میں نے اپنی نظر سے اس کی نظر اتاری... اگر وہ مجھے نہ ملا ہوتا تو مجھے یہ کبھی معلوم نہ ہوتا کہ خدا کی رحمت کیسے انسانی صورت مجسم ہوتی ہے اور اگر کرم اور مہربانی کی کوئی پہلی صورت ہے تو وہ اس جیسے انسان کی زندگی میں شامل ہونا ہے... اندھیروں پر قابض ہو جانے والا وہ روشن ستارہ جو طلوع ہوا کرتا ہے غروب نہیں۔

رات کو آنکھیں بند کرنے سے پہلے مجھے یہ منظر دیکھنا یاد رہتا ہے کہ کیسے وہ سر کو اٹھا کر قہقہے لگاتا ہے... مجھے دلی سکون ملتا ہے اس منظر کو دہرا کر جب وہ میرا مانک اٹھانے جھکا تھا۔ جو مسکراہٹ اس وقت اس نے اپنے ہونٹوں پر سجا رکھی تھی' وہ ان جذبوں کو عطا کی جاتی ہیں جو اب ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اس مسکراہٹ سے میں اس کی مداح ہو گئی اور طلب گار بھی۔ میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکی کہ وہ خاموش رہتا ہے تو گنگناتا ہوا لگتا ہے اور اگر وہ گنگنا لے تو ساری خاموشیوں کو جگاتا لگتا ہے۔ میں نے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا اور نہ اس نے مجھے سنا... اس نے اپنے کان ویرا کے منہ کے آگے کر دیے' کتنی جلدی میں تھا وہ بدہیت ہوتی ہے ایسی عجلت کہ مٹھی میں قید کر لینے والے مٹھی کھول دینے پر مائل ہوں۔"

اپنے وجود کو ساکت رکھے' دونوں ہاتھ گود میں رکھے اسے دیکھتے ولسن کی نظروں میں ترحم بڑھتا جا رہا تھا۔

"تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک دن خود تمہارے پاس آئے گا۔"

"مجھے بھی یہی خوش گمانی تھی۔"

"خوش گمان ہونا اچھا ہے' بجائے بدگمان ہونے کے... اپنے دل کو اور ہلکا کر لو... لیکن کہیں مت جاؤ۔"

جس حالت میں وہ بیٹھی تھی اسی حالت میں اٹھ کر

باہر آ گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ محبت نے شدت اختیار کر لی تھی... ڈریگن پریڈ تک وہ کچھ اور تھی۔ اب کچھ اور تھی... چشمہ دریا بن چکا تھا اور دریا ایسے پانیوں میں گرتا تھا جس کی وسعت کی کوئی حد نہیں تھی۔

جو کچھ ان کے درمیان ہو چکا تھا وہ اب سے پہلے عام اور معمولی لگتا تھا۔ کہانی کا ایک المیہ حصہ... جو ہر قصے کہانی سے جڑا ہوتا ہے اور پھر سے سب خوش... اور اب جب واقعی عالیان کسی اور کے سپرد ہوا تھا تو سب خوش فہمیاں' غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ حقیقت' سوچوں اور اندازوں سے کہیں آگے کی چیز ہوتی ہے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپر کو دیکھا۔ "کیا وہ اتنے سے عالیان پر راضی ہو جائے گی۔"

"نہیں... ہاں نہیں..."

خود سے کئی ہزار بار یہ سوال پوچھ چکے اور اس کا جواب جان چکے اور اپنا سب کچھ ہار چکے عالیان کو جیتنے کے لیے اس نے ایک آخری جوا بھی کھیل لینا چاہا۔

اس کے خاندان کو حسب نسب چاہیے تھا اور اسے وہ...

خاندان کے نام پر اس کے پاس کچھ تو ہو گا... کوئی تو... اور نہ جانے وہ کوئی کتنا معتبر ہو کہ اعتراض کا سوال ہی نہ اٹھے۔

وہ ویرا کو ہاں کہہ چکا ہے تو نہ بھی کہہ دے گا... امرحہ کی ہاں کے بعد کسی نہ کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس نے کوٹ کی جیب سے فون نکالا اور کافی دیر تک اسے دیکھا۔ وہ پہلے بھی ایک بار اس نمبر پر فون کر چکی تھی۔ اسے کچھ نہیں بتایا گیا تھا' بلکہ الٹا انہیں یہ شک ہو گیا تھا کہ وہ صرف پیسوں کے لیے یہ ظاہر کر رہی ہے کہ وہ ان کی مدد بھی کر سکتی ہے۔

برننگ مین اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور اسے یہ بتانے لگا کہ اب اسے ساری زندگی اسی کی طرح جلنا ہو گا... اور برننگ مین یہ نہیں جانتا تھا کہ آگ سے جل جانا جدائی کی آگ سے بہت کم تکلیف دہ ہوتا

ہے۔

☆ ☆ ☆

نیویارک سٹی کا مقامی ریسٹورنٹ ہے جس کی چھت کی زیبائش آنے والوں کو سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی اور جس کے سائے تلے بیٹھ کر کھانے میں وہ راحت محسوس کرتے ہیں۔ ہال میں پھیلی میزوں پر بیٹھے لوگ کھانے کو محبت اور نرمی سے برت رہے ہیں اور اپنے سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں دیکھنے کو پسند کر رہے ہیں۔ افراتفری کو وہ باہر چھوڑ آئے ہیں اور فرش سے چھت تک تنی شیشے کی دیواروں سے دکھائی دیتی نیویارک شہر کی روشنیوں کو اپنے ساتھ ساتھ' لیکن پس منظر میں رکھتے ہیں۔

وہ بلندی پر ہیں اور یہی تو انہیں پسند ہے۔

سامنے ہال کی اس دیوار کے سامنے جس پر مقامی مصور نے اپنا شاہکار ثبت کیا ہے کی دو فٹ اونچی ڈائس پر مائیک کے سامنے سفید فراک میں ملبوس وہ کھڑی ہے ویرا...

"میری شام بنام عالیان..." اس نے یہ فقرہ مسکرا کر کہا' لیکن وہ آواز کو زیادہ بلند نہیں کر سکی اور اس نے اپنی نظریں میزوں پر سجی بلوری شمعوں پر بھٹک بھٹک جانے دیں۔

"پہلی بار میں تب چونکی تھی جب اسائنمنٹ بناتے میں تھک کر رک گئی' اور ہاتھ میں پکڑے پین سے میں نے عالیان لکھا اور پھر میں نے صفحے کو اس نام سے بھر دیا اور میں ذرا نہیں تھکی۔ اپنے علاوہ کسی اور کا نام لکھنا' یہ کام کرنا مجھے اچھا لگا۔ پھر جب وہ نوٹ بک میرے لیے بے کار ہو گیا تو بس میں نے اس ایک صفحے کو نکال کر سنبھال لیا۔"

ریسٹورنٹ اپنے قیام کی سالانہ تقریبات کا ایک سلسلہ شام بنام منا رہا تھا اور وہاں موجود لوگوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس شخص کے نام کا اعلان کریں جو دنیا میں ان کے لیے سب سے زیادہ خاص ہونے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

"چند سالوں بعد مجھے اپنی اس حرکت پر ہنسی آئے گی۔ مجھے اب بھی آرہی ہے، لیکن مجھے اس ہنسی پر کوئی شرمندگی نہیں۔" کہہ کر وہ رک گئی۔ اسے اس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسے اچھے الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ اس نے سوچا۔

"میں زندگی میں اتنی پریکٹیکل رہی ہوں کہ مجھ میں وہ احساسات ہی کم ہونے لگے جو نان پریکٹیکل ہوتے ہیں۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں ایسے شخص سے شادی کروں گی جو بابا کی طرح کا ہوگا۔ شاید ہر لڑکی ہی ایسا چاہتی ہے۔ مجھے یقین تھا کہ میں کبھی اپنے بابا جیسے انسان سے نہیں مل سکوں گی اور ابھی تک ملی بھی نہیں اور اب یہ اتنا ضروری بھی نہیں رہا۔ مجھے ذہانت سے لیسا دینا تھا اور یہ عالیان کا میدان تھا، لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ اس کی سائیکل کے پیچھے بیٹھے جب میں نے اسے پکڑنا چاہا اور پھر میں نے ایسا نہیں کیا، کیونکہ مجھے خیال آیا کہ وہ برا مان جائے گا اور اس خیال کے آتے ہی مجھے خبر ہوئی کہ مجھے اس کی یہ ہی بات اچھی لگتی ہے۔" وہ ہنسی اور رک گئی اور ہلکے سے گردن کو خم دیا اور ایسا کرتے اس کے کھلے بال لہرا گئے۔ آج اس نے ترچھی مانگ نکال کر سامنے سے بالوں کی لٹ کو اٹھا کر اسے بل دے کر چمک دار سنہری پن لگائی تھی۔ وہ وہاں اپنی ساری خوب صورتیوں اور مترنم اداؤں سمیت موجود تھی۔

"میں ابھی تک اس کی سب اچھی باتوں کی فہرست نہیں بنا سکی اور ایسا مجھے کرنا بھی نہیں۔" ہاتھ کو ہلکا سا لہرا کر اس نے ایسے اشارہ کیا کہ ہال میں ہلکی ہنسی کی آوازیں گونج اٹھیں۔

"میرا خیال تھا کہ وہ یونی میں بس ایسے ہی مشہور ہے جیسا کہ خوب صورت اور ذہین اسٹوڈنٹس ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ ہر تیسری لڑکی کا اس پر کرش ہے اور ہر دوسری لڑکی خود کو اس پر کرش سے بچانا چاہتی ہے اور ہر پہلی لڑکی کے بارے میں، میں ابھی تک نہیں جان سکی کہ وہ کیا کرتی ہوگی۔"

ہال میں ہنسی پھر گونجی اور اس بار دیر تک گونجتی رہی۔ سب اسے توجہ سے سننے پر خوش تھے۔

"اور مجھے کبھی اس خبط کی سمجھ نہیں آئی۔ معلوم ہوا تو یہ کہ اس میں کچھ تو ہے' کچھ بہت زیادہ' جب اسے غصہ آتا ہے تو وہ گہرے سانس لیتا ہے اور سختی سے اپنا منہ بند کر لیتا ہے اور میرے نزدیک یہ ہی اصل طاقت ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہوں گے جو ایک انسان کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دینے کی طاقت رکھتے ہوں گے، لیکن ایسے کتنے لوگ ہوں گے جو زبان کو ہلانے کی معمولی، لیکن بے بس کر دینے والی قوت کو قابو میں رکھتے ہوں گے۔ میں نے جب جب اسے کچھ سنانا چاہا اسے ہمہ تن گوش پایا..... اسے بد مزاج اور چڑچڑاتے نہیں دیکھا۔

ہاں اگر مجھے فہرست تیار کرنی ہی ہو تو میں اس کے اخلاق کو سب سے اوپر رکھوں۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے۔ اگر میں ایک آئرن لیڈی ہوں، جیسا کہ میرے بارے میں کہا جاتا ہے تو میں اس کے سامنے خود کو صرف انسان محسوس کرتی ہوں۔ وہ وہی سانچہ ہے جو لفظ انسان پر پورا اترتا ہے۔ اس کی موجودگی میں وقت جلدی گزرتا ہے اور اس کی غیر موجودگی میں وقت کو اس تک لے جانے کی تمنا کی جاتی ہے۔ بابا کہتے ہیں وہ انسان بلاشبہ خوش قسمت ہوتا ہے، جس کے گرد خاندان کا جھرمٹ سجتا ہے۔ میں اس میں اضافہ کرنا چاہوں گی کہ وہ خاندان خوش قسمت ہوگا جس کا جھرمٹ عالیان کے گرد سجے گا۔"

اس کی آنکھوں کی چمک اتنی بڑھ گئی تھی کہ عین اس کے سر پر لگے فانوس کی چمک کو ماند کرنے لگی تھی۔

"تو میں نے سوچنے میں زیادہ وقت نہیں ضائع کیا۔ اکثر لوگ کر جاتے ہیں نا اور میں نے اس چیز کا انتظار بھی نہیں کیا کہ وہ مجھ سے آکر کہتا۔" آؤ مل کر زندگی گزاریں۔" مجھے اندازہ تھا کہ اب مشکل سے ہی وہ کسی سے یہ کہے گا۔ ایک بار کہہ کر اس کے ساتھ کافی برا ہوا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے کہہ دیا۔ مجھے کہہ لینے دیں کہ میں خوش ہوں اور مطمئن بھی، کیونکہ

میری ماما نے ایک بار کہا تھا۔ "شادی اس انسان سے کرنا جس کی تمہیں نگرانی نہ کرنی پڑے۔" میں نے ابھی کہا کہ اس کے اخلاق کو میں سب سے اوپر رکھتی ہوں تو مجھے ایسے اخلاق کے حامل انسان کی نگرانی کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئے گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان ہی لوگوں میں سے ہے، جو انسانوں کو استعمال نہیں کرتے، کیونکہ وہ انہیں کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ وہ جھوٹ بول لیتا ہے اور ایسے بولتا ہے کہ شہادتیں دیتا ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس سے مل کر میں نے ایک بات سیکھی کہ بہر حال یہ انسان کے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کو کس قدر خوب صورت بنا سکتا ہے۔"

اسے تین منٹ کا وقت دیا گیا تھا جیسا کہ سب کو دیا گیا تھا، لیکن وہ بیس منٹ لے چکی تھی اور ابھی بھی بول رہی تھی۔ بولنے والا شخص خاموش ہونے کو تیار نہیں تھا، تو شہر کی روشنیوں کو پس منظر میں رکھ کر بیٹھنے والے لوگ اسے روکنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہاں اس شخص کا ذکر کیا جا رہا تھا جس کے بارے میں بولتے اور سنتے وقت سے ٹھہر جانے کی گزارش کی جاتی ہے۔

مائیک کے پاس کھڑے اس کے گال گلابی ہو چکے تھے۔ اس نے محبت کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا اور کسے خبر تھی کہ اس نے یہ لفظ چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ وہاں کھانا کھانے آئی تھی یہ سب کہنے نہیں، لیکن اگر کہہ دیا تو اچھا ہی کیا..... شاید بہت اچھا کیا۔

☼ ☼ ☼

برننگ مین نائٹ ہے اور اس کے گرد و یرا گول گول گھوم رہی ہے۔ اس کی سماعتوں نے ہونی کی چاپ سن لی تھی اور اسے صاف صاف نظر آنے لگا کہ وہ کسی اور کی زندگی میں جا رہا ہے۔

"یہ آنا اور جانا کبھی ان کے معاملے صدیوں میں طے ہوتے ہیں، کبھی پلوں میں۔"

وہ ایک مرد تھا اور اس پر یہ تصور گراں گزرتا تھا کہ اس کے سامنے اسے اپنا لینے کی خواہش کی جائے۔ یہ حق وہ اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔ یہ رسم اسے ادا کرنی تھی۔ اسے یہ برا نہیں لگا کہ اس کا حق چھین لیا گیا، بس وہ ششدر سا رہ گیا۔ کوئی اسے اپنا لینے کی بات کر رہا ہے..... امرحہ نہیں..... بس کوئی..... ہاں بس پھر وہ کوئی ہی ہو۔

وہ جانتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس موڑ پر لے آیا تھا جس پر وہ خود کو کسی اور کے حوالے کر دینا چاہتا تھا اور دوسرے معنوں وہ کھیل ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن کھیل ختم نہیں ہو رہا تھا..... اسے ہر آواز بری لگ رہی تھی..... ہر انداز پر اسے اچنبھا ہوا..... برننگ مین جل رہا تھا اور اپنی ساری تپش اس کے اندر منتقل کر رہا تھا۔

جس زمین پر وہ کھڑا تھا وہ زمین اسے کھسکتی ہوئی لگی۔ ویرا اس کے سامنے کھڑی تھی، لیکن اس منظر نے اس کا دل نہیں لبھایا۔ وہ جس کے سامنے کھڑا ہوا تھا، وہ منظر ماضی کے اوراق سے نکل کر اس کے سامنے داستان بنا کر کھڑا تھا۔

آگ سے بھرے میدان کے دائرے اس کے گرد کھنچ گئے اور لاتعداد گھنٹے اس کے سر پر بجنے لگے۔

"میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے یہ بات سن لی تھی اور اسے یہ بات سنائی بھی نہیں دی تھی۔ یہ ایک انہونی کے ہو جانے کی سناؤنی تھی اور ایک اعلان بھی کہ جواہرات جڑے بیش قیمت آبخورے کے پیندے میں سوراخ ہو جائے تو پھر اسے یہ غرض نہیں رہتی کہ اس میں جواہرات محفوظ کیے جانے لگے ہیں یا کھنگتے سکے، وہ تو بس اتنا جان لیتا ہے کہ وہ "جام طہور" ہونے کا فخر کھو چکا ہے اور یہ ہی اعلان اس صداقت کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ جب پریم جل سے لبالب ہوئے پیالا دل کے ساتھ یہ ہوتا ہے تو اسے یہ فکر نہیں رہتی کہ اس نے کیا کھو کر اب کیا ہونے کا اعزاز پالیا ہے۔

اس کا دل اپنا فخر کھونے جا رہا تھا اور یہ کیفیت بہت ہیبت ناک ہوتی ہے۔ دل میں پہلی بار آنے والے کو ہم آخری سانس کے بعد بھی نکالنا نہیں چاہتے۔ اس عہد کو کر کے توڑنا ہی نہیں چاہتے۔ اپنا آپ بے معنی اور

بودا لگنے لگتا ہے، کیونکہ ہمارا دل پڑھی جانے والی کہانی کا کوئی کردار نہیں ہے، جسے پڑھتے پڑھتے اس پر لعن طعن کی جاتی ہے اور اس پر دو حرف بھیج کر ساری ہمدردیاں باوفا پر لٹا دی جاتی ہیں۔ دل اپنی کہانی قاری بن کر پڑھ ہی نہیں سکتا اور اگر ہم کسی ناقدرے کو سزا دینا چاہتے ہیں تو بہت جلد یہ جان لیتے ہیں کہ سزا تو ہم نے اپنے لیے تجویز کرلی اور تکلیف سب سے زیادہ ہم بھگت رہے ہیں۔ ناقدرا اور ناشکرا ہی سہی اس کے آگے پیچھے محبوب کا لفظ لگتا ہے اور یہ وہ لفظ ہے جس کے وزن پر کوئی دوسرا لفظ پورا اترتا ہے نا آدھا۔

اس نے اپنی ماں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل کرلیتی تو اس کے ساتھ ایسا نہ ہوتا۔ امرحہ پر یہ الزام لگایا کہ وہ ولید البشو جیسی ہے اور خود اپنے بارے میں فیصلہ اسے اب کرنا تھا۔

اب وہ کیا چاہتا ہے... ویرا...

اس نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے چھوا... "جواب کے لیے اصرار نہ کرو... مجھے وقت دو..."

"جتنا چاہے وقت لے لو صرف اتنا بتادو کہ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟" وہ اس کے سامنے بیٹھ کر معصومانہ انداز میں کہنے لگی۔

وہ بہت پیاری تھی... پر خلوص اور معصوم... اگر وہ ویرا نہ ہوتی تو اس کے لیے وہی امرحہ ہوتی۔

"ہاں... تم بہت اچھی لگتی ہو مجھے۔" اس نے خوش دلی سے کہا اور وہ اتنی زیادہ خوش ہوئی کہ اسے حیران کردیا۔ وہ اتنی چھوٹی سی بات پر اتنی خوش ہوگئی تھی اور امرحہ اتنی اہم بات سن کر مسکرا بھی نہیں سکی تھی۔ وہ ویرا کے لیے اتنا اہم تھا اور امرحہ کے لیے اتنا غیر اہم... اسے اس کی دوستی کی ضرورت تھی اور وہ اسے ایک اچھا دوست بنا کر نہیں رکھ سکی تھی۔ اس نے ویرا کی طرف دیکھا، جو کھڑے ہو کر سب کی تالیوں کا جواب خود بھی تالیاں بجا کر دے رہی تھی، سرہلا کر بے طرح مسکرا رہی تھی۔

جسے زندگی میں شامل ہونے کی دعوت دی جائے، اس کے لیے ایسے ہی مسکرانا چاہیے... پہلے اس پیغام کو عزت دی جانی چاہیے، پھر اس قبولیت کا احترام کرنا چاہیے۔ اس پر بہت سے اور اک ہورہے تھے۔ اسے ان پر کان بھی دھرنے چاہیے تھے اور پھر فیصلہ کرنا چاہیے۔

لیکن جو فیصلہ بے اختیاری میں ہوتا ہے اس میں ایسا کیا ہوتا ہے، جو اختیاری فیصلے میں نہیں ہوتا۔

اس نے گھوم کر چار اطراف نظر ڈالی اور اس کی ساری دلچسپیاں ہی ختم ہوگئیں۔ ہر طرف اسے ایک ہی چیز نظر آئی "آگ..."

"برننگ مین خوش قسمت ہے، وہ کتنی آسانی سے ختم ہو رہا ہے۔"

ویرا نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ اس کے ہاتھ میں نرمی تھی، پھر بھی اس کے وجود پر پہاڑ آگرا۔ وہ ویرا کی ساری خوبیوں کا معترف تھا، پھر بھی اس نے بھاگ جانا چاہا۔

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی، اس پر مسکراہٹ بجتی تھی۔

وہ ایک خوب صورت مرد تھا، وہ اپنی مسکراہٹ گنوا رہا تھا۔ یہ اگلی رات ہے... وہ ہارٹ راک کے اسٹور میں بند ہے۔ زمین پر بیٹھا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو اندھیرے میں موجود پایا... ایسا اس نے خود چاہا اور اس نے اس سے کئی سوال کیے۔

"یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ میں آپ کا خون ہوں یا اس لیے کہ قدرت کا آپ سے انتقام ابھی پورا نہیں ہوا؟" اس نے آواز سے الفاظ ادا کیے۔

ڈی جے کے Mash up کی آواز اس کے الفاظ سے زیادہ پر اثر نہیں تھی۔

"میں ایک انسان ہوں ماما! اور میں سب کچھ ٹھیک ٹھیک نہیں کرسکتا۔ جو مجھے ٹھیک لگ رہا ہے ہوسکتا ہے وہ غلط ہو اور جو غلط ہے وہ ٹھیک ثابت ہوجائے۔ میں خود کو کتنا بھی عقل مند سمجھوں، مجھے یہ یاد رہتا ہے کہ بہت سے معاملات میں عقل کا عمل دخل ہوتا ہی نہیں ہے۔ میرے دل کے ایک حصے میں یہ بات نقش تھی کہ آپ نے بے وقوفی کی۔ اب میرا یہ دل مجھے یہ یاد دلاتا ہے کہ میں بے وقوفی کر رہا ہوں... لیکن کہاں اور کیا مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو رہا۔ میں آپ کے ماضی میں جینے لگا ہوں اور میرا حال ماضی بن رہا ہے۔

میں زندگی میں دوبار انتہائی تکلیف سے گزرا، جب آپ کو سرد ہوتے دیکھا اور ایک تب جب امرحہ کے دل کو اپنے لیے سرد پایا۔ اس دوسری تکلیف نے مجھے پہلی تکلیف بھلا دی۔ میں آپ کی اور اپنی محبت میں پھنس گیا ہوں۔ آغاز میں نہیں۔ انجام میں... سائی کہتا ہے کہ میں نے امرحہ کو معاف نہیں کیا... میں نے معاف کردیا ہے... لیکن آگے کیا۔

اب میں اس پر سوچ رہا ہوں کہ آگے کیا؟ ایک پر خلوص دل ویرا کو مایوس کردوں یا ایک سخت دل امرحہ کے لیے خود کو تنہا کرلوں... یہ ایسے بھی ہے کہ میں ایک ایسے دل کے پیچھے بھاگوں جو مجھے ضمانت کے طور پر چند لفظ بھی نہیں دیتا۔ سائی کہتا ہے کہ یہ اس کی روایات ہیں جو وہ ایسے پابند ہے... تو ماما ایک انسان جس کی چاہت میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنے جذبے کو روایات سے اوپر لے جائے۔

کیا ایک انسان ہر شے سے بلند نہیں رکھا جاسکتا... کیا ایک انسان کو ارفع بنانے کے لیے اس طاقت، محبت کا استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ کیا ایک انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے برتا نہیں جاسکتا۔ ایک انسان کتنا قیمتی ہے، یہ مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے جس نے آپ کو کھو دیا، جو اپنا آپ کھونے جارہا ہے۔ کیا آپ کے محبت سے لبریز دل کے مقابلے میں کائنات کی کوئی چیز ٹھہر سکتی ہے۔ اور کیا یہ کہا نہیں جاتا کہ جس نے ایک انسان کو پالیا اس نے سب پالیا۔ تو کیا میں وہ انسان نہیں ہوں جسے پاکر سب پالیا جائے، میں امرحہ کے لیے یہ انسان کیوں نہیں ہوں؟

☆ ☆ ☆

"سائی دوبار گھر آچکا ہے تم کہاں تھیں؟" اس کی شکل دیکھتے ہی سادھنا پوچھنے لگی۔

"میں جاب پر تھی۔"

"آج چھٹی ہے اور تم صبح ہی گھر سے نکل گئیں کہاں گئی تھیں تم؟"

"ایسے ہی خریداری کرنے؟" وہ نشست گاہ کے سامنے کھڑی تھی۔

"اتنی صبح؟"

"اتنی بھی صبح نہیں گئی تھی۔"

"اپنے کمرے کی کھڑکی سے میں نے تمہیں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا، میں آریان سے بات کر رہی تھی۔"

"کیسا ہے آریان اب؟"

"سائی کہہ رہا تھا وہ اسٹور بھی گیا تھا۔ تم وہاں بھی نہیں تھیں، وہ بہت پریشان تھا۔"

"میری فون پر اس سے بات ہوچکی ہے۔"

"میں نے اس سے پوچھا کہ تم دوبار آچکے ہو، فون پر امرحہ سے رابطہ کیوں نہیں کرتے تو وہ خاموش رہا... وجہ کچھ اور ہے نا؟"

"بس ایسا ہی پاگل سا ہے وہ۔" وہ چلتی اپنے کمرے تک آگئی، پیچھے پیچھے ہی سادھنا تھی۔ امرحہ نہیں چاہتی تھی کہ سادھنا اس کے کمرے میں آئے۔ اس کے کمرے کی حالت کچھ ایسی اچھی نہیں تھی۔

"تم کہیں جا رہی ہو؟" کمرے میں آتے ہی سادھنا کی نظر بیڈ پر رکھے سوٹ کیس پر گئی۔

"نہیں... اب نہیں۔" جوتوں کا شاپر اس نے ایک طرف رکھ دیا۔

سادھنا نے ایک سوٹ کیس اٹھا کر دیکھا۔ "یہ کافی وزنی ہے۔"

"ان میں فالتو کا سامان ہے میں چیریٹی کے لیے دے رہی ہوں۔"

"یہ دو اتنے بڑے سوٹ کیس... چیریٹی؟"

"ہاں..." جھوٹ بولتے وہ ذرا نہیں گھبرائی۔

"تم کچھ چھپا رہی ہو امرحہ؟" وہ اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

"نہیں سادھنا! میں کچھ نہیں چھپا رہی۔" خود کو بہت پر وقار بنا کر اس نے کہا۔

"پھر کیا کرتی پھر رہی ہو...؟ اتنی صبح کیوں نکلی تھیں تم گھر سے؟"

"اپنے لیے نکلی تھی۔ اپنے خاندان کے مان سمان کے لیے۔" اس کا انداز تلخ ہو گیا۔

"کچھ ہوا ہے کیا۔" سادھنا چونک گئی۔

"کچھ کیا؟"

"تمہاری آنکھیں سرخ ہیں اور تمہارا چہرہ....."

"ماتم زدہ!" وہ طنزیہ ہنسی۔ "ہاں ایسا ہی ہے۔" کہتے اس نے نظریں نہیں چرائیں۔ "تم کچھ اور نہیں دیکھ رہیں سادھنا؟"

"کچھ اور....." سادھنا کی پیشانی کی کھال سمٹ گئی۔

"کیا میں تمہیں بدلی بدلی جرات مند نہیں لگ رہی؟"

"نہیں..... تم مجھے نڈر لگ رہی ہو۔" اس کے چہرے کے عضلات سکڑ گئے۔

"ایک ہی بات ہے۔" امرحہ بیٹھ کر اپنے جوتے کے تسمے کھولنے لگی۔

"نہیں..... جرات مند بہادر کو کہتے ہیں اور نڈر نہ ڈرنے والے کو..... بے حس کو بھی....." تسمے کھولتے امرحہ کے ہاتھ رک گئے۔ "تم نے کس کتاب میں نڈر کو بے حس پڑھا ہے؟" تسموں کی گرہ کھولنے کے بجائے اس نے گرہ لگادی۔

"اپنی زندگی کی کتاب میں....." سادھنا نے دیکھ لیا کہ اس نے گرہ لگادی۔

امرحہ سر اٹھا کر سادھنا کو دیکھنے لگی۔ "تم نہیں سمجھو گی۔"

"میں نے بھی اپنی بہن سے یہ ہی کہا تھا۔" تسموں میں ایک اور گرہ لگ گئی۔

"کیا وہ عالیان ہے؟" دوسری گرہ لگتی بھی سادھنا نے دیکھ لی تھی۔

وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "کیا تمہیں عالیان پسند نہیں؟"

"میرے بیٹے کو زندگی دینے والے فرشتوں میں سے ایک وہ بھی ہے' وہ مجھے کیوں پسند نہیں ہو گا۔"

"تو تم نے سوال ایسے کیوں کیا' جیسے تمہیں اعتراض ہو۔"

"ہمیں ہی تو اعتراض نہیں ہوتا امرحہ....."

سادھنا اتنی ذہین ہو گی امرحہ کو اندازہ نہیں تھا۔ ایک لفظ ہمیں..... میں ساری بات سمیٹ دی۔ پوری توجہ اس نے تسمے کھولنے میں لگادی اور اٹھ کر وارڈروب تک آئی' لیکن پھر یہ سوچ کر نہیں کھولی کہ خالی وارڈروب سادھنا نے دیکھ لی تو مزید سوال کرے گی۔

"مجھے کوئی تو جواب دو۔" وہ دونوں ایک ہی خطے سے تھیں اور سادھنا اپنی طرف سے اسے وہ سب سمجھانا چاہ رہی تھی جو خود اس نے بعد میں سمجھا تھا۔

"مجھے اعتراض نہیں ہے سادھنا..... اور میری بلا سے ساری دنیا کو ہو..... تھوڑا بہت اگر عالیان کے آگے پیچھے کا پتا چلے تو ٹھیک' ورنہ اب مجھے کوئی پروا نہیں۔ مجھے اپنے دل کے سوا کسی کی بھی پروا نہیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے اسے کھو کر کیسا لگتا ہے اور اس احساس کے ساتھ جینے کی مجھے کوئی خواہش نہیں' میری آنکھوں سے دیکھو مجھے اس کے علاوہ اب کوئی نظر نہیں آرہا' میں پہلے ہی بہت برا کر چکی ہوں' پھر نہیں کروں گی۔"

"تم نے اپنے دادا سے بات کی۔" سادھنا کو سن کر حیرت نہیں ہوئی۔

"کی تھی اور جواب وہی آیا جس کی توقع تھی' انہیں ایک اچھے انسان سے مطلب نہیں ہے' انہیں ایک اچھا خاندان چاہیے۔" تیز آواز میں کہہ کر وہ واش روم میں چلی گئی' تاکہ سادھنا کمرے سے چلی جائے۔

وہ زبان سے کہہ رہی تھی کہ وہ بہادر ہو گئی ہے' اور واش روم میں وہ پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ فون کرنے سے پہلے اس نے اپنے دماغ کو سلا دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی جب اس نے فون کیا تھا تو وہ گھبرا رہی تھی۔

"ہیلو..... ہاں..... جی..... نہیں میں اپنا نام نہیں بتاؤں گی۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ مارگریٹ کی اولاد کے بارے میں کون معلوم کرنا چاہتا ہے؟"

"تمہیں اس بارے میں فکرمند نہیں ہونا چاہیے۔" کھردرے انداز سے کہا گیا۔

"اگر مجھے کچھ معلومات مل جائیں تو شاید میں کچھ

کر سکوں۔" اس نے بات بنائی۔

"پیسے دیے جائیں گے معلومات نہیں۔"

"میرا صرف ایک سوال ہے..... کون ہے' جو یہ سب جاننا چاہتا ہے..... مارگریٹ کا شوہر؟"

تھوڑی دیر خاموشی رہی اور پھر فون بند کر دیا گیا۔ اس نے لوکل فون بوتھ سے فون کیا تھا۔ لیکن اس بار اس نے اپنے موبائل سے فون کیا تھا۔

"میں بتانے کے لیے تیار ہوں..... لیکن اس کے فوراً" بعد مجھے بتایا جائے گا کہ کون یہ سب معلوم کرنا چاہتا ہے؟"

کچھ دیر خاموشی رہی' پھر اسے ہولڈ کروایا گیا۔

"ٹھیک ہے۔"

"عالیان مارگریٹ' اسٹوڈنٹ آف مانچسٹر یونیورسٹی' ایم بی اے' رہائش Anselm ہال۔" وہ روانی سے بول گئی کہ مبادا وہ اپنا ارادہ ہی بدل دے۔

"اب مجھے میرے سوال کا جواب دیں۔" خوف نے یک دم اس کے گرد گھیرا تنگ کر دیا۔

"عالیان کا باپ۔" کہہ کر فون بند کر دیا گیا۔

اس نے بہت پرسکون سانس لی' اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

اب اس کا باپ غیر مسلم ہو تو بھی وہ موجود تو ہو گا۔ اس پر موجود سوالیہ نشان تو مٹے گا' وہ دادا کو منانے کی کوشش کرے گی کہ وہ ایک مسلمان سے شادی کرنے جا رہی ہے۔ باقی کی گنجائش اگر نہیں بھی نکلتی تو اب وہ اس بارے میں نہیں سوچے گی۔ بہت سوچ لیا' بہت رو لیا اور یک دم سے اسے خیال آیا کہ اسے معلوم ہوا تھا کہ عالیان کے کاغذات میں دو مذاہب لکھوائے گئے تھے۔ ایک مذہب اسلام تھا۔ یعنی اس کا باپ مسلمان ہی تھا۔ اس سوچ نے اسے اور ہلکا پھلکا کر دیا۔ اس نے اپنا دماغ منفی سوچوں سے آزاد کر دیا اور اپنا سامان کھول دیا۔

☼ ☼ ☼

ویرا نیویارک اپنے بھائی کے پاس آئی تھی۔

ایلسیکی نے درمیانے درجے کی ایک فلم میں پوسٹ پروڈکشن کا کچھ کام کیا تھا اور اب اس فلم کا پریمیر تھا۔ روس سے اس کے ماما' پاپا بھی آئے تھے۔ پریمیر رات کو تھا اور شام کو وہ پاپا کے ساتھ نیویارک کی سڑکوں پر چہل قدمی کر رہی تھی۔

"تمہارے نیویارک آنے کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔" انہوں نے ویرا کا ہاتھ اپنے بازو کے خم میں دیا اور اس کے چہرے پر دبے دبے اس جوش کو جانچا' جس کے لیے وہ انہیں چہل قدمی کے لیے لائی تھی۔

"میں ایلسیکی کے لیے آئی ہوں اور آپ سے ملنے بھی....."

"تم کرسمس کی چھٹیوں کے لیے پیسے اکٹھے کر رہی تھیں' اس ملاقات پر وہ کیسے ویسٹ کر دیے؟"

"میں اتنی بھی کنجوس نہیں پاپا۔"

"تم اتنی بھی شاہ خرچ نہیں ویرا۔"

"میں آپ کو یاد کر رہی تھی..... ملنا چاہتی تھی آپ سے۔" ان کے بازو کو تھامے وہ پوری ان کے ساتھ چپک گئی۔

"جب جب تم مجھ سے یہ کہتی ہو مجھے محتاط کر دیتی ہو' ایک سال اور چند ماہ پہلے یہ تم نے تب کہا تھا جب تمہیں مانچسٹر جا کر پڑھنا تھا۔"

"مانچسٹر جا کر پڑھنے کا فیصلہ غلط تو نہیں تھا۔"

"نہیں..... لیکن روس میں سب ہے..... یونیورسٹی بھی....."

"میں نئے ماحول میں آنا چاہتی تھی..... نئے لوگوں سے ملنا چاہتی تھی۔"

"امرحہ سے..... کارل سے..... عالیان سے؟"

"بالکل..... مجھے ان سب سے مل کر بہت اچھا لگا..... یہ روس میں مجھے نہ ملتے۔"

"روس میں جو روسی تم سے ملتے' وہ ان سے برے نہ ہوتے۔" رک کر انہوں نے ویرا کو جتایا۔

"آپ ہمیشہ اسی ایک بات کا ثبوت کیوں دیتے رہتے ہیں کہ آپ بہت محب وطن ہیں۔"

"میں ہوں۔۔۔ اور اس میں کیا برا ہے۔۔۔ ہر انسان کو اپنی سرزمین سے محبت کرنی چاہیے اور اس کی حمایت کرتے رہنا چاہیے' اپنی اولاد کے سامنے تو خاص کر۔۔۔"

"محب وطن ہونے کے ساتھ محب دنیا بھی تو ہونا چاہیے نا پاپا۔۔۔ اس دنیا کا بھی کچھ حق ہے ہم پر۔۔۔"

"تمہارا نکتہ کافی اہم ہے اور مجھے پسند بھی آیا اور مجھے یہ خیال بھی آرہا ہے کہ یہ محب دنیا کا فلسفہ تم نے مانچسٹر آکر سیکھا ہے۔" اپنے بازو کے خم میں موجود اس کے بازو کو اپنے دوسرے ہاتھ سے تھپک کر انہوں نے مسکرا کر کہا۔

"کسی سے ملوانا ہے آپ کو۔" اس نے ایک دم سے کہہ دیا۔

"میری کچھ کچھ سمجھ میں آرہا تھا۔" انہوں نے سر ہلایا۔

"کیسے؟" وہ ہنسی۔

"تم مجھے بار بار یہ کہتی تھیں کہ تم پڑھ پڑھ کر تھک چکی ہو' تمہاری آنکھوں کے گرد جھریاں نمودار ہونے لگی ہیں۔ دوسرے معنوں میں تم بوڑھی ہو رہی ہو۔ کتابوں کے صفحات پڑھ پڑھ کر تم اوبنے لگی ہو اور زندگی کو بس درس گاہوں تک ہی تو نہیں رہنا چاہیے نا۔"

وہ زور سے ہنسی۔۔۔ "یہ سب میں مذاق میں کہتی رہی ہوں۔"

"لیکن میں سنجیدگی سے سنتا رہا ہوں' تو تمہیں شادی کرنی ہے؟"

"نہیں کرنی چاہیے؟"

"ضرور کرنی چاہیے۔"

"آپ نے پوچھا نہیں کون ہے وہ؟"

"پوچھنا نہیں' ملنا چاہتا ہوں۔"

"پھر بھی۔۔۔"

"ضرور پوچھ لیتا اگر تمہیں نہ جانتا۔۔۔ کافی عقل مند ہو تم' بے وقوفی تو نہیں کی ہو گی۔"

"وہ بہت ذہین ہے۔"

"اوہ تو مسئلہ ذہانت ہے۔۔۔ شادی کر کے مات دینا چاہتی ہو اسے۔۔۔ ایسے ہراؤ گی اسے؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ مجھے اس کی شرافت پسند ہے۔"

"کتنے شریفوں سے مل چکی ہو جو اس کی شرافت کو اولین کر رہی ہو؟"

"آپ جانتے نہیں کتنا سفر کر چکی ہوں میں دنیا کا۔"

"تو تم نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اسے چنا؟"

"میں اس کا فیصلہ نہیں کر سکی۔" اس نے جھوٹ نہیں بولا۔

"کب آنا چاہتی ہو گھر؟"

"ڈگری لینے کے بعد۔۔۔ اس کا نام عالیان ہے۔"

"اوہ۔۔۔ عالیان۔۔۔ میں اسے جانتا ہوں۔۔۔ میری بیٹی ویرا اکثر اس کا ذکر کرتی ہے۔"

ویرا دل کھول کر ہنسی اور ان کے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ "میں اکثر سب کا ہی ذکر کرتی ہوں پاپا۔"

"شہو۔۔۔ مجھے اپنی یادداشت کھنگال لینے دو' میری بیٹی' ویرا نے اس کے بارے میں کیا' کیا کہا ہے۔" انہوں نے اپنی کنپٹی کو مسلا۔

"کل عالیان کی برتھ ڈے ہے اور میں پچھلے پندرہ دنوں سے مالز کی خاک چھان رہی ہوں اور کوئی ایک بھی تحفہ دریافت نہیں کر سکی جو اسے پسند آسکے' تو آخر میں کیا کروں۔۔۔ میں پھر سے مال جا رہی ہوں۔" انہوں نے ویرا کے انداز کی نقل اتاری۔

"پاپا!" وہ اور ہنسنے لگے اور زیادہ شدومد سے کنپٹی مسلنے لگے اور ویرا نے ان کے ہاتھ کو سختی سے اپنے ہاتھ میں بھینچ لیا۔

"عالیان کو ساتھ لے آتیں۔"

"اس نے کہا' وہ اپنی کلاس نہیں چھوڑ سکتا۔"

"تو امرحہ کو ہی ساتھ لے آتیں۔ مجھے اس سے باتیں کرنی تھیں بہت ساری۔"

"اس نے بھی کہا کہ وہ اپنی کلاس نہیں چھوڑ سکتی۔"

"دونوں نے ایک ہی بات کہی۔۔۔ دونوں بہت اچھے دوست ہیں نا؟"

"تقریباً"۔۔۔ امرحہ نے یہ بات عالیان سے سیکھی ہے۔"

"اور اس پر سختی سے عمل بھی کرتی ہے؟" رک کر انہوں نے ویرا کو دیکھا اور ویرا نے اپنی گردن ان کے شانے سے ہٹا لی۔

☼ ☼ ☼

رات کو اس نے اپنے لیے کافی بنائی اور کمرے میں جا کر اسے یاد آیا کہ مگ وہ کچن میں ہی بھول آیا ہے۔ پھر کچن سے مگ لا کر سامنے رکھ کر وہ اسے پینا بھول گیا۔ پھر وہ بلاوجہ ادھر ادھر ہال میٹس کے کمروں میں چکر لگاتا رہا۔ کچھ اسے بیٹھنے کے لیے کہتے تو وہ کمرے سے ہی باہر چلا جاتا۔

دوبار اس نے اپنا بستر ٹھیک کیا' تکیے سیٹ کیے اور لیٹ کر کتاب پڑھنے لگا پھر اس نے اس فلور میں جانے کا فیصلہ کیا جہاں ہفتہ وار خود ساختہ تھیٹر لگا تھا' اتوار کی رات تھی اور کارل اور شاہ ویز مل کر پروفیسرز اور فریشرز کی نقل اتار رہے تھے۔ وہ کوریڈور کے آخری سرے پر اپنے ڈرامے کر رہے تھے اور باقی لمبے کوریڈور میں ہال میٹس کرسیوں پر بیٹھے تھے اور گلے پھاڑ پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔ درمیان درمیان میں شاہ ویز زنانہ کپڑے بھی پہن لیتا اور کسی لڑکی فریشر کا کردار نبھاتا' کارل نے اسے بھی گھسیٹا۔

"کہاں تھے تم۔ کب سے بلا رہے تھے تمہیں۔"

"پڑھ رہا تھا۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"چلو پروفیسر oops set کو بہت دنوں سے ہم یاد کر رہے ہیں۔"

اپنے ذہن کو بہلانے کے لیے وہ پروفیسر اوپس سیٹ بن کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھوں پر چشمہ لگا لیا۔ بالوں کو پانی لگا کر سر پر جما لیا اور ذرا سا کپ نکال کر سر کو کھجانے لگا۔

دس اسٹوڈنٹس سامنے بیٹھ گئے۔

موبائل "Oops-oops-pick up the Call" کی مضحکہ خیز ٹون کے ساتھ بجا۔ پروفیسر اچھی طرح جانتے تھے کہ یونی میں انہیں کیا کہا جاتا ہے۔ ٹون کی آواز پر گردن کو جھٹک کر انہوں نے ایسے تاثرات دیے جیسے کسی نے پیچھے دبے پاؤں آکر ان کی کنپٹی سے گن لگا دی ہو "فریز پروفیسر" اور پروفیسر فریز۔ حرکت کا سوال ہی نہیں۔

"کس کا فون ہے یہ۔" ہلے بغیر کہا گیا۔

ایک لڑکی (شاہ ویز) نے ہاتھ اٹھا کر ذرا دور بیٹھے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا پروفیسر" اس تیسرے لڑکے نے چوتھے کی طرف اور یوں دس لوگوں کے بیس بازوؤں کا جال بن گیا ہے۔ جس میں پروفیسر الجھ گئے۔ فون ابھی بھی بج رہا ہے۔

ہر ایک ہاتھ کے بلند ہونے پر پروفیسر تاثرات کا مظاہرہ کرتے وہ سب کے پیٹ میں بل ڈال دیتا اور آخر میں ایک لڑکی "کاکروچ" جیسی بلا کو میز پر دیکھ کر ایسے چلاتی ہے کہ پروفیسر کلاس سے باہر پائے جاتے ہیں۔

کوریڈور میں بیٹھے وہ سب اپنی اپنی کرسیوں سے نیچے لڑھک چکے تھے۔

پروفیسر صاحب کے ساتھ وہ اس طرح کے (Oops) کئی بار کر چکے تھے۔

"آج تمہاری پرفارمنس ہی لاجواب تھی یا خود بھی اپ سیٹ ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"تم مجھے اپنے ٹھیک ہونے کے بارے میں مت بتایا کرو۔ ویسے میرا خیال تھا ویرا مجھے پسند کرتی ہے۔" کارل نے کوریڈور کی دیوار کے ساتھ کمر ٹکائی اور ہاتھ باندھ لیے۔ کارل بہت سی لڑکیوں کے بارے میں یہ دعوا کرتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں اسے پسند کرتی ہیں اور کچھ وقت بعد جب وہی لڑکی کسی بھلے انسان کے ساتھ دکھائی دیتی تو کارل کہتا کہ اس نے مجھے پروپوز کیا تھا لیکن مجھے اس کی نیلی آنکھیں پسند نہیں تھیں تو انکار کر دیا۔ بلکہ اکثر ہال میٹس یا کلاس فیلوز اسے بتاتے کہ کارل وہ جو سبز آنکھوں والی معصوم سی لڑکی ہے' جس کا تم پر کرش تھا نا' وہ آج فلاں ریسٹورنٹ میں ایک

ہینڈسم لڑکے کے ہاتھ سے اپنی انگلی میں انگوٹھی پہنتے پائی گئی ہے۔ افسوس اسے یہ کام بجھے دل کے ساتھ کرنا پڑا جبکہ وہ تو تمہیں پسند کرتی تھی۔"

"تو تم ویرا کو پسند کرتے ہو؟" عالیان اس کی تاریخ جانتا تھا' اسے چڑا رہا تھا۔

"میرا دماغ تھوڑا بہت کام کرتا ہے بڈی۔" وہ فی الحال چڑنے والا نہیں تھا۔

"ویرا کا بھی تھوڑا بہت کام کرتا ہے نا بڈی۔!"

"تمہاری ناک توڑ دوں گا میں۔" اس نے گھونسا تان کر کہا۔

"پھر بھی لڑکیاں تمہیں پروپوز نہیں کریں گی۔" اپنے ہاتھ کے گھونسے سے عالیان نے اس کے گھونسے کو روکا۔

"کیونکہ ان کی نظر کمزور ہے' انہیں لگتا ہے کہ تم کوئی شہزادے وہزادے ہو۔"

"شاید۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی عقل کمزور نہیں ہے' انہیں یقین ہے کہ تم کوئی شیطان ویطان ہو۔"

"زیادہ اچھلو مت' تم میں صرف ایک خوبی ہے کہ تم سگریٹ نہیں پیتے اور لڑکیوں کو سگریٹ سے نفرت ہوتی ہے۔"

"اور تم میں صرف ایک خرابی ہے کہ تم سگریٹ کے ساتھ ساتھ خون بھی پیتے ہو۔"

"تم بچ گئے ہو۔ ابھی تمہارا خون پینا ہے۔" اس نے اس کی گردن کو دبوچا۔

"فرشتے کا خون تمہیں بد ہضمی کردے گا۔ ہضم نہیں ہوگا تمہیں۔" عالیان نے اپنی گردن اس سے دور کی۔

"فرشتے تو فرشتوں کا خون پیتے نہیں تو یہ کام مجھے ہی کرنا ہے اور میں اسے ہضم بھی کروالوں گا۔ اور سنو دی اینجل! اگلے ہفتے دوالووں کے ساتھ ریس ہے' انعامی رقم پچیس پونڈ میں نے طے کروالی ہے۔" اس نے آنکھ ماری۔

ساری یونی جانتی تھی کہ وہ کیسے اسٹوڈنٹس کو بھڑکاتا تھا پھر انہیں مقابلہ کرنا ہی ہوتا تھا۔ یعنی ہر صورت مقابلہ' ورنہ ان کی غیرت کی موت۔

"ہاں ایک اور بار میں تمہارا اور ویرا کا بریک اپ بھی کرواسکتا ہوں' تمہیں یاد ہے نا تم نے میرے کتنے بریک اپس کروائے تھے۔"

کارل کہہ کر دوبارہ سے تھیٹر کی طرف لپکا' عالیان کے تاثرات ایک دم سے بدلے۔ کارل نے مذاق کیا تھا لیکن اسے وہ ہتک یاد آگئی تھی جو ہارٹ واک میں اس کی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آگیا۔

"امرحہ۔ وہ کون ہے۔ میں اسے نہیں جانتا۔"

پھر سے پرانی تکرار۔ جب انسان کا دل ٹوٹ جاتا ہے تو ان ٹکڑوں میں جابجا خوف' وہم' بے اعتباری قابض ہوجاتی ہے۔ درزوں اور درازوں میں۔ پھر یہ درزیں پہاڑ بننے لگتی ہیں اور پھر ان پہاڑوں کو سر کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔

اب اسی وقت وہ خود کو ان پہاڑوں میں گھرا پا رہا تھا' اور ان پر "ویرا" نام کی صدا لگا رہا تھا جو پلٹ کر "امرحہ" کی صورت آرہی تھی۔

ایک دروازہ اس نے اپنے اندر کھلتے پایا کہ وہ ویرا میں کتنے بھی پلس پوائنٹس نکال لے' ایک پوائنٹ فی الحال شاید کبھی ان میں شامل نہیں ہوسکے گا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

اس نے خود کو وقت دیا۔ جلد بازی ہتک نہیں ہوگی۔ اور آخری بار جب وہ اس کے پاس آئی تھی تو اس کے لیے کچھ لائی تھی۔ پیغامات۔ ان میں کیا لکھا تھا اس نے یہ جاننا نہیں چاہا تھا لیکن اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کاش چپکے سے اس کے کمرے سے چرا کر وہ انہیں پڑھ لے۔ یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں اس کے کمرے تک وہ بہت آسانی سے جاسکتا ہے۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی میں ویرا کے پروپوزل کی خبر اسٹوڈنٹس اور گروپس میں سنی اور سنائی گئی۔ عالیان کے پروپوزل کو دبے دبے انداز میں زیر بحث لایا گیا تھا۔ کیونکہ اس کے پروپوزل کی خبر ہارٹ راک سے نکلی تھی اور اس انداز میں نکلی تھی کہ اسٹوڈنٹس نے اسے کمال رحم دلی سے نظر انداز کردیا تھا' کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو عالیان کے لیے تکلیف کا باعث بنتے۔ ان سب کی ہمدردیاں عالیان کے ساتھ تھیں اور بہت سے اسٹوڈنٹس کے نزدیک امرحہ خود غرض تھی۔ بہت سوں کا خیال تھا کہ ایسے تعلقات میں اتار چڑھاؤ آتے ہی رہتے ہیں اور کچھ کا ماننا تھا کہ بات شروع ہوئی اور ختم ہوگئی۔ بس۔

"اور اب یہ ویرا کہاں سے آگئی؟" بون فائر پارٹی میں آگ کے گرد بیٹھے ان سب کے گروپ میں پلیٹ اور مگ ہاتھ میں پکڑے بیٹھتے شرلی نے کہا۔

"جب دو میں فاصلہ اتنا زیادہ ہوگا تو تیسرا تو آئے گا ہی۔" للی نے چچ چچ کے انداز سے کہا اور شرلی کی پلیٹ سے چکن پیس اٹھا کر اپنی میں رکھ لیا۔

"تم نے دیکھا تھا ویرا کو پروپوز کرتے؟" شرلی نے بیٹی لو سے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے اسٹوڈنٹس کی تالیوں نے متوجہ کیا وہاں زیادہ بزنس ڈیپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس ہی موجود تھے۔" بیٹی لو کافی پی رہی تھی۔

"عالیان نے کیا کہا؟" عذرا نے پوچھا۔

"اس کا جواب مبہم تھا۔ جارجیہ بتا رہی تھی کہ اس نے کہا جواب کے لیے اسے کچھ وقت چاہیے۔"

"اور کیا جواب ہوگا اس کا؟" ہانا نے سہم کر کہا۔

"ظاہر ہے ہاں۔ اگر ہاں نہ ہوتا تو ویرا کے پروپوز کرنے کی نوبت ہی کیوں آتی۔" عذرا نے سنگ دلی سے کہا۔

"تو ثابت ہوا کہ امرحہ کو عالیان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" شرلی نے ہونٹ سکوڑ کر رائے دی۔

"میں نے پہلے ہی کہا تھا وہ ایک کرسچن عورت کے بیٹے سے کوئی تعلق نہیں بنائے گی۔" عذرا نے شانے اچکا کر اپنی رائے کی تصدیق چاہی اور سب کی طرف دیکھا۔

"جب وہ نئی نئی یہاں آئی تھی تو تم نے کہا تھا یہ بہت بگڑ جائے گی۔" شرلی نے عذرا کو اس کی ایک اور رائے یاد دلائی۔

"بگڑنے سے میرا مطلب تھا کہ وہ غیر مناسب کپڑے پہننے لگے گی' بارز میں جائے گی' پارٹیز اٹینڈ کرے گی' اس کے دوستوں کے حلقے میں بہت سے لوگ ہوں گے۔ ٹھیک ہے میری رائے غلط ثابت ہوئی' اس نے ویسٹرن کپڑے پہنے' لیکن غیر مناسب نہیں' وہ ریسٹورنٹ اور کیفے میں دیکھی گئی لیکن نائٹ کلب میں نہیں۔"

"تو۔؟" ہانا نے پوچھا۔

"تو اس سے ثابت ہوا کہ وہ اپنی روایات کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہاں اسے کوئی نہیں دیکھ رہا' لیکن پھر بھی اس نے وہ نہیں کیا جو اکثر اسٹوڈنٹس کرتے ہیں۔ آزادی کا بے جا استعمال۔"

"اسے یہ یاد تھا کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔" شرلی نے بہت وثوق سے کہا۔

"وہ بزدل ہے۔ اگر عالیان مجھے پروپوز کرتا تو میں ساری دنیا سے لڑ کر اسے ہاں کہہ دیتی۔ بھاڑ میں جائے دنیا۔ اصول۔ قانون۔" للی نے سنجیدگی سے کہا۔

"اسی لیے اس نے تمہیں پروپوز نہیں کیا۔" عذرا نے للی کو چڑایا۔

"عالیان کو پوری یونی میں ایک وہی ملی تھی؟" شرلی نے کہتے مگ ہانا کے آگے کیا کہ خیر سے ایک مگ اور کافی لادے۔

"ویرا کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ہانا مگ لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔

"ویرا کی شخصیت کا ریکارڈ اتنا صاف ہے کہ اسے انکار کرنا بے وقوفی ہوگی۔" عذرا نے کہا۔

"مجھے کہانی کے کلائمکس کا انتظار ہے۔" ہانا واپس آکر بیٹھ گئی۔

"مجھ سے سن لو۔ عالیان ویرا کو ہاں کہے گا۔ امرحہ کو عالیان کی پروا ہوتی تو وہ ایسے اس کی بے عزتی نہ کرتی۔ کس انداز میں وہ عالیان کے بارے میں بات کر رہی تھی۔ چھوٹے ذہن کی۔" عذرا نے نخوت سے کہا۔

میرا ایک حصہ میری مٹھی میں ہے اور ایک اس کے وجود میں... میں خود کو کہاں کھڑا کروں اور کہاں سے چلنا کروں میں فیصلہ نہیں کرپا رہی... ولسن! میں نے اسے کھیل نہیں سمجھا تھا' لیکن کھیل کی طرح ہی کھیل گئی... اسی لیے تو محبت میں ہار جیت ہوتی ہے۔ اگر ہم اس سے نہ کھیلیں تو ایسا تو نہ ہوتا... صرف جیت ہی ہو... بس جیت..."

ولسن میز کے کنارے سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ امرحہ اردو میں بول رہی تھی' اسے الفاظ سمجھنے میں دقت تھی۔ محسوسات سمجھنے میں ہرگز نہیں۔

"میں نے ہر خوب صورت شے کی طرف سر اٹھا کر دیکھا ہے... آنکھیں گاڑ کر... دل جما کر... پھر بھی میں یہ یقین حاصل نہیں کرپائی کہ میں ان کے سہارے جی لوں گی وہ میرے لیے کچھ تو سہارا بن جائیں گی... دیکھو یہ سڑک پر چلتے لوگ' ہنستے مسکراتے لوگ مجھے کتنے ہیبت ناک لگ رہے ہیں اور یہ آسمان سے برستی پھوار مجھے اس پر ترس بھی آرہا ہے مجھے یہ کیسی حقیر بھی لگ رہی ہے... یہ میرے آنسوؤں سے مقابلہ کر رہی ہے... اور میں نے ساری بڑی نعمتوں کو گن کر دیکھ لیا ہے۔ ان کے انبار بھی مجھے دیے گئے تو میرے لیے رائی برابر خوشی کا سامان نہ ہو سکے گا... میں کبھی حساب میں اچھی نہیں رہی اور دیکھو' آج ہر غم کے جواب میں وہ نکلتا ہے اور ہر خوشی کے سوال میں بھی... میرا حساب اچھا ہو گیا ہے۔"

میز پر رکھے ٹشو باکس کو ولسن نے اس کے آگے کرنا قابل تحقیر جانا... وہ بچوں کی طرح اپنے کسی پیارے کھلونے کے ٹوٹ جانے پر رو رہی تھی... اسے لاڈ سے چپ کروایا جا سکتا تھا یا تسلی سے' صرف اس کی آنکھیں خشک کر دینا کافی نہیں ہو گا۔

"میں سوچتی ہوں اگر اپنی ہتھیلیوں پر آنسو بہاتی رہوں تو شاید میری قسمت بدل جائے۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ اسے سننے کے لیے کان اس کے منہ کے پاس لے جانے پڑتے تو ثابت ہوا کہ وہ خود اپنے آپ سے بات کر رہی تھی۔

"میں اسے کبھی یہ بتا نہیں سکی کہ وہ مجھے کتنا اچھا لگتا ہے... اب اسے کون بتائے گا کہ امرحہ نے اسے کتنا پسند کیا' اتنا کہ میں نے اس کے پلٹ جانے پر اس کی پشت کو اوجھل ہو جانے تک دیکھا اور اس کے سامنے آنے پر میں نے اپنی نظر سے اس کی نظر اتاری... اگر وہ مجھے نہ ملا ہوتا تو مجھے یہ کبھی معلوم نہ ہوتا کہ خدا کی رحمت کیسے انسانی صورت مجسم ہوتی ہے اور اگر کرم اور مہربانی کی کوئی پہلی صورت ہے تو وہ اس جیسے انسان کی زندگی میں شامل ہونا ہے... اندھیروں پر قابض ہو جانے والا وہ روشن ستارہ جو طلوع ہوا کرتا ہے غروب نہیں۔

رات کو آنکھیں بند کرنے سے پہلے مجھے یہ منظر دیکھنا یاد رہتا ہے کہ کیسے وہ سر کو اٹھا کر قہقہے لگاتا ہے... مجھے دلی سکون ملتا ہے اس منظر کو دہرا کر جب وہ میرا ماسک اٹھانے جھکا تھا۔ جو مسکراہٹ اس وقت اس نے اپنے ہونٹوں پر سجا رکھی تھی' وہ ان جذبوں کو عطا کی جاتی ہیں جو اب ناپید ہوتے جارہے ہیں۔ اس مسکراہٹ سے میں اس کی مداح ہو گئی اور طلب گار بھی۔ میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکی کہ وہ خاموش رہتا ہے تو گنگناتا ہوا لگتا ہے اور اگر وہ گنگنا لے تو ساری خاموشیوں کو جگاتا لگتا ہے۔ میں نے تو اسے کچھ بھی نہیں بتایا اور نہ اس نے مجھے سنا... اس نے اپنے کان ویرا کے منہ کے آگے کر دیے' کتنی جلدی میں تھا وہ بدہیئت ہوتی ہے ایسی عجلت کہ مٹھی میں قید کر لینے والے مٹھی کھول دینے پر مائل ہوں۔"

اپنے وجود کو ساکت رکھے' دونوں ہاتھ گود میں رکھے اسے دیکھتے ولسن کی نظروں میں ترحم بڑھتا جارہا تھا۔

"تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ ایک دن خود تمہارے پاس آئے گا۔"

"مجھے بھی یہی خوش گمانی تھی۔"

"خوش گمان ہونا اچھا ہے' بجائے بدگمان ہونے کے... اپنے دل کو اور ہلکا کر لو... لیکن کہیں مت جاؤ۔"

جس حالت میں وہ بیٹھی تھی اسی حالت میں اٹھ کر باہر آگئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ محبت نے شدت اختیار کر لی تھی... ڈریگن پریڈ تک وہ کچھ اور تھی۔ اب کچھ اور تھی... چشمہ دریا بن چکا تھا اور دریا ایسے پانیوں میں گرتا تھا جس کی وسعت کی کوئی حد نہیں تھی۔

جو کچھ ان کے درمیان ہو چکا تھا وہ اب سے پہلے عام اور معمولی لگتا تھا۔ کہانی کا ایک المیہ حصہ... جو ہر قصے کہانی سے جڑا ہوتا ہے اور پھر سے سب خوش... اور اب جب واقعی عالیان کسی اور کے سپرد ہوا تھا تو سب خوش فہمیاں' غلط فہمیاں دور ہو گئی تھیں۔ سب اتنا آسان نہیں تھا۔ حقیقت' سوچوں اور اندازوں سے کہیں آگے کی چیز ہوتی ہے۔

اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپر کو دیکھا۔ "کیا وہ اتنے سے عالیان پر راضی ہو جائے گی۔"

"نہیں... ہاں نہیں..."

خود سے کئی ہزار بار یہ سوال پوچھ چکے اور اس کا جواب جان چکے اور اپنا سب کچھ ہار چکے عالیان کو جیتنے کے لیے اس نے ایک آخری جوا بھی کھیل لینا چاہا۔

اس کے خاندان کو حسب نسب چاہیے تھا اور اسے وہ...

خاندان کے نام پر اس کے پاس کچھ تو ہو گا... کوئی تو... اور نہ جانے وہ کوئی کتنا معتبر ہو کہ اعتراض کا سوال ہی نہ اٹھے۔

وہ ویرا کو ہاں کہہ چکا ہے تو نہ بھی کہہ دے گا... امرحہ کی ہاں کے بعد کسی نہ کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اس نے کوٹ کی جیب سے فون نکالا اور کافی دیر تک اسے دیکھا۔ وہ پہلے بھی ایک بار اس نمبر پر فون کر چکی تھی۔ اسے کچھ نہیں بتایا گیا تھا' بلکہ الٹا انہیں یہ شک ہو گیا تھا کہ وہ صرف پیسوں کے لیے یہ ظاہر کر رہی ہے کہ وہ ان کی مدد بھی کر سکتی ہے۔

برننگ مین اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور اسے یہ بتانے لگا کہ اب اسے ساری زندگی اسی کی طرح جلنا ہو گا... اور برننگ مین یہ نہیں جانتا تھا کہ آگ سے جل جانا جدائی کی آگ سے بہت کم تکلیف دہ ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

نیو یارک سٹی کا مقامی ریسٹورنٹ ہے جس کی چھت کی زیبائش آنے والوں کو سر اٹھا کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی اور جس کے سائے تلے بیٹھ کر کھانے میں وہ راحت محسوس کرتے ہیں۔ ہال میں پھیلی میزوں پر بیٹھے لوگ کھانے کو محبت اور نرمی سے برت رہے ہیں اور اپنے سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں دیکھنے کو پسند کر رہے ہیں۔ افراتفری کو وہ باہر چھوڑ آئے ہیں اور فرش سے چھت تک تنی شیشے کی دیواروں سے دکھائی دیتی نیو یارک شہر کی روشنیوں کو اپنے ساتھ ساتھ' لیکن پس منظر میں رکھتے ہیں۔

وہ بلندی پر ہیں اور یہی تو انہیں پسند ہے۔

سامنے ہال کی اس دیوار کے سامنے' جس پر مقامی مصور نے اپنا شاہکار ثبت کیا ہے کی دو فٹ اونچی ڈائس پر مائیک کے سامنے سفید فراک میں ملبوس وہ کھڑی ہے ویرا...

"میری شام بنام عالیان..." اس نے یہ فقرہ مسکرا کر کہا' لیکن وہ آواز کو زیادہ بلند نہیں کر سکی اور اس نے اپنی نظریں میزوں پر سجی بلوری شمعوں پر بھٹک بھٹک جانے دیں۔

"پہلی بار میں تب چونکی تھی جب اسائنمنٹ بناتے میں تھک کر رک گئی' اور ہاتھ میں پکڑے پین سے میں نے عالیان لکھا اور پھر میں نے صفحے کو اس نام سے بھر دیا اور میں ذرا نہیں تھکی۔ اپنے علاوہ کسی اور کا نام لکھنا' یہ کام کرنا مجھے اچھا لگا۔ پھر جب وہ نوٹ پیڈ میرے لیے بے کار ہو گیا تو بس میں نے اس ایک صفحے کو نکال کر سنبھال لیا۔"

ریسٹورنٹ اپنے قیام کی سالانہ تقریبات کا ایک سلسلہ شام بنام منا رہا تھا اور وہاں موجود لوگوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس شخص کے نام کا اعلان کریں جو دنیا میں ان کے لیے سب سے زیادہ خاص ہونے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

"اگر امرحہ ایسے اس کی بے عزتی کر چکی ہے اور اسے عالیان سے کوئی مطلب نہیں تو وہ عالیان کے پاس بار بار جاتی کیوں رہی ہے؟"

"اس کا ضمیر ملامت کرتا ہوگا۔ شادی تو وہ اپنے پاپا کی مرضی سے ہی کرے گی۔" شرلی نے ایسے کہا جیسے وہ امرحہ کو اچھی طرح سے جان گئی ہے۔

"تو پھر عالیان کو اتنا پاگل بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر وقت عالیان اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔" ہانا کے انداز میں ساری ہمدردیاں عالیان کے لیے تھیں۔

"ضرورت نہیں خود غرضی۔" عذرا نے سر کو جھٹک کر کہا۔

"وہ خود غرض نہیں لگتی۔" ہانا اب امرحہ کی ہمدرد ہو گئی تھی۔

"لگتی نہیں لیکن ہو گئی ہو گی۔ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی لڑکا ایسے آگے پیچھے ہو تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔"

"ویسے مجھے امرحہ نے کافی کمپلیکس دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی بونگی لڑکی میں اسے ایسا کیا اچھا لگا ہے۔" تھوڑی دیر خاموش رہ کر جیسے عذرا نے اقرار کیا۔ اب اس کے بال کافی بڑے ہو چکے تھے اور اس پر بہت جچ رہے تھے۔

چاروں نے قدرے حیرت سے عذرا کو دیکھا کہ کیا وہ مذاق کر رہی ہے، لیکن مذاق کے آثار نظر نہیں آئے۔

"شاید اس کا بونگا پن۔" شرلی ہنسنے لگی اور آگ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔

"وہ کہتا تو میں بھی بھولی بن جاتی۔" اف عذرا کا سنجیدہ انداز۔

"تم کہنے سے بنتیں وہ بنی بنائی تھی۔" للی نے کہہ کر قہقہہ لگایا۔

"میں سمجھتی تھی، عالیان مجھے پسند کرتا ہے۔" عذرا آج رات رو کر سونا چاہتی تھی۔

"تم یہ کیسے سمجھیں۔؟" ہانا کو اس کی سنجیدگی پر حیرت ہو رہی تھی۔

"وہ مجھے نوٹس دے کر لینا بھول جاتا تھا۔"

"بس اتنی سی بات پر تم سمجھیں کہ وہ تمہیں۔" ہانا نے بمشکل اپنی ہنسی دبائی جبکہ عذرا نے اسے گھور کر دیکھا۔

یہی موضوع دو اور لوگوں میں زیر بحث تھا۔ وائم اور نوال میں۔

"اب مجھے امرحہ پر ترس آتا ہے۔" نوال نے سوپ پیتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ عالیان کو پسند کرتی ہے۔ نجانے کیوں لیکن مجھے ہمیشہ سے ہی لگا کہ وہ مختلف خیالات کی لڑکی ہے۔" دونوں ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔

"تمہارا مطلب عجیب خیالات کی؟" نوال امرحہ کے ساتھ تھی۔

"شاید۔"

"عالیان کو پسند کرنے میں ایسی کون سی سائنس چلانی تھی اسے۔"

"یار، سیدھی سی بات ہے۔ جب تمہارے گھر میرا پروپوزل گیا تھا تو تمہارے نانا نے کیا کہا تھا۔؟"

"کہا تو کچھ نہیں تھا انہیں تمہارے خاندان کے بارے میں کچھ معلومات چاہیے تھیں۔"

"میرا شجرہ نسب۔ میری ذات۔ میری ماما کی طرف کے خاندان کے بارے میں معلومات، میرے پاپا کی طرف کے خاندان کے بارے میں بھی۔" وائم نے جتایا۔

"کم آن یار، انہوں نے یہ سب ایسے ہی پوچھا تھا، اور ویسے بھی وہ ذرا پرانے خیالات کے انسان ہیں اور پھر بڑے ہیں اگر کچھ پوچھ بھی لیا تو یہ کوئی ایسا بڑا ایشو نہیں ہے... بس یہی خیالات امرحہ کے ہوں گے۔"

"وہ اتنی دقیانوسی نہیں ہو سکتی، ماسٹرز کر رہی ہے، روشن خیال ہے..."

"چلو پھر یہ مان لیتے ہیں کہ وہ روشن خیال ہے لیکن اس کے گھر والے نہیں۔"

"تمہارا مطلب اس نے اپنے گھر بات کی ہو گی؟"

"نہیں... بات کرنے سے پہلے ہی اسے معلوم ہو گا کہ ان کا رد عمل کیا ہو گا۔"

"آج کے دور میں یہ سب نہیں ہوتا وائم!"

"دنیا میں کہیں وہی پرانا دور ہے نوال... اور وہاں سب ہوتا ہے۔ تم برٹش پاکستانی ہو اور امرحہ خالص پاکستانی..."

"میں امرحہ کو پسند کرتی ہوں، میری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔"

"مجھے بھی وہ اچھی لگتی ہے۔ وہ بہت معصوم ہے۔"

"اس معصوم کو ہی تم نے پہلے دن رلا دیا تھا۔"

"وہ سب اس کے فائدے کے لیے تھا۔"

اپنے سب فائدے گنوا چکی امرحہ کلاس میں گم صم بیٹھی تھی کہ شزا سامنے ڈیسک پر آ کر بیٹھ گئی۔

"ویرا نے عالیان کو پروپوز کیا ہے۔" اس کے ہونٹوں کے کنارے استہزائیہ ہوئے اور آنکھوں سے تمسخر چھلکنے لگا۔

"مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" اس کے انداز پر امرحہ کو آگ ہی لگ گئی۔

"ویل میرا خیال تھا تم عالیان سے تعلقات بحال کرنے کی کوششیں کر رہی ہو۔"

امرحہ نے سختی سے اپنے لب بھینچ لیے، اب کیا وہ گلا پھاڑ کر اعلان کرے کہ جو اصل حکایت ہے وہ سب اسے کبھی نہیں جان سکتے... کوئی کچھ نہیں جانتا، نہ سمجھتا...

"آئی لائیک ویرا... وہ بہت خوب صورت ہے... عالیان کے ساتھ سوٹ کرے گی... اور آخر کار عالیان کو سمجھ آ ہی گئی کہ اسے اپنے اسٹینڈرڈ سے نیچے نہیں گرنا چاہیے تھا۔"

"کیا ہے عالیان کا اسٹینڈرڈ؟" اس کی آواز تیز ہو گئی جسے شزا نے انجوائے کیا۔

"کم سے کم تم نہیں..." وہ اور مسکرانے لگی۔

"کیوں میں کیوں نہیں...؟" وہ چلا اٹھی۔

کلاس کے سب اسٹوڈنٹس اس کی طرف دیکھنے لگے۔

شزا کے ہونٹوں کے کنارے لہرائے "تو اب تم جیلس ہو، اچھا کیونکہ تمہارے پیچھے بھاگتے بھاگتے اب وہ کسی اور کے پیچھے بھاگنے لگا ہے۔"

"شٹ اپ!" وہ پہلے سے زیادہ شدت سے چلائی اور کلاس سے باہر آ گئی، اس کی سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔

"تم کہاں تھیں امرحہ؟" اپنی طرف سے وہ بہت چھپ کر یونی کے ایک گم نام کونے میں بیٹھی تھی، لیکن سائی نے اسے ڈھونڈ ہی لیا۔

"مر گئی تھی میں سائی!" اس نے طنزیہ کہا۔

"کسی بھی معاملے میں میرا کیا قصور ہے امرحہ! تم مجھ سے اس انداز میں بات کیوں کر رہی ہو۔"

"تم مجھے بتا نہیں سکتے تھے ویرا کے بارے میں؟"

"نہیں... میں اپنے عہد نہیں توڑتا... اور اگر تمہیں معلوم ہو جاتا تو تم کیا کرتیں؟" اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

"بولو کیا کرتیں... کیا کہتیں ویرا سے... اسی ویرا سے جس نے خود تمہیں سمجھایا تھا کہ عالیان کی قدر کرو اور تم اسے چپ کرواتی رہیں... ویرا تمہاری جگہ نہیں آئی امرحہ، تم نے اپنی جگہ خود خالی کی... تم سے میں نے کہا تھا کہ اگر محبت کرتی ہو تو جرات کرو... ایک محبت کرنے والے کو اتنا تو کرنا ہی چاہیے، ورنہ صبر کرنا یا خاموش رہنا اور کسی کو الزام مت دینا... تم مجھ سے نفرت کر رہی ہو، تمہیں ویرا بری لگ رہی ہے... اور تمہارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں نے دادا سے بات کی تھی سائی!" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"پھر خود کو مت تھکاؤ۔" سائی نے ہمدردی سے کہا۔

"وہ مجھ سے ناراض ہو گئے۔ اب تک بات نہیں کی... دو پیاروں میں سے کس ایک پیارے کے لیے میں اپنا آپ قربان کر دوں تم ہی بتا دو..." اس نے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔

"ویرا اور عالیان....." سائی نے نرمی سے اسے کچھ سمجھانا چاہا۔

"ان دونوں کا نام ساتھ ساتھ نہ لو سائی..... خدا کے لیے....."

"تو تم حقیقت کا مقابلہ ایسے کرنا چاہتی ہو..... خود کو بدلو امرحہ....."

"کتنا تو بدل لیا ہے..... تم جانتے ہی نہیں اس رات سے اب تک میں کتنا بدل چکی ہوں۔"

سائی کو اس میں کسی انوکھے پن کا احساس ہوا..... اس کے چہرے کی تاثرات میں کچھ اور بھی نمایاں ہونے لگا۔

"میں نے عالیان کے باپ کو فون کیا ہے' وہ اسے ڈھونڈ رہے تھے' ان کا بھیجا ایک آدمی مجھ تک بھی آیا تھا اور اب میں نے انہیں عالیان کے بارے میں بتا دیا' لیڈی مہر کو کوئی حق نہیں کہ وہ اسے اس کے خاندان سے دور رکھیں..... عالیان کو اس کا خاندان مل جائے گا۔ دادا عالیان سے ضرور ملنا چاہیں گے۔"

سائی نے سہم کر امرحہ کو دیکھا تو اس کے چہرے پر نمایاں ہونے والا تاثر خود غرضی کا تھا۔ اس کے اپنے ہی اندر کچھ چھن سے ٹوٹ گیا۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹا۔ اگر وہ خود کو عہد توڑنے کی اجازت دیتا تو امرحہ کو بتاتا کہ عالیان اپنے باپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا'..... وہ اس کی ماں کو مرنے کے لیے چھوڑ گیا تھا اور اسے بھی.....

"یہ تم نے کیا کیا امرحہ؟" وہ بے آواز بڑبڑایا۔ عالیان کو اپنے باپ سے ملنا ہوتا تو وہ خود اسے ڈھونڈ لیتا..... تم نے اپنے اور اس کے تعلق کو تابوت میں دفنا کر اس میں وہ آخری کیل ٹھونک دی' جو اب قوت سے نکلے گی نہ تدبر سے..... اب وہ قسمت کی رحم دلی کا محتاج ہوگا اور قسمت کو رحم دلی پر اکسانے کے لیے بہت آنسو بہانے پڑتے ہیں....." وہ خاموش کھڑا سوچ رہا تھا۔

"تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو سائی.....؟"

"میں چاہتا ہوں تم اپنے لیے دعا کرو..... بہت ساری دعائیں کرو۔" کہہ کر سائی پلٹ آیا۔ اس کا دل برا ہو گیا تھا اور اسے امرحہ پر غصہ سا آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کے آخری پہر وہ چونک کر اٹھا۔

اس کے سینے پر مارگریٹ کی ڈائری تھی اور اس کی آنکھ میں نمی تھی۔

وہ چھت کو دیکھنے لگا پھر آس پاس' اسے یہ یاد کرنا پڑا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے۔

ان کیفیات کا شکار وہ بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ جب بستر پر روتے روتے سو جایا کرتا تھا اور پھر سوئی جاگی حالت میں اسے لگا کرتا تھا کہ کوئی اس کے سرہانے بیٹھے سرگوشیاں کرتا رہا ہے' ایسی سرگوشیاں جو اسے بوجھل نہیں کرتی تھیں اور آنکھ کھلنے پر اسے رو دینے پر مجبور کر دیتی تھیں۔ وہ اس خوشبو کو بہت قریب محسوس کرتا' جو مارگریٹ کے ساتھ لگ کر سونے سے اس کے اپنے اندر حلول کر گئی تھی اور جسے اس نے اپنے اندر سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا تھا۔

وہ سرگوشیوں کی رات تھی..... وہ مارگریٹ کی خوشبو کو بہت وضاحت سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور اسے لگا وہ بس ہاتھ بڑھا کر اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالے گا۔

اس نے کمرے میں اندھیرا ہی رہنے دیا اور خود وہ بچہ بن گیا جو اپنی ماں کے ساتھ سویا کرتا تھا اور اس نے بہت دھیمی آواز میں مارگریٹ کو پکارا۔

"ماما!"

اور پھر وہ اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ ڈائری کو ہاتھ سے چھوا اور لیٹ کر پھر سے اسے اپنے سینے پر رکھ لیا۔

صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے وہ سب یاد کرنا چاہا جو رات بھر اس کے ساتھ ہوتا رہا تھا۔ کافی دیر تک بستر میں پڑا وہ ذہن پر زور ڈالتا رہا..... کہیں سرگوشیاں تھیں' کہیں امرحہ اور ویرا اور کہیں وہ خود.....

بھاگ پڑنے..... ہانپ جانے اور رو دینے کی کیفیات غالب رہیں۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ زیادہ ہی

الجھا ہوا ہے اسے خود کو معمول پر لانے کی کوشش کرنی چاہیے..... اسے خود کو وقت دینا چاہیے اور خود کو تھکا دینے کے بجائے پُرسکون رہنے کے طریقوں پر غور کرنا چاہیے۔

اپنا بستر اور کمرہ صاف کرنے میں اسے معمول سے زیادہ وقت لگا پھر اس نے خود کو ذرا زیادہ اچھی طرح سے تیار ہونے دیا' تاکہ وہ ہشاش بشاش نظر آئے' اس نے سائی کی گفٹ کی چیک شرٹ پہنی اور کارل کا گفٹ کیا کوٹ اور بالوں کو ہیئر جیل لگا کر سیٹ کیا۔

کارل اس کے کمرے میں آیا "یہ لو اپنا ناشتا۔"

لیپ ٹاپ کو بند کرتے اس نے کارل کی لائی ٹرے کو دیکھا تین عدد موٹے تازے سینڈوچز اور کافی کا مگ..... "مجھے نہیں کرنا ناشتا.....!" اس نے ہنسی دبا کر کہا۔

برننگ مین ایونٹ میں آگ کے مختلف کرتبوں میں عالیان نے کارل کو ہرایا تھا۔ اب کارل کو اسے لنچ کروانا تھا اور لنچ سے پہلے وہ اس کا پیٹ اچھی طرح سے بھر دینا چاہتا تھا جبکہ اپنی باری وہ تین تین وقت بھوکا رہا کرتا تھا۔

"آج تم فوج بھی لے آؤ تو آج میں ناشتا نہیں کروں گا۔" عالیان نے اسے اور جلانا چاہا۔

"فوج کا سربراہ آگیا ہے کافی ہے....." اس نے بڑھ کر دروازہ لاک کیا۔

"شرافت سے انہیں کھا لو ورنہ مجھے تمہارا منہ کھول کر انہیں اندر ڈالنا پڑے گا اور یہ کوٹ اتار دو اس پر کافی کے داغ لگ سکتے ہیں۔"

عالیان نے اپنا موبائل نکالا اور دو منٹ بعد لاک کھلنے کی آواز آئی۔ شاہ ویز اور سائی دروازے میں کھڑے تھے۔ عالیان نے پہلے سے ہی چابی شاہ ویز کو دے دی تھی اب اس نے موبائل پر بیل دی تھی' دونوں نے کارل کی لائی ٹرے پر ہلا بول دیا اور عالیان دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا۔

"میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا..... اپنی جیب بھر کر نکلنا آج..... لنچ میں' میں تمہیں بھی کھا جاؤں گا۔" کہہ کر وہ بھاگ گیا۔

"اچھا کیا تم نے یہ سینڈوچز کھا لیے فرسٹ فلور پر جو جوئیل ہے نا' اسے میں جا کر بتاتا ہوں کہ اس کی ناشتے کی ٹرے جو غائب ہوئی ہے وہ کہاں ہے۔" کارل دانت نکال کر فرسٹ فلور کی طرف بھاگا۔

یونیورسٹی سے عالیان ہارٹ راک آگیا' کارل نے لنچ ٹال دیا تھا' وہ جانتا تھا کارل ایک دو دن ایسے ہی ٹالے گا' پھر بھی وہ ایک بھاری بل کی ادائیگی سے نہیں بچ پائے گا۔

ہارٹ راک میں داخل ہوتے ہی اسے سامنے منیجر کھڑا نظر آیا جو غیر معمولی بات تھی' اس کے تاثرات کافی حیران کن تھے اور اس کی آنکھوں میں ایسا اچنبھا تھا جیسے وہ پہلی بار عالیان کو دیکھ رہا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" کارل نے شرارت سے اس کی ٹھوڑی کو چھوا۔

"ہاں.....!" اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

"آج کیفے خالی کیوں ہے کوئی ایشو؟"

"پرائیویٹ بکنگ" کہتے اس نے ترچھی نظروں سے تن کر کھڑے اور چاق و چوبند نظر آتے دو گارڈز نما آدمیوں کو دیکھا۔

"اوہ۔" اس نے سیٹی بجائی۔ "پورا کیفے؟"

"ہاں....."

"اور اسٹاف.....؟"

"تم اس طرف چلے جاؤ....." منیجر نے اندر ایک ہال کی طرف اشارہ کیا۔

"اسٹاف میٹنگ ہے؟"

منیجر نے اس کا سوال سنا لیکن جواب دیے بغیر وہ اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔ منیجر کے انداز پر اسے حیرت ہوئی' لیکن پھر بھی وہ اس کی ہدایات پر عمل کرتے' اسٹاف میٹنگ کا سوچتے اس ہال کی طرف آگیا جس کی طرف جانے کے لیے اسے کہا گیا تھا۔

ہال میں چوکور میزوں میں سے ایک کے گرد ایک شخص قیمتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس' عجلت کا انداز لیے اپنی گھڑی کو دیکھ رہا تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنی

ٹھوڑی کو مسل رہا تھا۔ اس کا سر اس انداز میں اور ایسی بے نیازی لیے ہوئے اٹھا ہوا تھا جیسے اس کی سلطنت کی رعایا سامنے زمین پر بیٹھی تھی اور وہ ان پر اپنے من چاہے احکامات نافذ کرنے جا رہا تھا۔ اس کا پہلا تاثر مطلق العنان کا تھا اور اگلا تاثر پہلے کی گواہی۔۔۔

سامنے میز پر پرچ میں کافی کپ اوندھا پڑا تھا۔ ہال کے دروازے کے رخ وہ ترچھا بیٹھا تھا۔ آہٹ پر احکام صادر کرنے والے اس شخص نے سر اٹھایا۔ اور عالیان پر اس کی طرف آنے والی روشنی روک لیتے وجود کی حقیقت کھل گئی۔

سیاہ تل نے ساریاں روشنیاں کسی سیاہی چوس کی طرح جذب کرلیں۔

چھناکے سے ہال کی چھت سے جھولتے گول قمقمے ٹوٹے۔۔۔

گزر چکے وقت نے سب ہی دبی دبی سسکیاں اور آہیں اپنی قبروں سے اگل دیں۔

کچے گوشت کے جلنے کی بو اس کے نتھنوں میں گھسی اور دنیا بھر کی مخلوق کی ماداؤں کا درد زہ اس کے وجود سے لپٹ گیا۔۔۔ ہال میں پھیل گیا۔۔۔ آہیں اٹھیں۔

یہ اس کے اندر کی شدید خواہش رہی تھی یا شدید نفرت کہ اس کی نظریں آنکھ کی کمان کے کنارے براجمان تل پر ٹھہر گئیں اور جیسے ایسا تل ساری دنیا میں کل انسانیت میں صرف ایک وہی انسان رکھتا تھا۔۔۔

اور یہ وہی انسان ہی تو تھا۔ کھڑے کھڑے وہ اپنی ہی پرچھائیں بن گیا اور اس پر اپنے گپت ہونے کا ادراک ہوا۔۔۔ سمعی بصری قوتیں درفنا میں پناہ لینے کو ہوئیں اور عالم فنا کا شور عالم موجود میں کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔

اس کی سانسوں نے باد سموم (زہریلی ہوا) کی موجودگی کو محسوس کیا۔

چار بھوری آنکھیں اٹھیں۔۔۔ ایک دوسرے کی سمت۔۔۔

"اور جس دن میں اور ولید پہلی بار ایک چھت تلے اکٹھے ہوئے، مجھے یقین ہو گیا کہ اس سے تعلق مجھ پر واجب تھا اور اس سے محبت مجھ پر فرض۔۔۔"

اٹھ کر ملیں اور ٹھہر گئیں۔

"جب وہ سو جایا کرتا تھا تو میں جاگ کر اسے دیکھا کرتی تھی، میں اپنی سانسوں کی آمدورفت کو اتنا بے ضرر بنا لیا کرتی تھی کہ وہ اس کی نیند میں مخل نہ ہو سکیں اور اسے جی بھر کر دیکھتے رہنے کا میرا خواب ٹوٹ نہ جائے۔"

عالیان نے اتنا گہرا سانس لیا جیسے آخری سانس۔۔۔

"جب وہ مجھے دیکھا کرتا تھا تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ مجھے خاص اسی مقصد کے لیے بنایا گیا ہے۔ اگر وہ مجھے نہیں دیکھے گا تو میرے ہونے کا مقصد ختم ہو جائے گا۔"

وہ کھڑا ہوا اور چل کر اس انداز میں اس کی طرف آیا جیسے سدھاتے ہوئے جانور کی پشت پر ہاتھ پھیرنے کا ارادہ ہو۔

وہ مہزوم (شکست خوردہ) بنا کھڑا تھا کہ اس کی پشت پر ہاتھ پھیرا جا سکتا تھا۔

اس کے اندر دفن بند تابوتوں کے ڈھکن جھٹکوں سے کھلے اور اسے صاف صاف مارگریٹ دکھائی دینے لگی۔۔۔ رونا۔۔۔ تڑپنا۔۔۔ ہاتھ کاٹ لینا۔۔۔ بڑبڑانا۔۔۔ چلانا۔۔۔ بھول جانا۔۔۔ بھٹک جانا اور پھر "سرد" ہو جانا۔

آہیں۔۔۔ صدائیں۔۔۔ واویلا اور خاموشی۔

"میں نے تمہیں پہچان لینے میں وقت نہیں لیا۔"

ولید البشر نے اپنے دونوں ہاتھ کہنی سے اوپر اس کے بازوؤں پر رکھے اور اسے جوش سے جھنجھوڑا۔

"اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے کر بیٹھے رہنے کے خواب میں نے ہر رات دیکھے۔ میں ہر رات ایک ہی خواب دیکھ لینے پر قدرت حاصل کر چکی ہوں۔۔۔ جو بھی ہے میں ہر رات اہتمام سے اس خواب کے لیے خود کو تیار کرتی ہوں۔"

"تم میں میری کتنی شباہت ہے۔" ولید البشر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ عالیان بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"اس کے لوٹ آنے کی دعائیں میں نے اتنی

کثرت سے کیں جیسے لمحوں میں بنجر زمین پر جنگل اگ آئے اور اس جنگل میں، میں نے اپنی باقی ماندہ قوتوں کو اکٹھا کر کے اس کے نام کی صدائیں لگائیں۔"

"میرے بیٹے دیکھو۔۔۔ دیکھو اپنے باپ کو۔۔۔" اس نے اس کے سینے کے مقام پر جوش سے ایک گھونسا "اب ہم ایک ساتھ ہیں۔۔۔ میں تمہارے سامنے کھڑا ہوں۔۔۔ تمہارا باپ۔۔۔ ولید البشر۔۔۔"

"میں نے ایک افریقی جادوگر کو اپنی جمع پونجی تھما دی اور اس کے کہے پر ایمان لے آئی کہ ولید ضرور آئے گا۔"

"وہ آ گیا ہے۔۔۔" عالیان بڑبڑایا۔ "افریقی جادوگر نے وقت کیوں نہ بتایا؟" آواز اس کے اندر چکراتی رہی۔

"کچھ بولو مائی سن۔۔۔ میں نے تمہاری آوازیں خوابوں میں سنی ہیں!"

"جان لو مارگریٹ! آفاق ایک اہرام ہے، جس نے تمہاری ساری دعاؤں کو حنوط کر دیا ہے اور کوئی ایک بھی دعا آسمان کو چھید کر ولید کو چھین لانے کی طاقت نہیں رکھتی، مجھے اپنی قوت دعا پر ملال رہے گا۔"

ہال کی دیواروں پر مارگریٹ کی فلم چل رہی تھی۔ ایک کے بعد اگلا منظر۔۔۔ پھر اگلا۔۔۔ آخری منظر میں وہ سرد تر ہوتی جا رہی تھی، اس کی آواز کی لکنت اس کی ناپید ہوتی قوت کا نشان دے رہی تھی۔

"اس کے ساتھ گزری ساعتیں میں گنوانا نہیں چاہتی، میں اپنی آنکھیں بند کر لینے کو ہوں اور ان آنکھوں میں انہیں مقید۔۔۔ میں ماضی کا حصہ بننے جا رہی ہوں لیکن میں انہیں ماضی کے سپرد نہیں کروں گی۔۔۔ اگر ارواح کو دعا کا موقع دیا جائے گا تو میری پہلی دعا پھر سے وہ ہو گا اور آخری بھی۔۔۔"

اس کے کندھے پر ایک ہاتھ آکر ٹھہر گیا۔۔۔ وہ ہاتھ اس کے دائیں گال پر آیا اور گال کو نرمی سے مسلنے لگا۔

"عالیان!"

اس نے آواز کو روح میں اور انگلیوں کو دل پر محسوس کیا۔ ہال کی دیواروں پر بھاگتی دوڑتی مارگریٹ کی فلم اندھیرے میں گم ہونے لگی۔

"عالیان۔۔۔!" ہاتھ گال مسل رہا تھا۔

اسے دو مائیں ملی تھیں، لیکن باپ نہیں۔۔۔ اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔۔۔ اس کے باپ کا ہاتھ اس کے گال پر تھا۔ وجود میں آنے والا، وجود میں لانے والے کی بہت قدر کرتا ہے۔ خون میں ایک ابال ہوتا ہے جو دنیا کی کسی آگ سے نہیں ابلتا اور خونی رشتے کی صرف آنچ سے ابل کر چھلکنے لگتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی انسان سے دل کھول کر نفرت کی جا سکتی ہے۔ خونی رشتے سے نفرت کرنے کے لیے پتھر سا دل چاہیے۔

اس کا دل چاہا۔۔۔ حتیٰ کہ وہ مٹتے بنتے مارگریٹ کی زندگی کے مناظر دیکھ رہا تھا کہ وہ اس چوڑے سینے میں سر دے لے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس نے چاہا کہ وہ اپنی یادداشت کو گم کر دے، اور ولید البشر سے ناپسندیدگی کا جذبہ بھولا بسرا کر دے۔۔۔ ہاں وہ خود سے کیے گئے وعدے سے وعدہ خلافی کر دے۔۔۔ اس کے سامنے اس کا باپ کھڑا تھا۔ اس کے قد کے عین برابر۔۔۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے۔۔۔ اس کے گال اور شانے اس گرمی سے دہک رہے تھے، جو اس کا باپ اس کے وجود میں منتقل کر رہا تھا۔ اس کے دل کے مقام پر جو گھونسا پڑا تھا۔ وہ اسے گم شدہ مسرت سے لبریز کر دینے کو تھا۔

"بہت بڑے ہو گئے ہو تم۔۔۔ ہاں! تمہیں ہونا ہی تھا۔" ہاتھ اس کے سر کے بالوں تک گئے! اس نے خود کو ایک قدم پیچھے کیا۔

ولید البشر نے ذرا سا چونک کر اس خاموش کھڑے مجسمے کو دیکھا، جسے عربی ہاتھوں نے مغربی ڈھب میں ڈھالا تھا۔ جس کے چوڑے شانے اور اونچا قد اس کے مضبوط ہونے کی دلیل دے رہے تھے اور جس کی عرب رنگ آنکھیں اتنی بے تاثر تھیں جیسے وہ سدا روشنی سے انجان رہی ہیں اور جن کی بینائی کا واسطہ صرف اندھیرے سے رہا ہے۔

"دیکھو عالیان! میں نے تمہیں ڈھونڈ نکالا۔" دو قدم خود کو پیچھے لے جاتے ولید البشر نے دونوں بازو

وا کر دیے۔ اس اونچے، لمبے، طاقتور مرد کو قابو کر لینے کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا۔

عالیان کے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔

وہ چار قدم پیچھے ہوا اور نامحسوس انداز میں گہرے گہرے سانس لیے۔ مارگریٹ کی ڈوبتی ابھرتی تصویروں پر ابھی بھی اس کی نظر تھی۔

"مجھے گم کیوں کیا تھا؟" الفاظ کو اس نے جان لگا کر بے تاثر رکھا۔

ولید البشو ٹھٹک کر رہ گیا۔ عالیان کے سوال پر اس کے تاثرات نے حکم عدولی کی مہر لگائی۔ اس نے اپنی نظریں بدلیں اور پھر ان میں معاملہ فہمی چھلکنے لگی۔ عالیان نے ان بدلتے تاثرات کو بھانپ لیا۔

"تمہارا باپ تمہارے سامنے پہلی بار آیا ہے.... اس کے سینے سے لگنے سے پہلے ایسا سوال کوئی بھٹکا ہوا ہی کر سکتا ہے۔" آواز میں دبا دبا جلال تھا اور الفاظ سے زیادہ ان کی ادائی میں ایسی طاقت تھی کہ عالیان نے سوچا کہ اگر یہ شخص "میں مر رہا ہوں، میری بانہوں میں آجاؤ" کہہ دیتا تو وہ اس کے قدموں میں جا بیٹھتا۔ اب میرا باپ میرے پاس پہلی بار کیوں آیا؟ اس نے خود کو مضبوط کرنا چاہا جبکہ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ سامنے کھڑے شخص کو اس کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کی سب ہی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔

"تمہیں سب معلوم ہو جائے گا۔ میں بتاؤں گا.... آؤ میرے ساتھ یہاں بیٹھو۔" پیشانی پر ناگواری کی لکیریں ابھریں اور اس کی آواز کی خود ساختہ نرمی معدوم ہونے لگی۔

عالیان، مارگریٹ جوزف نہیں بننا چاہتا تھا۔ وہ ڈٹ کر کھڑا تھا گو ایسا کرنے میں بہت سی قوتیں حائل تھیں۔

"مجھے کھڑا رہنے دیں تاکہ ہم دونوں کو چلے جانے میں آسانی رہے۔" اس کی آواز سخت اور کھردری ہو گئی۔

کرسی کو اس کے لیے باہر نکالتے ولید البشر کے ہاتھ رک گئے اور خم زدہ گردن پر ناگواری کی چھپی ہوئی ——— نسیں بھی ابھر آئیں مگر انہیں فوراً" چھپا لیا گیا لیکن عالیان دیکھ چکا تھا۔ اس کی نظر سامنے موجود انسان کی ایک ایک جنبش پر تھی۔

"ہم جائیں گے تو ایک ساتھ جائیں گے۔" ولید مسکرایا۔

"ایک ساتھ کا مطلب جانتے ہیں آپ...."

اب ولید ٹھوڑی کو مسلتے اسے دیکھنے لگا۔ ایک ایسے کھلاڑی کی طرح جسے اپنا اگلا مہرہ چلنا تھا ورنہ بساط الٹ جاتی۔

"پتا نہیں اس عورت نے تمہیں میرے بارے میں کیا کیا کہانی بنا کر سنائی ہے۔"

"نہیں لیڈی مہر کہیے.... میں ان کے لیے احترام کی درخواست کروں گا۔"

"میں مارگریٹ کی بات کر رہا ہوں۔"

ولید البشو کے منہ سے اس نام کے نکلتے ہی وہ ٹھیک اس جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا جہاں سے چلا تھا "سرد مردہ ہاتھ سے ہاتھ چھڑائے جانے سے۔"

"ایسی نخوت اور نخوت سے ماما کا نام مت لیں۔" وہ چلّا اٹھا۔

ولید نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ "تمہارا انداز بتا رہا ہے کہ تمہیں میرے بارے میں غلط بتایا جاتا رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے.... اب آپ سب ٹھیک بتا دیں۔"

ولید البشو نے بائیں ہاتھ کی انگلیوں کو انگوٹھے کے ساتھ رگڑا.... شاید عادتاً" اس کی جھکی ہوئی بھنوئیں ذرا سا اور جھک گئیں، اور عالیان نے ان میں وہ رنگ دیکھا جو آسمان پر اڑتے باز پر نشانہ باندھے شکاری کی آنکھ میں اس وقت ابھرتا ہے جب وہ ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھانے والا ہوتا ہے۔

اور باز کا شکاری تند خو اور دور فہم ہوتا ہے.... آسمان سے جا لینے والا.... صرف شست ہی باندھ کر مار دینے والا۔

"میں نے مارگریٹ کو ایک اچھی عورت سمجھ کر شادی کی۔ وہ مجھے چھوڑ گئی اور تمہیں بھی اپنے ساتھ لے گئی اور میں پاگلوں کی طرح تم دونوں کو ڈھونڈتا رہا.... اتنے سال میں کہاں کہاں نہیں گیا.... پھر مجھے معلوم ہوا کہ اس کی موت واقع ہو گئی ہے۔ میں بہت مشکل سے تم تک پہنچا ہوں عالیان...."

اور جس آنچ سے اس کے خون میں ابال اٹھے تھے، وہ خون ایک دم سے سرد ہو گیا اور وہ استہزائیہ ہنس دیا۔

"ناروے کے ہوٹل میں کس عورت کو طلاق اور دھتکار دی تھی آپ نے؟"

ولید البشو کو جھٹکا سا لگا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ بہت چھوٹا تھا، جب اسے بے سہارا بچوں کے ادارے میں داخل کروایا گیا تھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اسے اس بارے میں بھی معلوم ہو گا۔

"جس فلیٹ میں شادی کر کے انہیں رکھا تھا، وہ اسی فلیٹ میں مر گئی تھیں تو آپ انہیں کہاں پاگلوں کی طرح ڈھونڈتے رہے تھے۔ میری پیدائش سے پہلے آپ انگلینڈ چھوڑ چکے تھے، بہت آسانی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ دوبارہ آپ انگلینڈ آئے...."

"میں اپنے دوست کو بھیجتا رہا تھا تمہیں ڈھونڈنے...." اپنے انداز کی تلخی کو اس نے بمشکل قابو میں کیا۔

"آپ خود کیوں نہیں آئے؟"

"مجھے انگلینڈ سے نکال دیا گیا تھا۔ میرے کاغذات میں گڑبڑ تھی، مارگریٹ نے مجھ سے رابطہ ختم کر دیا تھا۔"

"آپ کی نیت میں گڑبڑ تھی مجھے یقین ہے اس کا.... انگلینڈ سے نکلتے ہی آپ نے ناروے میں شادی کر لی تھی فوراً"۔"

"وہ میری مجبوری تھی۔"

"میں کیا تھا.... ضرورت.... مجبوری.... خواہش.... وقت گزاری....؟"

"میں صرف اس لیے غلط نہیں ہو سکتا کہ تم سے الگ رہا.... تم غصے میں ہو۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں.... ایک ساتھ اتنے جھوٹ بول دیے آپ نے...."

"خود کو پرسکون کرو.... تھوڑے نارمل ہو جاؤ۔"

"ٹھیک ہے.... اگلی بار پھر اتنے ہی سالوں بعد آئیے گا شاید میں نارمل ہو چکا ہوں۔" وہ پلٹ کر جانے لگا۔

"کیا چاہتے ہو تم؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"تمہیں لینے آیا ہوں...."

"اتنے سالوں بعد کیوں؟ مجھے صرف سچ سننا ہے ورنہ کچھ نہیں...."

ولید البشو نے اپنے اندر تیزی سے جوڑ توڑ کیے۔

"میں نے مارگریٹ کو طلاق دے دی تھی، یہ میرا حق تھا اور وہ غصے میں آگئی...."

"جب ناروے میں وہ آپ کو میرے بارے میں بتا رہی تھیں تب آپ نے کیا کہا تھا؟"

"میں سمجھا وہ جھوٹ بول رہی ہے۔"

"نہیں! آپ سمجھے میں آپ کا نہیں، کسی اور کا بچہ ہوں۔" کہتے وہ ذرا شرمندہ نہیں ہوا۔ حکم عدولی کرنے والوں کو دی جانے والی سزا کے اعلان کرنے کے انداز کو ولید نے بمشکل دبایا۔

"کسی اور کے بچے کو اب کیوں سمیٹنے آئے ہیں؟"

"یہ غلط ہے.... جھوٹ ہے...."

عالیان ایک کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گیا اور خود کو سوچنے کے لیے وقت دیا.... اس کے سامنے ایک صحت مند، خوش شکل، قیمتی لباس اور جوتوں میں ملبوس اس کا باپ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ گھڑی تھی جو ایک معروف کمپنی آرڈر پر صرف "ایک" تیار کرتی ہے۔ ولید البشو کی کھال پر ایک جھری نہیں تھی۔ وہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھتا رہا تھا یا وہ اسکن سرجری سے کئی بار گزر چکا تھا۔ اس کی خوب صورتی، اس کا لباس، اس کا انداز، اس کے الفاظ، اس کے تاثرات، کوئی ایک بھی چیز اس بات کی گواہی نہیں دے رہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کے غم میں گھلتا رہا ہے.... اس کی ماں گھل گھل کر مر چکی تھی اور اس کا باپ کھلا گلاب بنا

کرتے کرتے نہیں تھکی تھی۔ جو ایسے ایڑیاں رگڑتی رہی تھی جیسے اس کے وجود سے زہریلے حشرات لپٹے اسے ڈنک پر ڈنک مار رہے ہوں۔۔۔ اس وقت عالیان کو اپنی ماں پر بہت ترس آیا۔ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہا۔ اتنی محبت اور ایسے کرب کے بعد بھی اس کی ماں کے ہاتھ کیا آیا۔۔۔ شرمندگی۔۔۔ پچھتاوے' احساس' دکھ کا ایک لفظ بھی نہیں۔۔۔

"اگر مارگریٹ اس وقت نہ مرتی تو اس وقت مر جاتی۔"

اس کے اندر الاؤ سا دہکا' اس کے ہاتھ کی پوریں اتنی گرم ہو گئیں کہ ولید انہیں چھو لیتا تو جل جاتا۔

"میں آپ سے نفرت کرتا تھا اور اب اور زیادہ کرتا ہوں۔۔۔ آپ سے مزید بات چیت کا میرا ارادہ نہیں۔" اس نے ولید البشر کے منہ کے عین سامنے اپنا منہ لے جا کر کہا۔

ولید ایک قدم پیچھے ہوا۔ اس ٹھکرا دی گئی عورت کی اولاد کے ایسے انداز نے اسے سیخ پا کر دیا۔ اس نے خود کو بمشکل روکا کہ وہ اس لڑکے کی وہی تذلیل کر دے' جو اس کی ماں کی کی تھی۔

"تم لاکھوں ڈالرز ٹھکرا رہے ہو۔۔۔" اب وہ صاف صاف ایک کاروباری انسان بن گیا۔

"وہ کروڑوں ہوں تو بھی۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ تو تمہیں زیادہ حصہ چاہیے۔۔۔؟"

عالیان استہزائیہ ہنسا۔

"بولو کتنا چاہیے۔۔۔ وہ میری ساری زندگی کی کمائی ہے۔ تمہیں راضی ہونا ہی پڑے گا۔"

اب عالیان ترحم سے اسے دیکھنے لگا۔ "پیسوں کو کمائی کہہ رہے ہیں۔۔۔ انسانوں کو کس گنتی میں گنتے ہیں۔۔۔ مجھے مجبور نہ کریں کہ میں آپ کے ساتھ وہ کروں جو آپ دوسروں کے ساتھ کرنے کا شوق رکھتے ہیں۔"

"تمہیں میرے کام آنا ہی پڑے گا۔"

"میں اس کے لیے تیار نہیں۔۔۔"

"تو تم اپنی قیمت بڑھا رہے ہو؟"

"اگر آپ اس مدد کا سوال ماما سے کرتے تو وہ کبھی انکار نہ کرتیں۔۔۔ میں مارگریٹ نہیں ہوں۔"

"تو ٹھیک ہے پھر مارگریٹ کے لیے ہی سہی۔" اسے سودا کسی بھی صورت کروانا تھا۔

"اگر وہ میرے لیے زندہ رہتیں تو شاید۔ وہ آپ کے لیے مر گئیں تو بالکل نہیں۔۔۔" عالیان اب وہ سارے حساب لے لینا چاہتا تھا' جو اپنی ماں کی طرف سے اسے چکانے تھے۔

"میں آفیشلی مارگریٹ کو اپنی بیوی تسلیم کر لوں گا۔"

"اس کی ضرورت ہے' نہ اس کا فائدہ انہیں حاصل ہو گا۔"

"تمہیں یہی شکوہ ہے نا کہ میں نے اس کی بے عزتی کی۔ ٹھیک ہے میں اسے عزت بھی دوں گا اور اپنی بیوی ہونے کا خطاب بھی۔۔۔ میں پریس کانفرنس کروں گا۔۔۔"

"انہیں مار دینے کا اعتراف کون کرے گا؟" اس کی پیشانی پر کئی لکیریں بن گئیں۔

ولید البشر کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے' اس کی برداشت کی حدیں ختم ہو رہی تھیں۔

"تم یہ ثابت کر رہے ہو کہ تم میرا ہی خون ہو۔۔۔ تم اپنی اہمیت بڑھا رہے ہو۔۔۔ تمہیں ایسا ہی ہونا چاہیے۔۔۔ اور بڑھا لو اپنی قیمت۔۔۔ میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ مہنگی چیزیں خریدنے کا مجھے شوق ہے۔۔۔" کبھی خود بک چکے ولید کو لگتا تھا دنیا میں سب بکنے کے لیے ہی موجود ہیں۔

عالیان اندر ہی اندر ہنسا۔۔۔ یہ شخص تھوڑی دیر کے لیے بھی ایک اچھا باپ ہونے کی اداکاری نہیں کر سکا۔

"میری قیمت آپ نہیں چکا سکتے۔" طنز سے کہہ کر وہ تیزی سے جانے لگا۔ کبھی ایسے ہی اس کی ماں بھی اس کے سامنے کھڑی ہو گی اور وہ پشت دکھا کر جاتا ہو گا۔۔۔

"اگر مجھے تمہاری ضرورت ہے تو تمہیں بھی کہیں نہ کہیں میری ضرورت ضرور ہو گی عالیان ولید۔۔۔!"

قریب رکھے میز پر انگلیاں بجا کر اس نے کہا۔

"دنیا میں کوئی ایسا کھیل نہیں جسے ایک ہی انداز سے جیتا جا سکے۔۔۔" ولید البشر اس فلسفے پر یقین رکھتا تھا۔ عالیان پہلے سے زیادہ نفرت سے پلٹا۔

"دنیا میں آپ وہ آخری انسان بھی نہیں ہوں گے۔ جس کی مجھے ضرورت ہو گی۔۔۔ لکھ کر محفوظ کر لیں میں کبھی آپ کی طرف نہیں لوٹوں گا۔"

"ہوں۔۔۔" ولید البشر کے لب وا ہوئے۔

"عالیان ولید۔۔۔ تمہیں میرے نام کی۔۔۔ میری موجودگی کی ضرورت ہے۔" انگلیاں اور تیزی سے میز پر بجنے لگیں۔

"باقی ماندہ زندگی کے لیے یہ خوش فہمی آپ پال سکتے ہیں۔" وہ پلٹ کر جانے لگا۔

"پھر سوچ لو۔۔۔ ان کاغذات پر سائن کر دو اور میرے ساتھ چلو۔"

یہ ایک ایسا انداز تھا کہ جیسے ولید البشر اس پر کوئی احسان کر رہا ہے۔

"مجھے اپنا باپ مانو نہ مانو۔۔۔ ایک تجربہ کار انسان ہی مان لو۔ اس ایشیائی لڑکی کے پاس کوئی تو وجہ ہو گی جو اسے تم سے زیادہ ضروری تھی۔۔۔"

پہاڑیوں میں چھپ کر بیٹھے دشمن کے زہر بجھے تیر کی طرح جو فاتح کی پشت پر لگتا ہے اور اس پر فتح کا سورج حرام کر دیتا ہے۔۔۔ عالیان کی پشت پر تیر بن کر یہ آخری بات لگی اور اس نے جھٹکے سے گھوم کر اسے دیکھا۔۔۔ دنیا میں جتنی کراہیت آمیز چیزیں تھیں ان کے بوجھ تلے اس نے خود کو پایا۔۔۔

☼ ☼ ☼

اجنبی نمبر سے کال تھی۔ وہ آخری لیکچر لے کر نکل رہی تھی۔

"میں ولید البشر۔۔۔ عالیان کا باپ بات کر رہا ہوں۔"

اس کی ہیلو کے جواب میں فوراً" کہا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے آگے کیا بولے۔

"تم نے پیسے لینے سے انکار کیوں کر دیا؟"

"میں نے یہ پیسوں کے لیے نہیں کیا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"پھر کس لیے کیا ہے؟"

"عالیان میرا دوست ہے۔۔۔ میں صرف یہ چاہتی تھی کہ وہ اپنے پاپا سے ملے۔"

"بس صرف اس لیے؟"

"جی۔۔۔"

"تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟"

"پاکستان سے۔۔۔"

"مسلمان ہو؟"

"جی۔۔۔!"

بہت دیر خاموشی رہی کہ اسے لگنے لگا کہ فون بند کر دیا جائے گا۔

"عالیان تمہارا کتنا اچھا دوست ہے؟"

وہ خاموش رہی۔

"تم نے اس سے کبھی پوچھا نہیں کہ اس کا باپ کہاں ہے؟"

"میں نے پوچھنا چاہا تھا۔۔۔" وہ بات کرتے جھجک رہی تھی۔

"تو۔۔۔؟"

"وہ اس بارے میں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔۔"

"لیکن تم میرے بارے میں جاننا چاہتی تھیں۔۔۔ کیوں؟"

وہ پھر سے خاموش ہو گئی اور دوسری طرف بھی خاموشی چھائی رہی۔

"عالیان سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

اس سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

"میں نے تمہاری دونوں فون کالز کی ریکارڈنگ سنی ہے۔۔۔ مجھے یہ اندازہ فوراً" ہو گیا تھا۔۔۔ گھبراؤ نہیں۔۔۔ مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔۔۔؟"

"آپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ ہونا چاہیے۔۔۔ اسے یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے آپ کو سب بتایا ہے۔۔۔ شاید اسے اچھا نہ لگے۔۔۔" اس کی آواز اور زیادہ

کانپنے لگی۔

"اسے اپنے باپ سے ملنا ضرور اچھا لگے گا... میں سب سمجھ گیا... تمہارا شکریہ... تم یقیناً" میرے بیٹے کے لیے اچھے جذبات رکھتی ہو... کیا نام ہے تمہارا؟"

"امرحہ!"

"امرحہ...! تم سمجھ دار ہو کیوں کہ تم جانتی ہو کہ ایک باپ کا ہونا کس قدر ضروری ہے... اس پر اصرار کرتی رہنا امرحہ...! میں اور میرا بیٹا جلد تم سے ملیں گے۔"

☼ ☼ ☼

"تم بہتر طور پر سمجھ سکتے ہو کہ کیا وجہ ہو گی... اس نے پیسے بھی لینے سے انکار کردیا اور تمہارے بارے میں سب بتا بھی دیا... اس نے یہ نیکی یقیناً" اپنے لیے کی... مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے مذہب اسلام اپنایا ہے اور وہ لڑکی بھی مسلمان ہے..."

اس کے وجود میں جلتی آگ کی تپش نقطہ عروج پر جا پہنچی کہ اس کی کھال پگھل جانے کو ہو گئی۔

"اچھے مسلمان خاندان بنا باپ کے ناجائز اولادوں کو اپنی بیٹیاں نہیں دیتے..." عالیان سن سا ہو گیا۔ اس کے منہ پر چانٹا پڑا۔

"اس نے میرے آدمی سے ایک ہی سوال کیا تھا... مارگریٹ کے بیٹے کو اس کا باپ ہی ڈھونڈ رہا ہے نا... اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ باپ ہی ہے تو جیسے اس کی کوئی بڑی مشکل آسان ہو گئی۔ تم ایک آزاد معاشرے میں رہتے ہو' لیکن باپ کا سوال آج بھی مہذب معاشروں میں پہلے پوچھا جاتا ہے... باپ کے نام کے بغیر تم ناجائز ہو... میں کہاں ہوں اس بارے میں لوگ پوچھتے تو ہوں گے۔" ولید رکا۔ جیسے اب سارے کام ہو گئے۔

"اس عورت کے نام کے ساتھ تم کسی مسلم خاندان میں شامل ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے... میرے بغیر تمہاری حیثیت ہی کیا ہے...؟" ولید البشو نے اس آخری بات سے عالیان کو ایسے ذلیل کردیا جیسے مارگریٹ اور اس کی اولاد کی ہتک کا حق صرف اسی کے پاس ہے۔

اور اس نے اس حق کا ٹھیک ٹھیک استعمال کیا۔

"تمہاری غیر مسلم ماں کے بارے میں آسانی سے یہ سوچ لیا جائے گا کہ وہ کس طرح کی..."

"اپنی زبان کو لگام دو۔" عالیان دھاڑا۔ "کس نام اور کس خون کی بات کر رہے ہو۔ لعنت تو تم ہو۔"

"تم اس ملعون عورت کا خون نہ ہوتے تو جانتے کہ باپ کے ساتھ کیسے پیش آیا جاتا ہے۔"

"میں تمہارا ملعون خون نہ ہوتا تو اچھا ہوتا۔" اس نے اس کرسی اور میز کو طیش میں پیر سے ٹھوکر ماری، جس کے پاس وہ کھڑا تھا۔ باہر کھڑے گارڈز اندر لپکے۔ ولید نے اشارے سے انہیں روکا۔

"تم میرے کام آجاؤ۔ میں تمہارے کام آجاؤں گا۔ ڈیل سمجھ لو۔ اتنے جذباتی نہ ہو۔"

"تھو ہے اس ڈیل پر۔"

"پرسکون ہو جاؤ۔ تم جانتے نہیں کہ تم کس عورت کی اتنی طرف داری کر رہے ہو؟"

"ہاں جسے تم نے مار ڈالا۔" اس نے غصے میں ایک اور کرسی کو ٹھوکر ماری۔ "تم نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہی جال کاٹتے کاٹتے وہ مر گئی۔"

"اور اپنے پیچھے ان مردوں کو روتا چھوڑ گئی جن کے ساتھ وہ ہر رات..."

عالیان نے جھپٹ کر اس کے کوٹ کا کالر پکڑا اور گھونسا اس کے منہ کے قریب لایا۔ دونوں گارڈز فوراً" اس پر جھپٹے۔

"میری تربیت اچھے ہاتھوں میں نہ کی ہوتی۔ میں ایک مسلمان نہ ہوتا تو تمہارا گلا دبوچ لیتا۔ اور دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے بچا نہ سکتی ولید!" گارڈز اسے پوری قوت سے پیچھے کھینچ رہے تھے اور وہ چلا رہا تھا۔

"اگر ایک بھی اور لفظ ماما کے بارے میں کہا تو میں یہ بھی کر گزروں گا۔" اس نے خود کو گارڈز سے آزاد کروایا اور انگلی اٹھا کر چلایا۔

"تم وہ غلاظت ہو' جس میں میری ماں اپنی بدنصیبی سے جا گری۔ اگر میرا بس چلے تو میں اپنا جسم چھیل ڈالوں تاکہ تمہارے غلیظ خون کا ایک قطرہ میرے جسم میں نہ رہے۔" ولید البشو ششدر رہ گیا۔

"ساری دنیا کی دولت میرے آگے ڈھیر کرو گے۔ تو بھی اب مجھ سے اپنے لیے احترام کا ایک لفظ نہیں سن سکو گے۔ مجھے تمہاری ضرورت کبھی نہیں پڑے گی۔ وہ میری آخری سانسیں ہی کیوں نہ ہوں۔ میں زندگی مستعار لینے کے لیے تب بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔"

☼ ☼ ☼

برنٹ ورک کی حدود سے وہ ایسے نکلا جیسے بندوق سے گولی۔ اگر وہ ذرا سی دیر اور رک جاتا تو ولید البشو کا گلا اس وقت تک دبوچے رکھتا جب تک وہ حلق سے آخری سانس نہ اگل دیتا۔ اس نے زندگی میں کبھی اس شخص سے ملنے کی چاہ نہیں کی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ شخص اس کے سامنے آئے گا تو خود وہ انسانی رتبے سے گر جائے گا۔

"اگر وہ کبھی تمہارے سامنے آجائے تو تحمل سے کام لینا۔" ماما مہر اسے نصیحت کر چکی تھیں۔ "مجھ سے وعدہ کرو۔" "تم صبر سے کام لو گے۔ تم ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دو گے۔ تم میری تربیت کی لاج رکھو گے۔"

وہ سائیکل کو سڑک پر اڑا رہا تھا۔ اسے سڑک پر کوئی بس' گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اپنا گرم کوٹ وہ ہارٹ راک میں پھینک آیا تھا۔ اپنی شرٹ کے بٹن اس نے کھول دیے تھے' کف الٹ دیے تھے۔ اس کی شرٹ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اتنی ٹھنڈ بھی اس کی گرمی کم کرنے میں ناکام تھی۔

اس کی خون رنگ آنکھیں ٹمٹما رہی تھیں۔

اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ ماما نے گھر آنے سے منع کیا کردیا تھا' وہ اس کا پتا کرتا گھر تک پہنچ چکا تھا اور گھر والوں تک بھی۔ اگر ماما کی اور اولادیں نہ ہوتیں تو وہ اس سے پہلے اس تک پہنچ چکا ہوتا۔ اس کا باپ اپنے ڈوبتے ہوئے جہاز کو بچانے کے لیے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

اپنی لین میں چلتی کار سے آگے نکل جانے میں وہ اسی کار سے ٹکرا گیا' اور رگڑے کھاتا ہوا سڑک پر گرا۔ اسے کوئی دعا لگی۔ کار اس کے اوپر سے نہیں گزر گئی۔ اس کے ہاتھ اور گھٹنے چھل گئے۔ جس گال پر ولید البشو اپنا ہاتھ رگڑتا رہا تھا' وہاں سرخ لکیریں بن گئیں، اور ___ ان میں سے خون رسنے لگا۔

اس نے اسے ایک ٹوکن سے زیادہ اہمیت نہ دی، جس کے ڈالتے ہی اس کی پیسوں کی مشین چلنے لگتی۔

"کیا تم ٹھیک ہو؟" کار والا جلدی سے باہر نکل کر اس کے پاس آیا۔ جبکہ وہ سائیکل کھڑی کر کے اس پر سوار ہو چکا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے تازہ زخموں کو ادھیڑنے لگی اور ان میں سے گرم خون رسنے لگا۔

وقت ایک شرارہ ہے۔ جلا دینے پر قادر۔

دونوں ماں بیٹا ایک سے نصیب کے حامل تھے۔

دونوں نے ایک ہی انسان کے ہاتھوں ذلت اٹھائی۔

دوبارہ وہ کسی کار سے نہ ٹکرا جائے اس نے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"مجھے غلط مت سمجھنا۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ مجھے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"تم غلط وقت پر پوچھ رہی ہو۔"

"جانتی ہوں۔ وہ سب کہنے سے پہلے پوچھنا چاہیے تھا۔ پھر بھی۔ مجھے اپنے فادر۔"

"میرا کوئی باپ نہیں ہے امرحہ! صرف ایک ماں تھی' جو مر گئی۔"

"اچھے مسلمان خاندان بنا باپ کی ناجائز اولادوں کو بیٹیاں نہیں دیتے۔"

"باپ کا سوال آج بھی مہذب معاشروں میں پہلے پوچھا جاتا ہے۔ باپ کے نام کے بغیر تم ناجائز ہو۔"

"تمہاری غیر مسلم ماں کے بارے میں آسانی سے

یہ سوچ لیا جائے گا کہ وہ کس طرح کی۔۔۔ تم اس ملعون عورت کا خون۔"

"ملعون عورت۔ ملعون عورت۔"

"اور اپنے پیچھے ان مردوں کو روتا چھوڑ گئی جن کے ساتھ وہ ہر رات۔"

آتش فشاں پھٹنے سے پہلے جو اس کے اندر دھماکے ہوئے تھے، وہی دھماکے اس میں زلزلہ برپا کرنے لگے۔ ایک خیال اس کے ذہن سے ہو کر گزرا، اسے سڑک کی مخالف لین میں گھس جانا چاہیے اور سامنے سے آنے والی کسی بس سے ٹکرا جانا چاہیے۔

ولید البشر اسے کیسے جتا گیا تھا کہ اس کا نام اس کے لیے کتنا ضروری ہے۔ اس کی پاک باز ماں کے لیے آج بھی وہی انداز اپنایا گیا تھا جو سالوں پہلے اپنایا گیا تھا۔ وقت اس زندہ کے لیے بھی نہیں بدلا تھا اور مردہ کے لیے بھی نہیں۔ وقت نے اس کے درجات میں تبدیلی کی تھی تو بس اتنی کہ اسے اور پستی کی طرف لے گئے تھے۔

اس عورت نے ایسا کون سا گناہ کیا تھا کہ اسے عزت کے لائق سمجھا جا رہا تھا نہ محبت کے۔ اس نے کہاں کیا گستاخی کی تھی کہ مرنے کے بعد اسے زندہ رہ جانے والے روند رہے تھے۔ اس کے لیے رویا نہیں گیا۔ پچھتایا نہیں گیا۔ اس کی ریاضت اتنی کھوٹی تھی کہ اسے لفظوں میں سب سے بدترالفاظ میں یاد کیا جاتا ہے۔

اور عالیان نے پہلی بار سوچا۔ "میری ماں مارگریٹ جیسی بدنصیب عورت نہیں ہونی چاہیے۔"

ولید اسے بھی استعمال کر گیا تھا ولید اسے بھی استعمال کرنے ہی آیا تھا۔ جو عورت اس کے فراق میں مر گئی تھی وہ اس پر پھر سے لعنت بھیجنے آیا تھا۔ اس کا اکلوتا خونی رشتہ اس کا خون پی گیا تھا۔

اس کے جسم میں جابجا سوراخ ہو گئے تھے اور ان سوراخوں سے وہی کراہیں سنائی دینے لگی تھیں جو اس کی ماں کے وجود سے پھوٹتی تھیں۔

اس نے سائیکل کو اسٹور کے باہر پھینکا اور بھرپور طاقت سے شیشے کے دروازے کو دھکیل کر اس کے سر پر پہنچا۔

دور کھڑے ورکرز نے اس کے انداز کو حیرت سے دیکھا۔ وہ اس لڑکے کو جانتے تھے۔ وہ کافی عرصے بعد اسٹور میں آیا تھا اور ایک نئے اور عجیب انداز میں آیا تھا۔ وہ اس کے سر پر پہنچا اور اس کا بازو گھسیٹ کر کھڑا کیا اور اسٹور سے باہر لے گیا۔

"ولید کو فون کر کے تم نے بتایا تھا میرے بارے میں؟"

اس کی آواز بلند تھی اور اس کا انداز۔ اس کی آنکھیں۔ اف! امرحہ کا دل چاہا، وہ اپنی آنکھیں بند کرلے اور اپنے سکڑتے دل کو بند ہو جانے کا عندیہ دے دے۔

اس کی پلکیں لرز رہی تھیں اور اس کا انداز اس کے گال پر موجود خراشوں سے رستا خون تکلیف سے اس کی بے نیازی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے بازو پر موجود اس کا ہاتھ اتنا گرم تھا کہ اس کی کھال میں گرم سلاخ کی طرح گھس رہا تھا۔

وہ سہم گئی۔ اس نے اس کا ایسا شدت پسندانہ انداز پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"عالیان!" اتنی ہی آواز نکل سکی۔

"ولید کو فون تم نے کیا تھا؟" وہ دھاڑا۔

اسٹور کا منیجر اسٹور سے باہر نکل آیا تھا۔ اسٹور کے اندر کام کرتے ورکرز کام روک کر اور کسٹمرز جوتوں سے نظریں ہٹا کر شیشے کی دیوار کے پار کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے۔ سڑک پر چلتے کچھ دوسرے لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھ کر گزر رہے تھے۔

"کیا ہوا۔ ہے۔ تمہیں۔" خوف سے اس کا سانس رک جانے کو تھا۔

"تم نے فون کیا ہے نا؟" وہ پوری قوت سے پھر سے چلایا اور اس کا گرم ہاتھ اس کی کھال میں گھنے لگا اور وہیں اس کا خون جم گیا۔ اس کے دل میں تکلیف اٹھی اور اس نے مر جانا چاہا۔

"صرف اس لیے عالیان کہ مجھے۔"

اس کا جملہ گال پر پڑنے والے طاقتور تھپڑ سے درمیان میں ہی رہ گیا۔ اور اس کے سفید گال پر اپنے ثبت ہونے کا نشان چھوڑ گیا۔

ہونٹوں کے کنارے تھرتھرائے۔ آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو گئیں۔ اور اس نے جان لیا "سب ختم۔"

یورپ کا سفر پچھتم میں تمام ہوا۔ اور سورج ڈوب گیا۔

پروگ (جدائی) نے اپنی آمد کا طبل بجایا۔

اب وہ اس کا عالیان رہا نہ وہ اس کی امرحہ۔

اور پھر اس قموش نے بدہیت ہوتے ہوئے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تھپڑ تمہیں اس وقت پڑنا چاہیے تھا، جب تم نے میری ماں کی بے عزتی کی تھی۔ یہ تھپڑ ولید کو بھی اس عورت کے ہاتھوں پڑنا چاہیے تھا جو میری ماں تھی۔ اب میں دنیا میں کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دوں گا کہ وہ میری ماں پر انگلی اٹھائے۔" الفاظ کی ادائی میں ایسی ٹوٹ پھوٹ تھی جیسے وہ صدیوں سے لکنت زدہ رہے ہوں۔

آج سے پہلے اس کی آواز ایسے اونچی نہیں ہوئی تھی۔ آج سے پہلے وہ ایسے بے قابو نہیں ہوا تھا۔

امرحہ کا عالیان۔ وہ اس روپ کا سوداگر کیونکر ہوا؟

اگر اس کے ہاتھ میں مشعل دی جاتی تو وہ دنیا کو آگ لگانا شروع کر دیتا اور شروعات خود سے کرتا۔

میری ماں کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ولید سے محبت تھی اور میری تم سے۔" اس کے لکنت زدہ جملوں نے ادائی میں پھر وقت لیا۔

"تم ہر بار نئے انداز سے دکھ دیتی ہو۔ کتنی ظالم ہو تم امرحہ۔" ان آخری جملوں نے صدیوں سے بھی کہیں آگے کا سفر طے کیا اور اس کی زبان سے ادا ہوئے۔

اس کے ان الفاظ پر امرحہ کا جی چاہا، مر جائے۔

وہ اسٹور کے ایک طرف گری اپنی سائیکل کی طرف لپکا۔ اس کی ناک سے خون نکلنے لگا تھا۔ اس کی ویسٹ پر قطرے گر رہے تھے۔ اس کے پاس اس خون سے نبٹنے کا جذبہ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ کس کس زخم کی رک کر دیکھ بھال کرتا۔

امرحہ اس کے پیچھے لپکی اور اس کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھے معاف کر دو عالیان۔"

اس نے جھٹک کر اپنا بازو اس سے آزاد کروایا اور گری ہوئی اپنی سائیکل اٹھانے لگا۔ خون کے قطرے سڑک پر گرے۔

"میں نے یہ سب اس لیے کیا۔ تمہارے لیے کیا۔ عالیان! بہت محبت کرتی ہوں میں تم سے۔" پہلی بار اس نے عالیان کے سامنے اس محبت کا اقرار کیا۔ ناحق کیا۔

"یہ سب دادا کے لیے۔ میں تو۔ میری بات سنو اللہ کے لیے۔"

"میرے لیے اب تم مر چکی ہو امرحہ۔" گیلی ناک کو اس نے آستین سے رگڑا۔

اس کے خون اور اس کی آنکھوں پر امرحہ کی نظریں گڑی تھیں۔

"تمہارے بغیر میں مر ہی جاؤں گی۔ پلیز میری بات سن لو۔" اس نے لپک کر پھر سے اس کا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔

وہ سائیکل پر بیٹھ چکا تھا۔ "جاؤ کر دیکھو یہ بھی۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

خون آلود آستین کو اس نے امرحہ کی گرفت سے آزاد کروایا۔

"اگر فرق ہی دیکھنا ہے عالیان! تو چلو پھر مر کر دیکھتے ہیں۔" وہ استہزائیہ ہنس دی اور ساتھ ہی رو دی۔

وہ سائیکل لے کر چلا گیا۔

برہ کی نزولیت نے آسمان تک بلند قلعے کھڑے کرنا شروع کر دیے۔ اس نے اسے جاتے دیکھا۔

وقت نے اپنے تھال سے "رمز حقیقی" کا پہلا سکہ اچھالا۔

اس نے خود کو اکیلے کھڑے پایا۔

وقت نے اسی تھال سے "خط تقدیر" کا دوسرا سکہ اچھالا۔

اس پر انکشاف ہوا' وہ اسے اپنے ساتھ نہ لے گیا۔
تیسرے سکے کا وار وقت نے اس کے دل پر کیا جو "فراق یار" کا تھا اور وہ رونے لگی۔

اے آنکھ تو کیوں روتی ہے
نگاہ محبوب نے مجھے ایک داستان سنائی
اے آنکھ پھر تو کیوں روتی ہے
وہ داستان عشق تھی
اے آنکھ پھر تو رونا بند کر۔
اس میں میرا نام تھا' جواب مٹ چکا
ہاں اب تو رو.....

☼ ☼ ☼

اندھیرا رات کی تاریکی سے نہیں' نصیب کی تاریکی سے بڑھ جاتا ہے۔
اندھیرا دکھ کا ہم جولی۔
ایسا اندھیرا پھر جس کی تاریکی میں جلد کوئی سورج طلوع نہیں ہوتا۔

ناک سے بہنے والا خون تھک کر رک چکا تھا۔ اس نے اتنی زحمت بھی نہیں کی تھی کہ ٹشو ہی ناک پر رکھ لیتا۔ در پردہ اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی شاید۔ وہ اس وقت اس کیفیت میں نہیں تھا جس میں "میں کتنا دکھی ہوں" سوچا جایا کرتا ہے' وہ اس وقت اس کیفیت میں تھا' جس میں کوئی سوچ کام نہیں کرتی۔
کرسی پر وہ چپ بیٹھا تھا۔ ہاتھ گود میں تھے۔ کمرا اندھیرے میں۔ اور وہ خود "گمشدہ"

سائی اس کے کمرے کا دروازہ بجا رہا تھا' لیکن ایسا نہیں تھا کہ وہ کھول نہیں رہا تھا' بس ایسا تھا کہ وہ سن نہیں رہا تھا۔ سائی کو سادھنا نے فون کیا تھا اور وہ فوراً" اس کے کمرے کی طرف لپکا تھا۔ کارل موجود نہیں تھا' جاب سے آف ہونے کی وجہ سے وہ کلب چلا گیا تھا اور یقیناً" پاگلوں کی طرح ناچ رہا ہوگا' اسی لیے فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ صرف وہی اس کا کمرا کھول سکتا تھا اور جب اس نے فون اٹھالیا تو آنے میں اسے ذرا وقت نہ لگا۔ سائی نے مختصراً" اسے سب بتایا اور کمرا کھول کر کارل سائی کو باہر ہی چھوڑ کر عالیان کے پاس آگیا۔

کارل اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تو عالیان کو اس کی موجودگی کی خبر ہوئی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر کارل کو دیکھا تو کارل کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا' اس کا دل رک کر پھر چلا۔

"عالیان!" اس نے اس کے زخم خوردہ گال پر ہاتھ پھیرا اور اس کی اپنی آنکھیں نمی سے چھلک جانے کو ہو گئیں۔ جب اس پر پہلی بار یہ ادراک ہوا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے تو اس کی آنکھیں ایسی ہو گئی تھیں اور اس کے بعد اب۔ اس نے زندگی میں جس پہلے انسان کے ساتھ محبت کی تھی وہ عالیان تھا اور جس کے لیے وہ آگ میں کود سکتا تھا' وہ بھی عالیان ہی تھا۔

اس نے گود میں رکھے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے اور اس پر ظاہر ہوا جیسے اس نے کسی مرچکے انسان کے ہاتھوں کو چھولیا۔ ان ہاتھوں میں زندگی کی بوجھل تپش بھی ناپید تھی۔

اس کے بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کے ناخن جڑ سے اکھڑے ہوئے تھے اور اتنی تکلیف پر بھی وہ کیسے خاموش تھا۔ اس میں سہن زیادہ تھی یا فراموشی

"تم کب بڑے ہو گے عالیان؟" اس نے اس کے سر کے بال نرمی سے مسلے اور اس کی لاپتا نظروں کا پتا کرنا چاہا۔ پھر وہ اٹھ کر اس کی وارڈ روب تک آیا اور نچلے خانے میں رکھا فرسٹ ایڈ باکس نکالا اور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ کر روئی سے اس کے گال صاف کرنے لگا۔ اس کی ناک کے پاس خون کے لوتھڑے جمے تھے۔ انہیں اس نے نرمی سے صاف کیا اور پھر ان ناخنوں کو جو سارے اکھڑ چکے تھے لیکن ذرا سے جڑ کے ساتھ چپکے ہوئے تھے' کٹر سے کاٹا اور عالیان نے "سی" بھی نہ کی۔

"تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میری کچھ سانسیں تم میں سے راستہ بنا کر مجھ تک آتی ہیں اور یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ کارل کا شمار بھی بدنصیبوں میں ہوتا' اگر اس کے پاس عالیان نہ ہوتا۔"

"وہ مجھ سے ملنے بھی آیا تو اپنے فائدے کے لیے

کارل! میرا باپ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں اس کے بغیر کیسے رہا۔ اتنے سال۔ میں نے اس کے بغیر کیسے گزارے۔ میری ماں کب اور کیسے مر گئی۔ اس کی قبر کہاں ہے۔ وہ کتنی تکلیف میں رہی۔ اس پر کیا کیا بیتی۔ کوئی ایک بھی بات اس نے نہیں پوچھی۔"

عالیان نے بولنا شروع کر دیا اور کارل نے خود کو کئی راتوں اور کئی دنوں تک سننے کے لیے تیار کر لیا۔ اس نے عالیان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھے تھے اور وہ انہیں نرمی سے تھپک رہا تھا۔

دوسری طرف امرحہ سائی کے سامنے کھڑی تھی۔ دونوں ہال کے بیرونی گیٹ کے باہر کھڑے تھے۔

"ابھی وہ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارا اس سے ملنا ٹھیک نہیں ہے۔" سائی نے قدرے سختی سے کہا۔ ایسی سختی سے۔ جو اس کے مزاج کا خاصا نہیں تھی۔

"وہ غصے میں نہیں تکلیف میں ہے سائی! میں نے سب نیک نیتی سے کیا۔ میرا یقین کرو۔"

"نہیں' تم نے نیک نیتی سے نہیں سنگدلی سے کیا۔ اپنے لیے کیا امرحہ! تمہیں اپنے خاندان کے لیے اس کا خاندان چاہیے تھا۔ تمہیں اس سوال کا جواب معلوم کرنا تھا کہ وہ جائز ہے یا ناجائز۔ تمہیں اس پر ایک لیبل چاہیے تھا۔ "اس کے خاندانی ہونے کا۔"

تم ہر بات میں مجھ سے مشورہ کرتی ہو نا امرحہ! تم نے اس بات کو لے کر مجھ سے مشورہ کیوں نہیں کیا' اگر تم مجھ سے پوچھتیں تو میں تمہیں منع کر دیتا۔ امرحہ اتنی سیدھی سی بات تم نہیں سمجھ سکیں کہ خاندان لاپتا نہیں ہوا کرتے وہ خود کو لاپتا کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی اس کا باپ تھا تو وہ اب تک کہاں تھا۔ اس نے بے سہارا بچوں کے ادارے میں پرورش کیوں پائی۔ ایک دوسری خاتون نے اس کی ماں ہونے کا فریضہ کیوں ادا کیا اور اسی خاتون نے اس کے باپ کو اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا۔ وہ اسی حالت سے ڈرتی تھیں جس حالت میں اب عالیان ہے۔ تم تھوڑی سی عقل استعمال کرتیں تو سب سمجھ جاتیں۔"

امرحہ کی آنکھوں نے اس کی ذات کے اندر کی ویرانیاں بہت تفصیل سے دیکھیں۔

"میں اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے لیے ہر حد سے گزر گئی۔"

"ہر حد سے۔ ہاں تم گزر گئی۔ اور دیکھو اسے کتنی تکلیف ہوئی۔ کیا کبھی تمہیں عالیان نے کوئی تکلیف دی۔"

اس نے ناں میں سر ہلانا فرض جانا۔

"امرحہ! پہلے تم خود یہ فیصلہ کر لو کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔ جب اس نے تمہیں پرپوز کیا تو تم نے کہا تم اس سے محبت کرتی ہو' لیکن اس محبت کو اپنا سکتی ہو نہ اس کا اعلان کر سکتی ہو۔ تمہیں اس سے الگ رہنا ہے۔ پھر تم نے کہا کہ تم اس کے بغیر نہیں رہ سکتیں اور تم اپنے گھر والوں سے بات کرنا چاہتی ہو۔"

"میں نے دادا سے بات کی تھی۔" اس کی روح نے اس کے جسم کو اکیلا چھوڑنا شروع کر دیا۔

"امرحہ۔! ایک سیدھی سی بات ہے وہ جہاں ہے جیسا ہے۔ تمہیں اسے ایسے ہی قبول کرنا ہے۔ تم اس کے معاشرتی رتبے کو بدل کر ہی اسے اپنا نہیں سکتیں۔ یہ منافقت ہو گی۔ تم ایسے اس کا حساب کتاب نہیں کر سکتیں۔ یہ کوئی کھیل نہیں ہے کہ جب تم کھیل سکو تو ٹھیک' ورنہ تم چھوڑ کر چلی جاؤ کہ تم نہیں جیت سکتیں۔ اور جاتے جاتے تم اسے ہرا جاؤ۔ کبھی غور کیا ہے امرحہ کہ تم نے اس شخص کا کیا حال کر دیا ہے۔ تم سے پہلے وہ اور کارل سب کا ناک میں دم کیے رکھتے تھے۔ پڑھنے کے علاوہ جو انہیں دوسرا کام ہوتا تھا وہ شرارتیں تھا' یہاں سے جانے والا ہر اسٹوڈنٹ یونیورسٹی کو بھول سکتا ہے لیکن اسے نہیں۔ اس کی ایک زندگی تھی ہنستی مسکراتی' کھلکھلاتی ہوئی۔ اور تم نے خود یہ قبول کیا تھا کہ تم جانتی تھیں کہ وہ تمہیں کس قدر پسند کر رہا ہے اور تم نے یہ ہونے دیا۔ تم کیا اختتام چاہتی ہو اب اس سارے قصے کا امرحہ۔ کہ سب ٹھیک ہو جائے۔ تم امرحہ پہلے خود کو ٹھیک کرو۔ فیصلہ کرو اور خود کو سناؤ۔"

سائی ذرا دیر کے لیے رکا۔

"لیکن اس سے پہلے میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ فی الحال عالیان سے دور رہو۔"

امرحہ نے گیلی ہو چکی دل کی دھرتی سے آنکھیں اٹھا کر سائی کو دیکھا۔ "ہر طرف سے اسے دور رہنے کے فیصلے سنائے جا رہے تھے۔"

"اس کے فادر اسے پہلے سے ہی ڈھونڈ رہے تھے۔"

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔ لیڈی مہر نے مجھے بتا دیا تھا سب۔ جب اتنے عرصے تک وہ انہیں عالیان سے دور رکھتی رہیں تو تم نے یہ کامیابی انہیں کیوں حاصل کرنے دی۔

تمہیں لگا کہ وہ عالیان کے ساتھ ٹھیک نہیں کر رہیں؟ اسے اس کے باپ سے ملنے نہیں دے رہیں؟"

"ہاں۔" اس نے سچ بولا۔

"جب تم نے مجھے بتایا تو میں نے دعا کی کہ یہ حرکت تمہارے حق میں جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ امرحہ ہم میں سے کون ہے جو تمہارا برا سوچتا ہے۔ تمہیں ہماری کوئی ایک بات تو ماننی چاہیے تھی۔"

سائی کتنا ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ دادا کے پاس چلی جائے اور انہیں سمجھائے۔ لیکن اسے یہ خوف تھا کہ دادا اسے واپس ہی نہیں آنے دیں گے۔

"پہلی بار مجھے دکھ ہوا امرحہ! کہ میں ایک سخت دل انسان کا دوست ہوں۔"

"اس کے جدا ہونے کے خیال سے میرا دل سخت ہو گیا۔" اس نے اپنا جرم مان لیا۔

"اس نے خود کو ویرا کے قریب کیوں ہو جانے دیا۔" یہ وہ دکھ تھا جو اسے ساری زندگی نہیں بھولنے والا تھا جو اس کی آخری سانس تک اسے بنجر کیے رکھنے والا تھا۔

"تم نے اسے دور کیوں ہو جانے دیا۔؟"

"اس کی محبت میرے لیے اتنی جلدی ختم ہو گئی؟"

"اب تمہاری محبت اس کے لیے ایک دم سے اتنی جاگ اٹھی کہ تم یہ سب کر گزریں۔ یا تمہیں یہ سوچ کر سکون ملتا رہا ہے کہ وہ محبت تو تم سے ہی کرتا ہے نا۔ اور تمہیں یہ دکھ ہوا کہ وہ کسی اور کی طرف کیوں متوجہ ہوا۔ اسے تمہارے پیچھے ہی رہنا چاہیے تھا اور پھر جو چاہے تم اس کے ساتھ کرتیں۔ ویرا نے خود اسے پرپوز کیا اس نے اسے بڑھاوا نہیں دیا تھا۔ وہ اس کا دوست تھا۔ اگر ــــ محبت کو ایک طرف رکھ دیا جائے۔ تو امرحہ اور ویرا میں سے عالیان کے لیے بہتر کون ہے۔ میں چاہوں گا تم اس بارے میں بھی سوچو۔"

امرحہ نے سیاہ ــــ پتلیاں غیر مرئی نقطے سے ہٹا کر سائی کی طرف دیکھا اور دیکھتی ہی رہی۔ "ویرا" اسے کچھ وقت لگا یہ نام بڑبڑانے میں۔

"ہاں اگر محبت کو ایک طرف رکھ دیا جائے تو امرحہ میں کیا ہے؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

"کتنی ہی امرحہ ہوں گی دنیا میں۔ لیکن کتنے بہت سے عالیان نہیں ہوں گے۔"

"پال کے حملے کے بارے میں جب ہمارے ہال میٹ نے بتایا تو ہم سب پیٹ پر ہاتھ رکھے شاہ ویز اور کارل کے تھیٹر پر ہنس رہے تھے اور اسی وقت اس کی ہنسی ایسے رک گئی جیسے دوبارہ وہ کبھی نہیں ہنس سکے گا' وہ ساری رات نہیں سو سکا امرحہ۔ جے پیٹرسن نے تین لوگوں کی ڈیوٹیاں نہیں لگائی تھیں اس نے لگائی تھیں۔ وہ کارل اور ویرا' کتنی ہی راتیں تمہیں خاموشی سے گھر تک بحفاظت چھوڑ کر آتے رہے' انہوں نے ظاہر کر کے تم پر احسان نہیں جتایا۔ تمہاری ہمت' بہادری' حکمت کو انہوں نے صرف تمہارا ہی رہنے دیا۔ تمہیں ایسے لوگوں کی قدر کرنی چاہیے۔ تمہیں ان کے ماضی کے بدنما داغوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے۔ وہ جہاں ہیں جیسے ہیں' تمہیں قبول کرنا چاہیے۔ امرحہ ہم سب نے ہارٹ راک میں چلنے والی ریکارڈنگ سنی اور کبھی یہ ظاہر نہیں کیا کہ ہم نے کچھ سنا ہے۔ اور تم نے۔ تم نے اب تک کیا کیا؟"

"دعائیں۔ بس دعائیں۔"

"میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا ہے۔"

"اسے میرے آنے کے بارے میں مت بتانا سائی۔!"

"میں ضرور بتاؤں گا۔ لیکن تم ابھی گھر جاؤ۔ میرا لہجہ اور انداز برے ہو سکتے ہیں لیکن میرا مقصد غلط نہیں ہے۔"

"میں جانتی ہوں سائی۔ لیکن میرے آنے کے بارے میں تم اسے نہ بتانا۔ میرے دادا کبھی نہیں مانیں گے۔ اور اب تو عالیان بھی نہیں مانے گا۔ میں اس کے لیے "کوئی نہیں" بھی نہیں رہی اب۔ اور وہ اپنی جگہ ٹھیک ہے اور وہ پہلے بھی غلط نہیں تھا۔"

"میں چاہتا ہوں تم پرسکون رہو۔"

"ہاں میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ لیکن چاہنے سے سب کہاں ہوتا ہے۔"

"تم گھر جاؤ آرام کرو۔"

"ہاں مجھے آرام کرنے کی ہی راہیں ڈھونڈنی پڑیں گی اب۔!"

وہ گھر آئی تو پولیس کی ایک گاڑی کھڑی تھی اور اندر آفیسر لیڈی مہر کے پاس بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔

"عالیان کا باپ آیا تھا امرحہ۔" سادھنا اس کے قریب آئی۔

"دونوں میں بہت دیر بات چیت ہوتی رہی' پھر پولیس بلوانی پڑی۔" سادھنا اس کی شکل پر کچھ کھوج رہی تھی۔

"تم نے ٹھیک نہیں کیا امرحہ۔" اس نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

امرحہ کے پشتاوے پر یہ بات "آخری سل جو آ گری اور امرحہ پوری کی پوری دفن ہو گئی۔

لیڈی مہر نے بہت سرد نظروں سے امرحہ کو دیکھا اور جو تھوڑی بہت قوت امرحہ میں بچی تھی وہ بھی جاتی رہی۔ اس کا جی چاہا دیوار پر ٹنگی بندوق اتار کر اس میں کارتوس بھر کر اپنی کھوپڑی اڑا دے۔ اور بس پھر سب ٹھیک۔

☆ ☆ ☆

ایک لڑکی ہے امرحہ....
کشمیر کے سبزہ زار سی....
پرستان کے گلاب سی....
زمرد جڑے عطردان سی....

وہ کمرے میں آ گئی اور بیڈ پر بیٹھ گئی پھر اٹھ گئی وہ اتنی پتھر جگہ پر نہیں بیٹھ سکی پھر وہ کرسی پر بیٹھی اور اسی ایک تکلیف کو محسوس کرتے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے واش روم میں بہت دیر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اس کے گال کی سرخی پھر بھی مدہم نہ ہوئی۔

وہ کمرے میں جگہ بدل بدل کر بیٹھنے لگی اور آخری وقت میں وہ کرسی کے پیچھے' نیچے کونے میں خود کو محفوظ سمجھنے لگی.... اس کی کیفیات میں کوئی سودائی حلول کر گیا اور اس کی ہوش مندی کو کوئی وحشی لے اڑا.... اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے لیا.... اسے بہت دیر تک اپنے زندہ رہ جانے کے خیال سے خوف آیا۔

ایک لڑکی ہے امرحہ....
نافرمان کی بددعا سی....
ساحر کے جلال سی....
اور موت کے الہام سی....

اس کی زندگی کہیں بہت لمبی نہ ہو جائے" اس پر یہ خیال کوڑے برسانے لگا۔

"تم کتنی ظالم ہو امرحہ؟"

"ہاں میں بہت ظالم ہوں.... مجھے اب معلوم ہوا کہ میں بہت بری ہوں.... میں نے اب ٹھیک ٹھیک خود کو پہچان لیا ہے۔"

زمین کا وہ کونا.... مشرق.... اس کی مٹی کی زرخیزی میں ہی "بنجرپن" کی گانٹھیں گندھی ہیں۔

مشرق کا یہ کونا امرحہ.... اس کی زرخیز جڑوں میں گندھی گانٹھیں کھلنے لگیں اور اس پر اس کا بس نہ چلا' اور وہ اس بس نہ چل سکنے پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کئی گھنٹے ایسے ہی گزر گئے.... رات نے اپنا سفر نا تمام کرنے کی قسم اٹھا لی اور قسم نے نہ ٹوٹنے کا عہد باندھ لیا.... ساری نزاکتیں اس کے اندر دم توڑنے

لگیں اور سارے ارمان خود کو خود دفنانے لگے۔۔۔ وہ روتی رہی اور پریم روگی جڑیں اس میں سے پھوٹنے لگیں۔

میز پر رکھا اس کا فون کب سے بج رہا تھا' رات کے تین بجے تھے۔۔۔ فون بہت دیر تک وقفے وقفے سے بجتا رہا۔

"امرحہ! تمہارے دادا کا فون ہے۔ تم فون کیوں نہیں اٹھا رہیں' وہ بہت پریشان ہو رہے ہیں۔" بہت دیر تک اس کا دروازہ بجانے کے بعد سادھنا تیز آواز میں چلانے لگی۔

"وہ کہہ رہے ہیں' انہیں تم سے ابھی بات کرنی ہے وہ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ شاید ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔ امرحہ کہاں ہو۔۔۔ امرحہ۔۔۔ دروازہ کھولو۔"

اپنا منہ صاف کر کے امرحہ نے ذرا سا دروازہ کھول کر یہ کہنا چاہا کہ ان سے کہہ دے کہ وہ سو رہی ہے اور کل دن میں بات کرے گی' لیکن سادھنا کے ہاتھ میں لیپ ٹاپ تھا اور دادا سامنے ہی تھے۔

دادا نے اسے دیکھا اور جیسے کسی خدشے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ اس سے ناراض تھے اور کتنے ہی دنوں سے اس سے بات نہیں کر رہے تھے۔ آج انہیں کسی پل چین نہیں آ رہا تھا' ان کی آنکھوں سے آنسو اپنے آپ گر رہے تھے۔

"امرحہ!" وہ اس کا نام لے کر آگے بولنا ہی بھول گئے۔

سادھنا لیپ ٹاپ کو میز پر رکھ کر بہت دکھ سے امرحہ کو دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

"تم ٹھیک ہو؟" دادا کو نظر آ گیا تھا پھر بھی پوچھا۔

"بالکل!" اس نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا ہے اور تمہارا چہرہ۔۔۔؟"

"ٹھیک تو ہے سب۔۔۔" کہہ کر وہ جیسے مسکرائی' دادا پر بجلی سی گری۔

"نہیں مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا۔" دادا نے ہمت کر کے کہہ دیا۔

"کیوں۔۔۔ اب آپ کو ٹھیک کیوں نہیں لگ رہا۔۔۔ اب ہی تو سب ٹھیک ہوا ہے۔۔۔ میں نے آپ کے لیے سب ٹھیک کر دیا ہے۔۔۔ اب آپ کو فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم ناراض ہو مجھ سے؟" اس کی حالت کے مقابلے میں یہ سوال انہیں بہت بودا لگا۔

"نہیں۔۔۔ ناراض تو آپ مجھ سے ہو سکتے ہیں۔۔۔ میں نہیں۔۔۔ یہ حق مجھے کہاں دیا گیا ہے۔۔۔"

"تم طنز کر رہی ہو مجھ پر؟"

"یہ گستاخی میں کیسے کر سکتی ہوں؟"

"تمہیں کیا ہوا ہے امرحہ' مجھے بتاؤ' میں سوتے سے اٹھ بیٹھا۔۔۔ میرا دل بند ہو جانے کو ہے۔۔۔"

"آپ کو معلوم ہے دل بند ہو جانا کسے کہتے ہیں؟" آنسو آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"امرحہ۔۔۔" دادا۔ کانپ سے گئے۔

"مجھے معلوم کرنا ہے دادا! دل بند ہونا کسے کہتے ہیں' آپ کو بتانا ہی پڑے گا مجھے۔۔۔"

"جب۔۔۔ جب جان سے پیارا کوئی تکلیف میں ہو میری بچی۔" دادا کو بولنا پڑا۔

"اور جان سے پیارا کون ہوتا ہے؟"

"تم ہو مجھے جان سے پیاری۔۔۔ تم۔" ان کی اپنی آواز کانپ کر رہ گئی۔

"ہونہہ۔۔۔ دادا دل تب بند نہیں ہوتا جب جان سے پیارا تکلیف میں ہوتا ہے' یہ دل تب بند ہونے لگتا ہے جب کوئی جان سے پیارا جان چھڑا لیتا ہے۔۔۔ جب وہ خود سے دور کر دیتا ہے۔۔۔ جب وہ منہ پر تھپڑ مار دیتا ہے اور جب وہ۔۔۔ جب وہ کہتا ہے "جاؤ آج سے تم میرے لیے مر گئیں۔" اس کی کئی گھنٹوں تک رو چکی آنکھوں نے پھر سے خود کو آنسوؤں کے حوالے کر دیا۔

"امرحہ۔۔۔؟" دادا اتنا ہی بول پائے۔

"اور جاننا چاہیں گے کیا ہوتا ہے۔۔۔ جب وہ یہ کہہ دیتا ہے تو مر جانے کو دل چاہتا ہے۔۔۔ دل چاہتا ہے حلق میں ہاتھ ڈال کر سانسیں کھینچ لیں اور زندگی سے جڑا

ان کا تعلق کاٹ ڈالیں' جسم چیر کر دل باہر نکال پھینکیں' اور رگوں کو چھید کر ان میں دوڑتا خون بہا ڈالیں۔"

"امرحہ۔۔۔ کیا کرنے جا رہی ہو تم؟" دادا کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں اور اپنے بیڈ پر بیٹھے رہنا ان سے مشکل ہو گیا۔

"سنیں دادا' سب سنیں اب۔۔۔ میں آپ کو سب بتاتی ہوں۔" لیپ ٹاپ میز پر رکھا اور وہ سامنے نیچے آلتی پالتی جما کر بیٹھی تھی' اس نے اپنی ناک رگڑی اور ایک گہرا سانس لیا۔

"انسانوں کے ہجوم میں مجھے ایک انسان ملا۔۔۔ ایک انسان دادا۔۔۔ جانتے ہیں انسان کسے کہتے ہیں۔۔۔ جس کی آنکھوں میں احترام ہو اور الفاظ میں نرمی۔۔۔ جس کے اخلاق میں رحم دلی ہو اور مقاصد میں اعلا ظرفی۔۔۔ جو ساتھ ہو تو شان ہو ورنہ سب گمان ہو۔

ایسا انسان جو بولتا ہے تو زخموں پر مرہم رکھتا ہے اور نہ بولے تو زخم ہرے نہیں کرتا۔۔۔ جو احساسات پر کمندیں نہیں ڈالتا' بلکہ ان پر پھوار بن کر برستا ہے۔۔۔ وہ انسان دادا۔۔۔ مجھے ہمیشہ اپنی قسمت پر شک رہا تھا اور یہ شک اس انسان کے ملنے سے رشک ہو گیا۔ کبھی ملے ہیں آپ ایسے انسان سے؟ اس نے کبھی میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور سوال کیا بھی تو اتنا "مجھ سے شادی کرو گی؟"

"امرحہ! چپ ہو جاؤ میں نے کہا نا!" اس کی کیفیات میں کوئی سودائی حلول کر چکا تھا۔ اس سودائی سے دادا کو خوف آ رہا تھا۔

"کیوں چپ ہو جاؤں اب میں۔۔۔؟" وہ رو کر ہی بولی۔

"مجھے تکلیف ہو رہی ہے تمہارے انداز پر۔۔۔"

"آپ کو صرف مجھے دیکھ کر تکلیف ہو رہی ہے۔۔۔ صرف دیکھ کر۔۔۔ خوش قسمت ہیں آپ۔۔۔ آپ امرحہ نہیں ہیں۔۔۔"

"کیا ہوا ہے۔۔۔ تم کیا کرنے جا رہی ہو؟"

"ڈریں مت' میں مرنے نہیں جا رہی۔۔۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی' اس نے جب کہا تم میرے لیے مر چکی ہو۔۔۔ یہ کام تب ہی ہو گیا تھا۔"

"امرحہ! میری بات سنو خدا کے لیے۔"

"آپ چپ کر کے مجھے سنیں۔۔۔ خدا کے لیے آپ کو یہ شکوہ نہیں ہونا چاہیے کہ آپ سے سب کہا نہیں گیا۔ وہ اعلان سنیں جو مجھے بلندی پر چڑھ کر کرنا تھا۔۔۔ کل عالم کو اکٹھا کر کے۔۔۔ اب صرف ایک آپ کے سامنے کرتی ہوں۔۔۔" خشک ہونٹوں کو اس نے زبان سے گیلا کیا جیسے اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ اس حالت میں اس کا نام لیں۔

"مجھے انسانوں سے دلچسپی نہیں تھی۔۔۔ لیکن مجھے کیا پتا تھا انسانوں میں کوئی عالیان بھی ہے۔" دادا نے اپنے لب بھینچ لیے۔

"ہم مشرقی لوگ بہت عجیب ہوتے ہیں دادا' بیٹیوں کی رخصتی کے خیال سے ہی گھنٹوں روتے رہتے ہیں' اور ان کے دل کے ارمانوں کی رخصتی پر ایک آنسو نہیں بہاتے۔۔۔ ہمیں یہ مان رہتا ہے کہ ہماری اولاد ہمارا سر نیچا نہیں کرتی اور ہم یہ غرور حاصل نہیں کر پاتے کہ ہم نے اولاد کی خوشیوں کو نیچا ہونے نہیں دیا۔

دادا ہمارے سروں پر خاندان کی عزت کی پگڑیاں سجائی جاتی ہیں اور ہمارے دل کے تخت سونے رہ جاتے ہیں اور کوئی ان پر آہ بھی نہیں بھرتا۔ مشرقی عورت ارتقا کا ذریعہ کیوں ہے۔۔۔ خود ارتقا کیوں نہیں؛ ۔۔۔ یہ سوال میں نے خود سے کئی بار پوچھا اور خود کو یہ بھی بہلاتے بتایا کہ مشرق ایک گنجال خطہ ہے۔ فلسفیوں کے ان فلسفوں سے بھرا ہوا جن کے پیندے میں تعصب ہوتا ہے اور کنارے پر منافقت۔۔۔

آپ بھی وہی مشرقی فلسفی نکلے۔۔۔ میں نے آپ سے اس کی بات کی اور آپ نے مجھے چپ ہو جانے کے لیے کہا۔۔۔ یہ چپ کا تالا۔۔۔ اس کی چابی کہاں گم رہتی ہے۔۔۔ کبھی تو اس تالے کو کھلنے کی اجازت دیں'

ہمارے یہاں کی حکم کی پٹاریوں کے غلام جن بیٹوں پر ناچتے ہیں' ان بیٹوں کو کبھی تو توڑا جائے۔

اب آپ مجھے بتائیں کہ میں آپ کے خطے کے

کس حکیم کے پاس جاؤں کہ وہ میرے درد کو ٹھیک کر دے...... لیکن زخم پر مرہم رکھے، پر میرے تو جسم پر کوئی چوٹ ہی نہیں...... مجھے کسی بزرگ سے دم کروانا چاہیے کہ اب آنکھیں بند کرنے پر مجھے نیند آجایا کرے اور منہ کھولنے پر سانس...... ایک بات آپ ہی مجھے سکھا کر بھول گئے، جب میں نے اپنی ایک کالج کی دوست چھوڑ دی تھی، آپ نے کہا تھا قیمتی انسان روٹھ جائے تو تمہیں اپنے نقصان پر پشیمانی سے رونا چاہیے، چیزوں سے لاپروائی برتو اور انہیں گم کر دو...... قیمتی انسان کی پروا کرو اور انہیں گم نہ ہونے دو......"

اتنا کہتے کہتے وہ بیٹھے بیٹھے امرحہ سے برزن (بڑھی) ہو گئی...... جوانی قصۂ پارینہ ہو گئی۔

"دادا قیمتی انسان سے آپ کا مطلب "حسب نسب والا قیمتی انسان" ہو گا...... اور باقی سب بے کار...... ہے نا...... میں نے آپ سے کہا تھا میری زندگی ختم ہو رہی ہے، مجھے آگے زندگی نظر نہیں آ رہی...... اور کس طرح کہتی دادا! کہ آپ سمجھ جاتے...... ایک انسان آپ کے سامنے اپنے ختم ہونے کی نشانیاں بیان کرتا ہے اور آپ کہتے ہیں آپ کی سماعت پر گراں گزر رہا ہے...... میں یہاں آ رہی تھی تو آپ نے کہا ہمت سے کام لینا، ہر مشکل کا مردانہ وار مقابلہ کرنا...... اور اس...... اس جدائی کا...... اس کا مقابلہ میں نے سکندرانہ وار بھی کیا تو بھی شکست میرا ہی مقدر رہو گی...... میں ختم ہونا شروع ہو گئی ہوں اور اس عمل کی تکمیل میں بہت وقت نہیں لگے گا...... آپ دادا......" اس نے آہ بھری۔

"آپ چاہتے تھے میں آپ کے سامنے ڈٹ جاؤں یا آپ چاہتے تھے میں دو میں سے ایک کا انتخاب کر لوں تو دادا میں نے آپ کا انتخاب کر لیا، میں ڈٹ سکتی تھی، اکیلے ہی فیصلہ کر کے آگے بڑھ سکتی تھی، لیکن میں نے آپ کے مان سمان کو گرنے نہیں دیا...... میں نے اپنے ساتھ برا کر لیا، لیکن آپ کے ساتھ برا نہیں ہونے دیا، آپ ایک اچھے انسان ہیں...... میں بھی...... وہ بھی...... ہم تین اچھے انسان ایک دوسرے کے لیے اچھے نہیں ہو سکے۔"

اس کی بھیگی آواز خشک تر ہو گئی تھی۔

"اب میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں، اپنا دل نکال کر میں آپ کو دے دوں یا اسے کہیں باہر پھینک دوں کیونکہ اب یہ مجھے زندہ رکھنے کے بجائے مار ڈالے گا۔"

"امرحہ تم...... تم کیا کرنے جا رہی ہو......؟"

"ڈریں نہیں دادا...... میں خودکشی نہیں کروں گی...... اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، اب مجھے طبعی موت مرنے میں ویسے بھی زیادہ وقت نہیں لگے گا......"

"میری حالت پر رحم کرو امرحہ!" دادا نے ہاتھ جوڑ دیے۔

"آپ نے میری حالت پر رحم کیا...... بالکل ٹھیک نہیں کیا آپ نے میرے ساتھ...... کتنی معمولی وجہ تھی، جس پر میں پہلے خودکشی کر چکی ہوں...... اور اب میرے ہاتھ میں وہ معمولی وجہ بھی نہیں رہی جو مجھے زندہ رکھ سکے......"

سادھنا امرحہ کے کمرے کا دروازہ بجا رہی تھی جو وہ لاک کر چکی تھی۔ سادھنا کے ہاتھ میں فون تھا اور فون پر دادا تھے جو سادھنا کی منت کر رہے تھے کہ وہ اندر اس کے پاس جائے...... اس کے پاس جو آلتی پالتی مارے کسی پرچھائیں کی طرح اپنے آپ بولتی جا رہی تھی، بولتی جا رہی تھی۔

☼

(کیا عالیان کی زندگی میں ویرا کو امرحہ برداشت کر پائے گی۔ یہ صدمہ اس کا دل سہ پائے گا؟ عمر بھر کا پچھتاوا دادا جان کا مقدر ہے؟)

باقی کے واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔

مریم عزیز

وہ پائپ ہاتھ میں لیے گنگناتے ہوئے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ جب اسے اپنے نام کی پکار سنائی دی تھی۔

"پاپا! اتنی جلدی آ گئے۔" وہ پائپ کیاری میں رکھ کر تیزی سے کچن کے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ جالی کا دروازہ کھول کر جب وہ اندر داخل ہوئی، سلطان صاحب کچن میں ہی کھڑے تھے۔

"السلام علیکم پاپا!"

"وعلیکم السلام کہاں چلی گئی تھیں، کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"یہیں تھی پاپا! پیچھے لان میں پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ آج آپ جلدی آ گئے۔"

"ہاں، آج ساجد بھائی نے آنا تھا مجھے پتا تھا۔ میری بیٹی اکیلی ہو گی۔ سوچا چلو اس کی کچھ ہیلپ کروا دوں۔"

وہ ہنس پڑی تھی۔

"میری ہیلپ کے لیے سکینہ تھی۔ میرے ساتھ دوسرا مجھے کوکنگ آتی ہے پاپا! آپ نے مجھے بالکل ہی نکما سمجھ لیا ہے۔"

"چائے بنانی آتی ہے۔ آملیٹ بھی بنا لیتی ہو گو بھی گوشت بھی بنا لیتی ہو۔ اتنا مجھے پتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کچھ آتا ہے تو بتاؤ۔" ان کا انداز چیلنج کرتا ہوا تھا۔

"اوکے!" اس نے جیسے ان کا چیلنج قبول کیا تھا۔ "یہ دیکھیں "فرائی فش" بنائی ہے اور میں نے بنائی ہے۔" اس نے سینے پر انگلی رکھ کر کہا "اور یہ کوفتے۔"

مکمل ناول
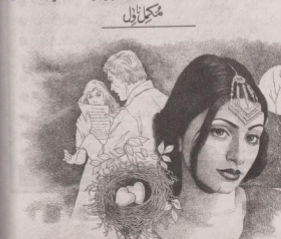
"واہ بھئی! یہ تو کمال ہو گیا۔" وہ بے ساختہ خوش ہو کر بولے۔
"لیکن ایک بات بتا دوں کوفتے ریڈی میڈ ہیں۔" اس کے بتانے پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔
"بھلے ریڈی میڈ ہوں بنائے تو میری بیٹی نے ہیں نا۔ سکینہ کدھر گئی ہے؟"
"اسے میں نے پاس کی بیکری میں بھیجا ہے آئس کریم لانے۔"
"ہوں گڈ!" میں ذرا فریش ہو کر آتا ہوں" تب تک تم چائے بناؤ۔ دونوں باپ بیٹی پیتے ہیں اور ساتھ میں گپ شپ کرتے ہیں۔"
وہ سر ہلا کر چولہے کی طرف مڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ بڑے انہماک کے ساتھ اپنے نوٹس بنانے میں مصروف تھی جب سکینہ دروازہ کھول کے اندر آئی تھی۔
"وہ آپ کے تایا جی آگئے ہیں۔" اس کے برا سا منہ بنا کر اطلاع دینے پر عائشہ کو ہنسی آگئی تھی۔ "ان کو اپنے گھر چین نہیں' آتے بھی اس وقت ہیں جب کھانے کا وقت ہوتا ہے۔"
"چلو غصہ چھوڑو' کھانا تو تم بنا چکی ہو نا!" عائشہ باہر آئی تھی۔
"السلام علیکم!" لاؤنج میں داخل ہوتے ہی اس نے سلام کیا۔
"وعلیکم السلام۔" وہاں موجود تین لوگوں میں سے دو نے جواب دیا تھا اور وہ اس کے تایا اور اس کا کزن سعد تھا جو اس کو بالکل پسند نہیں تھا اور اس کی تائی زبیدہ جنہوں نے اس کے سلام کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ وہ اسے پسند نہیں کرتی تھیں۔ اسے بھی وہ پسند نہیں تھیں سو وہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے تایا جی کی طرف بڑھی اور ان سے پیار لے کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔
"اور عائشہ بیٹی! کیا کر رہی ہو آج کل۔"
"کچھ خاص نہیں تایا جی! صبح کالج پھر گھر یہی روٹین ہے۔"
"تو بیٹا! سارا دن بور نہیں ہوتیں' کبھی ہماری طرف بھی چکر لگا لیا کرو سلطان بھی کم ہی آتا ہے۔ میں ہی آجاتا ہوں۔"
وہ ان کے شکوے کے جواب میں صرف مسکرا ہی سکتی تھی۔ کیونکہ جو جواب اس کے پاس تھا۔ انہیں پسند نہ آتا۔
"ابو جی! دراصل ہماری کزن کا اسٹینڈرڈ نہیں کہ وہ ہمارے چھوٹے سے گھر میں آئے۔" یہ اس کے کزن سعد نے تبصرہ کیا تھا۔
عائشہ کی مسکراہٹ سکڑ گئی تھی اور اس کا چہرہ دیکھ کر تایا جی نے زبردست گھوری سے نوازا تھا۔ تائی جی کو شاید اپنے بیٹے کی شان میں یہ گستاخی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بھی کٹیلے انداز میں بولی تھیں۔
"ہاں تو سعد غلط کیا کہہ رہا ہے۔ کب آتی ہے عائشہ ہماری طرف۔ اتنی دفعہ بلایا ہے یہ ہم ہی ہیں جو ڈھیٹوں کی طرح ان سے ملنے آجاتے ہیں۔" عائشہ کو ایک دم بہت غصہ آیا تھا۔
"زبیدہ!" ساجد صاحب نے غصے سے ان کا نام لیا تو وہ جو مزید بولنے کا ارادہ رکھتی تھیں' منہ میں ہی بدبدا کر رہ گئیں تب ہی سلطان صاحب کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر کچن میں آگئی۔ سکینہ تیزی کے ساتھ کام نپٹا رہی تھی۔
"سکینہ! تم یہ برتن ڈائننگ ٹیبل پر لگاؤ۔ میں یہ سلاد بناتی ہوں۔" اس کے ہاتھ سے چھری لے کر اس نے اسے ڈائننگ روم بھیجا تھا۔
سلاد کاٹ کر اس نے کباب بھی فرائی کر لیے۔ اب وہ ڈش میں انہیں نکال کر یونہی کھڑی تھی۔ اس کا موڈ بالکل آف ہو چکا تھا اور اس کا اندر جانے کا بالکل دل نہیں کر رہا تھا۔
"باجی!" وہ اپنی سوچ میں تھی جب سکینہ کی آواز پر چونکی۔
"سب چیزیں رکھ دی ہیں اور سب بیٹھ گئے ہیں۔ بڑے صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔"
"ہوں!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی "سکینہ! تم ایسے مت جانا۔ کھانا یہیں کھا لو۔"
"جی باجی!" وہ تابعداری سے سر ہلا کر کاؤنٹر کی طرف مڑ گئی۔
"عائشہ بیٹا! کہاں ہو۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اب کے سلطان صاحب نے خود اسے آواز دی تھی اور وہ جانتی تھی۔ ایک تو وہ اس کے بغیر کھانا نہیں کھاتے اور اب وہ نہ گئی تو وہ خود آجائیں گے وہ اندر کی طرف بڑھ گئی۔
کھانا کھانے کے بعد اس نے چائے اور بسکٹ ٹرالی میں سیٹ کیے اور سکینہ کو ٹرالی لاؤنج میں لانے کا کہہ کر خود لاؤنج میں آگئی۔ سب کو چائے سرو کر کے وہ سلطان صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔
"سلطان! تم تو اچھے خاصے ہنس مکھ ہو۔ زرینہ بھی بڑی خوش مزاج اور ملنسار تھی۔ عائشہ تو تم دونوں سے بالکل مختلف ہے۔" زبیدہ بیگم نے ابرو اچکا کر ایک دفعہ پھر عائشہ کی ذات کو ہدف بنایا تھا۔
"آپ کی غلط فہمی ہے بھابھی! میری بیٹی بہت خوش مزاج ہے۔ بس بات اتنی سی ہے کہ اس کا دل کسی کسی سے ملتا ہے۔" سلطان صاحب کو غصہ تو بہت آیا تھا لیکن جواب انہوں نے کافی ٹھنڈے انداز میں دیا تھا اور ان کے جواب پر عائشہ کے ہونٹوں پر خود بخود مسکراہٹ آگئی تھی۔
"بالکل ٹھیک کہا تم نے سلطان! ہماری عائشہ واقعی بڑی اچھی بچی ہے۔" ساجد صاحب نے ایک دم بات کو سنبھالا تھا۔ "خیر تم یہ بتاؤ سلطان وہ جو آرڈر تھا جس کا تم بتا رہے تھے کہ وہ پے نہیں کر رہے' انہوں نے پے منٹ دی یا نہیں۔"
"نہیں بھائی جی! ابھی تک تو نہیں۔ الٹا روز روز دھمکیاں ملتی ہیں۔" سلطان صاحب کے کہنے پر عائشہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔
"تم نے پولیس کو تو اطلاع نہیں کی؟"
"نہیں ابھی تو نہیں کی لیکن اب لگتا ہے ان کی مدد لینی ہو گی۔"
"نہیں نہیں۔" ساجد صاحب تیزی سے بولے۔ "پولیس کو انوالو نہ کرو' وہ مزید تنگ کریں گے۔ میں نے تم سے کہا بھی تھا سعد کو ساتھ رکھ لو۔ بیٹا کوئی ہے نہیں تمہارا اور اتنی دولت ہے۔ لوگ اس لیے بھی شیر ہو جاتے ہیں۔" ان کی بات سن کر سلطان صاحب مسکرا دیے تھے۔
"اب اتنا بھی اندھیر نہیں پڑا بھائی صاحب! آپ پریشان نہ ہوں' میں ہینڈل کر لوں گا۔" ساجد صاحب نے ایک نظر سعد پر ڈالی اور خاموش ہو گئے۔

"عائشہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"
"ان شاءاللہ جلد ہی خوش خبری سنیں گے آپ؟" ان کے مسکرا کر جواب دینے پر نہ صرف ان سب نے بلکہ عائشہ نے بھی چونک کر انہیں دیکھا تھا۔
"کیا مطلب کیا تم نے طے کر لیا ہے۔" ساجد صاحب کی آواز میں پریشانی تھی۔
"جی یہی سمجھیں۔ لڑکا بہت اچھا ہے؟" سلطان صاحب مطمئن لہجے میں بولے۔
اب کی بار عائشہ پریشان ہو گئی تھی اس کے پاپا تو اس سے چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ڈسکس کرتے تھے اتنی بڑی بات اس کی زندگی کا فیصلہ انہوں نے اکیلے کر لیا۔ اس سے پوچھا بھی نہیں۔
"چلیں ابو!" سعد ایک دم کھڑا ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ تایا جی اور تائی بھی کھڑی ہو گئی تھیں۔ سلطان صاحب ان کو رخصت کرنے باہر چلے گئے تھے۔ وہ وہیں صوفے پر بیٹھی رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو تمہاری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی۔ اپنی زبان کو لگام کیوں نہیں دیتیں تم۔" ساجد صاحب نے پیچھے مڑ کر غصیلی نظر اپنی بیوی پر ڈالی جواباً انہوں نے بھی غصے سے اپنے سرتاج کو دیکھا۔
"نہ ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟"
"تمہیں کیا ضرورت تھی عائشہ کے بارے میں الٹی سیدھی بکواس کرنے کی۔"
"کچھ تو خدا کا خوف کھائیں ساجد! میں نے کیا الٹا سیدھا کہا۔ اس جیسی مغرور بدمزاج لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔"
"اور کیا ابو! وہ کزن ہے میری لیکن مجال ہے اس نے کبھی سیدھے منہ بات کی ہو۔" اب کے ڈرائیو کرتا ہوا سعد بھی جلے ہوئے انداز میں بولا تھا' اسے چاچو کی دولت اور اپنی خوب صورتی کا کچھ زیادہ ہی مان ہے۔"
"اچھا بس زیادہ فضول بولنے کی ضرورت نہیں نہ تو وہ مغرور ہے نہ بدتمیز جس طرح کی تم طنزیہ گفتگو کرتی ہو' زبیدہ بیگم! اچھا خاصا بندہ تم سے دور ہو جائے۔"
"ابو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ اس کی اتنی طرف داری کیوں کرتے ہیں۔" اب کے سعد ناراضی سے بولا۔
"انسان کبھی تو عقل سے کام لیتا ہے۔ کیا تم لوگ نہیں جانتے۔ میں کیا چاہتا ہوں تم لوگ میرا بنا بنایا کام خراب کرو گے۔"
"ہونہہ!" ان کی بات ــــ سمجھ کر زبیدہ نے ہنکارا بھرا تھا "جو آپ سوچ رہے ہیں وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ سلطان کبھی بھی اپنی بیٹی کا رشتہ آپ کے بیٹے کو نہیں دے گا۔" زبیدہ نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ساجد صاحب کو دیکھا۔
"منہ اچھا نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیا کرو" زبیدہ بیگم تلملا کر رہ گئی تھیں۔
"آپ کی بھتیجی کی تو اچھی شکل ہے نا تو کر لیں پھر بات۔ آپ کو جب ٹکا سا جواب ملے گا تو ہو جائے گی تسلی بھی۔" انہوں نے ناراضی سے کہتے ہوئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"تم اپنی چونچ بند رکھو۔ میں خود سب سنبھال لوں گا۔" اب کی بار کوئی نہیں بولا تھا۔ گاڑی میں مکمل خاموشی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے!" وہ اپنے دھیان میں بیٹھی تھی جب سدرہ زوردار آواز میں بولتی ہوئی دھپ سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔
"کیا بدتمیزی ہے یہ؟" عائشہ نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
"تمہیں کیا ہوا ہے؟ یہ منہ کیوں بنا رکھا ہے؟"
"کچھ نہیں یار! کل تایا جی آئے تھے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔
"ہاں تو اس میں نیا کیا ہے۔"
"نیا وہ ہے جو میں نے سنا۔ مجھے پاپا کئی دن سے

پریشان لگ رہے تھے۔ وہ تو کل پتا چلا کہ کوئی انہیں دھمکیاں دے رہا ہے۔ دوسرے پاپا نے کسی کو میرے لیے پسند کر لیا ہے۔"
"ہیں!" سدرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"میں رات سے بہت پریشان ہوں۔"
"بات ہے تو پریشانی والی۔ کیا یہ پتا نہیں چلا کہ کون لوگ ہیں جو دھمکیاں دیتے ہیں۔"
"بزنس رائیول ہی ہو سکتے ہیں۔"
"ہوں اور وہ جو پسند کیا ہے' وہ کون ہے۔"
"پتا نہیں۔ میں سن کر اتنی شاکڈ ہوئی تھی کہ کچھ پوچھ ہی نہیں سکی۔ پاپا! مجھ سے پوچھے بغیر میری زندگی کا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں انہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں اپنی عادت کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کرتی کجا کہ ایک انجان اور ایسا شخص جیسے میں جانتی بھی نہیں اس کے ساتھ ساری زندگی.... اور سدرہ! شاید پاپا کی خوشی کے لیے میں ایسا کر بھی لیتی اگر حذیفہ میری زندگی میں نہ ہوتا۔"
"حذیفہ کو بتایا اس بارے میں؟"
"نہیں۔ اور میں اسے بتانا بھی نہیں چاہتی۔ پہلے میں پاپا سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"
"ہوں تو اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ مجھے یقین ہے۔ انکل نے اگر ایسا کہا ہے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہو گی۔" عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عائشہ!" دستک کے بعد اس کے نام کی پکار سنائی دی تو وہ جو اوندھے منہ لیٹی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"کیا بات ہے بیٹا! پاپا کب سے اپنی گڑیا کا انتظار کر رہے ہیں۔"
"سوری پاپا! مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ بال سمیٹتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ سامنے صوفے پر بیٹھ کر غور سے اسے دیکھنے لگے۔
"طبیعت ٹھیک ہے؟"
"جی!"
"پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ میں آفس سے آیا ہوں اور مجھے میری گڑیا کا چہرہ نظر نہیں آیا۔" عائشہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے جن کو چھپانے کے لیے اس نے سر جھکا لیا تھا۔
"عائشہ! تم جانتی ہو' تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں۔ بولو' کیا بات ہے۔" اس نے نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا تو ایک کے بعد دوسرا آنسو اس کی آنکھ سے نکلا وہ ایک دم پریشان ہو کر اس کے پاس آئے تھے۔
"عائشہ میری جان! کوئی بات ہوئی ہے' کسی نے کچھ کہا ہے۔" وہ اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔
"پاپا! کل آپ تایا جی سے کہہ رہے تھے۔ آپ نے میرے لیے کسی کو پسند کر لیا ہے۔ آپ نے مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔" اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ پہلے تو وہ سمجھے ہی نہیں اور جب بات سمجھ میں آئی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ عائشہ نے ناراضی سے انہیں دیکھا۔
"بس اتنی سی بات!"
"یہ اتنی سی بات نہیں ہے پاپا!" اب کے وہ سنجیدگی سے بولی تو سلطان صاحب کو بھی سیریس ہونا پڑا۔
"تم سعد سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"
"جی.... !" وہ ان کے سوال پر بے حد حیران ہوئی تھی اور اگلے ہی پل بڑے بے ساختہ انداز میں اس کا سر نفی میں گھوما تھا۔
"تو بس اس لیے کہا تھا۔ ساجد بھائی پہلے بھی کتنی بار باتوں باتوں میں یہ بات کر چکے ہیں اور اس وقت بھی مجھے لگا' یہی بات کرنے والے ہیں۔" اور عائشہ کو لگا اس کے دل سے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹا ہو۔
"پاپا! آپ کو پتا ہے۔ میں کل سے کتنی پریشان ہوں.... آپ کم از کم مجھے تو بتا دیتے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے مسکرا کر انہیں دیکھا۔
"اور اگر سچ مچ ایسی بات ہوئی عائشہ! جیسے میں نے کہا ہے تو؟"

"چھوڑیں ناں پاپا! ایسا ہے تو نہیں نا۔" اب وہ کافی ہلکی پھلکی ہو چکی تھی۔

"چلیں کھانا کھاتے ہیں اور مجھے پتا ہے۔ آپ نے بھی نہیں کھایا ہو گا۔" وہ ان کا بازو تھام کر انہیں اٹھاتے ہوئے بولی۔

☼ ☼ ☼

"ہائے!" کی آواز پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا جہاں حذیفہ کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"ہائے!" جواباً وہ مسکرا کر بولی۔

"کیسی ہو؟" وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیسی لگ رہی ہوں۔"

"ہمیشہ کی طرح خوب صورت۔"

"اچھا بس۔" عائشہ نے اسے ٹوک دیا۔ "کل کیوں نہیں آئے تھے؟"

حذیفہ کی مسکراہٹ مدھم پڑ گئی "بس ایسے ہی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور تم بتاؤ تم میرا فون اٹینڈ کیوں نہیں کر رہی تھیں اور نہ ہی میسج کا جواب دے رہی تھیں۔"

"بس ایسے ہی موڈ ٹھیک نہیں تھا۔" اس کے بتانے پر حذیفہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"بدلہ لینے میں تو تمہارا کوئی ثانی نہیں۔"

"ایسی ہی ہوں میں۔"

"جیسی بھی ہو، مجھے اچھی لگتی ہو۔" وہ شرارت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پتا ہے۔" وہ کھڑی ہو گئی تو حذیفہ بھی ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" اسے کلاس روم کی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"ظاہر سی بات ہے کلاس لینے۔" وہ پیچھے مڑ کر جتاتے ہوئے انداز میں بولی۔

"ہاں۔ لیکن میں نہیں جا رہا مجھے گھر جلدی جانا ہے اور ہو سکتا ہے میں دو تین دن تک نہ آؤں۔" وہ کہتے ہوئے اپنے موبائل پر میسج بھی چیک کر رہا تھا۔

مسلسل خاموشی پر اس نے سر اٹھایا۔ عائشہ بڑے سنجیدہ انداز میں اسے گھور رہی تھی۔

"کیوں کیا ہوا؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں اتنی غیر حاضری کی وجہ؟"

"یار! گھر میں کچھ کام ہے۔"

"کیا کام؟" وہ باقاعدہ جرح پر اتر آئی تھی۔

"ہے نا بس۔" وہ کچھ جھنجلا کر بولا تو عائشہ غصے سے مڑی تھی۔

"حذیفہ تم مجھ سے کس انداز میں بات کر رہے ہو"

"آئی ایم سوری عائشہ! مجھے پتا ہے، تمہیں برا لگا ہے، لیکن یار میں بہت پریشان ہوں۔" حذیفہ کے تاثرات اتنی بے چارگی لیے ہوئے تھے کہ اسے اپنا غصہ ایک طرف رکھنا پڑا۔

"مجھے پتا ہے تم پریشان ہو اور اسی لیے مجھے غصہ آ رہا ہے کہ تم مجھے کیوں نہیں بتا رہے۔ حذیفہ نے گہرا سانس لیا۔

"گھر میں کچھ پرابلم ہے۔"

"کیا؟" حذیفہ بتانے کے بجائے نظریں چرانے لگا۔

"پاپا کا آپریشن ہے۔ ستر ہزار کی ضرورت تھی۔ تیس ہزار کا انتظام ہو گیا ہے لیکن چالیس ابھی باقی ہیں اور ڈاکٹر آپریشن تب کریں گے جب فل اماؤنٹ جمع کروائی جائے گی۔"

اب کی بار عائشہ نے گہرا سانس لیا "حذیفہ! اتنی سی بات کے لیے تم پریشان ہو رہے ہو۔" حذیفہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"عائشہ! چالیس ہزار... تمہارے لیے معمولی بات ہو گی لیکن ہمارے لیے یہ ایک بہت بڑی رقم ہے۔" ایک لمحے کے لیے عائشہ چپ کی چپ رہ گئی پھر بولی۔

"میرا مطلب وہ نہیں تھا حذیفہ! لیکن تم مجھ سے ڈسکس کرتے تو اتنی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ میں کل تمہیں چالیس ہزار روپے دے دوں گی۔"

حذیفہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "نو عائشہ! میں اسی لیے تمہیں نہیں بتا رہا تھا۔ میرا ضمیر بالکل گوارا نہیں کرے گا کہ میں تم سے رقم لوں۔"

"ہوں تو تم کیسے ارینج کرو گے؟" اس کے سوال پر وہ بالوں میں انگلیاں چلانے لگا۔

"بھائی بھی کوشش کر رہے ہیں اور میں بھی۔ دیکھو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"اور اگر کچھ نہ ہوا تو کیا انکل اتنے دن تکلیف میں رہیں گے۔ نہیں حذیفہ! تمہیں یہ پیسے لینے ہوں گے۔"

"لیکن عائشہ! مجھے بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔"

"بس حذیفہ!" وہ دو ٹوک انداز میں بولی تو حذیفہ مسکرا کر رہ گیا۔

"اوکے۔ میں اتنی بڑی رقم ایسے نہیں لے سکتا۔ تمہیں ضرور واپس کروں گا لیکن تھوڑا وقت لگے گا۔" عائشہ نے سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ آج شہزادی صاحبہ نے مجھ غریب کے گھر آنے کی زحمت کیسے کی؟" سدرہ نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"شہزادی صاحبہ کا موڈ تھا کہ غریب لوگوں کے گھر جایا جائے۔" وہ بے نیازی سے بولی تو سدرہ حسب عادت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آج تم کالج نہیں آئیں تو سوچا تمہاری خیر خیریت پتا کرتی چلوں۔" سدرہ مسکرائی۔

"گھر میں بہت خاموشی ہے۔" عائشہ نے خاموشی محسوس کر کے پوچھا۔

"ہاں سب باہر گئے ہیں اور علینہ سو رہی ہے اس نے اپنی چھوٹی بہن کا نام لیا "تم بیٹھو میں کچھ کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

"نہیں چھوڑو۔ میرے پاس بیٹھو۔"

"رکو بس پانچ منٹ میں آتی ہوں۔" سدرہ کے جانے کے بعد اس نے گہرا سانس لیا اور دل میں الفاظ ترتیب دینے لگی جو بات وہ کرنے آئی تھی اور پورے پانچ منٹ بعد سجی ہوئی ٹرالی کے ساتھ سدرہ اس کے سامنے تھی۔

"واہ بڑی فاسٹ سروس ہے۔" عائشہ بشاش لہجے میں بولی۔

"کیک لو نا!" اس کو آہستہ آہستہ کانٹے سے کباب کھاتے دیکھ کر سدرہ نے کہا۔

"نہیں یار! دل نہیں کر رہا۔" سدرہ نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"اب وہ بات کہہ دو جس کو کہنے کی تم کب سے کوشش کر رہی ہو۔"

عائشہ کو حیرت نہیں ہوئی۔ پاپا کے بعد ایک وہی تھی جو اسے سمجھتی تھی۔

"مجھے بیس ہزار کی ضرورت ہے۔" سدرہ کو جھٹکا لگا تھا۔

"مگر کیوں؟" عائشہ ہونٹ کاٹنے لگی تھی۔

"حذیفہ کو پیسوں کی ضرورت ہے۔" سدرہ منہ سے کچھ نہیں بولی تھی لیکن اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"اس نے نہیں مانگے میں خود اس کی مدد کرنا چاہ رہی ہوں اس کے فادر سیریس ہیں اور آپریشن کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ وہ کافی پریشان ہے اور مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"تم بہت غلط کر رہی ہو عائشہ! اسے پیسے مانگنے کے لیے تم ہی نظر آتی ہو۔"

"اس نے مجھ سے کوئی ڈیمانڈ نہیں کی۔ میں نے خود فورس کیا تھا کہ وہ مجھ سے پیسے لے لے۔ وہ تو نہیں لے رہا تھا۔"

سدرہ نے غصے سے سر جھٹکا۔ "اس کی شرٹ پرانی ہو گئی تو تمہیں فکر لگ جاتی ہے۔ اس کا موبائل گم ہو گیا تو یہ بھی تمہارا فرض ہے کہ تم اسے چالیس ہزار کا موبائل خرید کر دو، تمہارا بس چلے تو شاید اپنا بنگلہ بھی اس کے نام لکھ دو۔"

"سدرہ پلیز۔ میں یہاں تمہاری لعنت ملامت سننے نہیں آئی۔ پچاس، ساٹھ ہزار، میرے لیے کوئی مسئلہ

نہیں۔ میں دے سکتی ہوں لیکن میرا اور پاپا کا جوائنٹ اکاؤنٹ ہے۔ میں وہ آؤٹ آف ریزن (بلا کسی وجہ) اتنے پیسے نہیں نکال سکتی۔ اس لیے تمہارے پاس آئی تھی بیس ہزار تم دے دو' باقی میں کر لوں گی۔" وہ اپنا ہینڈ بیگ پکڑ کر کھڑی ہو گئی تو سدرہ نے تیزی سے اس کا بازو تھام لیا اور اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا۔

"میں نہ تو تم پر لعنت ملامت کر رہی ہوں اور نہ ہی طنز۔ میں تمہیں بس سمجھا رہی ہوں۔ یہ جو تم کر رہی ہو یہ غلط ہے۔"

"سدرہ! میں نہ تو بچی ہوں اور نہ نادان نا سمجھ۔ تم جانتی ہو میں حذیفہ کو پسند کرتی ہوں۔"

"اور تم یہ بھی جانتی ہو نا کہ تمہارے اور حذیفہ کے اسٹیٹس میں کتنا فرق ہے۔ انکل جنہوں نے تمہیں شہزادیوں کی طرح پالا ہے۔ وہ حذیفہ کے ساتھ تمہاری شادی کے لیے نہیں مانیں گے۔ تمہاری اور حذیفہ کے لائف اسٹائل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

عائشہ ایک پل کے لیے خاموش ہو گئی تھی "مجھے پتا ہے سدرہ لیکن میں پاپا کو منا لوں گی اور جیسا تم حذیفہ کے بارے میں سوچتی ہو' ویسا کچھ نہیں ہے اسے میری دولت سے کچھ غرض نہیں۔ وہ مجھ سے پیار کرتا ہے۔"

"تم پچھتاؤ گی' عائشہ! میں نے اس کی آنکھوں میں لالچ دیکھا ہے۔ کبھی اسے آزما کے دیکھنا۔"

"مجھے اس پر پورا یقین ہے۔" سدرہ اس کے پریقین انداز پر اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"اب بولو دے رہی ہو یا نہیں؟" سدرہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

"کل کالج لے آؤں گی ابھی نہیں ہیں میرے پاس۔" سدرہ ناراضی سے بولی جبکہ عائشہ مسکراتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی۔

"مجھے پتا تھا' میری دوست کبھی مجھے انکار نہیں کر سکتی۔" تب ہی اس کے موبائل پر بیل ہوئی تھی "پاپا آ گئے" اسکرین دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔

"کل یاد سے لے آنا۔" کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ یاد دہانی کروانی نہیں بھولی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر دیکھا۔

پاپا بستر پر نیم دراز تھے اور ایک البم ان کے آگے کھلا تھا۔

"پاپا! آجاؤں؟" اس نے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"آؤ بیٹا! اس میں پوچھنے والی کیا بات ہے۔" وہ کہنے کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ ان کو دیکھتی ہوئی سامنے بیٹھ گئی۔

"میں ٹھیک ہوں گڑیا!" وہ مسکرا کر بولے۔

"پر مجھے تو ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کتنے دن سے دیکھ رہی ہوں آپ کچھ پریشان ہیں۔"

"تمہارا وہم ہے۔ یہ بتاؤ کیا کر رہی تھیں۔"

"مووی پر آپ کا ویٹ کر رہی تھی۔ آپ نہیں آئے تو دیکھنے آئی تھی۔ سو تو نہیں گئے۔"

"لیٹا تو سونے کے لیے تھا پر نیند نہیں آئی۔ تمہارا بچپن یاد آ رہا تھا تو یہ البم لے کر بیٹھ گیا۔ یہ تصویر دیکھو یہ تم چھ ماہ کی ہو اور تمہاری ماں دیکھو۔ کتنی خوش تھی تمہیں گود میں لیے۔"

بار بار دیکھی ہوئی تصویروں کو وہ پھر سے اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا پاپا کہ میں ماما کی طرح خوب صورت ہوں۔" تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

"نہیں ہم اپنی ماما سے زیادہ خوب صورت ہو۔" وہ ہنس کر البم کا اگلا صفحہ پلٹنے لگی۔

"پاپا! ایک بات پوچھوں؟"

"ہوں" "ماما کی ڈیتھ بہت ارلی ایج میں ہو گئی تھی۔ آپ بھی تب ینگ تھے پھر بھی آپ نے شادی نہیں کی۔"

"کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔"

"لیکن پھر بھی پاپا! مجھے پتا ہے۔ آپ ماما سے بہت پیار کرتے تھے لیکن ماما کے بعد آپ کو حق تھا کہ آپ شادی کرتے ہمیں جب آپ کو چپ اداس دیکھتی ہوں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔"

اس کی بات پر وہ ہنس پڑے تھے "اب اس عمر میں تو میں شادی کرنے سے رہا۔"

"پاپا! مذاق میں میری بات کو نہ ٹالیں۔ آئی ایم سیریس۔" وہ منہ بسور کر بولی۔ "یہ سچ ہے ہمیں تمہاری ماں سے بہت پیار کرتا تھا' میرا دل نہیں مانتا تھا کہ میں اس کی جگہ کسی اور کو دوں لیکن سب سے بڑی وجہ تم تھیں۔ میں تمہیں سوتیلے پن کا درد نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوتیلے پن کا درد برداشت کیا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اس درد سے آشنا ہو۔"

"لیکن پاپا! تایا جی تو آپ سے بہت پیار کرتے ہیں اور آپ نے کبھی انہیں سوتیلا نہیں کہا۔"

"وہ تو میں اب بھی نہیں کہہ رہا لیکن ان کی والدہ نے کبھی مجھے اپنا بیٹا نہیں سمجھا۔ وہ اذیتیں جو انہوں نے مجھے دی تھیں۔ اب بھی اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی جب مجھے یاد آتی ہیں تو میں کانپ جاتا ہوں۔"

"چھوڑیں پاپا!" انہیں ڈپریس دیکھ کر اس نے موضوع بدل دیا۔

"یہ کون ہے پاپا؟" اس نے ایک گروپ فوٹو پر انگلی رکھی تھی۔

"یہ" سلطان صاحب نے مسکرا کر اس تصویر کو دیکھا "یہ میرا بیسٹ فرینڈ نوازش اور یہ اس کی وائف نوازش تمہاری ماما کا کزن بھی تھا۔"

"یہ اب کہاں ہیں پاپا! میں نے تو اتنے سالوں سے کبھی انہیں نہیں دیکھا۔"

"تمہاری مما کی ڈیتھ کے بعد یہ لوگ امریکہ چلے گئے تھے۔ میرا فون پر ان سے رابطہ تھا۔ اب نوازش کا فون آیا تھا کہ وہ لوگ پاکستان آ رہے ہیں۔"

عائشہ نے حیرت سے ان کی خوشی دیکھی "میں نے پہلے آپ کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا۔"

"ہاں۔ میں واقعی بہت خوش ہوں کیونکہ وہ میرا دوست' میرا ہمدرد ہمراز ہے۔ اس سے میں اپنی ہر پریشانی شیئر کر سکتا ہوں۔"

"پاپا! آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ ایسا کیا ہے جو آپ مجھ سے نہیں اپنے اس دوست سے شیئر کرنا چاہتے ہیں جن سے آپ سالوں سے نہیں ملے۔"

"ارے میری جان! ایسا کچھ نہیں۔ بس اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں نا تو جلدی گھبرا جاتا ہوں۔ بس ہر وقت تمہاری فکر ہی رہتی ہے اور تمہارے معاملے میں میں کسی پر بھی بھروسا نہیں کر سکتا۔ سوائے نوازش کے اور اس کے آتے ہی میں تمہارے فرض سے سبک دوش ہو جاؤں گا۔"

"پاپا! آپ کو ہر وقت میری شادی کی فکر کیوں رہتی ہے۔ کیا میں آپ کو اتنی بری لگتی ہوں کہ آپ کا دل چاہتا ہے۔ میں آپ سے دور چلی جاؤں۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

سلطان صاحب نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا "عائشہ! میں کب چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے دور جاؤ بس کسی نقصان سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں' تم کو کسی مضبوط ہاتھوں میں سونپ جاؤں جو تمہارا مجھ سے زیادہ خیال رکھے۔ مجھ سے زیادہ پیار کرے۔"

"پاپا! ایسا اس دنیا میں کوئی نہیں جو مجھے آپ کی طرح پیار کرے۔"

"ہے ایسا ایک گھر جہاں سب تمہیں پیار کریں گے۔" ان کی مسکراتی آواز پر وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"نوازش اور سلمیٰ نے جب تم چھوٹی تھیں تب ہی مجھ سے اور زرینہ سے تمہیں مانگ لیا تھا۔"

"پاپا؟" حیرت کی شدت سے اس کے آنسو جم کر رہ گئے۔

"یہ بات میں تمہیں بہت پہلے بتانا چاہتا تھا لیکن مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دن جب تم نے میری بات پر یوں ری ایکٹ کیا تو مجھے لگا یہ بات تمہیں پہلے بتا دینی چاہیے تھی تاکہ تم ذہنی طور پر تیار رہتیں۔ لیکن خیر دیر تو اب بھی نہیں ہوئی۔" وہ کتنی دیر خاموشی

سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔
"عائشہ!" ان کے پکارتے ہی جیسے وہ پھٹ پڑی تھی۔
"آپ ایسے کیسے سوچ سکتے ہیں پاپا! ایک بات جو کبھی بچپن میں کی گئی تھی۔ آپ اسے میری زندگی بنانا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ اتنے سالوں سے باہر ہیں۔ کیا جانتے ہیں آپ ان کے بارے میں۔ ان کے بیٹے کے بارے میں۔ اس کی کوالیفکیشن کیا ہے؟ وہ کرتا کیا ہے؟ دکھتا کیسا ہے؟ اس کی عادتیں کیسی ہیں؟ وہ فنانشلی کیسے ہیں؟ کچھ پتا ہے آپ کو؟" اس کا چہرہ ضبط کے مارے سرخ ہو گیا تھا۔
"عائشہ!"
"نہیں پاپا! آپ میری بات سنیں۔ آپ مجھے جان کہتے ہیں اور مجھے اندھے کنویں میں دھکیلنا چاہتے ہیں صرف یہ کہ وہ آپ کے دوست کا بیٹا ہے چاہے وہ ڈرگ ایڈکٹ ہو' چور ہو' سمگلر ہو کہیں ویٹر ہو سویپر ہو۔ ٹیکسی ڈرائیور ہو لیکن میں اس سے شادی کر لوں کیونکہ وہ آپ کے دوست کا بیٹا ہے۔ پاپا میں آپ کی ہر بات مان سکتی ہوں لیکن یہ نہیں۔ جس انسان کو میں نے کبھی دیکھا نہیں جسے میں جانتی نہیں' اس سے میں کیسے شادی کر سکتی ہوں۔" وہ کھڑی ہو گئی تھی۔
"عائشہ!" انہوں نے اسے آواز دی تھی لیکن وہ کمرے سے نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

عجیب سا احساس تھا جس نے اس کے سوئے ہوئے اعصاب کو بیدار کیا تھا لیکن اپنی دکھتی آنکھوں کو کھولنے کے لیے اسے کافی تکلیف کا سامنا کرنا پڑا تھا اس کے قریب رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا اور پتا نہیں کب سے بج رہا تھا کیونکہ اس کے ہاتھ بڑھانے پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل تھاما۔ دس مسڈ کالز تھیں وہ بھی حذیفہ کی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہاتھ میں پکڑا موبائل ایک بار پھر بج اٹھا۔ آنے والی کال حذیفہ کی تھی۔

"ہیلو' ہیلو عائشہ! کب سے فون کر رہا ہوں۔ ریسیو کیوں نہیں کر رہیں اور کالج کیوں نہیں آئیں۔"
"ہاں۔ بس ایسے ہی۔" اب کی بار دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔
"کیا بات ہے' تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔"
"ہوں۔ رات سے طبیعت ٹھیک نہیں۔ تم بتاؤ سدرہ نے تمہیں پیسے دے دیے تھے۔"
"ہاں مل گئے تھے۔ تھینک یو ویری مچ عائشہ! میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"
"اٹس او کے حذیفہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ بعد میں تم سے بات کروں گی۔"
"او کے ٹیک کیئر۔" حذیفہ نے بھی مزید بات کیے بغیر فون بند کر دیا۔ وہ اب بھی چت لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔ بیدار ہوتے ہی ساری سوچیں پھر سے دماغ پر حاوی ہونے لگی تھیں۔ دستک پر اس نے سامنے دیکھا جہاں سکینہ کھڑی تھی۔
"اٹھ گئیں باجی آپ؟" اس کے مسکرا کر پوچھنے پر وہ صرف "ہوں" کر کے رہ گئی۔
"ناشتا بناؤں آپ کے لیے۔" وہ اس کے کمرے میں بکھری چیزیں سمیٹتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
"نہیں ابھی نہیں۔ پاپا چلے گئے۔"
"جی وہ ان کا فون آیا تھا مگر مجھے کہہ کر گئے تھے کہ آپ کو ناشتے کے بغیر کالج نہ جانے دوں۔" عائشہ کتنی دیر غائب دماغی سے سامنے دیکھتی رہی۔
"پاپا نے ناشتا کیا؟" تھوڑی دیر بعد اس نے سکینہ سے پوچھا جو جھک کر میگزین اٹھا رہی تھی۔
"انہوں نے کبھی آپ کے بغیر ناشتا کیا ہے۔" سکینہ کے جتاتے ہوئے انداز پر اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔
"جاؤ۔ میرے لیے چائے بناؤ میں آتی ہوں۔" وہ سکینہ سے کہہ کر خود واش روم میں گھس گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"باجی! سدرہ باجی آئی ہیں۔" وہ بڑی بے دلی کے ساتھ ٹی وی دیکھ رہی تھی جب سکینہ کی اونچی آواز پر اس نے لاؤنج کے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے سدرہ اور سکینہ داخل ہو رہی تھیں۔ اس کے اندر آتے آتے سدرہ نے بغور اس کا جائزہ بھی لے لیا تھا۔
"کسی اینگل سے نہیں لگ رہا کہ تم بیمار ہو تو کالج سے آف کرنے کا مطلب؟"
"نہ سلام نہ دعا اور آتے ہی تم نے چڑھائی کر دی۔" عائشہ نے برا مانتے ہوئے کہا۔
"سکینہ! تم کھانا لگاؤ ہم آتے ہیں۔" سکینہ کے جاتے ہی سدرہ بول پڑی تھی
"اگر تم نے مجھے یہ پوچھنے کے لیے بلایا ہے کہ میں نے حذیفہ کو پیسے دے دیے ہیں تو اس کا جواب ہاں ہے اور اپنی تسلی کے لیے تم اس کو فون کر کے کنفرم کر سکتی ہو۔" عائشہ نے سامنے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر جھلاتی مطمئن بیٹھی سدرہ کو غصے سے دیکھا۔
"میں نے تم سے کچھ بھی ایسا پوچھا؟" سدرہ نے کندھے اچکائے۔
"کہا تو نہیں پر مطلب تو وہی تھا نا" اب کی بار عائشہ کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔
"دفع ہو جاؤ تم اسی وقت۔" عائشہ سرخ چہرہ لیے کھڑی ہو گئی تھی۔ "ایک تو میں اتنی پریشان ہوں اور اوپر سے تمہاری بکواس بند نہیں ہو رہی اور یہاں آ کر تم نے جو مجھ پر احسان کیا ہے۔ اس کے لیے مجھے معاف کرو۔" آخر میں اس کی آواز بھرا گئی' کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی جبکہ اس دوران سدرہ پوری آنکھیں کھولے "ہیں ہیں" کرتی رہ گئی اور پھر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھولتے ہی وہ اسے دونوں ٹانگیں صوفے پر رکھے بیٹھی نظر آئی جبکہ چہرہ اس نے جھکا رکھا تھا۔ وہ گہرا سانس لیتی ہوئی اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔
"عائشہ!" اس کے بلانے پر بھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس کے ہلتے ہوئے وجود سے اسے اندازہ ہوا وہ رو رہی ہے۔

"عائشہ! ادھر دیکھو میری طرف۔" سدرہ نے اب زبردستی اس کا چہرہ اپنی طرف موڑا اور ایک لمحے کے لیے حیران رہ گئی۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ دونوں رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہے تھے۔
"ہوا کیا ہے' انکل تو ٹھیک ہیں نا۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ اسی طرح روتی رہی تو سدرہ کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔
"بولو عائشہ مجھے اب گھبراہٹ ہو رہی ہے انکل ٹھیک ہیں؟" اس نے بمشکل سر ہلایا سدرہ نے دونوں آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔
"تو پھر کیا ہوا ہے جو تم اتنا رو رہی ہو۔" اب کے سدرہ کے چہرے پر پریشانی کی جگہ الجھن نظر آ رہی تھی۔

"رات میری پاپا سے بات ہوئی تھی۔" اور رات کو جو جو سلطان صاحب نے اسے کہا اور بتایا تھا وہ سب عائشہ نے سدرہ کو بتایا تھا "تم بتاؤ۔ میں کیا کروں؟" وہ اب سدرہ سے پوچھ رہی تھی۔
"تم نے انکل کو حذیفہ کے بارے میں بتایا نہیں۔"

"میں وقت کا انتظار کر رہی تھی جب ہم اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کر لیتے اور حذیفہ کو جاب مل جاتی پہلے کی بات اور تھی اب پاپا کے دوست کا بیٹا درمیان میں آ گیا ہے مجھے نہیں پتا وہ کیسا ہے اس کا بس پلس پوائنٹ یہ ہے کہ وہ پاپا کے دوست کا بیٹا ہے ہو سکتا ہے وہ ویل آف بھی ہو' ویل ایجوکیٹڈ بھی ہو تو پاپا کو تو ریزن مل جائے گا حذیفہ کو ریجیکٹ کرنے کا جو میں نہیں چاہتی۔"
"یہ اچانک جو پاپا کے دوست کا بیٹا!" وہ یوں دانت پیس کر بولی جیسے پاپا کے دوست کا بیٹا اس کے دانتوں کے درمیان ہو سدرہ نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی بے ساختہ ہنسی کو روکا تھا۔ "کیا کروں میں؟" وہ دونوں ہاتھ ملتی ہوئی بے بسی سے بولی۔
"عائشہ تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ ایک دفعہ انکل کے دوست کے بیٹے سے مل لو" عائشہ نے غصے سے

اسے دیکھا۔
"تو اس سے کیا ہوگا؟"
"ہونا کیا ہے ہوسکتا ہے وہ تمہیں پسند آجائے آخر انکل نے اسے پسند کیا ہے' کوئی تو خاص بات ہوگی اس میں۔"
"وہ دنیا کا بہترین انسان ہو تب بھی مجھے اس سے شادی نہیں کرنی اور ملنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جہاں تک پاپا کی بات ہے وہ تو خود اس سے نہیں ملے یہ تک نہیں جانتے وہ کرتا کیا ہے' دکھتا کیسا ہے کچھ بھی نہیں جانتے بس اسی لیے کہ وہ ان کے دوست کا بیٹا ہے میں اس سے شادی کرلوں اور تم بھی ان ہی کی حامی ہو کیونکہ تمہیں بھی حذیفہ پسند نہیں۔"
"ٹھیک کہہ رہی ہو مجھے حذیفہ پسند نہیں کیونکہ تمہاری آنکھوں پر تو پسندیدگی کی پٹی بندھی ہے جبکہ ہمیں حقیقت صاف نظر آئی ہے لالچی دھوکے باز۔"
"سدرہ شٹ اپ" عائشہ نے ناراضی سے اسے ٹوکا۔
"کامیاب شادی شدہ زندگی کے لیے محبت اور انڈر اسٹینڈنگ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اور یہ دونوں باتیں حذیفہ میں ہیں۔" سدرہ نے سر جھکا۔ وہ سمجھ گئی تھی بحث کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ اس کی سمجھ پر پردہ پڑچکا تھا۔
"تو اس کا ایک ہی حل ہے تم انکل کو صاف صاف اپنی خواہش کے بارے میں بتادو۔ میرے خیال میں انکل کے نزدیک تمہاری خوشی سے زیادہ کچھ نہیں ہوگا۔"
عائشہ پرسوچ انداز میں اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی'
"پاپا مان جائیں گے؟" کچھ دیر بعد اس نے سدرہ سے پوچھا تھا۔
امید تو یہی ہے' سدرہ کے کہنے پر وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ پاپا سے ناراض تھی اور جانتی تھی وہ اسے منانے ضرور آئیں گے تو وہ آج ضرور ان سے حذیفہ کے متعلق بات کرے گی۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے الفاظ ترتیب دے رہی تھی جو اسے پاپا سے حذیفہ کی فیور میں کہنے تھے۔ گاڑی کا مخصوص ہارن بجتے ہی اس کے قدم رک گئے تھے اور وہ اضطرابی انداز میں انگلیاں موڑتے ہوئے منتظر نظروں سے دروازے کو دیکھنے لگی۔ لیکن کچھ دیر بعد اسے سلطان صاحب کے بجائے ساجد صاحب کی آواز سنائی دی تو وہ حیران ہوتی ہوئی باہر نکل آئی اور سامنے کا منظر اسے دہلانے کے لیے کافی تھا۔
"پاپا!" وہ تقریباً چیختی ہوئی ان کی طرف بڑھی تھی۔
"یہ کیا ہوا پاپا؟" ان کے بازو اور سر پر پٹی بندھی تھی اور چہرہ بے تحاشا زرد ہو رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے تھے اور آنکھیں بند کرکے صوفے کی بیک سے ٹیک لگالی تھی۔
"پاپا!" وہ ان کے کندھے کو ہلاتے ہوئے رو پڑی تھی۔ اس کے رونے پر انہوں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔
"میں ٹھیک ہوں عائشہ!" وہ جب بولے تو نقاہت ان کی آواز سے ظاہر ہو رہی تھی۔
"ہوا کیا ہے تایا جی؟" وہ اب صوفے کے پیچھے کھڑے ساجد صاحب سے پوچھ رہی تھی۔
"کچھ لوگوں نے۔"
"کچھ نہیں ہوا۔ گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔" اس سے پہلے ساجد صاحب کچھ بتاتے انہوں نے ٹوک دیا تھا۔
"عائشہ بیٹا! اپنے پاپا کے لیے کچھ کھانے کو لے کر آؤ اور سعد! تم چاچو کو ان کے کمرے میں لے جاؤ۔" اور اس نے چونک کر سامنے دیکھا تھا جہاں سعد کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ اتنی پریشانی میں بھی اس کے ماتھے پر بل پڑگئے تھے۔ نہ جانے اسے سعد سے اتنی نفرت کیوں تھی اور سب سے زیادہ اس کے دیکھنے کے انداز پر اندر تک اترتی گندی نظریں۔

وہ تیزی سے اٹھ کر کچن میں گئی تھی۔ فریزر سے گوشت نکال کر اس نے یخنی چڑھائی تھی جب وہ ٹرے لے کر دروازے کے قریب پہنچی تو اسے سلطان صاحب کی دھیمی آواز سنائی دی تھی۔
"بھائی صاحب! عائشہ کے سامنے کوئی بات مت کیجئے گا۔ وہ پریشان ہوگی۔"
"لیکن سلطان! اس کو پتا ہونا چاہیے۔"
"نہیں۔ میں ہینڈل کرلوں گا۔ بس اسے پریشان نہیں کرنا۔" وہ ٹرے ہاتھ میں پکڑے باہر کھڑی بری طرح الجھ گئی تھی۔
ایسی کیا بات تھی جو پاپا اس سے چھپا رہے تھے۔
"تم کہو تو سعد کو یہاں چھوڑ جاؤں؟" عائشہ کے ماتھے پر بل پڑگئے تھے۔ وہ دروازے کو دھکیلتے ہوئے اندر آگئی۔
"جیتی رہو۔ چائے کی بہت طلب محسوس ہو رہی تھی۔" چائے کا کپ انہیں پکڑا کر وہ سعد کی طرف بڑھی جس نے کپ تھامتے ہوئے اس کی انگلیوں کو بھی مَس کیا تھا۔ ایک کرنٹ تھا جو اس کے وجود کو لگا تھا۔ اس کی نظریں بے ساختہ انداز میں اس کی طرف اٹھی تھیں جو اسے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا جیسے اس نے اپنی اس حرکت کو انجوائے کیا ہو۔ عائشہ کے ہونٹ بھینچ گئے تھے تھپڑ مارنے کی چاہت وہ دل میں دبا گئی تھی۔
وہ یخنی کا پیالا لے کر سلطان صاحب کے پاس بیٹھ گئی۔
"ہاں سلطان! تم نے جواب نہیں دیا۔ سعد کو یہیں رہنے دوں۔" سلطان صاحب نے عائشہ کی طرف دیکھا جس نے بڑے غیر محسوس انداز میں سر نفی میں ہلایا تھا۔
"نہیں بھائی صاحب! اس کی ضرورت نہیں۔ میں اب ٹھیک ہوں اور اگر ضرورت ہوئی تو میں خود سعد کو فون کرلوں گا۔ گھر والی بات ہے۔"
"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ گھر والی بات ہے تمہارا اپنا خون ہے' بیٹا بن کر رہے گا تمہارا' جو میں نے تم سے بات کی ہے سنجیدگی سے سوچو اس بارے میں۔" کہنے کے ساتھ انہوں نے سلطان صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا تھا۔
عائشہ ان کی در پردہ باتوں کے پیچھے چھپے پوشیدہ معنی کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی لیکن خود پر جبر کیے خاموشی سے بیٹھی رہی۔ اسے اس وقت صرف اپنے باپ کی فکر تھی۔
سلطان صاحب کو مسلسل خاموش دیکھ کر ساجد صاحب کو غصہ تو بہت آیا تھا لیکن یہ وقت تحمل سے کام لینے کا تھا ورنہ بنا بنایا کھیل خراب ہوسکتا تھا۔
"کوئی بات ہو تو فون کردینا۔ اللہ حافظ!" ساجد صاحب کے نکلتے ہی سعد سلطان صاحب سے ہاتھ ملا کر چند لمحوں کے لیے اس کے قریب رکا تھا لیکن اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر اسے نہیں دیکھا تھا۔ مایوس ہوکر وہ باہر نکل گیا تھا۔
ان کے جاتے ہی اس کا خود پر کنٹرول ختم ہوگیا تھا اور آنسو نکل آئے تھے۔
"عائشہ روؤ نہیں بیٹا! مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"
"پاپا! آپ مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں بیٹا بتایا تو ہے گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔"
"جھوٹ میں نے گاڑی دیکھی ہے۔ بالکل ٹھیک ہے ایک خراش بھی نہیں آئی۔" ایک پل کے لیے سلطان صاحب کچھ بول ہی نہیں سکے۔
"بولیں پاپا!"
"رات میں تم سے نوازش کی بات کر رہا تھا۔ آج اس کا فون آیا کہ وہ پاکستان آگیا ہے' میں اس کے گھر جانے کے لیے آفس سے نکلا ہی تھا کہ چار پانچ لڑکے آئے اور مجھ سے پیسے اور موبائل مانگا۔ میری مزاحمت پر انہوں نے مجھے مارا پیٹا اور میرا والٹ اور موبائل چھین کرلے گئے' میں زمین پر پڑا تھا اتنی سکت نہیں تھی مجھ میں نہ ہل بھی سکوں۔ اسی وقت ساجد بھائی اور سعد آگئے۔"
عائشہ پریشانی سے ان کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اس

وقت ان کی حالت کی وجہ سے اتنی پریشان تھی کہ نوازش صاحب کے آنے کی خبر بھی اس نے سرسری انداز میں لی حتی کہ حذیفہ بھی اس کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پاپا! آپ کہاں جارہے ہیں۔" عائشہ نے حیرانی سے سلطان صاحب کو دیکھا تھا۔

"آفس" وہ کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئے تھے۔

"پاپا! کچھ دن تو آرام کر لیتے آپ۔"

"مجبوری ہے گڑیا! بہت ضروری کام ہے۔" انہوں نے آملیٹ کا ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جائیں گے کیسے؟"

"سعد کو بلوایا ہے۔" عائشہ نے برا سا منہ بنایا۔

"پاپا! آپ کوئی ڈرائیور کیوں نہیں رکھ لیتے۔ مجھے بالکل پسند نہیں سعد۔۔۔ کا آنا جانا۔"

"جانتا ہوں بیٹا!" انہوں نے اپنا موبائل ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"آپ تو جارہے ہیں آفس۔ میں گھر رہ کر کیا کروں گی۔ میں بھی کالج چلی جاؤں؟" وہ جو باہر کی طرف بڑھ رہے تھے تیزی سے مڑے تھے۔

"نہیں تم ابھی کالج مت جاؤ۔"

"پر کیوں پاپا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"بس کہا نا کچھ ارینج منٹ کرلوں پھر چلی جانا۔"

"کیا ارینج منٹ؟" وہ پوچھنا چاہتی تھی لیکن پھر ان کے آنے پر ٹال دیا اور انہیں لاؤنج سے اللہ حافظ کہہ کر ناشتے کی میز پر آبیٹھی۔ ابھی اس نے نوالہ منہ میں رکھا ہی تھا کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اسکرین پر حذیفہ کا نمبر دیکھ کر اس نے گہرا سانس لیا۔

"ہیلو۔" اس کے ہیلو کہتے ہی وہ بولا تھا۔

"کہاں ہو عائشہ؟"

"گھر پہ ہوں۔"

"تین دن ہو گئے۔ کالج کیوں نہیں آرہی ہو۔"

"بہت جلدی یاد آگیا تمہیں یہ۔" عائشہ کے طنزیہ

کچھ دیر کے لیے وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔

"آئی ایم سوری" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ساتھ ہی شکایت بھی کر ڈالی۔

"اگر میں نے فون نہیں کیا تو تم نے بھی تو فون نہیں کیا۔" عائشہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے۔

"میں کیوں تمہیں فون کرتی؟"

"میں نے سوری کہا نا عائشہ! پھر سے کہہ دیتا ہوں سوری۔" اب کی بار عائشہ کچھ نہیں بولی تھی۔

"اچھا اب تو بتا دو۔ آ کیوں نہیں رہیں؟"

"پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"اوہ! کیا ہوا تھا۔"

"بس فرکچھو تھا تم بتاؤ انکل کا آپریشن ہو گیا۔ کیسے ہیں وہ؟"

"ہاں الحمدللہ۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہیں بس پچھلے تین چار دن ہسپتالوں کے چکروں میں رہا۔ اس لیے بھی تمہیں فون نہیں کر سکا۔"

"ہوں۔" وہ ہنکارا بھر کر رہ گئی۔

"کل آؤ گی کالج؟"

"پتا نہیں۔"

"تم مجھ سے ناراض ہو؟"

"نہیں۔"

"تو پھر اتنا روڈلی کیوں بات کر رہی ہو۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔ بس پاپا کی طبیعت کو لے کر کچھ اپ سیٹ ہوں۔ چلو ٹھیک ہے حذیفہ فون رکھتی ہوں پھر بات ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اپنا خیال رکھنا بائے۔" فون بند کر کے وہ کتنی دیر ویسے ہی بیٹھی رہی۔

"باجی۔" سکینہ کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔

"کھانا بنا دیا ہے۔ اب جا رہی ہوں شام میں آؤں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" سکینہ کے جانے کے بعد وہ ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی اور پتا نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور دروازے کی گھنٹی پر کھلی تھی اس کی نظر گھڑی کی طرف گئی جہاں دوپہر کے دو بج رہے تھے۔

"اس وقت کون آگیا؟" وہ سوچتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھی تھی، دو تین دفعہ پوچھنے پر جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے گیٹ کھول دیا۔ سامنے مانگنے والا کھڑا تھا۔ اس کا حلیہ ایسا تھا کہ اگلے ہی پل اس نے ڈر کر دروازہ بند کر دیا۔ اب بیل کے بعد دستک بھی شروع ہو گئی تھی۔

"اس نے جان نہیں چھوڑنی۔" جب دستک کا سلسلہ طویل اور زوردار ہو گیا تو اس نے دس کا نوٹ پکڑا اور بڑبڑاتی ہوئی گیٹ کی طرف بڑھی لیکن اب کی بار اس نے پورا گیٹ کھولنے کے بجائے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر دس کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا لیکن جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے زور سے ہاتھ ہلایا۔

"پکڑو۔۔۔" جواب میں اس نے نوٹ کے بجائے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اس کے منہ سے بڑے بے ساختہ انداز میں چیخ نکلی تھی اور ہاتھ چھڑوانے کے لیے جب اس نے گیٹ کھولا تو مزاحمت کرتا اس کا ہاتھ حیرت کے مارے ساکت ہو گیا۔ کیونکہ سامنے اس خوفناک حلیے والے فقیر کی جگہ ایک ہینڈسم سا لڑکا کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" اس نے دوبارہ ہاتھ کھینچتے ہوئے غصے سے اسے دیکھا۔

"خود تو کہا تھا۔ پکڑو۔"

"میں نے ہاتھ پکڑنے کو نہیں کہا تھا۔"

"تو پھر۔" وہ اسی طرح ہاتھ تھامے پوچھ رہا تھا۔

"ہاتھ تو چھوڑیں میرا۔"

"او۔" اس نے ایسے پوز کیا جیسے اسے پتا ہی نہ ہو کہ وہ ہاتھ پکڑے کھڑا ہے۔

"یہ نوٹ پکڑنے کو کہا تھا۔" عائشہ نے نوٹ اس کے سامنے لہرایا۔ "میں سمجھی مانگنے والا ہے۔"

"واٹ۔" سامنے کھڑے شخص کو جھٹکا لگا تھا۔

"میں تمہیں بھکاری لگتا ہوں۔" اس کے انداز پر عائشہ کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی جسے اس نے سر جھکا کر ضبط کیا تھا اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا جو بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم اگر مجھے پسند نہ آئی ہوتیں تو اس بدتمیزی پر تمہیں مزہ چکھا دیتا۔"

"آپ ہوش میں تو ہیں۔ کیا کہہ رہے ہیں؟" اس کی جرات پر اسے غصہ آگیا اور وہ گیٹ بند کرنے لگی تو وہ جلدی سے بولا۔

"مجھے سلطان انکل سے ملنا ہے۔"

"وہ گھر پر نہیں ہیں۔"

"جانتا ہوں۔" اس نے کہنے کے ساتھ جھک کر بیگ اٹھایا اور گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ حیرت کی شدت سے اس کا منہ کھل گیا۔ اگلے ہی پل وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی جو لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی طرف جا رہا تھا۔

"ایکسکیوز می رکیے پلیز۔ آپ کیسے منہ اٹھا کر اندر جا رہے ہیں، تمیز نام کی کسی چیز کو جانتے ہیں آپ۔" اس پر وہ نہ صرف رک گیا بلکہ مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"منہ کے ساتھ ہی گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ آپ کیا منہ گیٹ پر رکھ کر اندر آتی ہیں۔"

"بدتمیز!" اس نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

"آپ ہیں کون؟ میں آپ کو نہیں جانتی۔"

"تو کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو تمہیں جانتا ہوں۔" اس کے انداز پر عائشہ ایک بار پھر اسے دیکھنے پر مجبور ہو گئی۔

"تم عائشہ ہو، انکل سلطان کی بیٹی۔" اس کا منہ کھل گیا تھا۔ اس نے اپنی یادداشت کا پورا استعمال کیا تھا، لیکن وہ اپنی ساری زندگی میں اس شخص سے نہیں ملی تھی۔

"منہ بند کرو۔ مکھی چلی جائے گی اور جاؤ اب جلدی سے کوئی شربت، کولڈ ڈرنک لے کر آؤ۔ اتنی گرمی میں آرہا ہوں اور تم نے باتوں میں لگا لیا ہے۔" کہہ کر وہ اندر بڑھ گیا تھا۔

"اوہ میرے خدا۔" وہ چکرا کر رہ گئی۔ اسے لاؤنج کا دروازہ کھولتے دیکھ کر وہ اس کے پیچھے بھاگی تھی سب سے پہلے اس نے سلطان صاحب کا نمبر ملایا تھا۔

"ہیلو پاپا!" ان کی ہیلو سنتے ہی وہ تیزی سے بولی۔
"پاپا! پتا نہیں گھر میں کوئی بد تمیز آدمی گھس آیا ہے؟"

"کون؟" دوسری طرف سلطان صاحب گھبرا گئے تھے۔
"پتا نہیں پاپا! پر وہ آپ کو بھی جانتا ہے اور مجھے بھی"۔

"نام کیا ہے اس کا؟"
"وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔" وہ ایک دم گھبرا کر بولی۔
"عائشہ بیٹا! آپ نے نام پوچھے بغیر اسے اندر بلا لیا؟" وہ کچھ برہمی سے بولے۔
"پاپا! میں نے نہیں بلایا۔ وہ زبردستی اندر آگیا اور اب کولڈ ڈرنک مانگ رہا ہے۔"
اس نے کن اکھیوں سے پیچھے دیکھا تو وہ وہاں دروازے سے ٹیک لگائے اس کی باتیں سن رہا تھا۔
اس کے خاموش ہونے پر وہ آگے بڑھا اور موبائل اس کے ہاتھ سے لے لیا۔
"اسلام علیکم انکل! احمد بات کر رہا ہوں۔"
"ٹھیک انکل اور خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔" کہہ کر وہ ہنس پڑا تھا۔
"انکل! نام پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ محترمہ مجھے بھکاری سمجھ کر دس روپے تھما رہی تھیں۔"
حیرت سے اس کا چہرہ دیکھتی عائشہ کو غصہ آگیا تھا۔
"نہیں انکل! حلیہ تو میرا ٹھیک تھا۔ لگتا ہے آپ کے محلے کے مانگنے والے بھی کافی ہینڈسم ہیں۔ اوکے انکل! میں آپ کا ویٹ کر رہا ہوں۔ لو بات کرو۔" اس نے فون اسے تھما دیا تھا۔
"جی پاپا!" وہ فون لے کر دوسری طرف چلی گئی تھی۔
"بیٹا! یہ احمد ہے میں نے اسے بلایا ہے تم اس کی خاطر مدارت کرو۔ میں تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں اور ڈرنے والی بات نہیں۔ بھروسے کا بچہ ہے۔" اس نے فون بند کر کے اس کی طرف دیکھا جو جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔
"آپ ٹھنڈا پییں گے یا گرم۔"
"اگر لیمن اسکواش ہے تو وہ نہیں تو کچھ بھی ٹھنڈا اپنے مزاج کی طرح گرم نہ لانا۔" عائشہ نے کچھ بھی کہنے کے بجائے صرف گھوری پر اکتفا کیا تھا وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آیا تھا۔
"تم گھر پر اکیلی ہوتی ہو؟" عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اسکوائش کی بوتل نکال کر گلاس میں ڈالنے لگی۔
"پڑھتی ہو۔" وہ اب بھی خاموش تھی۔
"مجھے پتا ہے تم گونگی نہیں ہو۔" عائشہ نے شربت والا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔
"تم نہیں پیو گی؟"
"یہ آپ نے کیا تم تم لگائی ہوئی ہے۔"
"اس لیے کہ تم مجھ سے چھوٹی ہو ویسے تمہاری عمر کیا ہے۔"
"اف۔" وہ پاؤں پٹختی ہوئی کچن سے باہر نکل گئی جبکہ اس نے مسکراتے ہوئے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ وہ ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی تو وہ اس کے دائیں صوفے پر آکر بیٹھ گیا۔ خود پر جمی اس کی نظروں سے اسے اچھی خاصی کوفت ہو رہی تھی' لیکن وہ اسے چھوڑ کر کمرے میں بھی نہیں جا سکتی تھی۔ پاپا نے تو کہہ دیا کہ بھروسے والا بچہ ہے لیکن کیا پتا۔
"اگر تم کچھ کام کرنا چاہتی ہو تو کر سکتی ہو میں تمہاری کمپنی کے بغیر بور نہیں ہوں گا۔" اس کے مسلسل چپ رہنے پر وہ چوٹ کرتا ہوا بولا تھا۔
"اور بے فکر رہو۔ میں کچھ چرا کر بھی نہیں بھاگوں گا۔ سیکورٹی کے طور پر تم میرا والٹ اور موبائل رکھ سکتی ہو۔"
"توبہ۔ یہ شخص تو دل کی باتیں جان لیتا ہے۔" اس نے گھبرا کر منہ دوسری طرف موڑ لیا۔
"میرا نام احمد ہے" کچھ دیر بعد وہ دوبارہ بولا۔
"آپ تھوڑی دیر کے لیے چپ نہیں رہ سکتے؟" تنگ آکر وہ بول پڑی تھی۔

اس سے پہلے وہ مزید کچھ کہتا سلطان صاحب کی گاڑی کا مخصوص ہارن بجا تھا وہ شکر ادا کرتی ہوئی تیزی سے باہر نکلی تھی۔ اس کے بعد وہ جو کمرے میں گھسی رات تک باہر نہیں نکلی۔

☼ ☼ ☼

صبح جب وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں آئی تو وہ پہلے سے سلطان صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ برا سا منہ بنا کر سلطان صاحب کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
"بیٹا! سلام نہیں کیا آپ نے؟"
"السلام علیکم!" وہ لٹھ مار انداز میں بولی۔
"وعلیکم السلام۔" وہ مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بریڈ پر جام لگا کر کھانے لگی۔
"پاپا! مجھے کالج سے دیر ہو رہی ہے۔"
"ہاں بھئی میں بھول ہی گیا۔ احمد! تم عائشہ کو کالج چھوڑ دو اور عائشہ! احمد اب ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔ سکینہ۔" ساتھ ہی انہوں نے سکینہ کو آواز دی۔
"سکینہ بیٹا! گیسٹ روم اچھی طرح صاف کر دو احمد اب یہاں رہے گا۔"
"جی۔" وہ مسکرا کر سر ہلاتی واپس مڑ گئی۔
"لیکن کیوں پاپا؟" وہ جو حیرت سے سن رہی تھی بے ساختہ بول پڑی' سلطان صاحب نے تادیبی نظروں سے اسے دیکھا۔
"سیکورٹی ریزن کی وجہ سے۔ میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں لے سکتا اب تم جہاں بھی جاؤ گی احمد تمہارے ساتھ جائے گا" سلطان صاحب کی گفتگو کے دوران احمد جوس پیتے ہوئے بڑے غور سے عائشہ کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ اس لیے خاموشی سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اور وہ جیسے اس کے جانے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ جیسے پھٹ پڑی تھی۔
"پاپا! آپ کیسے ایک اجنبی آدمی پر اتنا بھروسا کر سکتے ہیں کہ مجھے ہر جگہ اس کے ساتھ بھیج رہے ہیں۔"
"وہ اجنبی نہیں۔"
"آپ کے لیے نہیں ہو گا۔ میرے لیے تو ہے اور مجھے بالکل پسند نہیں یہ شخص۔"
"ایک ہی دن میں وہ تمہیں اتنا برا لگنے لگ گیا۔" انہوں نے مسکرا کر اپنی بیٹی کا ناراض چہرہ دیکھا۔
"کسی کے برا لگنے کے لیے ایک پل ہی کافی ہوتا ہے۔ اور میں اسے ایک دن برداشت نہیں کر سکتی اور آپ نے اسے چوبیس گھنٹوں کے لیے میرے سر پر سوار کر دیا ہے۔" اب کے انہوں نے رک کر سنجیدہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"بعض دفعہ زندگی ایسا رخ اختیار کرتی ہے کہ آپ کو مرضی کے خلاف ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ ساری زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ خود کو حالات اور لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے کی عادت ڈالو۔"
"پاپا۔" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" اس کو پریشان دیکھ کر انہوں نے سر جھٹکا تھا۔
"کچھ نہیں کہنا چاہتا' صرف ایک حقیقت بتا رہا ہوں۔ احمد اپنا بچہ ہے اور تمہیں کیا لگتا ہے۔ تمہارے معاملے میں میں یوں لاپروائی کا مظاہرہ کروں گا چلو شاباش دیر ہو رہی ہے۔" انہوں نے اسے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا اور وہ اسی طرح الجھی ہوئی ان کے ساتھ چلنے لگی۔
"احمد! پہلے عائشہ کو کالج چھوڑ دیتے ہیں پھر لائر کے پاس چلتے ہیں۔ میں نے کل رات بات کی تھی ان سے پھر آفس چلیں گے؟ اسٹاف کو بھی تم سے ملوانا ہے۔"
"جی انکل۔" وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے تابعداری سے بولا اور کن اکھیوں سے مرر میں پیچھے بیٹھی عائشہ کو دیکھا جو صدمے سے بس بے ہوش ہونے والی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آنے والی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔
کالج داخل ہوتے ہی اس نے سب سے پہلے سدرہ کو تلاش کیا تھا جو اسے دیکھ کر بے تحاشا خوش ہو گئی

تھی۔

"مجھے لگا تم آج بھی نہیں آؤ گی۔" اس کی اتنی گرم جوشی پر وہ صرف مسکرا ہی سکی تھی۔

"کیا بات ہے ابھی بھی پریشان لگ رہی ہو۔ انکل تو ٹھیک ہیں نا۔"

"ہاں وہ ٹھیک ہیں۔"

"پھر کیا ہوا ہے ایسے لگتا ہے کسی سے مار کھا کر آئی ہو۔" سدرہ نے حسب عادت بات کے اختتام پر قہقہہ لگایا تھا۔

"بکواس بند کرو۔" اسے غصے میں دیکھ کر سدرہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کنٹرول کی تھی۔

"پتا نہیں پاپا کو کیا ہو گیا ہے۔ کسی کو گھر میں بلا لیا ہے۔"

"کیا مطلب۔"

"پتا نہیں کون ہے پر جو بھی ہے اتنا بدتمیز ہے کل سے میرے گھر میں ہی مجھ پر کرفیو لگا دیا ہے۔ اتنا بولتا ہے کہ بس اور تو اور میں جو سوچ ہی رہی ہوتی ہوں وہ میرے چہرے سے اندازہ لگا لیتا ہے۔"

"نجومی تو نہیں یار! مجھے بھی اس سے ملوانا۔ میں بھی ذرا مستقبل کا حال جانوں۔"

"میں سیریس ہوں اور تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" عائشہ نے ناراضی سے اسے دیکھا تو سدرہ کو سنجیدہ ہونا پڑا۔

"پر انکل نے اسے رکھا کیوں ہے؟"

"کہتے ہیں فار سیکیورٹی ریزن۔ میں جہاں بھی جاؤں گی وہ میرے ساتھ جائے گا۔ ابھی بھی وہی چھوڑ کر گیا ہے۔"

"تو یار! اس میں پریشان ہونے والی کیا بات ہے اگر انکل نے اسے گھر میں رکھا ہے تو سوچ سمجھ کر ہی رکھا ہو گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سدرہ! لیکن اتنا یقین پتا ہے گاڑی میں کیا بات کر رہے تھے کہ اپنے لائر سے اسے ملوائیں گے اور آفس کے اسٹاف سے۔ مطلب سمجھتی ہو اس کا۔"

"ہوں۔" سدرہ کے پر سوچ انداز میں "ہوں" کہنے پر وہ چڑ کر بولی۔

"کیا ہوں؟ کیا سمجھی ہو۔"

"یہی کہ تم کہہ رہی تھیں نا کہ وہ چہرے پڑھ لیتا ہے دل کی بات جان لیتا ہے۔ لگتا ہے اس نے انکل پر کافی ریسرچ کی ہے۔ ہو سکتا ہے اسے کالا جادو ٹائپ کوئی چیز آتی ہو اور اس نے انکل پر کوئی عمل کیا ہو اسی لیے تو انکل نے نہ صرف اسے گھر میں رکھ لیا بلکہ اسے اپنے بینک بیلنس سے بھی آگاہ کر رہے ہیں۔" سدرہ کی بات سن کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"اب میں کیا کروں سدرہ۔" وہ پریشانی سے سدرہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"ایک بات اور ہو سکتی ہے یہ بتاؤ۔ اس کی شکل کیسی ہے؟"

"یہ کیسا سوال ہے؟" عائشہ نے ناگواری سے پوچھا۔

"اپنی چڑ سے بالاتر ہو کر بتاؤ۔"

"ہوں اچھی ہے۔"

"ایجوکیٹڈ ہے؟"

"پتا نہیں۔" عائشہ بے زاری سے بولی۔ "پر لگتا تو ہے۔"

"تو کہیں ایسا تو نہیں۔ انکل اسے گھر داماد بنانے کی سوچ رہے ہوں۔" پہلے تو وہ کتنی دیر سدرہ کا منہ دیکھتی رہی لیکن جب سدرہ کے منہ سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا تو اس نے پاس رکھی کتاب سے اس کی پٹائی شروع کر دی۔

"مجھے ایسا گھٹیا مذاق بالکل پسند نہیں۔" وہ گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی تھی۔

"یہ حقیقت بھی ہو سکتی ہے۔" اس کی بات پر کچھ لمحوں کے لیے عائشہ خاموش ہو گئی تھی۔

"اگر پاپا نے ایسا سوچا بھی ہے تو میں ایسا ہونے نہیں دوں گی۔ اتنا برا امپریشن دوں گی اس ٹام کروز کو کہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے گا۔"

"ہاں بھئی۔ تمہاری بدتمیز طبیعت سے میں یہ امید رکھتی ہوں۔" سدرہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جھاڑے تھے اور سامنے نظر پڑتے ہی اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے۔

"اس کو بھی ابھی ٹپکنا تھا۔" سدرہ نے کہنے کے ساتھ سامنے پڑی کتاب اٹھالی جبکہ اتنی بیزاری پر عائشہ نے پلٹ کر دیکھا جہاں سے حذیفہ آ رہا تھا عائشہ نے خشمگیں نظروں سے سدرہ کو دیکھا جو منہ پر نو لفٹ کا بورڈ سجا کر بیٹھ گئی تھی۔

"گڈ مارننگ!" وہ ان کے قریب ہی گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔

"شکر ہے تمہاری شکل تو نظر آئی اگر آج تم نہ آتیں تو میں نے تمہارے گھر آ جانا تھا۔" حذیفہ کی بات پر وہ مسکرا دی تھی جبکہ سدرہ کی سنجیدگی دیکھنے لائق تھی۔

"انکل کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

"ہاں وہ ٹھیک ہے۔ تم بتاؤ تمہارے فادر اب کیسے ہیں؟"

"ہاں۔ وہ بھی ٹھیک ہیں اور اب گھر آ گئے ہیں۔"

"گڈ! میں آؤں گی ان سے ملنے۔"

"نہیں۔ اٹس اوکے۔" وہ ایک دم گھبرا کر تیزی سے بولا۔ عائشہ کے ساتھ ساتھ سدرہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

"کیوں تم مجھے ان سے ملوانا نہیں چاہتے۔" عائشہ نے سنجیدگی سے حذیفہ کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں تو پھر کیسی بات ہے۔" عائشہ کے بجائے سدرہ نے سوال کیا تھا۔

"وہ دراصل میرے پیرنٹس کافی پرانے خیالات کے ہیں اگر ــــ میں انہیں یہ بتاؤں گا کہ ایک لڑکی میری دوست ہے تو انہیں اچھا نہیں لگے گا۔"

"اچھا۔" سدرہ نے ابرو اچکا کر طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"جب تم نے عائشہ سے دوستی کی تھی تب یہ خیال تمہیں کیوں نہیں آیا اور خاص طور پر تب جب تم اس سے قیمتی قیمتی گفٹس لیتے تھے۔" سدرہ کے طنزیہ انداز پر حذیفہ کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا تھا۔

"تم میری انسلٹ کر رہی ہو سدرہ۔"

"ہونہہ! انسلٹ اس کی ہوتی ہے جس کی کوئی عزت ہو۔"

"انف سدرہ!" حذیفہ زور سے بولا۔

"دیکھو عائشہ! تمہاری دوست مجھ پر طنز کر رہی ہے۔" اس نے خاموش بیٹھی عائشہ سے شکایت کی جس نے اس کی فیور میں ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

"تم میرے بارے میں کیا سوچتے ہو حذیفہ۔" اس کی سنجیدگی پر ایک پل کے لیے وہ خاموش رہ گیا۔

"میں سمجھا نہیں۔"

"میں کیا ہوں تمہاری صرف ایک دوست؟"

"تم جانتی ہو عائشہ! میں تمہیں کتنا پسند کرتا ہوں۔"

"آج تم مجھے ایک دوست کے طور پر اپنے پیرنٹس سے متعارف نہیں کروا سکتے تو کل انہیں اپنی پسندیدگی کے بارے میں کیسے بتاؤ گے؟"

"عائشہ! تم غلط سمجھ رہی ہو میں نہیں چاہتا۔ میرے پیرنٹس تمہیں لے کر کچھ غلط سوچیں۔ میں مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔"

"لیکن میرے پاس وقت نہیں حذیفہ! میرے پاپا میری جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں اور انہوں نے کسی کو منتخب بھی کر لیا ہے۔" عائشہ کہتے ساتھ غور سے حذیفہ کے تاثرات بھی دیکھ رہی تھی جو ہونٹ چباتا ہوا کافی کنفیوز لگ رہا تھا۔

"تو کیا تم اس سے شادی کر لو گی؟"

"ہو سکتا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"تم ایسا نہیں کر سکتیں عائشہ! پلیز کہہ دو یہ مذاق ہے۔" وہ ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"پلیز حذیفہ۔" عائشہ نے ناگواری سے اپنا ہاتھ کھینچا تھا۔

"پلیز عائشہ! تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا۔"

"میں تمہیں بتا دوں گی کب پاپا سے بات کرنی ہے۔"

"چلو عائشہ! دیر ہو رہی ہے۔" سدرہ نے اس کا ہاتھ کھینچا تھا۔

"عائشہ! میں امی کو لے کر کب آؤں۔"

"کہا تو ہے حذیفہ میں پہلے پاپا سے بات کرلوں پھر تمہیں بتاتی ہوں۔" وہ کہہ کر سدرہ کے ساتھ چل پڑی۔ اس نے کچھ قدم چل کر پیچھے دیکھا حذیفہ وہیں کھڑا پرسوچ انداز میں گھاس کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں خود سے حذیفہ سے شادی کی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔" سدرہ نے افسوس سے سر جھٹکا۔

"تو کیا کرتی۔ پاپا نے پتا نہیں کیا سوچ رکھا ہے جبکہ میں حذیفہ کے لیے سیریس ہوں۔"

"جبکہ وہ نان سیریس ہے' پتا نہیں تمہیں کب نظر آئے گا۔" عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا اسے خاموش دیکھ کر سدرہ نے پوچھا تھا۔

"انکل سے کیا کہو گی۔"

"سمجھ نہیں آرہا' پاپا سے کیسے بات کروں۔" وہ دونوں گیٹ کے آگے آکر رک گئی تھیں۔

"سدرہ میرے لیے ایک فیور کرو گی۔"

"ہاں بولو۔"

"آج میرے ساتھ گھر چلو۔" سدرہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"یار! تم نے اس باڈی گارڈ کو کچھ زیادہ ہی سر پر سوار کرلیا ہے۔ تم اس کی وجہ سے کہہ رہی ہو نا۔" عائشہ کچھ نہیں بولی تو سدرہ نے ہنسنا شروع کردیا "قسم سے مجھے اس بندے کو دیکھنے کی بہت خواہش ہو رہی ہے جس نے تمہیں ڈرا دیا ہے۔"

"شٹ اپ! میں کسی سے نہیں ڈرتی۔" سدرہ کے مذاق اڑانے پر وہ چڑ کر بولی۔ وہ دونوں گیٹ سے باہر نکلیں تو تھوڑی نظر دوڑانے پر وہ انہیں گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے نظر آگیا تھا۔

"یہ تمہارا باڈی گارڈ ہے۔" سدرہ نے حیرت سے اس لمبے چوڑے شخص کو دیکھ کر کہا۔

"یار! بڑا اچھا ہے۔" سدرہ تقریباً" اس کے کان میں گھستے ہوئے بولی۔

"بکومت اور اس کے سامنے تم نے کوئی بکواس کی تو میرے ہاتھوں آج تمہارا قتل ہو جائے گا۔"

"اچھا۔" سدرہ نے بڑی تابعداری سے سر ہلایا تھا۔ گاڑی کے قریب جا کر سدرہ نے باقاعدہ ادب کے ساتھ سلام کیا تھا جس کا جواب بڑی خوش اخلاقی سے دیا گیا تھا۔

"میں سدرہ ہوں' عائشہ کی فرینڈ۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"ہیں وہ کیسے؟" سدرہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

"انکل نے بتایا تھا آپ کے بارے میں۔"

"اچھا۔" سدرہ نے عائشہ کو دیکھا اور عائشہ نے نظروں سے کہا تھا "دیکھا میں نہیں کہہ رہی تھی۔" وہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"آگے آکے بیٹھو۔ میں تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں۔" سدرہ بھی بیٹھ گئی تھی وہ ان دونوں کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے بیٹھ گیا تھا۔

"میرا خیال ہے ہم بیٹھ چکے ہیں۔" اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر عائشہ نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا تھا۔

"اور میرا بھی خیال ہے' میں بتا چکا ہوں کہ میں تمہارا ڈرائیور نہیں۔ آگے بیٹھو ورنہ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو گی۔" عائشہ کا غصے کے مارے برا حال تھا اور سدرہ کا حیرت کے مارے۔ پانچ منٹ تک دونوں ٹس سے مس نہیں ہوئے تو سدرہ کو بولنا پڑا۔

"اگر آپ کی اجازت ہو تو میں فرنٹ سیٹ پر آجاؤں۔"

"سدرہ! میں ضرور آپ کو ہی بٹھاتا اور یہی اچھا ہوتا لیکن اب تو اسے ہی آنا ہو گا۔" اس کے لیے اتنا احترام عائشہ نے حیرت سے اس کی پشت کو گھورا۔

"عائشہ پلیز۔ چلی جاؤ نا۔ دیر ہو رہی ہے۔" عائشہ نے غصے سے سدرہ کو گھورا جس نے ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی' وہ جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلی اور آگے بیٹھتے ہی جھٹکے سے دروازہ بند کیا تھا۔

"کار آپ کے والد محترم کی ہے۔" اس نے جیسے اسے جتایا تھا۔

"چلو ذرا لگاتی ہوں پاپا کو شکایت۔ اسی وقت گھر سے نکال دیں گے۔" اس نے خود کلامی کی تھی۔ لیکن مقابل کے کان کافی تیز تھے۔

"یہ کوشش بھی کر کے دیکھ لو" عائشہ کو جانے کیوں رونا سا آیا تھا۔

"ویسے احمد بھائی! بھائی کہہ سکتی ہوں نا۔" سدرہ نے پوچھا۔

"ضرور۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

"آپ کی بڑی تعریف سنی تھی عائشہ سے۔"

"اچھا۔ حیرت ہے۔" اس نے حیران ہونے کی ایکٹنگ کی تھی۔

"میرا نہیں خیال' وہ تعریف ہو گی؟"

"نہیں خیر۔ ایسا بھی نہیں جیسا اس نے بتایا تھا' آپ بالکل ویسے ہیں۔"

"گنوار!" عائشہ زیر لب بڑبڑائی۔

"چلیں' آپ کہتی ہیں تو مان لیتا ہوں جو اس نے میرے بارے میں کہا۔ وہ تعریف ہی تھی۔" گھر پہنچنے پر وہ تیزی سے کار کا دروازہ کھول کر نکلی تھی۔ جبکہ سدرہ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آئی تھی۔

"تھینک یو ویری مچ احمد بھائی۔"

"مائی پلیژر اور ایک بات۔ تھوڑی سی تمیز اپنی دوست کو بھی سکھا دیں" احمد کے کہنے پر سدرہ نے عائشہ کی طرف دیکھا جو سرخ چہرہ لیے گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"اچھا۔" وہ مسکرائی تھی "ویسے آپ سے ملاقات کافی دلچسپ رہی۔"

"آگے بھی یہ ملاقات ہوتی رہے گی۔"

"اچھا وہ کیسے؟" سدرہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

"سدرہ! آ بھی چکو کہ وہیں مرنا ہے۔" گیٹ کھلتے ہی عائشہ نے مڑ کر دیکھا اور سدرہ کو دانت نکال کر باتیں کرتے دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

"وہ پھر کبھی بتاؤں گا' فی الحال آپ جائیں ورنہ آپ کی دوست جل جل کر اپنا خوب صورت رنگ برباد کر لے گی۔" سدرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

"اور اسے بتا دینا' انکل کے پاس آفس جا رہا ہوں۔ شام کو انکل کے ساتھ آؤں گا۔" کہہ کر وہ ان سے گاڑی بھگا لے گیا تھا۔

"بڑے دانت نکل رہے تھے تمہارے۔" اس کے قریب آتے ہی عائشہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"صحیح کہہ رہے تھے احمد بھائی۔"

"کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہہ رہے تھے' عائشہ سے کہو غصہ مت کیا کرے ورنہ گورا رنگ کالا پڑ جائے گا۔"

"ذلیل انسان" وہ مٹھیوں کو بھینچ کر بولی۔

"اب چلو اندر۔" سدرہ کہنے کے ساتھ اندر چلی گئی تھی۔

"احمد بھائی نہیں آئے۔" اندر داخل ہوتے ہی سکینہ کے سوال پر جہاں عائشہ کو آگ لگ گئی تھی وہیں سدرہ کی ہنسی چھوٹ گئی تھی۔

"دفع ہو گئے ہیں تمہارے احمد بھائی۔" کہنے کے ساتھ وہ تن فن کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"یہ باجی کو کیا ہوا ہے؟" سکینہ نے حیرت سے اس کا غصہ دیکھا تھا۔

"کچھ نہیں۔ بے چاری کو گرمی زیادہ لگ رہی ہے۔ تم بس کھانا لگاؤ بلکہ ایسا کرو کمرے میں لے آؤ۔"

"لیکن باجی؟ احمد بھائی' ان کے لیے سینڈوچ بنائے تھے۔"

"انہیں فریز کر دو۔ وہ آفس گئے ہیں انکل کے ساتھ آئیں گے۔" وہ سر ہلا کر مڑ گئی اور سدرہ کمرے کی طرف آگئی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی عائشہ گہرے سانس لیتے ہوئے اپنا غصہ کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ریلیکس یار!" سدرہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر خود اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"تم نے دیکھا' کیسے بات کرتا ہے وہ مجھ سے۔"

"تو یار! تم بھی کون سا اس کا لحاظ کرتی ہو۔"

"تو میں کیوں کروں اس کا لحاظ۔" عائشہ نے غصے سے اسے دیکھا۔

"چھوڑو یار! تم کیوں اپنا موڈ خراب کرتی ہو۔"

"موڈ خراب نہ کروں تو کیا کروں، پتا نہیں اس نے سب پر کیا جادو کر دیا ہے پاپا تو پاپا سکینہ بھی بھائی بھائی کرنے لگی ہے اور تم بھی تم بھی تو کیسے فری ہو رہی تھیں۔" یاد آنے پر وہ ایک دم اس کی طرف مڑی تھی۔

"عائشہ! مجھے وہ ایک اچھا انسان لگا ہے۔ ہمدرد سچا اور انکل نے جو اسے گھر میں رکھا ہے تو ضرور وہ قابل بھروسا ہے مجھے تو وہ اچھا لگا ہے۔"

"تم تو کبھی کبھی مجھے میری دوست کم دشمن زیادہ لگتی ہو۔ ہر وہ شخص جو مجھے اچھا لگتا ہے، تمہیں برا لگتا ہے۔"

"وہ اس لیے مائی ڈیر کہ مجھے انسان کی پہچان ہے۔"

اس سے پہلے عائشہ مزید کوئی بات کرتی، سکینہ ٹرالی لے کر اندر داخل ہوئی تھی اور عائشہ نے سر جھٹک کر خود کو اس کے بارے میں بات کرنے سے روکا تھا۔

☼ ☼ ☼

سدرہ کے جانے کے بعد اس نے شاور لیا اور پڑھنے بیٹھ گئی، لیکن پڑھنے میں دل نہ لگا تو اس نے کتاب پٹخی اور تکیہ سر پر رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔ دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو سارا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے مندی مندی آنکھوں سے موبائل اسکرین کو دیکھا جہاں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔ اتنی دیر ہوگئی اور کسی نے مجھے جگایا بھی نہیں۔ وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی بال سمیٹتی باہر نکل آئی، سکینہ ڈائننگ ٹیبل صاف کر رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا۔ کھانا کھایا جا چکا ہے۔ اس کا غصہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔

"پاپا کہاں ہیں۔" اس نے سکینہ سے پوچھا تھا۔

"اپنے کمرے میں ہیں۔" ہلکا سا بجا کر دروازہ کھولا اور اندر آ گئی۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کے سامنے شطرنج کی بساط بچھی تھی۔ اس نے ارد گرد نظریں گھمائیں وہ کہیں نہیں تھا۔

"اٹھ گئیں بیٹا؟" وہ ناراضی سے انہیں دیکھتی ہوئی سامنے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"پاپا! میں اگر آپ کو نظر نہیں آئی تو آپ نے مجھے جگایا نہیں اور اکیلے ہی کھانا کھا لیا؟" انہوں نے کچھ حیرت سے اس کا غصیلا چہرہ دیکھا۔

"تم نے ہی سکینہ کو کہا تھا کہ تمہیں نہ جگائیں۔"

"یہ آپ کو سکینہ نے کہا۔"

"نہیں۔ احمد نے کہا ہے۔"

"اف احمد' احمد' پاپا! دو دن ہوئے ہیں اس شخص کو آئے اور اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔ آپ جانتے ہیں کس قدر بدتمیز ہے۔ کیسے بات کرتا ہے میرے ساتھ۔ مجھ پر ایسے حکم چلاتا ہے جیسے جیسے۔" آگے اسے کوئی مثال سمجھ میں نہیں آئی۔

"میں اب اسے ایک منٹ بھی یہاں برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ نکالیں اسے۔" وہ خاموشی سے اسے سنتے رہے۔

"پہلی بات تو یہ کہ احمد ایسا نہیں کر سکتا۔ دوسرا اس نے مجھے بتایا کہ تم اس سے بدتمیزی کرتی ہو تم نے اسے ڈرائیور کہا۔ عائشہ! میں نے تمہاری تربیت ایسے کی ہے کہ تم بڑوں سے بدتمیزی کرو یا ان کی انسلٹ کرو۔"

"پاپا۔" اب کے وہ رونے والی ہو گئی تھی۔

"جھوٹ بولتا ہے وہ جھوٹا انسان۔"

"یہ تم کیسے بات کر رہی ہو۔ اس سے بھی ایسے ہی بات کرتی ہوگی۔" اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"آخر یہ شخص ہے کون۔ جس کے لیے آپ کو پہلی بار اپنی بیٹی بدتمیز لگ رہی ہے۔"

"احمد میرا۔"

"انکل۔" اس کی بھاری آواز پر عائشہ نے بے ساختہ گردن گھما کر پیچھے دیکھا وہ واش روم کے دروازے میں کھڑا تھا۔

"آپ کو میرے بارے میں کچھ بھی بتانے یا وضاحت دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ کہتا ہوا سلطان صاحب کے ساتھ صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔

"یہ مجھے جو سمجھتی ہے۔ سمجھنے دیں بلکہ میں دیکھنا چاہتا ہوں، یہ مجھے کیا سمجھتی ہے۔"

"تم اس قابل ہی نہیں کہ میں تمہیں کچھ سمجھوں۔ تم ایک بدتمیز انسان ہو میرے پاپا کے ملازم ہو ملازم بن کر رہو۔"

عائشہ۔" سلطان صاحب اتنے غصے سے بولے کہ وہ کانپ کر رہ گئی۔ اس نے پہلی بار ان کو اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

"ریلیکس انکل۔" احمد نے ان کا ہاتھ تھپکا تھا جبکہ احمد اسے پہلے سے زیادہ برا لگا تھا جس کی وجہ سے اس کے باپ نے اس پر غصہ کیا تھا۔ وہ کچھ دیر ڈبڈبائی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر بھاگتی ہوئی ان کے کمرے سے نکلی تھی، عائشہ کے جانے کے بعد احمد نے دزدیدہ نظروں سے سلطان صاحب کو دیکھا جو سر جھکائے کافی پریشان نظر آ رہے تھے۔

"انکل! آئی ایم سوری۔ میری وجہ سے عائشہ کو پرابلم ہو رہی ہے۔"

"نہیں احمد! سوری تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔ میں عائشہ کے رویے کے لیے تم سے بہت شرمندہ ہوں۔"

"انکل پلیز! ایکسکیوز کر کے آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"احمد! تم یقین کرو عائشہ بہت اچھی ہے۔ بہت لونگ۔ پتا نہیں کیوں وہ ایسے بی ہیو کر رہی ہے۔ وہ تو کبھی کسی سے ایسے روڈلی بات نہیں کرتی۔"

"پلیز انکل! آپ مجھے کوئی وضاحت نہ دیں۔ میں سمجھتا ہوں۔"

"تم مجھے بتانے دو احمد اسے تمہارے بارے میں۔"

"نہیں انکل! آپ نے خود مجھے بتایا تھا اس کی ناپسندیدگی کے بارے میں۔ ابھی جب اسے میرے بارے میں پتا نہیں تو وہ ایسے کر رہی ہے اگر پتا چل گیا تو پھر معاملہ اور خراب ہو جائے گا۔ ہم کچھ عرصہ ساتھ رہیں گے تو اسے مجھے اور مجھے اسے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔"

"تم عائشہ کو برا نہ سمجھنا۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر التجا بھرے انداز میں بولے۔

"نہیں انکل! میں اسے برا نہیں سمجھتا اس کا بچپنا ہے بس۔" سلطان صاحب خاموش ہو گئے تھے جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہوں۔ دستک پر دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا تھا جہاں سکینہ کھڑی تھی۔

"وہ تایا جی اور تائی جی آئے ہیں۔"

"اس وقت۔" سلطان صاحب کی نظریں بے ساختہ گھڑی کی طرف گئی تھیں۔ جہاں رات کے نو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر باہر آ گئے جہاں ساجد صاحب اور زبیدہ بیگم ان کے منتظر تھے۔

"السلام علیکم! بھائی صاحب! خیریت تھی۔"

"ہاں بھائی! خیریت ہے۔ کیا ہم اس وقت نہیں آ سکتے۔" ساجد صاحب کے مسکرانے پر انہوں نے سکون بھرا سانس لیا۔

"نہیں کیوں نہیں۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ سکینہ بیٹا ٹھنڈا کچھ لے آؤ۔

کھانا لگواؤں بھائی صاحب۔"

"نہیں کھانا ہم کھا کر آئے ہیں بس ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"جی۔" سلطان صاحب کچھ الرٹ ہو کر بیٹھ گئے۔ تب ہی احمد لاؤنج میں داخل ہوا تھا۔ ان دونوں کی نظریں پہلے احمد کی طرف اور پھر سوالیہ انداز میں سلطان صاحب کی طرف گئی تھیں۔

"آؤ احمد! یہ میرے بھائی ساجد اور یہ میری بھابھی زبیدہ ہیں۔" احمد ان کو سلام کرتا ہوا سلطان صاحب کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"اور یہ احمد ہے، میرے دوست کا بیٹا' اسلام آباد

سے آیا ہے۔ کچھ دن پہلے مجھ سے ملنے آیا تھا جب مجھ پر حملہ ہوا تھا۔ میرے دوست کو پتا چلا تو اس نے احمد سے کہا یہیں میرے پاس رک جائے۔ تب سے یہ میرے ساتھ ہے، بہت اچھا بچہ ہے۔" آخر میں انہوں نے بڑے پیار سے احمد کا کندھا تھپتھپایا تھا جبکہ وہ سر جھکائے مسکرا رہا تھا۔ ساجد صاحب نے زبیدہ کی طرف دیکھا، جنہوں نے جتاتی ہوئی نظروں سے ساجد صاحب کو دیکھا تھا۔

"انکل! مجھے کچھ کام ہے، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔"

"ہاں بیٹا ضرور جاؤ اور گاڑی کی چابی لے جاؤ۔ وہ سامنے ریک میں رکھی ہے۔"

"جی۔" وہ ان دونوں کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ جب تک سکینہ شربت سرو کرتی رہی۔ ان تینوں کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔

"ویسے بڑے افسوس کی بات ہے سلطان! تم ہمیں غیر سمجھتے ہو۔ آخر تم نے ثابت کر دیا، تم ہمیں سوتیلا سمجھتے ہو" سلطان صاحب نے حیرت سے زبیدہ کو دیکھا۔

"کیوں بھابھی میں نے ایسا کیا کیا ہے۔"

"تمہاری ہی خاطر ہم نے کہا تھا، سعد تمہارے پاس رہ جاتا ہے۔ ورنہ ہمارا ابھی اکلوتا ہی بیٹا ہے پر تم نے منع کر دیا۔ ہم نے بھی سمجھ لیا چلو جوان بچی کا ساتھ ہے۔ اس لیے منع کر دیا ہوگا، پر یہ بھی تو جوان لڑکا ہے۔ تمہارے دوست کا بیٹا نہ جان نہ پہچان تم نے اسے گھر میں رکھ لیا۔ سعد تو تمہارا بھتیجا ہے سوتیلا ہی سہی پر اپنا تو تھا۔ تم نے اس پر بھروسا نہ کیا اور اس انجان پر بھروسا کر لیا۔ تم آفس چلے جاتے ہو۔ یہ گھر ہوتا ہے اور عائشہ بھی۔" سلطان صاحب نے بہت تحمل سے ان کی ساری باتیں سنی تھیں، لیکن آخری بات پر ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"مطلب کیا ہے بھابھی آپ کا؟"

"چپ رہو تم۔" ساجد صاحب نے زبیدہ کو روکا تھا۔

"اس کو چھوڑو سلطان! تم تو جانتے ہو، عورتوں کی عقل کو۔ چھوٹی سی بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہیں۔ تم نے اس لڑکے کو ساتھ رکھا ہے تو سوچ سمجھ کر رکھا ہوگا اور پھر عائشہ ہماری اپنی بچی ہے، اچھی طرح اسے جانتے ہیں ہم۔" انہوں نے سلطان صاحب کے غصے کو لفظوں سے ٹھنڈا کر دیا تھا۔

"اب کام کی بات کرتا ہوں، جس کے لیے ہم دونوں آئے ہیں۔ میں کتنی دفعہ آیا لیکن بات نہیں کر سکا۔ عائشہ ہمیں بہت پسند ہے۔ ہم اس کو اپنی بیٹی یعنی سعد کی بیوی بنانا چاہتے ہیں۔ پہلے سعد کی کوئی پراپر جاب نہیں تھی۔ اسی لیے بات نہیں کی۔ اب تو ماشاءاللہ اس کی بہت اچھی جاب ہے۔ مجھے تو پتا ہے تمہیں اعتراض نہیں ہوگا پر زبیدہ اور سعد کا کہنا ہے کہ تم سے اور خاص کر عائشہ سے پوچھ لیں۔" سلطان صاحب کتنی دیر تک بول ہی نہیں سکے۔ انہیں یہ تو اندازہ تھا کہ وہ لوگ عائشہ کے لیے یہ خواہش بھی رکھتے ہیں، لیکن وہ عائشہ کی ناپسندیدگی بھی جانتے تھے اور ان کی اپنی خواہش ان لوگوں کی خواہش سے مختلف تھی، لیکن وہ بالکل صاف جواب نہیں دے سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے بھائی صاحب! میں عائشہ سے پوچھ کر جواب دوں گا۔" کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ دونوں کھڑے ہو گئے تھے۔

"اچھا سلطان! چلتے ہیں اور تمہاری ہاں کے منتظر رہیں گے۔" ان کے کہنے پر سلطان صاحب بمشکل مسکرائے تھے۔ ان کے جانے کے بعد وہ عائشہ کے کمرے کی طرف بڑھے دروازہ لاک تھا۔ وہ کچھ دیر باہر کھڑے رہے اور پھر صبح بات کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئے۔

صبح وہ احمد کے ساتھ ساجد صاحب کی رات والی بات ڈسکس کر رہے تھے جب عائشہ ڈائننگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے سے انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان سے ناراض ہے۔ وہ کسی کو سلام یا مخاطب کیے بغیر ان سے فاصلے پر جا کر بیٹھ گئی اور کچھ بھی کھانے کے بجائے جوس کا گلاس تھام لیا۔

"عائشہ! کل تمہارے تایا اور تائی آئے تھے۔" انہوں نے خود ہی اسے مخاطب کر لیا تھا۔ اس نے کوئی ریسپانس نہیں دیا تھا۔

"سعد کے لیے تمہارا رشتہ لے کر۔" اب کے اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھتے احمد کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی۔

"پھر آپ نے کیا کہا؟" اس کا چہرہ اس کی بے چینی کو عیاں کر رہا تھا۔

"میں نے کہا۔ میں عائشہ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔" اس کے تنے ہوئے اعصاب ایک دم پرسکون ہوئے تھے اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔

"آپ جانتے ہیں، مجھے سعد بھائی بالکل پسند نہیں۔"

"جانتا ہوں۔ اسی لیے میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ صاف انکار کرنا اچھا نہیں لگتا۔ کوئی پراپر ریزن ہونا چاہیے تو اس لیے۔" انہوں نے اگلی بات کہنے کے لیے گلا کھنکھارا تھا۔ "میں چاہتا ہوں بلکہ میری خواہش ہے تمہاری شادی احمد سے ہو جائے۔"

اور ان کی بات اس کے لیے اتنی اچانک تھی کہ وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکی "تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ احمد کون ہے۔ احمد نوازش میرے دوست اور تمہاری مما کے کزن کا بیٹا ہے، جس سے تمہارا رشتہ ہم نے بچپن میں طے کر دیا تھا۔ میں یہ بات تمہیں احمد کی آمد سے پہلے بتانا چاہتا تھا، لیکن احمد نے مجھے منع کر دیا، لیکن جتنی بدتمیزی تم نے احمد کے ساتھ کر کے مجھے شرمندہ کیا ہے، مجھے لگتا ہے کہ تمہیں بتا دوں احمد کے ساتھ تمہارا کیا رشتہ ہے شاید تم....."

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ کتنی دیر انہیں ایسے دیکھتی رہی، جیسے ان کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔ سلطان صاحب غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے، وہ خاموش تھی اور یہی ان کے لیے غنیمت تھا کہ وہ مزید احمد کے سامنے بدتمیزی نہ کرے۔

"میں ابھی آفس جا رہا ہوں۔ شام میں اس بارے میں بات کرتے ہیں۔" چلو احمد!

ان کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر یونہی بیٹھی رہی۔

"اتنا بڑا جھوٹ میرے پاپا نے میرے ساتھ بولا۔ وہ جانتے تھے احمد کون ہے لیکن مجھے نہیں بتایا کیونکہ احمد نے انہیں منع کر دیا تھا۔ اب ان کے لیے احمد مجھ سے زیادہ ہو گیا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ ہونٹ چباتے ہوئے خود پر کنٹرول کرنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن جب آنسوؤں میں روانی آگئی تو اس نے جھٹکے سے ڈائننگ ٹیبل پر رکھے گلاس کپ چمچوں کا اسٹینڈ سب گرا دیا تھا۔ آواز سن کر کچن میں کام کرتی سکینہ تیزی سے باہر نکلی اور اس کو یوں پاگلوں کی طرح چیزیں گراتے دیکھ کر الٹے قدم پیچھے ہٹی تھی۔

☼ ☼ ☼

جب وہ گھر میں داخل ہوا تو مکمل خاموشی تھی۔ وہ حیران ہوتا دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا کچن کی طرف آگیا۔ جہاں سکینہ ہنڈیا بنا رہی تھی۔

"السلام علیکم بھائی جان۔"

"وعلیکم السلام جیتی رہو اور یہ بتاؤ محترمہ طوفان صاحبہ کہاں ہیں اور اتنی خاموشی کیوں ہے۔" اس کے طوفان کہنے پر سکینہ کھی کھی کرنے لگی۔

"وہ جی۔ صبح تو انہوں نے ہنگامہ کیا تھا۔ میں تو ڈر کے مارے کچن سے نہیں نکلی اور تب سے کمرے میں ہیں۔ باہر ہی نہیں نکلیں۔"

"پتا کرنا تھا، ٹھیک تو ہے۔" احمد نے مذاق سے کہا تھا لیکن اندر سے وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"جی ٹھیک ہیں۔ دو دفعہ ڈانٹ کھا چکی ہوں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو کر بولا۔

"اچھا چلو اب اچھی سی چائے بنا کر پلاؤ۔"

"احمد بھائی! باجی بہت اچھی ہیں۔ آپ ڈر کر انہیں چھوڑ نہ دینا۔" اس کی بات پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"نہیں چھوڑوں گا کیونکہ تمہاری باجی جیسی بھی ہیں۔ مجھے پسند آگئی ہیں۔" اس کی بات سن کر سکینہ

مسکرادی تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں اپنا لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا۔ تب ہی سلطان صاحب اندر آئے تھے اور انہوں نے بھی آتے ہی سکینہ سے عائشہ کے بارے میں پوچھا تھا وہ صبح سے کمرے سے نہیں نکلی۔ سن کر وہ پریشان ہو گئے تھے۔ وہ کتنی دیر دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر اسے پکارتے رہے، لیکن اس نے دروازہ نہیں کھولا حتیٰ کہ احمد کو اٹھ کر ان کے پاس جانا پڑا۔

"انکل! آپ آجائیں۔ وہ خود باہر آجائے گی۔" احمد انہیں بازوؤں کے حلقے میں لے کر آگے بڑھ گیا، جبکہ دروازے کے ساتھ لگی عائشہ کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آگئے۔

رات کے بارہ بج رہے تھے اور بھوک سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے چپکے سے دروازہ کھولا۔ لاؤنج میں ہلکی لائٹ آن تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی کچن میں آئی تھی، فریج کھولتے ہی اندھیرے کمرے میں روشنی کی لکیر سی پھیل گئی تھی۔ وہ سالن والا ڈونگا نکال کر مڑی ہی تھی کہ کچن ایک دم روشنی میں نہا گیا۔ ڈونگے پر ایک پل کے لیے اس کی گرفت ڈھیلی پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے ڈونگا کاؤنٹر پر رکھا اور مڑ کر دیکھا، جہاں احمد دروازے میں کھڑا دل جلانے والی مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔ عائشہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

"تو آخر بھوک نے محترمہ کو بل سے باہر آنے پر مجبور کر دیا۔"

"یہ میرا گھر ہے۔ جو مرضی کروں، آپ ہوتے کون ہیں مجھ سے ایسے بات کرنے والے۔" سارے دن کا غصہ اب وہ نکالنا چاہتی تھی۔

"جس دن سے ہمارے گھر آئے ہیں، جینا حرام کر دیا ہے میرا آپ نے، کیا اپنے گھر میں کوئی رکھتا نہیں آپ کو جو یوں ہمارے گھر آکے پڑے ہیں، مجھے تو لگتا ہے کوئی ڈگری بھی نہیں، جو ڈرائیور تک بننے کو تیار ہو گئے ہیں اور پتا نہیں پاپا کو کیا کہانی سنائی ہے، جو وہ یوں اعتبار کرنے لگے ہیں۔ آپ نے سوچا ہو گا امیر آدمی کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر کے ساری جائیداد پر قبضہ کر لوں گا۔ آپ جیسی مینٹیلیٹی کے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے اور اگر کامیاب ہو بھی جائیں تو ان کی حیثیت نوکر سے زیادہ نہیں ہوتی۔" وہ اپنی بھڑاس بڑی کامیابی سے نکال چکی تھی، کیونکہ مقابل کا چہرہ ضبط کرنے کے چکر میں سرخ ہو گیا تھا اور عائشہ کی مسکراہٹ بڑی پر سکون تھی۔ وہ پتھریلا چہرہ لیے بالکل اس کے مقابل آکر کھڑا ہو گیا۔ اگلے ہی پل اس نے اسے دونوں بازوؤں سے تھاما تھا۔ پہلے تو وہ اس کی اتنی جرات پر حیران ہوئی اور پھر اس کی آہنی گرفت پر روہانسی ہو کر خود کو چھڑوانے لگی تھی۔

"تمہاری جیسی بدمزاج لڑکیوں کا دماغ کیسے درست کرنا ہے۔ مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ یہ جو ابھی تم نے بکواس کی ہے نا۔ اس کا مزہ میں ابھی چکھا دیتا لیکن مجھے انکل کا لحاظ ہے، لیکن فکر نہ کرو۔ تمہارے سارے اختیارات میرے ہاتھ آجائیں۔ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ یاد رکھو گی۔" اس کے انداز پر ایک پل کے لیے وہ سہم کر رہ گئی تھی، لیکن اگلے ہی پل اس نے سر جھٹکا تھا۔

"ناممکن بات ہے کہ میں آپ سے شادی کروں۔" اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بے خوفی سے بولی۔ "اگر ایسا ہوا تو میں زہر کھا لوں گی۔"

زہر خند مسکراہٹ احمد کے چہرے پر آئی تھی۔

"اس کی تم فکر مت کرو۔ وہ میں خود تمہیں دے دوں گا۔" کہنے کے ساتھ اس نے زور سے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا تھا اور وہ جو اس سلوک کے لیے تیار نہ تھی۔ جھٹکے سے ماربل شیلف کے ساتھ لگی تھی۔

"اور تمہاری اطلاع کے لیے بتا دوں۔ ہمارے پاس اتنی دولت ہے کہ تمہارے گھر جیسے تین گھر خرید سکتے ہیں اور ایم بی اے کی ڈگری ہے میرے پاس، وہ بھی امریکہ کی۔" جبکہ وہ درد کی شدت سے بلبلا اٹھی تھی۔

"جنگلی انسان!" اس نے سنا ضرور تھا لیکن مڑ کر نہیں دیکھا بلکہ سالن والا ڈونگا اٹھا کر لے گیا تھا اور عائشہ کو جتنی گالیاں آتی تھیں، اس نے اسے دی تھیں۔ ساری رات رونے کے بعد صبح تک وہ خود کو کافی کمپوز کر چکی تھی اور وہ جانتی تھی۔ پاپا نماز کے بعد نہیں سوتے اور اس وقت احمد نامی آسیب بھی ان کے ساتھ نہیں ہو گا۔ اس نے ہلکا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ وہ آنکھیں بند کیے تسبیح پڑھ رہے تھے۔ آہٹ پر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اسے دیکھ کر وہ مسکرائے تھے جیسے وہ اسی کے منتظر ہوں۔

"میری بیٹی ناراض ہے مجھ سے۔" اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"میں کل آیا تھا لیکن تم نے دروازہ نہیں کھولا۔ مجھے پتا تھا تمہیں غصہ تھا اور میں چاہتا تھا۔ تم سے تب بات کروں جب تمہارا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور تم تسلی سے کسی نتیجے پر پہنچ جاؤ۔"

"پاپا! میں نے بہت تسلی سے سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں احمد سے شادی نہیں کر سکتی۔"

"کیوں؟" اس کے خاموش ہونے پر وہ بولے تھے۔

"کیونکہ پاپا! جیسا وہ نظر آتا ہے ویسا وہ ہے نہیں۔ پہلے دن سے اس نے مجھے ٹارچر کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔ آپ کے سامنے وہ تمیز کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن مجھ سے وہ ہمیشہ بدتمیزی سے بات کرتا ہے۔" سلطان صاحب کتنی دیر تک اس کا چہرہ دیکھتے رہے جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"احمد سے شادی نہ کرنے کی وجہ صرف ناپسندیدگی ہے یا کچھ اور؟" عائشہ نے چونک کر انہیں دیکھا اور اس نے پوری ہمت کے ساتھ خود کو حذیفہ کے بارے میں بتانے کے لیے تیار کیا۔

"پاپا۔" اس نے جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا "میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں۔"

سلطان صاحب کو بہت تکلیف ہوئی تھی انہیں لگ رہا تھا احمد سے شادی نہ کرنے کی وجہ کچھ اور ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی امید تھی کہ عائشہ کسی اور کو پسند نہیں کر سکتی۔

"اس کا نام حذیفہ ہے، وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتا ہے۔" یہ دو جملے اس نے ان سے نظریں ملائے بغیر ادا کیے تھے۔ ان کی مسلسل خاموشی پر اس نے ڈرتے ڈرتے ان کی طرف دیکھا اور بے اختیار ان کا ہاتھ تھاما تھا۔

"پاپا! آپ کچھ کہیں گے نہیں۔" انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"کیا کہوں عائشہ! تم نے مجھے مایوس کیا ہے، جب تم نے احمد سے بدتمیزی کی میرا ابھی لحاظ نہیں کیا تو میں نے سوچا۔ میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی ہے اور آج پھر وہی سوال میرے سامنے ہے۔ کیا میرے پیار میں کمی تھی جو تمہیں کسی اور کی ضرورت پڑی۔ میں نے تمہیں وہاں اچھی تعلیم حاصل کرنے بھیجا تھا۔ یہ اختیار نہیں دیا تھا۔ تم اپنے لیے خود لڑکا پسند کرتی پھرو۔" وہ جو خاموشی سے سر جھکائے ان کی بات سن رہی تھی، ایک دم بول پڑی۔

"پاپا! میں نے کبھی آپ کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی اگر آپ کو مجھ پر یقین ہے تو میں نے ہمیشہ اس یقین کا مان رکھا ہے، اگر میں حذیفہ کو پسند کرتی ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے کوئی لمٹ کراس کی ہے۔ میں کبھی اس کے ساتھ باہر آؤٹنگ پر نہیں گئی۔ کبھی ہوٹلنگ نہیں کی۔ کالج میں بھی جب کبھی میری اس سے بات ہوتی ہے۔ سدرہ ہمارے ساتھ ہوتی ہے پاپا! آپ مجھے اتنا چاہتے ہیں۔ ہر چیز گھر میں میری مرضی سے ہوتی ہے، لیکن زندگی کے سب سے اہم فیصلے پر میرا اختیار کیوں نہیں پاپا!" وہ اب رو پڑی تھی۔ سلطان صاحب جو ناراضی سے منہ دوسری طرف کیے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ اس کے رونے پر اسے دیکھنے لگے۔

"عائشہ۔" انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"کیا تمہیں میری محبت پر شک ہے؟" اس کا سر نفی میں ہلا تھا۔

"مجھ سے زیادہ تمہارا بھلا چاہنے والا اس دنیا میں کوئی ہے؟" اس نے پھر سر نفی میں ہلایا تھا۔

"تو میں تمہارا برا کیسے سوچ سکتا ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اور بہت پرکھنے کے بعد احمد کو

تمہارے لیے چنا ہے۔ یہ میرا جذباتی اور جلد بازی کا فیصلہ نہیں' میری نظر وہ دیکھ سکتی ہے جو تم اب نہیں دیکھ رہیں وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔" عائشہ نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں پاپا! میں پھر بھی اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ میں صرف حذیفہ کے ساتھ خوش رہوں گی وہ مجھے سمجھتا ہے۔" اس کے ضدی انداز پر انہوں نے اس کے چہرے کے گرد سے ہاتھ ہٹا لیے تھے۔

"پاپا! ایک بار آپ اس سے مل تو لیں۔" اس نے ملتجی انداز میں کہا تھا۔

"نہیں عائشہ! میں ایسا کچھ نہیں کروں گا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔ تمہاری شادی احمد سے ہوگی۔" عائشہ نے دکھ سے انہیں دیکھا اور آنسو صاف کرتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

"اور میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے کہ میں شادی حذیفہ سے کروں گی۔"

"عائشہ۔" وہ ایک دم غصے سے چلائے تھے تو باہر کھڑے احمد نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔

"میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔"

"اور میرے مرنے کے بعد یہ قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔" اس کا مطلب سمجھنے میں انہیں ایک پل لگا تھا۔

"عائشہ!" وہ گھبرا کر کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے دروازہ کھولنے سے پہلے احمد سائیڈ پر ہو گیا تھا۔ وہ کچن کی طرف بھاگی تھی۔ اس کے پیچھے سلطان صاحب اور احمد ان کے کچن میں پہنچنے سے پہلے وہ چاقو نکال کر وہ اپنے بازو پر کٹ لگا چکی تھی۔ سلطان صاحب وہیں ساکت ہو گئے ان کی ساکت نظریں زمین پر جمع ہوتے خون پر جمی تھیں۔ ان کے پیچھے کھڑا احمد ایک پل کے لیے حیران پریشان اس منظر کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا اور سمجھ آتے ہی اس نے عائشہ کو مزید موقع دیے بغیر چاقو اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ وہ اتنی سی دیر میں اتنی نقاہت کا شکار ہو گئی تھی کہ مزاحمت نہ کر سکی اور چکراتے سر کے ساتھ اس نے کاؤنٹر کا سہارا لینا چاہا لیکن ناکام رہی' اس سے پہلے وہ گرتی احمد نے اس کو تھام لیا تھا۔ لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"انکل۔" وہ دونوں ہاتھ ڈائننگ ٹیبل پر رکھے گہری سوچ میں گم تھے جب احمد کی آواز پر چونک کر سر اٹھایا۔ وہ جوس کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

"نہیں احمد! دل نہیں کر رہا۔"

"پلیز انکل آپ نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ شام ہو رہی ہے اتنی دیر پیٹ خالی رکھنا ٹھیک نہیں۔" اس کے انداز پر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ احمد نے کسی آدمی کو یوں بے بسی سے روتے نہیں دیکھا تھا جب پہلی بار وہ ان سے ملا تھا کتنی مضبوط پرسنالٹی تھی ان کی۔ ان کی اپنی اولاد نے انہیں کتنا بے بس کر دیا تھا اور پہلی دفعہ اسے عائشہ پر بے حد غصہ آیا تھا۔

"انکل! پلیز۔" اس نے بے اختیار اٹھ کر انہیں ساتھ لگا لیا تھا۔

"آئی ایم ویری سوری احمد۔"

"انکل مجھے سوری کیوں کہہ رہے ہیں۔"

"میری بیٹی نے مجھے تمہارے سامنے شرمندہ کر دیا۔ میں نے کتنے مان سے اس سے بات کی جبکہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" یہ بات احمد کو بتاتے ہوئے ان کا دل چاہا' زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں۔ احمد کچھ نہیں بولا تھا کیونکہ انہوں نے اپنی طرف سے جو انکشاف کیا تھا وہ یہ سب سن چکا تھا۔

"میں تمہارا ہی نہیں نوازش کا بھی مجرم ہوں۔ اس نے بچپن کی بات کو اہم جانا' چاہتا تو اگنور کر سکتا تھا لیکن اس نے پاس رکھا' میری ایک کال پر تمہیں بھیج دیا۔ عائشہ کی اتنی بدتمیزی پر بھی تم نے کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی۔ لیکن آج میں تم سے کہہ رہا ہوں میری بیٹی تمہارے لائق نہیں' میری تم سے ایک گزارش ہے کہ عائشہ کی اس حرکت کا کسی کو پتا نہ چلے تمہارے گھر والوں کو بھی نہیں۔"

احمد نے سر ہلا کر اقرار کیا تھا۔

"تھینک یو۔" انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ

تھام لیے تھے۔

"میں جانتا ہوں' وہ غلط فیصلہ کر رہی ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں۔ میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔" وہ سر جھکائے خود کلامی کے انداز میں بولے۔

احمد نے افسوس سے ان کے چہرے کو دیکھا جو ایک ہی دن میں بوڑھے لگنے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

جب اسے ہوش آیا تو اس کے قریب سدرہ بیٹھی تھی اور اس سے کچھ فاصلے پر صوفے پر سلطان صاحب بیٹھے تھے۔

"انکل! عائشہ کو ہوش آگیا ہے۔" سدرہ کی پرجوش آواز پر انہوں نے سر اٹھا کر عائشہ کی طرف دیکھا اور گہرا سانس لے کر کھڑے ہوگئے۔

"تم جس لڑکے کی بات کر رہی تھیں۔ اسے بلاؤ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" کہہ کر وہ رکے نہیں تھے۔

"ہیں یہ انقلاب کیسے ہوا؟" سدرہ نے حیرت سے اسے دیکھا تو اس نے بمشکل مسکراتے ہوئے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ سدرہ نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"انکل نے مجھے تو نہیں بتایا۔ انہوں نے کہا۔ چوٹ لگی تھی۔" وہ اب بھی حیران تھی۔

"پر عائشہ! یہ سب کیوں۔"

"وہ مان نہیں رہے تھے۔ وہ میری شادی احمد سے کروانا چاہتے تھے۔"

"ایک بات کہوں۔"

"ہاں۔" وہ بند آنکھوں کے ساتھ بولی۔

"حذیفہ سے کروڑ درجے بہتر احمد ہے۔" عائشہ نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟"

"ٹھیک ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔" سدرہ پھر بھی اپنی کہنے سے باز نہیں آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

منگنی کی تقریب بہت سادگی کے ساتھ انہوں نے گھر میں ارینج کی تھی۔ ان کی طرف سے ان کے بھائی تھے' وہ بھی ان سے ناراض تھے۔ وہ خود عائشہ کے مستقبل کو لے کر اتنے پریشان تھے کہ کسی اور طرف دھیان ہی نہیں جاتا تھا۔ انہیں پہلے ہی عائشہ کے فیصلے پر اعتراض تھا مزید حذیفہ سے مل کر ان کا دل خراب ہو گیا تھا۔ انہیں یہ اندازہ تھا کہ ان کی بیٹی کو لوگوں کی پہچان نہیں ورنہ احمد جیسے ہیرے کو نہ ٹھکراتی ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے حذیفہ میں کیا نظر آیا۔ انہیں پہلی نظر میں وہ لڑکا احساس کمتری کا شکار لگا اور اس سے باتیں کرنے کے بعد اس کی باتوں میں لالچ صاف نظر آیا تھا۔ جاننے کے دعوے کے باوجود عائشہ کو کیوں یہ سب نظر نہیں آیا۔ حذیفہ کے گھر والے موجود تھے' بالکل ان کے اندازے کے مطابق ان پڑھ' جاہل' لالچی' حریص نظروں سے ان کی گھر کی چیزوں کو دیکھتے ہوئے۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے ان لوگوں کے لیے اچھے کپڑوں کا انتظام کیا تھا جبکہ وہ عائشہ کے لیے ایک معمولی سی انگوٹھی اور سستی سی جیولری کے سوا کچھ نہیں لائے تھے۔ انہوں نے غور سے عائشہ کا چہرہ دیکھا کہ شاید اسے کچھ برا لگا ہو لیکن وہ مسکرا رہی تھی۔ انہوں نے گہرا سانس لے کر احمد کو تلاش کیا' وہ وہاں نہیں تھا۔ اب احمد کو دیکھ کر انہیں عائشہ کے لیے زیادہ افسوس ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سدرہ کے ساتھ شاپنگ کر کے لوٹی تھی جب سکینہ نے بتایا کہ پاپا اس کو بلا رہے ہیں۔ وہ بہت خوش ہو گئی کیونکہ منگنی کے بعد وہ بہت کم اس سے بات کرتے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی ان کے کمرے کی طرف بڑھی لیکن دروازہ کھولتے ہی پہلی نظر احمد پر پڑی اور اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔

"آپ نے بلایا تھا پاپا۔"

"ہاں آؤ۔" انہوں نے سنجیدگی سے اسے سامنے بیٹھنے کو کہا۔

"تم کہاں جارہے ہو؟" احمد کو اٹھتا دیکھ کر سلطان صاحب نے پوچھا۔

"باہر۔"

"بیٹھ جاؤ۔" وہ چاروناچار بیٹھ گیا۔

"تم نے جب بھی مجھ سے ضد کی میں نے ہمیشہ پوری کی۔ اپنی یہ والی ضد پوری کرنے کے لیے تم نے جو طریقہ اختیار کیا۔ میں نے سوچ لیا تھا۔ میں اب بھی تم سے کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن باپ ہوں' اپنی محبت سے مجبور ہوں۔"

"بات کیا ہے پاپا؟" اب کے وہ پریشان ہو کر بولی۔

"مجھے پہلی نظر میں حذیفہ پسند نہیں آیا لیکن میں نے نہیں کہا۔ اس کے گھر والے دیکھے تھے ناتم نے۔ اس کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں جانتی ہو تم کچھ؟" ان کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔ "اس کے فادر ایک اسکول میں چپڑاسی ہیں۔ ایک بھائی اس کا موٹر مکینک ہے اور ایک درزی کا کام کرتا ہے۔ منشیات کا عادی ہے' دو کمروں کا گھر ہے۔ جس میں ان پانچ افراد کے علاوہ اس کی دو بہنیں بھی رہتی ہیں۔ کیا یہ بات تمہارے نالج میں ہے؟" اور عائشہ کے سر میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ اسے یہ پتا تھا حذیفہ کا تعلق مڈل کلاس سے ہے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ اس کا تعلق لوئر مڈل کلاس سے ہے اور اس کا فیملی بیک گراؤنڈ اس نے کبھی اس کے بہن بھائیوں کا پوچھا ہی نہیں اور نہ اس نے کبھی بتایا تھا۔

"تمہاری خاموشی سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ تمہیں یہ سب نہیں معلوم۔" اسے خاموش دیکھ کر سلطان صاحب جتاتے ہوئے انداز میں بولے۔

"آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟"

"میں نے پتا کروایا ہے۔"

"کس سے؟"

"احمد نے پتا کروایا ہے۔" عائشہ نے کھا جانے والی نظروں سے احمد کو دیکھا۔

"اس نے کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ یہ آدمی تو کبھی میرا اچھا نہیں سوچ سکتا۔ آپ کو یہ کیوں نظر نہیں آرہا کہ یہ مجھ سے بدلہ لینے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے۔"

"وہ کیوں بدلہ لے گا۔"

"یہ تو آپ اس سے ہی پوچھیں اور مجھے افسوس ہے پاپا! کہ آپ کو مجھ سے زیادہ اس شخص پر یقین ہے۔" وہ کہہ کر رکی نہیں تھی۔

"میں نے کہا تھا' انکل! وہ نہیں مانے گی۔" دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے احمد کی آواز سنی تھی۔ اس نے کمرے میں جا کر سب سے پہلے حذیفہ کو فون کیا تھا۔

"شکر ہے' تم نے فون تو کیا۔" اس کی آواز سن کر حذیفہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"پلیز حذیفہ! اس وقت میرا موڈ اچھا نہیں۔"

"کیوں کیا ہوا؟" دوسری طرف وہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"تم نے مجھے کبھی بتایا نہیں کہ تمہارا ایک بھائی موٹر مکینک اور دوسرا درزی ہے۔ وہ بھی ڈرگ ایڈکٹ۔"

"ہاں یہ سچ ہے۔ میں تمہیں یہ سب بتانا چاہتا تھا لیکن کبھی موقع ہی نہیں ملا اور پھر تم نے کبھی پوچھا بھی تو نہیں۔" عائشہ کا پہلے غصے اور اب صدمے کے مارے برا حال تھا۔

"گھر بھی تمہارا اتنا چھوٹا ہے حذیفہ مجھے کہاں رکھو گے۔"

"میں مانتا ہوں عائشہ! جو تم کہہ رہی ہو' سب ٹھیک ہے۔ یہ سب تمہارے اسٹینڈرڈ کے مطابق نہیں لیکن میں نے کبھی نہیں سوچا کہ میں تمہیں اپنی فیملی کے ساتھ رکھوں گا' میں تو خود بھی ان کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا' جہاں مسئلے اور غربت ہی ختم نہیں ہوتی۔ شادی کا کچھ عرصہ ہم انکل کے ساتھ رہیں گے جیسے ہی مجھے کوئی اچھی جاب ملے گی۔ ہم اپنا گھر لے لیں گے اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو انکل کا اتنا بڑا بنگلہ اور بزنس سب تمہارا ہی تو ہے۔"

"پاپا مجھے کچھ نہیں دیں گے۔" بے خیالی میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"کیا مطلب؟" حذیفہ کو دھچکا لگا تھا۔

"تم جانتے ہو۔ میں نے پاپا کی مرضی کے خلاف جا کر تم سے منگنی کی ہے۔ انہوں نے منگنی اس شرط پر کی تھی کہ وہ شادی کے بعد مجھے اپنی جائیداد میں سے کچھ نہیں دیں گے۔" اس نے جیسے ہوا میں تیر چھوڑا تھا۔

"تم مذاق کر رہی ہو عائشہ!" حذیفہ جیسے رو دینے کو تھا۔

"نو۔ آئی ایم سیریس۔" دوسری طرف خاموشی چھا گئی تھی۔

"اچھا عائشہ! میری کال آرہی ہے۔ تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

فون رکھتے ہی عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا تھا۔ وہ دونوں ٹانگیں صوفے پر رکھے ان پر ٹھوڑی ٹکائے گہری سوچ میں گم تھی۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے حذیفہ سے بات کی تھی۔ اس کے بعد نہ اس نے کال کی اور نہ حذیفہ نے۔ وہ کالج بھی نہیں جارہی تھی دو ماہ بعد شادی تھی اس کی' لیکن اس نے شاپنگ بھی بند کر دی تھی۔ پاپا الگ خاموش رہتے تھے۔ پہلے بھی گھر میں دو افراد تھے لیکن آوازیں تھیں۔ اب تو لگتا تھا جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ احمد جب تھا تو پاپا اس سے بات کر لیتے تھے۔ اب تو وہ بھی چلا گیا تھا' اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ گاڑی کا ہارن بجا اور اس کے بعد ڈور بیل بجی تھی۔ وہ حیران ہوتی ہوئی باہر نکلی' کیونکہ کار کا ہارن پاپا کی گاڑی کا نہیں تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تو سامنے ہی پاپا کھڑے تھے۔ لیکن دو آدمیوں کا سہارا لیے ہوئے۔

"پاپا۔" وہ بے ساختہ ان کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا انہیں؟" اس نے ان دونوں سے پوچھا تھا۔

"اچانک آفس میں سر کی طبیعت خراب ہو گئی تھی ہم ہسپتال لے کر گئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔ کسی ٹینشن کی وجہ سے۔" اس نے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ دونوں ان کو سہارا دیتے ہوئے بیڈ روم میں لے آئے تھے۔

"حفیظ صاحب! تھینک یو ویری مچ۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" وہ بمشکل یہ بول سکے تھے۔

"یہ ان کی میڈیسن ہے اگر کوئی پرابلم ہو تو یہ میرا نمبر ہے۔ میں سر کا منیجر ہوں۔"

"تھینک یو ویری مچ۔" انہیں چھوڑ کر وہ اندر آئی تو وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔

"پاپا!" اس نے روتے ہوئے انہیں پکارا تو انہوں نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"وہ تمہارے لائق نہیں عائشہ!"

"کون پاپا؟"

"حذیفہ۔" وہ کچھ نہیں بولی۔ بس ان کا ہاتھ پکڑ کر روتی رہی۔

"آج آفس آیا تھا وہ اور اس کا بھائی۔" عائشہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"پچاس لاکھ مانگ رہے تھے۔ کرائے کا گھر تھا جہاں سے انہیں جواب مل گیا ہے اور وہ مکان خریدنا چاہتے ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا تب بھی تو مکان آپ نے دینا ہے تو ابھی سہی۔ میری باتوں پر بھی شاید تم یقین نہ کرو جیسے احمد کا نہیں کیا تھا میں نے ریکارڈنگ کی ہے۔ سن لو۔" انہوں نے موبائل اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"اور اگر میں نہ دوں تو۔" سلطان صاحب کی آواز آئی تھی۔

"وہ تو آپ کو دینے پڑیں گے اور یہ میں اپنے لیے نہیں آپ کی بیٹی کے لیے کہہ رہا ہوں کہاں عادت ہے اسے ایک کمرے میں رہنے کی اگر آپ نے مجھے پچاس لاکھ نہ دیے تو آپ کی بے وقوف بیٹی تو ہے نا۔ سوچیں اس پر میرے پیار کا رنگ کتنا گہرا ہے۔ پہلے بھی وہ میری خاطر خودکشی کی کوشش کر چکی ہے تو سوچیں کیا میری خاطر وہ گھر سے نہیں بھاگ سکتی اور پھر جو آپ کی۔ عزت رہ جائے گی تو پچاس لاکھ کیا برے ہیں۔"

یہ مکروہ انداز حذیفہ کا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"مجھے پتا تھا۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا اس لیے ریکارڈ کرلی۔ آج میرا دل چاہ رہا ہے عائشہ کہ میں مر جاؤں۔ جتنی ذلت مجھے اس لڑکے کے سامنے محسوس ہوئی۔ تم نے مجھے ماردیا عائشہ! ماردیا۔"

"خدا کے لیے پاپا! ایسے مت کہیں پاپا! مجھ سے غلطی ہوگئی۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بری طرح رو پڑی تھی۔

"احمد کو بلاؤ۔"

"پاپا۔"

"عائشہ! احمد کو بلاؤ۔" وہ بے بسی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میرے موبائل میں اس کا نمبر ہے۔"

اس نے احمد کا نمبر ڈائل کیا تھا دوسری بیل پر اس نے فون اٹھالیا تھا۔

"السلام علیکم انکل کیسے ہیں!"

"عائشہ بات کر رہی ہوں۔" دوسری طرف خاموشی چھاگئی تھی جیسے وہ اس سے بات نہ کرنا چاہتا ہو۔

"پاپا آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں تم اسے کہو آجائے۔"

"پاپا کہہ رہے ہیں آپ آجائیں۔"

"خیریت ہے نا۔" اس کی بھاری آواز پر وہ چونکا تھا۔

"پاپا کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" اب کے وہ رو پڑی تھی۔

"اوکے۔ میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے ان کو دو تین دفعہ آواز دی لیکن وہ شاید سو گئے تھے وہ اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔ وہ بڑی بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ پندرہ منٹ تھے کہ گزر نہیں رہے تھے پندرہ منٹ میں دس دفعہ اس نے اندر جھانک کر دیکھا تھا کہ ماما سانس۔ لے رہے ہیں اچانک وہ پتا نہیں کیوں بہت ڈر گئی تھی۔

"یا اللہ! احمد آجائے۔" اس نے دل سے دعا کی تھی۔ تب ہی ڈور بیل بجی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی گیٹ تک گئی تھی۔

"کہاں ہیں انکل؟" وہ بھی اس کی طرح پریشان تھا اور اس کے جواب سے پہلے بھاگتے ہوئے سلطان صاحب کے کمرے کی طرف گیا تھا۔

"انکل!" اس نے قریب جاکر پہلے انہیں پکارا تھا اور اس کی ایک پکار پر انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائے تھے۔ عائشہ کا دل چاہا خود کو شوٹ کرلے۔ اس کے ایک غلط فیصلے نے اس کے باپ کو اس سے دور کردیا تھا۔

"تم آگئے احمد۔"

"جی انکل! میں آپ کے پاس ہوں۔ یہ اچانک کیا ہوا۔ طبیعت کیسے خراب ہوگئی آپ کی۔"

"جانے کا وقت آگیا ہے احمد۔"

"پاپا۔" وہ ایک دم چیختی ہوئی ان کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔

"ایسے مت کہیں پاپا! میں مرجاؤں گی۔" احمد بھی ایک دم پریشان ہوگیا تھا۔

"پلیز انکل ایسے مت بولیں۔ کچھ نہیں ہوگا آپ کو۔ میں آگیا ہوں نا۔ ابھی ہسپتال چلتے ہیں۔"

"نہیں احمد! اب جینے کو دل نہیں کرتا میرا دل آج مرگیا ہے۔"

"پاپا مجھے معاف کردیں۔" وہ اب ان کے پاؤں چوم رہی تھی۔

"نہیں پاپا۔" وہ اور زور سے رونے لگی۔

"یہاں آؤ عائشہ۔" وہ ان کے دائیں طرف آکر بیٹھ گئی۔

"پاپا! مجھے معاف کردیں مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی۔ آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں پاپا! جو چاہے۔" وہ ان کے کندھے پر سر رکھ کر بری طرح رو پڑی تھی۔

"احمد! آج پھر تم سے کچھ مانگنے لگا ہوں۔ تم بھی کہو گے کیسا خود غرض آدمی ہے لیکن کیا کروں تم پر مجھے مان بھی بہت ہے۔" انہوں نے بائیں ہاتھ میں احمد کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"میری بیٹی بہت نادان ہے اس سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں اس سے ناراض ہوں پر میں اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرے بعد یہ اکیلی ہوجائے گی۔"

"پاپا۔"

"مجھے بات کرنے دو عائشہ۔" انہوں نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"اسے میں نے آج تک زمانے کی ہر برائی سے بچا کر رکھا ہے اس لیے یہ لوگوں کو پہچاننے میں دھوکا کھا گئی۔ میرے بعد صرف ایک تم ہو جس پر میں بھروسا کرسکتا ہوں۔"

"انکل!" احمد نے کچھ کہنا چاہا لیکن انہوں نے اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش کروادیا۔

"میں نے خود تم سے کہا تھا کہ میری بیٹی تمہارے لائق نہیں۔ میرے بعد بے شک تم اس سے شادی نہ کرنا لیکن اس کا خیال ضرور رکھنا۔ رکھو گے نا؟"

"پاپا! مت کریں ایسا۔ مجھے معاف کردیں' آپ جیسا کہیں گے میں ویسا کروں گی۔ میں کبھی بدتمیزی نہیں کروں گی میں کبھی ضد بھی نہیں کروں گی۔ آپ کو حذیفہ نہیں پسند میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ آئی پرامس پاپا نہیں کروں گی۔ بس مجھے معاف کر دیں۔" وہ دونوں ہاتھوں میں ان کا چہرہ تھام کر ان سے وعدہ کر رہی تھی۔ اس کی حالت اس وقت اتنی قابل رحم ہو رہی تھی کہ احمد کو بھی افسوس ہو رہا تھا۔

"عائشہ۔" سلطان صاحب نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لے لیا تھا۔ وہ ان کے سینے پر سر رکھ کر رو پڑی تھی۔

"میں تم سے ناراض نہیں میری بچی! میں کبھی تم سے ناراض نہیں ہوسکتا۔" انہوں نے اب بھی احمد کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

"احمد! وعدہ کرو۔ میری عائشہ کا خیال رکھو گے۔" اس کے سرہلانے پر وہ مسکرادیے تھے۔

"میرے دونوں بچے میرے ساتھ ہیں۔ مجھے بہت سکون ہے۔" وہ اب نارمل انداز میں بات کر رہے تھے۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ کچھ دیر سوؤں گا۔ احمد تم جانا نہیں۔ عائشہ اکیلی ہوجائے گی۔" احمد نے بے ساختہ عائشہ کی طرف دیکھا تھا تب ہی اس نے بھی احمد کی طرف دیکھا تھا۔ نظریں ملنے پر دونوں نے نظریں چرالی تھیں۔

"میں اٹھوں گا تو نوازش سے میری بات کروانا۔" احمد نے سرہلایا تھا۔

"تھوڑی دیر سوؤں گا۔" وہ غنودگی میں چلے گئے تھے۔

"پاپا۔" عائشہ نے گھبرا کر آواز دی تھی۔

"شاید دوائیوں کا اثر ہے۔ سونے دو ان کو۔ باہر آجاؤ۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا تھا۔ انہیں چادر اوڑھا کر لائٹ آف کرکے باہر نکل آئی۔ کتنی دیر وہ انگلیاں مروڑتی صوفے کی سائیڈ پر کھڑی رہی جبکہ احمد آنکھیں بند کیے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ اس سے معافی مانگنا چاہتی تھی لیکن اس کے آنکھیں کھول کر دیکھنے پر وہ کچھ اور بول گئی۔

"کھانا کھائیں گے۔"

نہیں تم سو جاؤ۔ میں یہیں ہوں۔" وہ کچھ کہے بغیر کمرے میں آگئی تھی۔ نامانوس شور پر اس کی آنکھ کھلی تھی پہلے تو اسے کچھ سمجھ نہیں آیا' وہ عائشہ کے چیخنے کی آواز تھی۔ وہ ننگے پاؤں سلطان صاحب کے کمرے کی طرف بھاگا تھا "پاپا!" وہ روتے ہوئے ان کو اونچی آواز میں پکار رہی تھی۔

"احمد! پاپا بول نہیں رہے۔ یہ مجھ سے ناراض ہیں اس لیے نہیں بول رہے آپ بلائیں نا۔ آپ کی بات ضرور مانیں گے۔" وہ اب اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ رہی تھی۔ احمد نے سلطان صاحب کے دل پر ہاتھ رکھا جو بالکل ساکت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اور عائشہ جو منتظر نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پاگلوں کی طرح چیخنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پھر کیا سوچا ہے؟"

"کس بارے میں؟" نوازش صاحب کے پوچھنے پر اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"عائشہ کے بارے میں۔" احمد نے گہرا سانس لیا۔

"پاپا! یہ اس کی اپنی زندگی ہے۔ اسے کیا کرنا ہے یہ آپ کو اس سے پوچھنا چاہیے۔"

"میں دو تین دفعہ گیا ہوں اس کے پاس، پر وہ مجھے دیکھتے ہی رونے لگتی ہے۔ میری ہمت نہیں ہوئی کوئی بھی بات کرنے کی، میں نے اس کے تایا سے پوچھا تھا کہ ہم عائشہ کو اپنے ساتھ لے جائیں پر انہوں نے منع کر دیا۔"

"کیوں؟" وہ ماتھے پہ بل ڈال کر بولا۔

"وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہیں احمد! وہ عائشہ کے تایا ہیں۔ ان کا اس پر حق ہے جبکہ ہم کون ہیں اس کے۔"

"لیکن پاپا! انکل نے جانے سے پہلے عائشہ کی ذمہ داری مجھے سونپی تھی۔"

"وہ تمہیں پتا ہے لیکن لوگوں کو نہیں۔ وہ تم سے پوچھیں گے کہ کس حق سے تم عائشہ کو ساتھ لے کر جانا چاہتے ہو تو کیا کہو گے اور کیا عائشہ تمہارے ساتھ جائے گی؟"

اب کی بار وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

"ہمیں دو ہفتے ہو گئے ہیں یہاں آئے۔ تمہاری ممی بھی بار بار فون کر رہی ہے۔ اب ہمیں واپس چلنا چاہیے اور میرے خیال میں عائشہ کو تھوڑا ٹائم دینا چاہیے شاید وہ خود کوئی بہتر فیصلہ کر سکے۔" وہ سر ہلا کر رہ گیا۔ تب ہی شور کی آواز پر وہ دونوں گھبرا کر اندر کی طرف بھاگے تھے اور دروازے میں ہی رک گئے۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے سامنے آنے کی؟" احمد نے عائشہ کا سرخ چہرہ اور جارحانہ انداز دیکھ کر مقابل کو دیکھا جہاں حذیفہ کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ سینے پر باتھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"عائشہ!"

"نام مت لو اپنی گندی زبان سے میرا۔ تم میرے پاپا کے قاتل ہو۔ لالچ نے میرے پاپا کی جان لے لی۔" زور سے بولتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔

"مجھے معاف کر دو عائشہ۔" وہ دو قدم آگے بڑھا اور وہ بے ساختہ تین قدم پیچھے ہٹی تھی۔

"دور رہو مجھ سے گھٹیا انسان! میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ لو اپنی گھٹیا انگوٹھی اور دفع ہو جاؤ۔ میں سمجھوں گی، مر گئے تم، بلکہ مر جاؤ تم۔ مجھے سکون آجائے گا۔"

"عائشہ..." وہ **گھگھیانے** والے انداز میں آگے بڑھا۔

"تم دفع ہوتے ہو یا میں تمہارا قتل کر دوں۔" کہنے کے ساتھ اس نے ٹیبل پر پڑے اسٹینڈ میں سے چاقو نکال لیا۔ نوازش صاحب کے ساتھ ساجد صاحب اور تماشا دیکھتا سعد ایک دم آگے بڑھے تھے جبکہ سدرہ نے مضبوطی سے اسے کندھے سے تھام لیا تھا۔ آج کافی دن بعد احمد نے اسے اس کے پرانے انداز میں دیکھا تھا اور وہ جانتا تھا اگر حذیفہ مزید کچھ دیر یہاں رکا تو اپنی ٹانگوں پر واپس نہیں جائے گا۔

"جاتے کیوں نہیں۔ عائشہ نے کہہ دیا نا کہ وہ تم سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی۔ چلے جاؤ۔ آئندہ یہاں نظر مت آنا ورنہ سیدھا پولیس اسٹیشن جاؤ گے۔"

"اور ایک بات۔" وہ جھک کر انگوٹھی اٹھا رہا تھا جب عائشہ بولی۔

"آج تک میں نے تمہیں جتنی رقم دی ہے۔ وہ مجھے واپس چاہیے اگر تم نے واپس نہ کی تو پولیس کے ذریعے مجھے یہ کام کرنا ہو گا۔" حذیفہ نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن ساجد صاحب اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے گئے تھے۔ جبکہ سدرہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

"یہ کیا تھا۔" نوازش صاحب اب تک پریشان اور حیران تھے۔

"وہ ایسی ہی ہے۔" احمد نے مسکرا کر جانے کس بات کا مزہ لیا تھا جبکہ نوازش صاحب کے لیے روتی گھبراتی عائشہ کا یہ روپ ہضم کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

دستک پر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور نوازش صاحب کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ کتنی دیر اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے تسلی دیتے رہے۔ وہ، جو بہت غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"آپ جا رہے ہیں؟"

ہاں بیٹا! جانا تو ہے۔ اتنے دن ہو گئے تمہاری آنٹی بھی اکیلی ہیں۔ مجھے تمہاری فکر تھی لیکن تمہارے تایا نے کافی تسلی دی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رہیں گے لیکن تم فکر نہ کرو۔ ہم آتے جاتے رہیں گے۔ فون پر بھی تم سے رابطہ رہے گا۔"

پتا نہیں کیوں اسے ڈھیر سا رونا آیا تھا۔

"عائشہ! تم ایسے رو ؤ گی تو مجھے پریشانی ہو گی وہاں بھی میں پریشان رہوں گا۔" تب ہی احمد اندر آیا تھا۔

"چلیں پاپا۔"

"ہاں چلو۔ اچھا بیٹا اپنا خیال رکھنا" وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ان کے جانے کے بعد عائشہ نے آنسو بھری نظروں سے سامنے دیکھا۔ وہ وہیں کھڑا تھا عائشہ خود اٹھ کر اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

"میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔ میں نے پاپا کے علاوہ آپ کو بھی بہت ہرٹ کیا ہے۔ پاپا آپ سے بہت پیار کرتے تھے۔ آپ پر ان کو مان بھی بہت تھا۔ میں نے تو ان کا مان توڑ دیا تھا۔" کہنے کے ساتھ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ "اگر آپ مجھے معاف کر دیں گے تو پاپا بھی مجھے معاف کر دیں گے بولیں آپ نے مجھے معاف کر دیا نا!"

احمد کا سر خود بخود ہل گیا تھا۔

"میں تم سے ناراض نہیں۔"

"تو؟" عائشہ کی تو پر اس نے چونک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"تو کیا۔"

"کچھ نہیں۔" وہ پلٹ گئی تھی جبکہ اس کی تو کو لے کر وہ سارا راستہ سوچتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اب اس کے دن رات معافی مانگتے گزر جاتے تھے ابھی بھی کمرے میں پڑے پڑے اس کا دل گھبرانے لگا تو وہ باہر آگئی۔ اس کا رخ سلطان صاحب کے کمرے کی طرف تھا لیکن اندر داخل ہوتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ سے ہلی تھی۔ وہ وہیں سے چیخی تھی "سکینہ۔"

"جی باجی۔" وہ بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"یہ کس نے۔" اس نے انگلی سے کمرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ غصے کے مارے اس سے بات پوری نہیں ہو رہی تھی۔

"باجی! ابھی نہیں۔ ساری جگہ پر یہی کچھ ہے آپ کے تایا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔" وہ ایک دم شاکڈ ہو کر رہ گئی تھی۔ اب کے اس نے دھیان سے سارے گھر کا جائزہ لیا۔

اس نے ان کی وارڈ روب کھولی۔ ان کے کپڑے ان کے لاکرز میں رکھے زیورات نقدی سب غائب تھے۔ وہ جیسے وہیں گر گئی تھی اس کا دماغ بالکل سن ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی باہر آئی۔ سکینہ وہیں کھڑی تھی۔

"یہ سب کب سے ہو رہا ہے؟"

"یہ تو جی قتل کے بعد سے ہو رہا ہے۔"

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔"

"میں کتنی دفعہ آئی تھی آپ کے پاس پر آپ کی حالت ایسی نہیں تھی اور تو اور وہ لوگ مجھے بھی نکالنا چاہتے ہیں۔ میں ہی ڈھیٹوں کی طرح خود آجاتی ہوں مجھے بس آپ کی فکر ہے۔ میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔" وہ جو ہونٹ چباتے ہوئے سکینہ کی بات سن رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

"روؤ نہیں باجی آپ تو بڑی بہادر ہو۔" سکینہ کو اس پر بڑا ترس آیا تھا۔

"بہادر نہیں ہوں سکینہ ... ! میری ساری بہادری میرے پاپا کی وجہ سے تھی۔ وہ کہتے تھے ہمیں دنیا کے

روپ نہیں جانتی۔ دیکھو سکینہ میں نے کتنا دھوکا کھایا۔ ہر جگہ ہر رشتے سے دھوکا کھا رہی ہوں اور جانتی ہو کیوں؟ کیونکہ میں نے اپنے پاپا کا دل دکھایا اور اب مجھے سمجھ آ رہی ہے۔ انہوں نے مجھے معاف نہیں کیا۔" وہ اب پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"نہیں باجی! ایسے نہ روؤ ۔ ماں باپ اپنے بچوں سے ناراض نہیں ہوتے چاہے وہ جتنی مرضی بڑی غلطی کرلیں، صاحب تو آپ سے پیار بھی بہت کرتے تھے۔ وہ غصہ ضرور تھے پر ناراض نہیں۔"

"میں اکیلی رہ گئی سکینہ! بالکل اکیلی۔"

"آپ اکیلی نہیں باجی! جس کا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کا اللہ ہوتا ہے اور پھر احمد بھائی بھی تو آپ کے اپنے ہیں۔" اور وہ رونا بھول کر سکینہ کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں ٹھیک کہہ رہی ہوں باجی! بڑے صاحب نے انہیں آپ کے لیے پسند کیا تھا۔ احمد بھائی تو دعا ہیں صاحب کی آپ کے لیے۔" وہ سب بھول کر سکینہ کا منہ دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ لاؤنج میں آئی تو وہ تینوں بڑے خوشگوار موڈ میں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔

"ارے واہ بھئی۔ آج عائشہ کیسے کمرے سے باہر آ گئی۔" زبیدہ نے بڑے طنزیہ انداز میں اسے دیکھ کر کہا تھا۔

"تایا جی! آپ نے اپنا سامان پاپا کے روم میں شفٹ کیوں کیا؟ اس کے سوال پر ایک پل کے لیے تینوں کے چہرے کے رنگ اڑ گئے تھے۔

"بھئی اب ہمیں یہیں رہنا ہے تو گھر کے سربراہ کا جو کمرہ ہو گا۔ میں اسی میں رہوں گا نا۔" ساجد صاحب کی ڈھٹائی پر اس کا غصہ عود آیا تھا۔

"وہ کمرہ میرے پاپا کا ہے اور یہ گھر میرا ہے اور پاپا کے ڈاکومنٹس، زیورات، پیسے سب کس کی اجازت سے آپ نے نکالے ہیں؟"

"توبہ کیسی بدتمیز لڑکی ہے۔ اپنے ——— تایا سے زبان چلا رہی ہے۔" زبیدہ نے دونوں گال پیٹتے ہوئے کہا۔

"دیکھو لڑکی! تمہارے یہ بدتمیز انداز تمہارا باپ برداشت کرتا تھا۔ میں نہیں کروں گا۔ اب یہ میرا گھر ہے اور سلطان کا بھائی ہونے کے ناتے یہ جائیداد، یہ بزنس سب میرا ہے۔ تمہارا کام گھر میں رہنا ہے اور تمہاری روٹی کپڑے کی جو ضرورت ہے، پوری ہو جائے گی اور یہ ہمارا احسان مانو کہ تم جیسی بدزبان لڑکی جس کی پہلے منگنی ٹوٹ چکی ہے یہ بھی ہماری قربانی سمجھو ہم تمہیں بہو بنا رہے ہیں۔ اگلے ہفتے ہم تمہارا نکاح سعد کے ساتھ کر رہے ہیں۔"

دھماکا ہونا، زلزلہ آنا یہ سارے محاورے اب اس کی سمجھ میں آ رہے تھے۔ اس کی نظریں ان دونوں سے ہوتی ہوئی سعد پر جا رکیں۔ اس کی وہی مکروہ دل جلانے والی ہنسی۔ وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی۔

"یہ ناممکن ہے۔ میں اس سے شادی کروں اس سے بہتر ہے۔ میں اپنی جان دے دوں۔" اب کے سعد کھڑا ہو گیا تھا۔

"اپنی خواہش پوری کیے بغیر میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔"

"بس۔" ساجد صاحب نے اسے ٹوک دیا۔

"دیکھو عائشہ! یوں ضد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ تمہارے پاس دوسرا کوئی آپشن نہیں اور اس جائیداد کو پانے کے لیے میں نے بہت انتظار کیا ہے۔ اب جب مجھے موقع ملا ہے تمہاری ضد کے لیے میں اسے گنوا نہیں سکتا۔ تمہارا باپ بھی ایسا ہی تھا اڑیل، سیدھی زبان اس کی بھی سمجھ نہیں آتی تھی مجبوراً غنڈوں کو بھیج کر مجھے اسے ڈرانا پڑا تاکہ وہ سعد کو اپنانے پر تیار ہو جائے لیکن وہ نوازش کے بیٹے کو لے آیا اور وہ لڑکا تو جیسے تمہارے باپ کا سایہ بن گیا تھا۔ ہر جگہ اس لڑکے نے ہمیں ناکام کیا۔ پر جو کام ہم نہیں کر سکے۔ تم نے کر دیا۔ جاؤ شاباش۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔"

اور وہ اپنے بے جان ہوتے وجود کو گھسیٹتی ہوئی اندر

"تم کیا کرو گی؟" اس کا نمبر لکھوانے کے بعد اس نے پوچھا۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ فون سائلنٹ پر کر کے اس نے وارڈ روب میں چھپا دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب اپنے ماضی میں جھانکنے بیٹھتی تھی تو سوائے ندامت کے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ اسے پاپا کی کہی ہوئی ایک ایک بات یاد آتی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ احمد پر آ کر رک گئی پھر سر جھٹک کر جیسے خود کو اسے سوچنے سے روکا تھا۔

"وہ کبھی مجھے نہیں اپنائے گا میں بدتمیز ہوں نا" اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہو گئی تھی۔ اگر اس کے دل میں میرے لیے کوئی اچھا احساس ہوتا تو میری خبر تو لیتا زندہ ہوں یا مر گئی اور پھر سدرہ نے فون تو کیا ہو گا میری پریشانی کا بھی بتایا ہو گا، ایک دن گزر گیا وہ نہیں آیا تب ہی ناگوار سی بو اس کی ناک سے ٹکرائی تو اس نے نظریں گھما کر دیکھا اس کے بالکل سامنے سعد بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ وہ ایک دم یوں اچھل کر کھڑی ہوئی تھی جیسے اسے بچھو نے ڈنک مارا ہو۔

"ایسا کیا سوچا جا رہا تھا جو تمہیں میرے آنے کا بھی پتا نہیں چلا۔" وہ نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا اس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ اور حرکات بتا رہی تھیں کہ وہ نشہ کی حالت میں ہے۔ وہ اس وقت بالکل بھی اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

خود پر جمی اس کی نظروں سے اسے کراہیت ہو رہی تھی اور ایسے ہی تاثرات شاید اس کے چہرے پر بھی آ گئے تھے، وہ کچھ کہے بغیر آگے بڑھی تھی لیکن اس نے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا تھا اور اسی تیزی سے عائشہ کا ہاتھ گھوما تھا اور اس کے منہ پر نشان چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا ایک پل کے لیے لڑکھڑا گیا تھا لیکن اگلے ہی پل اس نے طیش کے عالم میں تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا اور وہ لہرا کر منہ کے بل

"کل تک مجھے یہ گھر خالی چاہیے۔" اس نے احمد کی اونچی آواز سنی تھی۔

"یہ گھر سلطان نے میرے نام کر دیا تھا۔" ساجد صاحب کی آواز پر اس نے نوازش صاحب کے کندھے سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"اچھا۔" احمد طنزیہ آواز میں بولا۔ "ان کی اکلوتی بیٹی ان کی وارث موجود ہے پھر کس خوشی میں وہ جائیداد آپ کے نام کریں گے۔"

"میرے پاس ثبوت ہے۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے بتا دوں انکل کی جائیداد کی سارے اصل دستاویز میرے پاس ہیں۔ میں بحث نہیں کرنا چاہتا جس طرح آپ کا بیٹا جیل پہنچا ہے میں نہیں چاہتا اس عمر میں آپ دونوں میاں بیوی جیل میں چکی پیسیں۔ آپ دونوں کو تو میں عمر کا لحاظ کر کے چھوڑ رہا ہوں لیکن آپ کے بیٹے نے ایک کمزور لڑکی پر ہاتھ اٹھا کر جو بے غیرتی کا ثبوت دیا ہے۔ وہ ناقابل معافی ہے۔ چلیں پاپا۔"

وہ کہہ کر باہر نکل گیا اور ان کے پیچھے وہ دونوں بھی نکل آئے۔

☼ ☼ ☼

احمد کے گھر میں تین نفوس تھے نوازش انکل، سلمیٰ آنٹی اور احمد شروع میں وہ ان کے ساتھ ایک فاصلے پر رہی حالانکہ وہ اس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ انکل صبح اپنے سامنے اسے ناشتا کرواتے ان کے جانے کے بعد آنٹی اسے کچن میں ساتھ لے جاتیں، کبھی اپنی کسی فرینڈ کے گھر تو کبھی آؤٹنگ پر۔

زبردستی اسے ہر بات میں شامل کرتے ______

______ وہ کافی حد تک بہل گئی تھی

ان کا خلوص اور محبت تھی کہ وہ ان سے اٹیچ ہو گئی تھی صرف وہی ایک نظر نہیں آتا تھا اور کبھی آمنا سامنا ہو بھی جاتا تو لاپروا سا گزر جاتا اور وہ سارا سارا دن کڑھتی رہتی اسے احمد کا اگنور کرنا بہت برا لگتا تھا۔ اپنے اس برے وقت میں اسے وہی یاد آیا تھا اور وہ ہی آئی تھی اور بیڈ پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں میں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا تھا۔

"یا اللہ! مجھے میری نافرمانی کے لیے معاف کر دیں معاف کر دیں" وہ اب معافی کی گردان کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"او میرے خدا۔" اس کی باتیں سن کر سدرہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔ "مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے سدرہ! ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے ابھی کچھ ہو جائے گا۔ ہر نیا دن میرے لیے نیا انکشاف لے کر آتا ہے۔ باہر جاتے ہیں تو مجھے لاک کر جاتے ہیں۔ ایک سکینہ کا سہارا تھا۔ اسے بھی انہوں نے نکال دیا۔ میرا موبائل بھی چھین لیا۔ یہ تو اندر ایک پرانا موبائل تھا۔ پاپا کی کوئی پرانی سم تھی وہ استعمال کر رہی ہوں۔"

"اور پتا ہے عائشہ! میں دو دفعہ تم سے ملنے آئی تھی لیکن مجھے تم سے ملنے نہیں دیا کہا تم گھر پر نہیں ہو۔ تمہارا اسیل بھی بند تھا شک تو مجھے تب ہی ہو گیا تھا۔"

"سدرہ پلیز، کچھ کرو نہیں تو میں ایسے ہی گھٹ گھٹ کر مر جاؤں گی۔" وہ اب رو پڑی تھی۔

"عائشہ! پاگل مت بنو۔ کب تک یوں رو رو کر خود کو ہلکان کرتی رہو گی بہادری کا مظاہرہ کرو۔"

"کیسے؟" وہ اب روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"تم احمد کو فون کرو۔"

"احمد۔" وہ ایک دم رکی تھی۔

"ہاں احمد، وہی تمہاری مدد کر سکتا ہے۔"

"لیکن سدرہ! کس منہ سے اس سے مدد مانگوں تم جانتی ہو میں نے ہمیشہ اس سے بدتمیزی سے بات کی ہے۔ وہ کیوں کرے گا میری مدد۔"

"وہ کرے گا تمہاری مدد اور کیوں کا جواب وہ خود دے گا۔"

"میں سمجھی نہیں سدرہ! تم مجھے الجھا رہی ہو۔"

"تمہارے پاس اس کا نمبر ہے۔"

"ہاں۔"

"مجھے دو۔" عائشہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔

زمین پر گری تھی۔ پیشانی اتنی زور سے زمین سے ٹکرائی تھی کہ وہ بلبلا اٹھی تھی۔ ابھی وہ سنبھلی نہیں تھی کہ اس نے بالوں سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔ درد کے مارے اس کی چیخ نکل گئی تھی۔

"تم دیکھو، آج میں تمہارا کیا حشر کرتا ہوں کہ دوبارہ کبھی سر اٹھا کر بات نہیں کر سکو گی۔" وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر بیڈ روم کی طرف لے جا رہا تھا خود کو چھڑانے کے لیے وہ پورا زور لگا رہی تھی۔ ڈور بیل پر وہ ایک دم رکا تھا اور یہی وہ پل تھا جب وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر سیدھا کمرے میں داخل ہوئی اور دروازہ لاک کر لیا۔ اب وہ پاگلوں کی طرح دروازے کو ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ پھر ساجد صاحب کی آواز آئی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

"یا اللہ میری مدد کر۔" وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں جکڑے دیوار سے لگ گئی پھر اچانک باہر سے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں اسے لگا کسی نے اسے آواز دی ہے۔ اس نے غور سے سنا اس کا ہی نام لیا جا رہا تھا وہ دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

"عائشہ۔" اب کے آواز صاف تھی اور اس نے پہچان بھی لی تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا وہ بالکل سامنے کھڑا متلاشی نظروں سے اسے ڈھونڈ رہا تھا۔

"احمد۔" وہ چیخنی ہوئی اس کی طرف بھاگی تھی۔ اس کے قریب جاتے ہی اس نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام کر ما تھا اس پر ٹکا دیا تھا۔ احمد نے دونوں بازوؤں سے تھام کر اسے سیدھا کیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو نا۔" وہ غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا جہاں دائیں گال پر انگلیوں کے نشان بہت واضح تھے اور رونے کی وجہ سے اس سے بات نہیں ہو پا رہی تھی۔

"عائشہ! تم ٹھیک ہو۔" اب کے نوازش صاحب نے قریب آکر پوچھا تو وہ ان کے گلے لگ گئی۔

"بس بیٹا! ہم آگئے ہیں نا۔"

تھا جو اس کی مدد کو آیا تھا پھر کیا بات تھی کہ وہ اس سے بولتا نہیں تھا حالانکہ وہ معافی بھی مانگ چکی تھی۔

آج وہ انکل اور آنٹی کے ساتھ باہر نہیں گئی تھی۔ کمرے میں پڑی بور ہونے لگی تو باہر آگئی اور پھر وہیں رک گئی ٹی وی لاؤنج میں ٹی وی کے آگے وہی بیٹھا تھا اور کھانا کھا رہا تھا تبھی اس کی نظر بھی اس پر پڑی تھی۔

"تم مما' پاپا کے ساتھ نہیں گئیں؟" اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"ہوں۔" وہ کہہ کر دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گیا تو وہ ڈھیٹوں کی طرح دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے بیٹھنے پر دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ زیادہ دیر تک اسے دیکھتی رہی۔ اچانک اس نے نظریں گھما کر اسے دیکھا تو وہ سٹپٹا کر ٹی وی کی طرف دیکھنے لگی۔

"زیادہ بھوک لگی ہے۔" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"یوں ندیدوں کی طرح کیوں دیکھ رہی ہو مجھے کیا آنکھوں کے رستے مجھے نگلنے کا ارادہ ہے۔"

"یہ آدمی کبھی نہیں سدھر سکتا۔" وہ غصے میں کھڑی ہو گئی۔

"کہاں جا رہی ہو۔"

"جہنم میں۔"

"ویٹس گڈ۔ اپنا خیال رکھنا۔"

کمرے میں آتے آتے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

وہ سلمیٰ آنٹی سے سر درد کی گولی لینے آئی تھی لیکن اس سے پہلے وہ اندر داخل ہوتی۔ ادھ کھلے دروازے سے اسے اپنا نام سنائی دیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی باہر رک گئی تھی۔

"بہت پیاری بچی ہے۔ مجھے تو بہت پسند ہے۔"

"جی بالکل اس پیاری بچی کا اصل روپ نہیں دیکھا آپ نے۔ اس لیے پیاری لگتی ہے آپ کو۔" سلمیٰ آنٹی کے جواب میں اسے احمد کی آواز سنائی دی۔

"تم نے ہی کہا تھا نا کہ تم عائشہ سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" اب نوازش صاحب کی آواز آئی تھی جبکہ عائشہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

"جی وہ تب کی بات ہے جب میں اسے ٹھیک طرح سے جانتا نہیں تھا' جانتے ہیں نا اس نے انکل کو کتنا ٹارچر کیا ہے۔" عائشہ نے بے ساختہ ہونٹ دانتوں تلے دبایا تھا۔

"احمد۔ وہ اس کا بچپنا تھا اور جو بھی بات تھی' باپ بیٹی کے درمیان تھی۔ اگر سلطان اس سے ناراض ہوتا تو آخری لمحوں میں کبھی مجھے عائشہ کو بیٹی بنانے کی بات نہ کرتا اور نہ تمہیں اس کی ذمہ داری سونپتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم اس لیے شادی سے انکار کر رہے ہو کہ اس نے کسی اور لڑکے سے منگنی کی تھی۔"

"نہیں۔ میں جانتا ہوں' وہ اس کی اصلیت جاننے کے بعد اس سے کتنی نفرت کرتی ہے بات یہ ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔"

"غلط اس دن جب ہم اس کے گھر پہنچے تھے وہاں سب تھے' چلو ان کو چھوڑو تمہارے علاوہ میں بھی تھا لیکن اس نے سب سے پہلے تمہیں آواز دی تھی اور جب تمہیں اس کی دوست کا فون آیا تھا تو پاگلوں کی طرح بھاگے بھی تم تھے لیکن اگر پھر بھی تمہیں عائشہ سے شادی نہیں کرنی تو بتا دو' وہ میری بیٹی ہے اور اسے تم سے اچھے لڑکے مل جائیں گے۔" اس سے آگے احمد نے کیا کہا' کیا فیصلہ ہوا۔ وہ نہیں سن سکی۔ اس رات وہ روئی نہیں پر سو نہیں سکی۔

صبح جب وہ ڈائننگ روم میں آئی تو وہ تینوں موجود تھے وہ نوازش صاحب کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"انکل! میں گھر جانا چاہتی ہوں۔" تینوں نے ایک ساتھ اسے دیکھا تھا جبکہ وہ نظریں جھکائے پلیٹ کے ڈیزائن پر انگلی پھیر رہی تھی۔

"کیوں بیٹا! ہماری کوئی بات بری لگی تمہیں۔" سلمیٰ نے پریشانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں آنٹی! آپ لوگوں نے جتنی محبت مجھے دی ہے۔ وہ میں ساری زندگی نہیں بھول سکتی۔ لیکن آخر کبھی نہ کبھی تو مجھے اپنے گھر جانا ہے۔"

"لیکن تم اکیلے کیسے رہو گی؟"

"ویسے ہی انکل! جیسے وہ سب لوگ رہتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا۔" احمد نے بے ساختہ پہلو بدلا تھا۔

"لیکن میں تمہیں اپنی بیٹی بنا کر لایا ہوں میں تمہیں اکیلے وہاں نہیں بھیج سکتا۔"

"پلیز انکل! مجھے فورس نہ کریں۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" وہ یہی بتانے آئی تھی۔ بات ختم کر کے وہ کسی کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اٹھ گئی تھی۔

"تم نے کچھ کہا ہے عائشہ کو۔" نوازش صاحب نے غصے سے احمد کو دیکھا تو اس نے سر نفی میں ہلایا۔ وہ تو خود حیران تھا اسے کیا ہوا ہے۔

"میں پوچھتا ہوں۔"

نہیں پاپا! میں دیکھتا ہوں۔" وہ ایک دم کرسی دھکیل کر اٹھا تھا۔

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا۔ وہ اپنے بیگ میں کپڑے رکھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ چونکی تھی۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی سے پیکنگ کرتی رہی۔

"تم جانتی ہونا' سعد اب پولیس کسٹڈی میں نہیں اور تم وہاں اکیلے رہنا چاہتی ہو تاکہ وہ پھر کچھ الٹا سیدھا کرے' میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" اس کی مسلسل خاموشی پر احمد نے غصے سے اسے بازو سے پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔

"تو اچھا ہے نا۔ میرے ساتھ الٹا سیدھا کر لے' جو لڑکیاں اپنے باپ کو ٹارچر کرتی ہیں۔ ان کی عزت کو نیلام کرتی ہیں۔ وہ ڈیزرو کرتی ہیں کہ ان کی عزت سے کھیلا جائے۔" بڑے زور کا تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا پہلے تو وہ گال پر ہاتھ رکھے ہکا بکا اس کا سرخ چہرہ دیکھتی رہی پھر بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"تم کہیں نہیں جاؤ گی ورنہ تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

"ہوتے کون ہیں آپ مجھ پر حکم چلانے والے۔" وہ ایک دم ہاتھ ہٹا کر غصے سے بولی۔

"تمہارا ہونے والا شوہر۔" وہ بھی اسی کے انداز میں ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

"مجھے نہیں کرنی آپ سے شادی۔"

"پر مجھے تو کرنی ہے۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ آئی لو یو!" وہ رونا بھول کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تو وہ مسکراتا ہوا اس کے بالکل سامنے بیٹھ گیا۔

"اور اب سے نہیں تب سے جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تمہاری ساری بدتمیزیوں کے باوجود انکل کی وجہ سے تھوڑا دل خراب ہوا تھا لیکن جب اس دن تم نے معافی مانگی تھی' میں نے اسی دن سب بھلا دیا تھا۔"

"تو پھر آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتے تھے۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"تمہیں تنگ کر رہا تھا کیونکہ تم نے بھی مجھے کم تنگ نہیں کیا تھا۔"

"اور آپ نے رات کو انکل کو کیوں کہا' آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے۔"

"وہ اس لیے کہ مجھے پتا تھا کہ تم باہر کھڑی ہو۔"

"آپ کو سب کیسے پتا چل جاتا ہے۔" وہ سب بھول کر جلدی سے بولی۔

"مجھے دل کو جاننے کا علم آتا ہے۔"

"اچھا تو بتائیں' میرے دل میں کیا ہے؟"

"میں۔" احمد کے دعوے پر وہ حیران رہ گئی۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" احمد کے قہقہے پر اسے اپنی بے اختیاری کا احساس ہوا تو ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"چلو' یہی بات اب مما پاپا کو چل کر بتاؤ' وہ پریشان ہو رہے ہیں۔" وہ اس کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔

"احمد! میرا ہاتھ چھوڑیں۔" اب کے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

"چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا۔ چلو۔" وہ اسے کھینچتے ہوئے بولا تو وہ شرمیلی مسکراہٹ لیے ہوئے اس کے ساتھ چلنے لگی کیونکہ اب انہیں یونہی ساتھ ساتھ رہنا تھا۔

✡

رخسانہ نگار عدنان

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہو جاتے ہیں۔

عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کر پاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کر رہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

حمیدہ خالہ، عاصمہ کو سمجھاتی ہیں کہ عدت میں زبیر کا اکیلے اس کے گھر آنا مناسب نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنا رہے ہیں
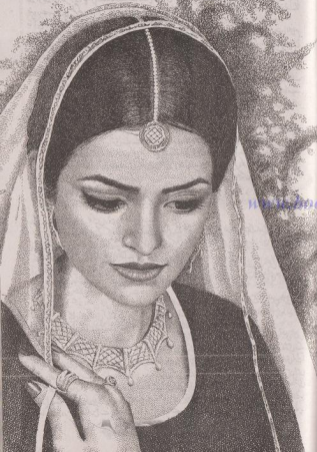
جبکہ عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے، بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بہو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔

اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلا پاتا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل سخت پریشان ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے اور کچھ دنوں بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔ اچانک ہی فوزیہ کا کہیں رشتہ طے ہو جاتا ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچ بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔

انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم خوش ہو جاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔ ایک پراسرار سی عورت عاصمہ کے گھر بطور کرائے دار رہنے لگتی ہے۔ وہ اپنی حرکتوں اور انداز سے جادو ٹونے والی عورت لگتی ہے۔ عاصمہ بہت مشکل سے اسے نکال پاتی ہے۔

بشریٰ کا سابقہ منگیتر احسن کمال ایک طویل عرصے بعد امریکا سے لوٹ آتا ہے۔ وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور دوبارہ بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں مانتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال، بشریٰ کے پاس رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ، بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً ”پوش ایریا“ میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا ہے۔ اسے مثال بہت اچھی لگتی ہے۔ مثال، واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں وقار، وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

مثال کو نیند میں محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اسے گھسیٹ رہا ہے۔

تیئسویں قسط

اسے لگ رہا تھا وہ کھڑے کھڑے وہیں منجمد ہو چکا ہے۔ اس کی تمام تر حسیات جیسے مر چکی تھیں۔ وہ وہیں اپنے ہی قدموں پر کھڑا برف بن چکا تھا۔ کوئی حنوط شدہ ممی!

”ہیلو... کس سے ملنا ہے آپ کو... کس کے ساتھ ہیں؟“ ایک خوب صورت سی لڑکی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی لیے بڑے شوخ سے انداز میں پوچھ رہی تھی جیسے وہ اسی کے لیے تو وہاں کھڑا تھا۔

وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

”ہیلو مسٹر! آپ نیند میں تو نہیں کھڑے کھڑے سو چکے ہیں یا ہوش کھو چکے ہیں۔“ وہ اب کے باقاعدہ بہت بے تکلفی سے اس کا بازو ہلا کر لطف لینے والے انداز میں بولی۔ واثق کو جیسے کسی نے ہزار واٹ کا کرنٹ لگایا ہو۔

وہ سر جھٹک کر اتنے پاس کھڑی آسمان سے اتری اس پری کو دیکھتا رہ گیا، جو واقعی میں پری تھی۔

”کس کی تلاش میں ہیں، جناب!“ وہ اسی طرح آنکھوں میں شوخی اور پسند لیے معنی خیزی سے پوچھ رہی تھی۔

”اگر کہوں آپ کی تو... کیسا لگے گا آپ کو؟“ وہ بھی اس کی بے تکلفی کو بظاہر انجوائے کرتے ہوئے بولا۔ اس کی نظریں پری کو دیکھتے ہوئے بھی اس محبوب چہرے کے گرد طواف کر رہی تھیں، جو شاید کسی اور کا ہونے جا رہا تھا۔ پری بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ گویا وہ واثق کے منہ سے یہ ہی سننا چاہتی تھی۔ عجب سی جھنکار تھی اس کی کھلکھلاہٹ میں۔

واثق نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔

وہ خوب صورت سی لڑکی بذات خود ایک مکمل پیکج تھا۔ دعوت نظارہ! وہ لمحہ بھر کو اس کے موتیوں جیسے دانتوں کی قطار کو دیکھتا رہ گیا۔

”بہت اچھا لگے گا مجھے یہ سن کر کہ آپ میری تلاش میں تھے۔ لیکن کیا ہے کہ یہ جملہ تو مجھ سے ملنے والا ہر دوسرا لڑکا کہتا ہے... تو اس میں کچھ بھی نیا پن نہیں ہے۔“ وہ بہت اٹھلا کر بظاہر شوخ مگر مغرور بھرے انداز میں بولی۔

”اور پہلا لڑکا کیا کہتا ہے؟“ وہ جھک کر رازداری سے پوچھنے لگا۔

”وہ...“ وہ محظوظ ہوئی۔ ”وہ تو بے چارا کچھ بول ہی نہیں پاتا۔“ گنگ سا رہ جاتا ہے۔“ وہ بھی اسی طرح

رازداری سے بولی۔
"بے چارہ!" واثق افسوس بھرے لہجے میں بولا۔
"بائی داوے میرا نمبر کتنواں ہے 'ان دوسرے لڑکوں کی لائن میں۔" وہ جھک کر پھر اسی انداز میں بولا۔
"آں!" وہ یوں ظاہر کرنے لگی جیسے دل ہی دل میں گنتی کر رہی ہو۔
"پری! تم کہاں رہ گئی ہو۔ میں نے تمہیں بھیجا تھا کہ اپنے پاپا کو بلا کر لاؤ' خود جا کر وہیں بیٹھ گئی ہو۔" پیچھے سے آتی عفت جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولی۔ پری فوراً "بوکھلا کر اسٹیج کی طرف بھاگ گئی۔
عفت' واثق کو سرسری نظر سے دیکھتی عجلت بھرے انداز میں آگے چلی گئی۔ واثق پھر سے اس بھرے مجمع میں اکیلا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے اتنی دیر تو نہیں کی تھی مشال!" وہ یک ٹک اس جھکے چہرے والی لڑکی کو دیکھتے ہوئے دل میں مخاطب ہوا۔
"تمہیں میری محبت کا اعتبار نہیں تھا یا مجھ پر بھروسا نہیں تھا۔ صرف چار دن میں تم نے خود کو میری محبت سے آزاد کر دیا۔" اس کے دل پر کوئی بھاری پتھر آپڑا تھا۔
اسٹیج پر اب بہت سے لوگ آگے پیچھے کھڑے ہو گئے تھے۔ مشال ان کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ شاید کوئی رسم ہو رہی تھی۔ واثق کے اردگرد لوگ کم ہو گئے تھے۔ وہ بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔
مشال ہاتھ کی تیسری انگلی میں پڑی ڈائمنڈ رنگ کو دیکھتی جا رہی تھی۔ یہ انگوٹھی نہیں تھی' اس کے لیے عمر قید کا ٹوکن تھا۔
"کچھ مہینوں میں میری فہد سے شادی ہو جائے گی۔ ایک ایسا شخص جسے میں جانتی تک نہیں' جسے میں نے کبھی دیکھا بھی نہیں' بات بھی نہیں کی۔ پاپا جو کہہ رہے تھے کہ وہ فہد سے میری بات کرائیں گے' پھر بھول گئے۔
پاپا کے لیے یہ بڑی سیدھی بات ہے کہ وہ کہیں بھی ایسی جگہ جو انہیں میرے لیے فنانشلی بہتر لگتی ہے' لوگ مناسب لگتے ہیں' وہ میری شادی کر کے میرے بوجھ سے نجات حاصل کر لیں گے۔ مگر یہ سیدھی بات...... میں جانتی ہوں' یہ سیدھی نہیں۔"
وہ بہت عجیب ڈھب میں سوچتے ہوئے خود سے سوال جواب کر رہی تھی۔ اس طرح کی باتیں اس نے پہلے کبھی نہیں سوچی تھیں۔
ایک انگوٹھی اس کی انگلی میں آگئی اور اسے لگا اس کے جذبات احساسات سب بدل رہے ہیں۔ شاید وہ خود بھی بدل رہی ہے۔ فہد سے شادی کے بعد اگر ہم دونوں کے مزاج نہیں ملے یا کچھ مہینوں' دنوں کے لیے مل بھی گئے...... پھر ہماری اولاد ہو گئی اور فہد کا رویہ اس کی عادات اپنی اصل فطرت پر آگئے' جو مجھ سے بالکل مختلف ہوئے۔ پھر ہم دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے' جو ہوتے چلے گئے۔ کیونکہ جھگڑے ایک بار شروع ہو جائیں تو پھر رکا نہیں کرتے اور اس نے مجھے پاپا کی طرح تین لفظ بول کر گھر سے نکال دیا۔ میری اولاد کو مجھ سے چھین لیا جو ہم دونوں کو پیاری ہو گی' پھر ہم دونوں اس کو حاصل کرنے کے لیے لڑیں گے اور پھر آدھا آدھا کر لیں گے۔
آدھی آدھی اولاد!
نہیں...... بالکل نہیں۔"

وہ ایک دم سے سر پر پڑا کامدانی کا دوپٹا جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔
اس کے سامنے عفت کھڑی اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
"ماما...... ماما...... پلیز مجھے یہ شادی نہیں کرنی۔ پلیز آپ پاپا سے کہہ دیں۔ وہ ان لوگوں کو انکار کر دیں...... مجھے نہیں کرنی یہ شادی۔" وہ اپنے جذباتی پن میں یہ دیکھے بغیر کہ اس کے سامنے بشریٰ کھڑی ہے یا عفت...... تیز تیز بولتے ہوئے بے اختیار رونے لگی۔
"مشال...... مشال کیا ہوا ہے...... کیا ہو گیا تمہیں؟" عفت ایک دم سے فکرمند لہجے میں کہتی ہوئی آگے بڑھی اور اسے گلے سے لگا لیا۔
"ماما...... پلیز آج پاپا سے بول دیں۔ مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ عفت کے گلے لگتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
"مشال!" عفت اس کے یوں رونے پر پریشان ہو گئی۔
"ہوا کیا ہے مشال...... کیا ان لوگوں نے کچھ کہا ہے تم سے۔" وہ اسے ساتھ لگا کر نرمی سے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔
مشال نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
"تو پھر کیا ہوا ہے بتاؤ مجھے شاباش......" وہ خلاف عادت اسے چمکار کر پوچھ رہی تھی۔
"مجھے یہ شادی نہیں کرنی ہے۔" وہ ایک ہی جملہ دہراتے ہوئے ہاتھ میں پڑی انگوٹھی نکال کر عفت کو دیتے ہوئے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔
"مشال!" عفت انگوٹھی ہاتھ میں لیے شاکڈ سی کھڑی رہ گئی۔ اس کی مرادیں بر آئے گی۔ عفت نے نہیں سوچا تھا۔
"بھلے پری کی شادی یہاں نہ ہو' مگر مشال کی بھی نہیں ہونی چاہیے۔" اس نے چپکے چپکے دل میں بے شمار دعائیں مانگی تھیں۔ اس کی دعائیں کبھی یوں جھٹ پٹ قبول نہیں ہوئی تھیں' مگر اس بار ہو گئی تھیں۔ وہ بے یقین سی کھڑی تھی۔ مشال خود شادی سے انکار کر رہی تھی۔ اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا تھا۔ عفت پر جیسے شادی مرگ ہو گیا تھا۔
"تمہارے پاپا......" وہ اٹک کر اس سے کچھ کہتے ہوئے رکی۔
"اس کو اپنے اس بے بس باپ کی کیا پروا۔" ایک دم پیچھے سے عدیل آیا تھا۔ دونوں لمحہ بھر کو ساکت سی رہ گئیں۔ عدیل کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔
"پاپا!" اس کے لب فقط ہل ہی سکے تھے۔
"یہ...... اپنی ماں کی طرح اپنے باپ کا صرف تماشا بنانا چاہتی ہے اور اس نے اس ماں سے اس کی تربیت سے اور کیا سیکھا ہو گا۔" وہ نفرت بھرے اجنبی لہجے میں کہہ رہا تھا اور مشال کے جسم میں پہلی بار جیسے چنگاریاں سی چبھ رہی تھیں۔
"معاف کیجیے گا پاپا! میری تربیت صرف اس عورت نے نہیں کی۔ پندرہ دن کے لیے میں آپ کے پاس بھی ہوتی تھی۔ میری بٹی ہوئی آدھی زندگی کے ذمہ دار آپ ہیں۔" جانے کیسے لہو میں دوڑتے شراروں نے اسے چیخنے پر مجبور کر دیا۔ لمحہ بھر کو عدیل ششدر سا اسے دیکھتا رہ گیا۔
"ہٹو تم بیچ میں سے' آج مجھے اس سے بات کر لینے دو۔" عدیل یک لخت سب لحاظ درمیان سے اٹھا کر بولا۔

عفت کو کہتے ہوئے اس نے پرے کیا تھا اور اب مثال کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔

"ہاں بولو کیا تکلیف ہے تمہیں کیوں یہاں شادی نہیں کرنا چاہتیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور مثال کو لگ رہا تھا اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی ہے۔

"بولو..... جواب دو۔" وہ دھاڑ کر بولا۔

پری اور دانیال بھی دروازے میں آکر کھڑے ہوگئے تھے اور صد شکر کہ سارے مہمان جا چکے تھے۔

"میں وجہ نہیں بتا سکتی مگر..... مجھے یہاں نہیں کہیں بھی شادی نہیں کرنی۔" جانے کیسے اس کے اندر اتنی ہمت آگئی۔ وہ نظریں جھکا کر ذرا سا رک کر بول پڑی۔ عدیل نے اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ فضا میں اٹھایا اور مٹھیاں بھینچ کر روک لیا۔ اسے شعلہ بار نظروں سے کچھ دیر یوں ہی دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ میں پکڑا موبائل فون آگے کرتے ہوئے اس پر بشریٰ کا نمبر ملانے لگا۔ مثال خوف زدہ نظروں سے باپ کو نمبر ملاتے دیکھتی رہی۔

"کرو اپنی ماں سے بات کہ وہ تمہیں اپنے پاس بلائے۔ آج سے تم میری طرف سے آزاد ہو' جہاں جس کے پاس جس وقت جانا چاہتی ہو چلی جاؤ' میں تمہیں نہیں روکوں گا۔"

عدیل کے غصے نے حد پار کرلی تھی۔

مثال کو لگا یہ وہی وقت ہے جب عدیل' نسیم بیگم اور فوزیہ کے بھڑکانے پر بشریٰ پر چیخ رہا تھا اور اس نے طلاق دے کر اسے ہاتھ پکڑ کر گھر سے باہر کردیا تھا۔ آج اسی غصے میں اس نے مثال کو بھی خود سے جھٹک کر الگ کردیا تھا۔

"پاپا!" مثال شاکڈ سی باپ کو دیکھتی رہ گئی۔

"مر گیا تمہارا پاپا۔ کرو اپنی من مانی اور جو تمہارے جی میں آتا ہے۔ بات کرو اپنی ماں سے۔" وہ سیل اس کے کان سے لگاتے ہوئے زور سے بولا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی رہی۔

اس کے کان سے لگے سیل فون سے اب بشریٰ کی آواز آرہی تھی' جو ہیلو ہیلو کر رہی تھی۔

"ہیلو عدیل..... ہیلو..... کیا بات ہے عدیل؟" وہ اب کچھ فکر مندی سی پوچھ رہی تھی۔

"ماما..... ماما۔" مثال کے ہونٹوں سے بے اختیار سسکی سی نکلی اور وہ زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔

عدیل نے غصے سے اسے دیکھا اور سیل فون اپنے کان سے لگالیا۔

"سنو! کسی بھی طرح اپنی بیٹی کو اپنے پاس بلالو..... میں اب اس کی مزید ذمہ داری نہیں لے سکتا۔ مہینے بھر کے اندر میں اسے تمہارے پاس بھجوا رہا ہوں۔" کہہ کر اس نے ایک تیز نظر نیچے بیٹھی مثال پر ڈالی اور چیزوں کو جو رستے میں پڑی تھیں ٹھوکریں مارتا باہر نکل گیا۔

مثال زمین پر بیٹھی دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسکنے لگی۔ پری اور دانیال باپ کا غصہ دیکھ کر پہلے ہی آہستگی سے باہر نکل چکے تھے۔ عفت ہمدردی بھری نظروں سے مثال کو دیکھتی رہیں' پھر آہستگی سے جھک کر اسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھانے لگی۔

"اوپر بیٹھو!" اسے زبردستی اوپر بٹھا کر وہ اسے روتے ہوئے دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کھانا کیوں نہیں کھانا۔" وردہ تیسری بار پوچھنے کے لیے آئی تھی۔

"بھوک نہیں ہے۔ تمہیں سمجھ میں نہیں آئی ایک بار کی کہی بات؟" واثق کبھی اس طرح غصے میں نہیں آیا

تھا اور وردہ کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں۔ وہ ششدر سی واثق کو دیکھتی رہ گئی۔

"بھائی....." اس کی آواز آنسوؤں کے زور سے پھٹ سی گئی۔

"وردہ! مجھے بھوک نہیں ہے۔ لگے گی تو میں خود کچن سے لے کر کھالوں گا۔" وہ رخ پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا کیونکہ وہ اس کی آنکھوں میں امڈتے آنسوؤں کو دیکھ چکا تھا' مگر اب وردہ کو چپ کرانے کی ہمت نہیں تھی۔

"اب جاؤ پلیز یہاں سے۔ میرے سر میں درد ہے۔" وہ کچھ بے زاری سے بولا۔ وردہ کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد چلی گئی۔

"تو اس طرح میں نے تمہیں پانے سے پہلے ہی کھو دیا اور یہ تو میں پہلے بھی جانتا تھا کہ میں کبھی بھی خوش قسمت نہیں رہا کہ جو چاہوں گا قسمت خود بخود میری جھولی میں ڈال دے گی۔ آج تک مجھے جو کچھ بھی ملا' اس کے لیے بہت محنت' بہت جتن کیے۔ پھر تم مجھے ایسے کیسے مل سکتی تھیں۔" وہ بہت دکھی' بہت حساس ہو رہا تھا۔

"وہ کسی اور کی ہوگئی اور میں دیکھتا رہ گیا۔" اس نے ہتھیلی سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔

وہ رونا نہیں چاہتا تھا مگر آنسو جیسے آنکھوں میں آتے چلے جا رہے تھے۔

"میں جتنی بھی کوشش کرلیتا' جتنا بھی اس کے پیچھے بھاگتا' وہ میری قسمت میں نہیں تھی۔" اسی وقت اس کے بیگ میں موجود مثال کا فون بجنے لگا۔ اس نے بے حس انداز میں فون نکال کر دیکھا۔ اسکرین پر بشریٰ ماما بلنک کر رہا تھا۔

اس نے کچھ دیر یوں ہی اسکرین کو دیکھنے کے بعد کال ریسیونگ کا بٹن دباتے ہوئے سیل فون کان سے لگالیا۔

"مثال بیٹا! کیا ہوا ہے۔ تمہارے پاپا کی ابھی مجھے کال آئی تھی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔ وہ تمہیں میرے پاس بھجوانے کا کیوں کہہ رہے تھے۔ تم نے کوئی بدتمیزی کی ہے ان کے ساتھ..... ایسا کیا' کیا کہ وہ تمہیں میرے پاس بھجوانا چاہ رہے ہیں۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ کبھی کچھ ایسا مت کرنا جس سے وہ ناراض ہو جائیں اور تم جانتی ہو میں تمہیں اپنے پاس کیسے بلوا سکتی ہوں۔ مثال! تم تو میری مجبوریوں سے آگاہ ہو۔ احسن کمال تمہیں کبھی قبول نہیں کرے گا اور پھر سیفی..... میری جان! میں تمہیں کبھی اپنے پاس نہیں بلا سکوں گی۔ میں تمہاری ماں ہوں' تمہاری بہتری چاہتی ہوں' ہر وقت تمہارے لیے پریشان رہتی ہوں' دعا کرتی رہتی ہوں۔ تم سن رہی ہونا.....

اور میرے بچے! اگر پاپا کے ساتھ کچھ مس بی ہیو کیا ہے تو تم ان سے معافی مانگ لو۔ عدیل غصے کے تیز ہیں' مگر دل کے اچھے اور تم سے تو وہ اس دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔ تم سمجھ رہی ہونا مثال! کہ تمہارا پاپا کے ساتھ رہنا کتنا ضروری ہے۔ تم ... کچھ بھی ہو اپنے باپ کے گھر محفوظ ہو ہر طرح سے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکتی۔ تحفظ تو بالکل بھی نہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کچھ دنوں میں تمہیں کچھ پیسے بھجوادوں مگر پلیز تم عدیل کے ساتھ اپنا معاملہ ٹھیک کرو۔ میں تمہیں اپنے پاس نہیں بلوا سکتی' تم سمجھ رہی ہونا۔" واثق نے آہستگی سے فون بند کردیا۔

☼ ☼ ☼

عدیل کے چہرے پر تناؤ تھا۔ عفت کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے چائے کا کپ اس کے قریب رکھ رہی تھی۔ گھنٹے بھر میں یہ اس کا دوسرا کپ تھا۔ وہ بظاہر ہاتھ میں پکڑی کتاب کی طرف متوجہ تھا مگر عفت جانتی تھی وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا۔ بلکہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ کسی بھی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"بس کردیں نا پہلے ہی دن بھر کی تھکن ہے' اب یہ کیا لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ اتنی رات ہوگئی ہے ریسٹ کرلیں۔

صبح آپ آفس بھی ضرور جائیں گے۔" کہتے ہوئے اس نے کتاب اس کے ہاتھ سے لے کر بند کردی۔
عدیل شاید یہ ہی چاہتا تھا کوئی اسے اس بے وجہ کی مشقت سے رہا کرے۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگائے بے آواز چسکیوں سے پینے لگا۔
"کیا مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے؟" کچھ دیر بعد عفت نے نرمی سے پوچھا۔ وہ صرف اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔
"عدیل! اسے ٹائم چاہیے۔" وہ کچھ دیر بعد نرمی سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔
"ٹائم ہی تو نہیں ہے۔" وہ بڑبڑا کر بولا۔
"اس طرح مت کریں اس کے ساتھ.... وہ ابھی ذہنی طور پر اس کے لیے بالکل بھی تیار نہیں۔" وہ پھر سے بولی۔
"ہو جائے گی.... اسے ہونا ہی ہوگا۔" وہ اسی طرح تنے ہوئے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔
"کیا زبردستی کریں گے؟" عفت کچھ جتانے والے انداز میں بولی۔
"مجھے زبردستی کا بھی حق حاصل ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔
"آپ اس طرح کے باپ نہیں۔ یہ بات وہ بھی جانتی ہے۔" وہ پھر کچھ جتا رہی تھی۔
"اسی لیے فائدہ اٹھا رہی ہے میری نرمی سے۔ لیکن میں فیصلہ کرچکا ہوں۔ اگر وہ اس طرح اپنی اس بے جا ضد پر اڑی رہی تو پھر میں اس کے ساتھ سختی بھی کر ڈالوں گا۔" وہ واضح کرتے ہوئے بولا۔
"مگر پھر بھی عدیل! آپ سمجھنے کی کوشش کریں.... وہ عجیب ہٹ دھرم سی ذہنیت کی ہو چکی ہے۔ آپ دونوں کی جنگ میں وہ بہت کچھ جھیل چکی ہے۔ سوا سے جھیلنے کا خوف تو نہیں ہے۔ آپ سے اسے بہت سی امیدیں ہیں۔" عفت جانے کیسے ایسی ہمدردانہ باتیں کر رہی تھی، وہ بھی مثال کے لیے۔ عدیل نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔
"مجھے بھی اس سے بہت سی امیدیں ہیں۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ عفت کو اس پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی.... اس کی ساری امیدیں فقط اپنی اس ایک اولاد سے تھیں۔
"ابھی اسے اپنی ماں سے بچھڑے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ پہلے پندرہ دن بعد بھی وہ ماں سے مل لیا کرتی تھی۔ جو بھی بچیاں ماں کے قریب ہوتی ہیں وہ ماں سے دل کی بات کر سکتی ہیں۔" وہ رک رک کر عدیل کو کسی بچے کی طرح سمجھا رہی تھی۔
"تو ٹھیک ہے، اگر وہ نہیں مانتی تو میں اسے اس کی ماں کے پاس بھجوا دیتا ہوں، کیونکہ اس رشتے سے اچھا رشتہ اور میں اس کے لیے نہیں ڈھونڈ سکتا۔" وہ قطعی انداز میں بولا۔
عفت کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔
اگر ایسا ہو جاتا ہے۔ یعنی مثال اپنی ماں کے پاس چلی جاتی ہے تو لازمی طور پر یہ رشتہ صرف پری کے لیے ہوگا۔ اس کا مسئلہ تو خود بخود حل ہو جائے گا۔ اگر مثال بشریٰ کے پاس چلی جاتی ہے تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی بھلا، میری بھی جان چھوٹ جائے گی۔ اس نے چند لمحوں میں سارا حساب کتاب کر لیا۔
"دیکھ لیں جو آپ کو ٹھیک لگتا ہے، میں جو سمجھتی تھی آپ کو بتا دیا۔" اس نے ساری گفتگو کو ایک جملے میں لپیٹ کر تکیہ سیدھا کیا اور لیٹ گئی۔
عدیل نے جیسے اس کی بات سنی نہیں۔ وہ ابھی بھی کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ عفت اس کی طرف سے کروٹ

لے کر لیٹ چکی تھی۔
عدیل کو ابھی جانے کیا کچھ کتنی دیر تک سوچنا تھا۔ عفت کے سونے تک وہ جاگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے کسی کا بھی اعتبار نہیں رہا تھا۔
وہ اس دنیا میں سب سے زیادہ عدیل سے محبت کرتی تھی۔ اس کا اسے اعتبار تھا، مگر جیسے اب وہ بھی نہیں رہا تھا۔
وہ بالکل خاموش ہو گئی تھی۔
ناشتا کیے بغیر وہ کالج چلی گئی تھی۔ اس نے عفت کا سامنا کیا تھا نہ عدیل کا۔ آج تو اس نے روزمرہ والے گھر کا بکھراوا سمیٹنے والا بھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔
خاموشی سے تیار ہو کر کمرے میں بیٹھی رہی، اس کی وین آئی تو خاموشی سے سب کی نظروں سے بچتی وین میں بیٹھ کر چلی گئی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔
کالج جا کر بھی اس نے صرف دو کلاسز لیں۔ اس کے بعد وہ سارا ٹائم اکیلی بیٹھی گھاس کے تنکے نوچتی رہی۔ اس کا دماغ کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔
بارہ بجے کے قریب اسے بھوک نے ستانا شروع کیا۔ اس نے ایک طرف لگے ڈسپنسر سے تھوڑا سا پانی پیا اور پھر بے جان قدموں سے گیٹ کی طرف چل پڑی۔ ابھی وین کے آنے میں بہت ٹائم تھا مگر وہ یونی گیٹ سے باہر نکل کر سڑک کی طرف چل پڑی۔
"تھینک گاڈ! تم مجھے نظر تو آئیں۔" اس کے بہت قریب سے فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے آواز آئی۔ اس نے

"مجھے نہیں کھانا۔"

"تمہیں نہیں کھاؤں گا پرامس۔۔۔ صرف ہم دونوں مل کر کھانا کھائیں گے کسی اچھی سی جگہ پر اور میں تمہیں تمہارے مسئلے کا حل بھی بتاؤں گا۔" وہ اسے چھوٹے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔

"کون سے مسئلے کے بارے میں؟" وہ اس کے ساتھ باتوں کے دوران چند منٹوں میں سب کچھ بھول چکی تھی۔ عدیل کی خفگی' ناپسندیدہ رشتہ اور بشریٰ کی بے اعتنائی!

"ماشاءاللہ۔۔۔ تو آپ بھول چکی ہیں کہ آج آپ صبح گھر سے کس وجہ سے بغیر کھائے پیے روانہ ہوئی تھیں اور آپ نے انگیجمنٹ رنگ کیوں نہیں پہنی۔" وہ ہنسا کر بولا۔

وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"پلیز میں ایک گھنٹے میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں گا۔"

"نہیں۔۔۔ میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہی۔۔۔" وہ قطعیت سے بولی۔

"اچھا چلو میں تمہیں ڈراپ تو کر سکتا ہوں نا!" وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔ وہ چلتے ہوئے رک گئی۔

"پلیز کوئی دیکھ لے گا مجھے آپ کے ساتھ۔" وہ کچھ ڈر کر بولی۔

"اسی لیے کہہ رہا ہوں نا کہیں بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔ میرا یقین نہیں ہے تمہیں اور تمہارا سیل فون بھی تو میری گاڑی میں پڑا ہے۔ وہ بھی لے لینا۔" وہ اسے بہلا کر بولا۔

"وہ تو لگتا ہے آپ کا دل ہی نہیں کر رہا ہو گا لانے کا۔" سیل فون کے ذکر پر وہ جل کر بولی تو وہ ہنس پڑا۔ دونوں باہر کی طرف چل پڑے۔

☼ ☼ ☼

"مگر کیوں؟" بشریٰ عدیل کی بات سن کر پریشان ہو گئی۔ دونوں فون پر بات کر رہے تھے۔

عدیل نے بہت سوچ سمجھ کر بشریٰ کو کال کی تھی۔ وہ مثال کے معاملے میں بہت پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ وہ رات بھر نہیں سو سکا تھا۔

"اس کا جواب تو میں بھی اس سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا ہوں۔ وہ ایک ہی بات دہرائے جاتی ہے کہ اسے یہ شادی نہیں کرنی۔ میں اس پر سختی بھی نہیں کر سکتا۔ تم اس سے کسی طرح معلوم کرنے کی کوشش کرو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں کچھ بتا دے۔" عدیل تھکے ہوئے بے بس لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"یہ رشتہ ہر لحاظ سے پرفیکٹ ہے۔ وقار اور فائزہ کو تم بھی جانتی ہو۔ فہد کو بھی بچپن میں تم نے دیکھ رکھا ہے پھر وہ بہت سیٹل ہو چکے ہیں۔" وہ تھک کر لمحہ بھر کو خاموش ہوا۔

"اور اب تو منگنی بھی ہو چکی ہے۔ فہد تین چار ماہ میں پاکستان آتا ہے تو شادی طے ہے اور یہ لڑکی۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" وہ بے بسی سے خاموش ہو گیا۔

"کیا۔۔۔ وہ کسی اور کو تو پسند نہیں کرتی؟" ایک دم سے اسے خیال آیا تو وہ پوچھنے لگا۔ "اس نے تم سے ذکر کیا ہو۔"

"کسی اور کو نہیں۔۔۔ نہیں بھلا کس کو پسند کرے گی اور مجھے اس نے کبھی کچھ ایسا نہیں بتایا۔" بشریٰ عجیب دامن بچاؤ والے انداز میں بولی۔

"تمہارے۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے شوہر کے بیٹے کے ساتھ۔" وہ اٹک کر کچھ جھجک کر بولا۔

اور بشریٰ کے ہاتھ سے سیل فون نیچے گرتے گرتے بچا۔ یہ خواہش تو کبھی اس کے دل نے ٹوٹ کر کی تھی مگر اس

کا نتیجہ کیا نکلا۔

کاش ایسا ہو سکتا تو میں اپنی بیٹی کو کبھی خود سے جدا نہیں کرتی۔ اس کا دل بھر آیا۔ آج اتنے دن ہو گئے تھے اس نے مثال کو نہیں دیکھا تھا۔ وہاں سے پندرہ دن بعد سہی وہ اس کو دیکھ تو لیتی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا بشریٰ؟" اس کی خاموشی پر وہ بول اٹھا۔

"نہیں ایسا کچھ نہیں تھا عدیل! ایسا کچھ ہوتا تو میری نالج میں ضرور ہوتا۔ دوسرے سیفی کسی اور ٹائپ کا لڑکا ہے۔ میں اسے مثال کے لیے سوٹ ایبل بھی نہیں سمجھتی تھی اور پھر مثال اس طرح کی لڑکی نہیں ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرے۔" وہ بیٹی کے حق میں صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس نے رنگ بھی اتار کر پھینک دی ہے۔ اگر وقار اور بھابھی کو پتا چلا تو کتنا برا لگے گا انہیں۔" وہ پریشان تھا بشریٰ کو اندازہ ہوا۔

"ہوں۔۔۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔ سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ بہت سمجھ دار بیٹی ہے مثال۔ مجھے امید ہے وہ سمجھ جائے گی میری بات۔۔۔ تم پریشان نہیں ہو۔" آخر میں کچھ جھجک کر وہ اسے تسلی دیتے ہوئے کہہ گئی۔

"میں رات بھر نہیں سو سکا۔ معاملہ اب صرف مثال کی زندگی کا نہیں میری عزت کا بھی ہے۔ پچاس لوگوں کے درمیان رشتہ طے ہوا ہے۔ یوں راتوں رات خدانخواستہ توڑا تو نہیں جا سکتا۔" وہ کنپٹی دبا کر تشویش سے بولا۔

"میں سمجھ سکتی ہوں تمہاری پریشانی۔ میں بات کرتی ہوں مثال سے ان شاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اگر ایسا ہو جائے بشریٰ! تو زیادہ بہتر ہے ورنہ میں نے سوچ لیا ہے۔" وہ رک کر بولا۔

بشریٰ کو اس کے لہجے میں کسی انہونی سی بو آئی۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ ڈر کر بولی۔

"میں اس کے لیے اس سے اچھا رشتہ نہیں ڈھونڈ سکوں گا۔ اگر وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوئی تو میں اسے تمہارے پاس بھجوا دوں گا۔ میں اس کی مزید ذمہ داری نہیں اٹھا سکوں گا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا۔

بشریٰ کو یوں لگا جیسے اس کے سر پر کمرے کی چھت ہی آن گری ہو۔ کس مشکل سے تو وہ اپنا گھر بچا کر یہاں تک آئی تھی۔ اگرچہ اس کے دل کو سکون نہیں تھا مگر زندگی میں ایک ٹھہراؤ' ایک ضمانت شدہ سائبان تو اس کے سر پر تن چکا تھا اور مثال کو تو وہ کبھی بھی اپنے پاس نہیں بلا سکتی تھی۔ اس نے کچھ بھی کہے بغیر فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں۔" وہ ہاتھ روک کر قطعی لہجے میں بولی۔

"مگر کیوں؟" واثق کے چہرے پر اضطراب تھا۔

"اس کا جواب نہیں ہے میرے پاس۔" وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بے تاثر لہجے میں بولی۔

"مثال میں ان سے بات کر چکا ہوں۔ میں انہیں بتا چکا ہوں کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور۔۔۔"

وہ اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بیگ کندھے پر ڈال کر کھڑی ہو گئی۔

"کھانا کھلانے کا شکریہ یہ بل کے پیسے اور۔۔۔" وہ بیگ سے کچھ نوٹ نکال کر رکھنے لگی تھی کہ واثق نے ایک دم سے غصے میں اس کا ہاتھ دبوچ لیا۔ "اگر تم نہیں چاہتیں کہ یہاں کوئی تماشا بنے تو یہ پیسے واپس رکھو۔" غرا کر بولتے ہوئے اگرچہ اس کی آواز دھیمی تھی مگر مثال ڈر سی گئی۔

اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر اس کی گرفت سے نکالنے کی کوشش کی' وہ اسی طرح اسے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

"پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔" وہ رو دینے کو تھی۔

واثق نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"تم ایک ہفتے میں فیصلہ کر لو کہ تم نے کیا کرنا ہے' میں اپنی امی کو ایک ہفتے بعد بھیجوں گا اگر تمہارے پیرنٹس آئی مین تمہارے فادر نہیں مانے تو....."

"تو.... کیا کریں گے؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا یا.... پھر ہم کورٹ میرج کر لیں گے' مگر مثال! میں تمہارے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر تم مجھے نہیں ملیں تو میں اپنی جان لے لوں گا اور اس کی ذمہ دار صرف اور صرف تم ہو گی۔" وہ عجیب جذباتی پن میں بولا۔

مثال اسے بے بس سی نظروں سے دیکھ کر رہ گئی۔

"پلیز مجھے گھر ڈراپ کر دیں مین روڈ سے پرے۔ میں لیٹ ہو گئی ہوں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔

"کیا تم نے میری بات سن لی ہے؟" وہ اسے ری مائنڈ کرواتے ہوئے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"سننے سے کیا ہوتا ہے۔" وہ ہولے سے بولی۔

"مثال! یہ سوچ لینا اگر میں نے اس دنیا سے جانے کا فیصلہ کر لیا تو میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تمہیں میرے ساتھ یہ دنیا چھوڑنی ہو گی۔" وہ اسے دھمکاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تو اس کے لیے انتظار کیوں کر رہے ہیں۔ آج بلکہ ابھی اس پر عمل کر لیں۔ میرے لیے تو یہ بلیسنگ ہو گا۔" وہ بے خوفی سے بولی تو وہ اسے گھور کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

عفت گھر کی کچھ ضروری چیزیں لینے نکلی تھی۔

جلدی جلدی کرتے بھی اسے دو سے زائد گھنٹے لگ گئے۔ اب وہ سامان سے لدی پھندی ٹیکسی میں گھر کی طرف جانے والی گلی میں مڑتے ہوئے بے اختیار ٹھٹک کر رہ گئی۔

اس کی نظریں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ مثال کسی گاڑی سے اتر رہی تھی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہینڈسم سا لڑکا جن نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا' وہ عام نظریں نہیں تھیں' چند لمحوں میں عفت نے جیسے بہت کچھ کھوج لیا۔ ٹیکسی ان کے گھر کے گیٹ کے آگے سے روانہ ہونے کو تھی عفت سامان گھر کے اندر رکھوا چکی تھی اور وہ یہ سب کچھ ست روی سے کرتی رہی۔

اس کی امید کے عین مطابق مثال گلی سے اندر آتی ہوئی نظر آئی' جب ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر عفت نے روانہ کیا اور خود وہیں کھڑی ہو گئی۔

"یہ لڑکا وہی ہے جو اس روز بھی تمہیں کالج سے گھر ڈراپ کر کے گیا تھا۔ تمہاری کسی دوست کا بھائی جب تمہاری وین نہیں آئی تھی۔" عفت کچن میں سامان لگانے کے دوران سرسری لہجے میں کہہ رہی تھی جب مثال کچن میں آ کر پانی کا گلاس لے کر جانے لگی تھی' وہ لحہ بھر یونہی کھڑی رہی۔

"جی!" اس نے بے تاثر لہجے میں کہا۔

"آج بھی تمہاری وین نہیں آئی واپسی پر۔" وہ پھر سے بولی۔

"نہیں.... آج میں خود پہلے نکل آئی تھی کالج سے۔" وہ بے خوفی سے کہہ رہی تھی۔

"اس لڑکے کے ساتھ؟" عفت اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"نہیں۔" وہ اب دل میں سوچ رہی تھی' وہ کچن میں آئی کیوں۔

"تمہارے اس نہیں پر کون یقین کرے گا کم از کم میں تو نہیں۔" وہ تڑخ کر بولی۔

"مجھے آپ کو یقین دلانا بھی نہیں۔" وہ جواباً" کہہ گئی۔

"بالکل ٹھیک' تمہیں مجھے یقین دلانے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ تم اپنی ان کوششوں کو سنبھال کر رکھو' تمہارا باپ تم سے شام میں پوچھے گا تو جو بہانہ گھڑنا ہو گا اس کے سامنے گھڑنا۔" وہ حقارت بھرے لہجے میں کہہ کر باہر نکل گئی۔

"اگر.... پاپا.... اب تو مجھے ضرور ہی ماما کے پاس بھجوا دیں گے اور بے چاری ماما.... وہ تو شاید مر ہی جائیں گی سن کر کہ میں ان کے پاس آ رہی ہوں' انہیں اپنے گھر کی فکر پڑ جائے گی۔" وہ تاسف بھرے انداز میں سوچتی گھونٹ گھونٹ پانی پیتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"یہ کیا کہہ رہے ہو واثق؟" عاصمہ ایک دم سے پریشان ہو گئی۔

"وہ شاید میرے نصیب میں نہیں ہے امی!" وہ مایوسی سے بولا۔

"ایسی باتیں نہیں کرتے بیٹا اور نصیبوں سے گلہ بزدل کیا کرتے ہیں' میرا بیٹا بہت بہادر ہے۔" عاصمہ اس کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر ایک دم سے گھبرا گئی۔

"اور یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا' اگر میں اس شام جا کر بات کر لیتی مثال کے والدین سے تو شاید یہ سب کچھ نہیں ہوتا۔" وہ اپنی غلطی تلاشتے ہوئے بولی۔

"نہیں امی تو بھی ایسے ہی ہوتا ہے' اس کے پاپا پہلے سے یہ معاملہ طے کر چکے تھے۔" وہ اسی طرح مایوس تھا۔ عاصمہ بیٹے کو دیکھتے ہوئے رنجیدہ ہو گئی۔

"اب تم نے کیا سوچا ہے؟" وہ کتنی دیر گم صم بیٹھا رہا۔

"کچھ بھی نہیں.... آپ نے دوا لی؟" وہ گہرا سانس لے کر موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کیا مجھے جا کر ان سے بات کرنا چاہیے؟" وہ بے چینی سے پوچھنے لگی۔

"نہیں.... یوں بھی اس کا اب کچھ فائدہ نہیں.... منگنی وہ کر چکے ہیں' اور چند ماہ میں شادی بھی کرنے والے ہیں آپ جا کر اور کیا بات کریں گی' اگر ایسا کچھ کریں گی تو اس کی اپنے گھر میں پوزیشن خراب ہو گی۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"واثق بیٹا کوئی تو حل ہو گا نا.... یوں خاموش تو نہیں بیٹھ سکتے ہم۔" وہ بے چینی سے بولی۔

"امی! آپ ٹینس نہیں ہوں' آپ کہتی ہیں نا کہ وہی ہوتا ہے جو اللہ کو منظور ہوتا ہے' انشاءاللہ اچھا ہی ہو گا۔ اللہ میرے دل کے حال سے واقف ہے میں آفس جا رہا ہوں۔ کچھ منگوانا تو نہیں آپ نے؟"

عاصمہ کو واثق کی یہ بات اچھی بھی لگتی تھی اور بری بھی' وہ بڑے سے بڑے مسئلے پر کوئی بھی تاثر نہیں دیا کرتا تھا کہ وہ مایوس یا دل گرفتہ ہے یا آگے کا اس نے کوئی پلان سوچ رکھا ہے' وہ عاصمہ کے نفی میں سر ہلانے پر جا چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما!" مثال بے بس سی ہو گئی۔

"میری جان! ماں باپ ہمیشہ اولاد کی بہتری کا سوچتے ہیں جیسے ہم دونوں بے شک ہم دونوں نے شادی کرلی الگ گھر بنا لیے مگر ہم تمہاری ذمہ داری سے کبھی غافل نہیں ہوئے ہم گواہ ہو اس بات کی" بشریٰ کی بات پر مثال کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

وہ کس طرح اپنے احساس ذمہ داری کا ذکر بہت فخر سے کر رہی تھی۔

"میری جان! تمہارے پاپا بہت پریشان ہیں اور مثال جانو تم تو اپنے پاپا سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہو پھر تم انہیں کیوں پریشان کر رہی ہو۔" وہ حتی الامکان لہجے کو نرم اور محبت بھرا رکھے ہوئے تھی۔

"میں ایسا کچھ نہیں کر رہی ماما!" وہ آہستگی سے بولی۔

"تو پھر تم نے رنگ کیوں اتار دی پہننے کے بعد۔"

"کیوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔" وہ اسی بے تاثر لہجے میں بولی جس سے وہ بشریٰ سے بات کر رہی تھی۔

"مثال!" بشریٰ کے لیے یہ جملہ کسی دھچکے سے کم نہیں تھا "میری جان تم نے ایسا سوچا بھی کیسے؟" وہ بھی پریشان ہو گئی۔

"اور بیٹا! شادی تو تمہاری ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی سے ہونی ہے' وقار بھائی اور فائزہ بھابھی کو میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں' تمہارے پاپا کے ان لوگوں سے فیملی ٹرمز تھے' بہت اچھے شریف خاندانی لوگ ہیں تو..."

"ماما! مجھے اس میں سے کسی بھی بات سے کوئی کنسرن نہیں کہ وہ کیسے لوگ ہیں۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"کیا تمہیں فہد پسند نہیں۔" وہ کچھ پریشان ہوئی' کچھ ڈری۔

"میں نے ایسا بھی نہیں کہا۔" مثال ماما کے اس نصیحتوں بھرے فون سے اکتا گئی تھی۔

بشریٰ نے ایک بار بھی تو نہیں پوچھا تھا کہ وہ کیسی ہے' وہ اس طرح کی باتیں کیوں کرنے لگی ہے۔

"تو پھر کیا بات ہے؟" وہ ذرا سختی سے بولی۔

"کچھ نہیں ہے۔" وہ کوفت سے بولی۔

"کسی کو پسند کرنے لگی ہو؟" بشریٰ رک کر بولی۔

"ایسا کچھ ہوا تو بھی بتا دوں گی۔" وہ اسی انداز میں بولی۔

"پھر کیا مسئلہ ہے؟" بشریٰ نے درشتی سے بولی "کیوں ہم دونوں کو پریشان کر رہی ہو۔"

اسے معلوم تھا بشریٰ اب یہی کہے گی۔

"میں آپ دونوں کو اپنے مسئلے' اپنی پریشانی سے آزاد کرنا چاہتی ہوں۔" وہ کچھ دیر بعد ٹھوس لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟" بشریٰ چونکی۔

"آپ پاپا سے کہہ دیں' وہ مجھے کسی ہاسٹل میں بھیج دیں میں پارٹ ٹائم جاب کرلوں گی اور اپنی تعلیم کا خرچ بھی خود اٹھا لوں گی مگر میں شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے اس سے زیادہ کوئی مجھے مجبور نہیں کرے گا۔"

بشریٰ کو لگا یہ وہ مثال تو نہیں' جسے وہ کچھ مہینے پہلے پاکستان چھوڑ کر آئی ہے۔

"اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو تم کیا کرو گی؟" وہ کچھ محتاط لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"میں ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی جس سے آپ لوگوں کو پریشانی ہو اگر میں خود گھر چھوڑ کر چلی گئی تو..." اس نے

حتی الامکان لہجے کو نارمل رکھا۔

"مثال! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" بشریٰ دھک سے رہ گئی ایسی بات تو اس نے کبھی نہیں سوچی تھی۔

"خدا حافظ ماما! آپ کی کال کافی طویل ہو گئی ہے۔" نارمل لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"ماما میں کیسی لگ رہی ہوں؟" پری عفت کے سامنے اسٹائلش ڈریس پہنے' بہت خوب صورت انداز میں بالوں کا اسٹائل بنائے ہوئے کھڑی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو تم اس وقت؟" عفت اس کی تیاری پر کچھ چونک کر بولی۔

"بتایا تو تھا آپ کو' مجھے اپنی فرینڈ کی طرف جانا ہے تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔" وہ خود کو آئینے میں تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"کہاں جانا ہے؟ پاپا آتے ہیں تو وہ چھوڑ آئیں گے تمہیں؟"

"ماما! یہ تین گلیاں چھوڑ کر اس کا گھر ہے' بہت دنوں سے وہ اصرار کر رہی ہے' آج مجھے اس سے کچھ نوٹس بھی لینے ہیں۔ میں آجاؤں گی گھنٹے بھر میں۔" وہ ہینڈ بیگ کی چیزیں چیک کرتے ہوئے اطلاعی انداز میں کہہ رہی تھی۔

"تمہارے پاپا آنے والے ہیں۔" عفت کچھ تشویش سے بولی۔

"سو واٹ... میں کہہ رہی ہوں نا' میں جلدی آجاؤں گی۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"دانی بھی گھر میں نہیں ہے' بس بیگ رکھا کھانا کھایا اور خدا جانے کہاں نکل گیا؟" عفت پریشانی سے بولی۔

"ماما یہ کوئی نئی بات ہے' اس کی روز کی روٹین ہے اور وہ بھی تو روز جاتا ہے' آپ اسے کچھ نہیں کہتیں میں تو صرف آج جا رہی ہوں' آجاؤں گی' جلدی بائے۔" کہہ کر وہ عفت کا جواب سنے بغیر باہر نکل گئی۔

"پتا نہیں ان دونوں کے دماغوں میں کیا چل رہا ہے۔ ایک یہ منحوس مثال یہاں سے دفعان ہو تو عدیل کو اس گھر کے باقی افراد نظر آئیں۔ اچھے بھلے دانی کو ٹائم دینے لگے تھے' پھر سے فراموش کر بیٹھے' پتا نہیں یہ لڑکا کیا کرنا چاہتا ہے۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کر باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"کون سا لڑکا؟" عدیل کے بیگ کی زپ کھولتے ہاتھ بے اختیار رک گئے۔ اگرچہ عفت نے بہت محتاط انداز میں ساری بات کی تھی' مگر عدیل تو بری طرح سے چونکا تھا اور جس طرح کا مثال کا رویہ تھا اس کا چونکنا غلط بھی نہیں تھا۔

"میں نہیں جانتی وہ پہلے بھی اس لڑکے کے ساتھ ایک دو بار گھر آئی ہے۔ باہر مین روڈ پر اترتی ہے اندر نہیں لے کر آتی ہے پری نے بھی اسے دیکھا ہے کالج سے اس لڑکے کے ساتھ باہر جاتے ہوئے اور آج میں نے۔" عفت رک رک کر یاسیت بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"اور تم مجھے آج بتا رہی ہو۔" وہ چلایا۔

"مثال' مثال... مثال!" وہ عفت کا جواب سنے بغیر اسے پکارتا ہوا باہر جانے لگا۔

"عدیل یہ غلطی نہیں کریں۔" وہ تیزی سے اس کے سامنے آکر ملتجی لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔

"اگر آپ نے اس کو سامنے کھڑا کر کے سب کچھ پوچھ لیا تو کیا پتا وہ نڈر ہو کر اقرار کرلے یا کوئی انتہائی قدم اٹھا

لے۔"

"تو تم جھوٹ بول رہی تھیں اس کے بارے میں۔" عدیل غصے سے بولا۔

"مجھے دانی اور پری کی قسم! میں کیوں جھوٹ بولوں گی آپ میری ہر بات کو منفی لیتے ہیں' جائیں پھر جو کرنا چاہتے ہیں کیجیے' پھر اگر اس نے کچھ ایسا ویسا کر دیا تو پھر نہ کہیے گا' اور میں صرف اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کا کوئی بھی عمل میری بیٹی کی راہ کا روڑا ضرور بنے گا' ورنہ وہ تو وہی کرے گی جو اس کی ماں نے کیا ہے آگے آپ کی مرضی۔"

عدیل گم صم سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

عفت باہر چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

وردہ پری کے آگے بچھی جا رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ سارا گھر اٹھا کر اس کی مدارت کر ڈالے۔

"ارے بس کرو ناں۔ میں اتنا کچھ نہیں کھاتی۔" پری اس کے والہانہ انداز پر کچھ بوکھلا کر بولی۔

"وہ تو تمہارا شاندار فگر دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا ہے۔" وہ توصیفی انداز میں اسے سراہتے ہوئے بولی۔

"اپنی امی سے تو ملواؤ پھر میں گھر جاؤں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میرے پاپا آفس سے آ گئے ہوں گے۔" وہ گھڑی دیکھ کر کچھ عجلت میں بولی۔

"امی نماز پڑھ رہی ہیں۔ بس آ رہی ہیں تم بیٹھو میں بلا کر لاتی ہوں اور جلدی میں تمہیں نہیں جانے دوں گی ہم ابھی گھنٹہ بھر اور بیٹھو گی' خوب باتیں کریں گے اور فکر نہیں کرو' میں خود تمہیں گھر چھوڑنے جاؤں گی تمہاری ماما اور پاپا سے بھی مل لوں گی اور پرمیشن لے لوں گی کہ ہم دونوں کمبائین اسٹڈی کر لیا کریں۔ کیسا؟"

"ہاں یہ زبردست آئیڈیا ہے لیکن ابھی تو میں جلدی جاؤں گی۔"

"میں آتی ہوں۔" وہ کہہ کر باہر نکل گئی۔

"ارے آپ!" وہ کمرے کے دروازے تک یونہی ٹہلتی ہوئی پہنچی اور اندر آتے واثق سے ٹکراتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھی' وہ بھی آنکھوں میں شناسائی لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

سمیرا عثمان گل

سیاہ ہنڈا سوک اجنبی راستوں پر گامزن تھی' ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے اپنے شوہر کے ساتھ اگلی نشست پر براجمان تھی مگر دونوں یوں اجنبی لاتعلق سے بیٹھے تھے جیسے یکسر انجان' اجنبی ہوں' تھے تو وہ اجنبی ہی مگر نئے رشتے کی نوعیت کا بھی کچھ لحاظ تھا کوئی چھیڑ چھاڑ کوئی شوخ فقرہ کوئی خاموش گستاخی' چلو وہ تو لڑکی تھی مگر دوسری جانب بیٹھا مرد یوں تھا جیسے کوئی برف کا اسٹیچو' بالکل ساکت صامت' یہ بھی اچھا تھا ورنہ وہ جس موڈ میں تھی اس کا تو گاڑی الٹانے کو دل چاہ رہا تھا یا پھر ڈیش بورڈ سے سر ٹکرانے کو۔

"کیا تھا جو اس شخص کی جگہ یہاں احسن ہوتا' کیا تھا جو ابا مان جاتے' کون سی قیامت آ جاتی جو وہ مل جاتا مجھے۔ زندگی کس قدر پرسکون اور خوشگوار گزرتی۔ مگر ہم لڑکیوں کے خواب بس خواب ہی ہوتے ہیں کبھی جو

من چاہی زندگی ہمیں میسر ہو۔ مگر کروں گی تو میں اپنی ہی من مانی۔" گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تو اس کی سوچوں کو یک دم بریک لگا۔

"آؤ کچھ کھالیں۔" یہ آدمی شاید۔ روبوٹ تھا اتنی نپی تلی گفتگو‘ وہ خاموشی سے گاڑی سے اتر آئی۔

اب وہ آگے چل رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے۔ اچانک اس کا پاؤں رپٹا اور وہ سی کی آواز کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی۔ ہیل ٹوٹ گئی تھی۔ مگر مجال ہے جو اس نے پلٹ کر دیکھا ہو۔ وہ اپنی ٹیبل منتخب کر کے بیٹھ چکا تھا اور وہ ابھی تک سینڈل ہاتھ میں پکڑے پاؤں کا معائنہ کر رہی تھی‘ چلنے میں کچھ تکلیف تو ہوئی مگر وہ میز تک پہنچ ہی گئی۔

وہ تھوڑی خفت کا شکار ہوا۔

"سوری میں نے دیکھا نہیں تھا۔" اب اسے بھلا کیا کہنا تھا محض لب کاٹ کر رہ گئی۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں۔" چائے کے دوران یہ پہلا سوال تھا جو اس نے خود سے پوچھا تھا عباد نے کچھ تعجب سے اسے دیکھا۔

"اپنے گھر۔"

"اور وہ کہاں ہے؟" اتنا معصومانہ سوال عباد کے لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ جگمگائی‘ وہ کیا بے خبر تھا یہ لڑکی تو اس سے بھی زیادہ غائب دماغ تھی۔

"آپ کو کسی نے بتایا نہیں۔" پہلی بار وہ اس کی سمت متوجہ ہوا‘ سیاہ کالی آنکھیں‘ گندمی رنگت اور لمبے بال وہ خاصی پرکشش تھی۔

"میں نے پوچھا نہیں۔" اس نے جیسے اعتراف کیا۔

وہ چونکا۔

"یہ سعادت مندی ہے یا راہ فرار۔"

"کچھ بھی سمجھ لیں۔" وہ جی بھر کر بدمزہ ہوئی تھی۔

"ہاں میں جانتا ہوں آپ کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے‘ لیکن مجھے تھوڑا وقت چاہیے اس رشتے کو قبول کرنے میں‘ نہیں بلکہ اس خود اذیتی کو فراموش کرنے میں۔" وہ بولا تو اس کا لہجہ بہت ٹوٹا بکھرا سا تھا۔

"راستے میں مجھے حیا کا فون آیا تھا کہہ رہی تھی عباد کو گھر لے آؤ۔"

"گھر۔" وہ یک دم تلخ ہوا۔

"کون سا گھر۔" اس کی آنکھوں میں سرخی چھا گئی۔

"وہ گھر میری ماں سے تھا جب وہ نہیں رہی تو اب کچھ باقی نہیں رہا۔"

"لیکن حیا آپ کی بہن ہے۔"

"آفٹر ون ویک‘ وہ بھی ہاسٹل چلی جائے گی تو وہ گھر ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔"

"لیکن۔۔۔"

"ڈونٹ آرگیومنٹ۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"اُفوہ مجھے کیا بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا گھر۔" اسے جی بھر کر کوفت ہوئی کہ بھلا کیوں وہ اس شخص کی ہمدردیوں میں گھل رہی ہے۔ یہی تو تھا اس کی خوشیوں کا قاتل۔ کیا ضروری تھا ان دنوں اس کا پرپوزل آتا وہ ابا کو منا لیتی۔

☼ ☼ ☼

گھر آنے کے بعد وہ پھر سے باہر چلا گیا تھا عنبرین بہت خوش ہوئی۔ اس کی واحد خوشی کا مرکز تھا یہ شہر‘ لاہور۔ احسن اسی شہر کا باسی تھا وہ اس کے شہر میں سانس لے رہی تھی وہ اس کے کتنے قریب آچکی تھی اتنے میں دروازہ کھلا اور عباد کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں گروسری کا سامان تھا جو اس نے اوپن کچن کے کاؤنٹر پہ رکھا تھا۔

"آؤ مل کر سیٹ کر لیتے ہیں۔" وہ اسے سارے کیبنٹ کھول کھول کر دکھا رہا تھا تمام چیزوں کو ٹھکانے پر رکھنے کے بعد وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھی تو عباد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کچھ ٹائم کا مطلب یہ نہیں کہ تم منہ پھلا کر ادھر ادھر بیٹھی رہو۔ تمہارے لیے یہ کوئی سزا نہیں ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھو ہنسو بولو جیسے اپنے ہی گھر میں ہو۔" وہ اس کے اتنے دوستانہ انداز پر بھی سپاٹ سی کھڑی رہی تھی۔

"میں سونا چاہتی ہوں۔"

"وہ وہاں بیڈ روم ہے آرام سے رہو اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو جھجکنا مت۔" اس نے دائیں جانب کمرے کی سمت اشارہ کیا تھا وہ سر ہلا کر اپنے اور عباد کے مشترکہ بیڈ روم میں چلی آئی۔

عباد اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔

"اس لڑکی کے بھی کچھ خواب‘ کچھ ارمان ہوں گے اپنے غم میں مجھے اس کی خوشیوں کو نہیں بھولنا چاہیے بے چاری کیسی مرجھائی ہوئی افسردہ سی لگ رہی ہے اپنے گھر والوں سے دور ایک اجنبی بندے کے ساتھ۔" اسے بے حد ہمدردی ہو رہی تھی‘ وہ سوچ رہا تھا تھوڑا وقت اس کے ساتھ گزارے‘ لیکن پھر خیال آیا تھکی ہوئی ہے اچھا ہے سو جائے اور خود کافی کا مگ بنا کر لاؤنج میں صوفے پر آبیٹھا اسی وقت فون کی بیل بجی تھی۔

"بھائی کہاں ہو آپ پلیز گھر آجاؤ۔" حیا نے روتے ہوئے کہا تھا۔

وہ بے چین ہو اٹھا۔

"حیا پلیز سنبھالو خود کو‘ میں تمہیں کل اپنے پاس بلوا لوں گا اور پھر تمہیں کون سا ہمیشہ وہاں رہنا ہے ایک ہفتے بعد تم ہاسٹل چلی جاؤ گی۔" بمشکل اس کو بہلا پایا تھا مگر اس کے بعد پھر خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا‘ لاڈلا اور چہیتا تھا اور ماں کی یوں اچانک وفات نے اسے شدید صدمے سے دوچار کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یہ دو ماہ پہلے کی بات تھی لاہور میں اس کی نئی نئی نوکری لگی تھی۔ وہ پہلی بار گھر والوں سے دور ہوا تھا اماں کو اس کے متعلق سوچ سوچ کر ہول اٹھتے تھے۔

"پتا نہیں اکیلا کیسے رہتا ہو گا کھانا‘ برتن‘ کپڑے یہ ڈھیر سارے کام کون کرے گا۔" اور بس انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس کی شادی کر دیں گی کسی تقریب میں انہوں نے عنبرین کو دیکھا تھا بس فوراً" رشتہ طے ہو گیا۔ انہیں شادی کی جلدی تھی لڑکی والوں نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا اور تاریخ طے ہو گئی۔

شادی میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا اس کی اماں کس قدر چاؤ اور خوشی کے ساتھ تیاریاں کر رہی تھی کہ اچانک خبر آئی کہ اس کے چچا نے دوسری شادی کر لی ہے اس کی چچی بدقسمتی سے اس کی خالہ بھی تھیں۔

اماں کو اس قدر صدمہ تھا کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج ہو کر رہ گئیں اس نے بارہا سمجھایا۔

"امی! پلیز خالہ سے زیادہ تو آپ ٹینشن لے رہی ہیں اتنا مت سوچیں طبیعت خراب ہو جائے گی۔" مگر اس کی اماں کی عادت تھی جو بات ایک بار خود پہ طاری کر لیتی پھر اس کی گرفت سے آزاد ہونا مشکل تھا۔

نتیجہ رات کو ہارٹ اٹیک کی صورت نکلا اور صبح ڈھتے ہو گئی وہ اس سب کا قصور وار چچا کو سمجھ رہا تھا ایک ہفتے بعد طے شدہ تاریخ پہ اس کا نکاح ہوا اور وہ عنبرین کو لے کر لاہور چلا آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں آتے ہی اس نے بیگ سے اپنا موبائل نکالا اور احسن کا نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لائٹ اس نے پہلے ہی آف کر دی تھی وہ جانتی تھی عباد کمرے میں نہیں آئے گا اسے اپنی ماں کا سوگ منانے سے ہی فرصت نہیں تھی دوسری جانب بیل جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات بہت ہو چکی تھی پھر اتنے دنوں کا رت جگا‘ کچھ سفر کی تھکان اس کے پپوٹے دکھ رہے تھے۔ پانی کے ساتھ اس نے ایک سلیپنگ پلز لی اور سونے کے لیے وہیں صوفے پہ لیٹ گیا تب ہی اسے جیب میں کچھ محسوس ہوا تھا ہاتھ ڈال کر اس نے ڈبیہ باہر نکال لی۔

یہ عنبرین کی منہ دکھائی کی انگوٹھی تھی اس نے سوچا وہ چپکے سے اس کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دے تاکہ ایک

اور فارمیلٹی سے بچا جائے' اسی خیال کے تحت وہ بیڈ روم کی سمت بڑھا تھا۔ لیکن اندر سے آتی عنبرین کی آواز نے قدموں کو دروازے میں ہی جکڑ لیا۔

"میں تمہارے شہر میں ہوں۔" اس وقت وہ کسی سے بات کر رہی تھی۔

"ایک بار آئی تھی ٹرپ کے ساتھ مگر بہت بور ہوئی تھی۔"

وہ ایک پل کے لیے خاموش ہوئی تھی شاید دوسری جانب کی بات سننے کے لیے۔

"ہاہاہا' مزہ تو اب آئے گا جب تمہارے ساتھ بائیک پر بیٹھ کر لاہور دیکھوں گی انار کلی سے شاپنگ' مینار کے آخری کونے سے بادلوں کو چھونا اور بارہ دری میں پاؤں لٹکانا سب کتنا خوابناک ہوگا۔" کھڑے کھڑے اسے چکر آنے لگے تھے اس کا ذہن سو رہا تھا وہ واپس صوفے پر آکر لیٹ گیا اور اس کے بعد صبح اٹھا تو اس کے دماغ میں رات والی باتیں گونجنے لگیں' الجھے بکھرے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے اس نے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھا وہ شاید ابھی تک سو رہی تھی۔

"جانے وہ سب سچ تھا یا پھر میرے دماغ کی اختراع۔" وہ اٹھ کر ناشتا بنانے لگا آفس سے آج کل اس کی چھٹیاں تھیں جو اس نے شادی کے لیے لی تھیں۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" اس نے دروازے سے اندر جھانکا تھا عباد نے گردن موڑ کر سجی سنوری نکھری نکھری سی نئی نویلی دولہن کو دیکھ کر مسکرانا چاہا' مگر اس کی یہ کوشش ناکام رہی تو وہ سپاٹ سا اسے دیکھنے لگا۔

"نہیں بس تیار ہے سب کچھ۔"

"تو میں میز پر لگا دیتی ہوں۔" وہ اندر چلی آئی اور برتن اٹھا کر میز پر رکھنے لگی۔

"میں آفس جا رہا ہوں۔" کچھ سوچتے ہوئے اس نے اطلاع دی' عنبرین نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا۔

"اتنی جلدی۔"

"ہاں بس کچھ ضروری کام تھا۔" وہ سوچے سمجھے بغیر گھر سے نکل آیا اور پھر بے مقصد سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا رہا۔

"مجھے اسی وقت اندر جانا چاہیے تھا اور صاف صاف بات کرنی چاہیے تھی۔"

دوسری جانب عنبرین کو جیسے گھر سے نکلنے کا موقع ملا تھا' اس نے احسن کا نمبر ملایا اگلے بیس منٹ میں وہ بلڈنگ کے باہر کھڑا تھا۔

عباد جب گھر آیا تو وہ گھر میں نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

احسن سے اس کی ملاقات دو سال قبل اس کی فرینڈ کی شادی میں ہوئی تھی وہ بارات کے ساتھ آیا تھا۔

شوخ' باتونی اور ہینڈسم سا احسن عنبرین کو اچھا لگا تھا۔ وہیں فون نمبرز کا تبادلہ ہوا اور تب سے اب تک وہ محض ٹیلی فونک گفتگو ہی کرتے رہے تھے۔ پھر ایک روز اس نے ملنے کی بات کی تو عنبرین شادی پہ زور دینے لگی اب ان کی باتیں گھوم پھر کر شادی پہ آجاتی تھیں آخر تنگ آکر احسن نے کہا۔

"تم پہلے اپنے گھر والوں کو مناؤ۔" اس نے گھر میں بات کی اور گویا بھونچال ہی آگیا۔ اس کا کالج جانا بند' موبائل اماں نے چھین لیا۔

"جو پہلا رشتہ آئے اس کی فوراً شادی کر دو۔" ابا کا یہی فیصلہ تھا۔ اس دوران وہ چوری چھپے کبھی بھائی اور کبھی کزن کے موبائل سے فون کرتی رہی تھی اور آج ہر قید و بند سے آزاد وہ اس کے ساتھ گھوم رہی تھی۔

لیکن عباد نے اسے بائیک سے اترتے دیکھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کون تھا وہ لڑکا۔" عباد نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

وہ بھی عباد کو سب بتانا چاہتی تھی مگر اتنی جلدی یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"جس کی خاطر میں نے آپ سے شادی کی ہے۔" بس کھیل ختم آخر اور کتنا لمبا کھینچتی۔ اس کا من پسند ساتھی اور من پسند زندگی دو قدم کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ بس اب اور انتظار نہیں۔

"کیا مطلب۔" وہ کچھ سمجھا نہیں تھا۔

عنبرین نے سارا قصہ دہرا دیا۔ "ابا نے مجھے گھر میں بند کر رکھا تھا میں اس قید سے نکلنا چاہتی تھی اور وہ صرف آپ سے شادی کی صورت ہی ممکن تھا سو میں نے آپ سے شادی کر لی اور اب احسن......" اس کی بات مکمل ہونے سے قبل عباد نے اسے تھپڑ دے مارا تھا۔ وہ ششدر رہ گئی۔ پھر چلا اٹھی۔ "آپ ایسا کوئی حق نہیں رکھتے کیونکہ میں آپ کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔"

"تم ایک قید سے نکل کر دوسری میں داخل ہو چکی ہو۔ اب تمہارا جینا مرنا اس گھر میں ہوگا اور سن لو جو محبت کرتے ہیں نا وہ ساتھ نبھاتے ہیں بیچ راہ میں چھوڑ کر نہیں جاتے اور اگر چھوڑ جائیں تو پلٹ کر نہیں دیکھتے جو ہوا وہ تمہارا ماضی تھا۔ میں بھول جاؤں گا سب اگر تم بھی بھول جاؤ۔"

"نہیں مجھے احسن چاہیے۔" عجیب بچگانہ ضد تھی۔ عباد نے اسے ایک اور تھپڑ لگا کر کمرے میں بند کر دیا تھا۔

اس نے عباد کے دروازہ باہر سے بند کرنے پر جھنجلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر آکر غصے میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ کچھ خیال آنے پر اس نے موبائل اٹھا کر احسن کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے اپنی الجھن بیان کی۔

"ہاں تو ٹھیک ہے تم اپنے شوہر کے ساتھ ایڈجسٹ ہونے کی کوشش کرو کیوں کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ پھر تم وہی ضد بار بار کیوں کرتی ہو۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

"میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہوں۔"

"تمہاری حماقت ہے یہ ورنہ ہم اچھے دوست ہیں بس۔"

"بس اچھے دوست۔" عنبرین کو گہرا صدمہ ہوا تھا۔

"ہاں اچھے دوست۔" وہ لاپروائی سے کہہ رہا تھا۔

"تم ہزار مرتبہ مجھ سے اظہار محبت کر چکے ہو اور اب کہہ رہے ہو کہ ہم صرف اچھے دوست ہیں۔" اس نے ایک ہاتھ سے موبائل اور دوسرے ہاتھ سے اپنا سر تھاما۔

"تو کیا دوستوں سے شادی نہیں ہوتی؟" اس نے بھی اس انداز میں پوچھا۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "میں شادی شدہ ہوں یار۔" ایک لمحے کے لیے اسے اپنا کان سن ہوتا محسوس ہوا۔ اسے اپنے وجود کے چیتھڑے اڑتے ہوئے محسوس ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے ترمرے ناچ رہے تھے۔ موبائل آف ہو چکا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا؟ اپنے ہاتھوں اس نے سارے در بند کر دیے تھے۔ سر گھٹنوں میں دے کر بیٹھنے سے پہلے اس نے موبائل اٹھا کر دیوار پر دے مارا اور آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھر گئیں۔

"چلو اٹھو ناشتا کر لو کب تک بیٹھ کر روؤ گی۔" آواز پر اس نے یک دم سر اٹھا کر دیکھا سامنے عباد ناشتے کی ٹرے لیے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے رونے میں تیزی آگئی۔

"میں نے کہا تھا نا کہ محبت کرنے والے یوں بیچ راستے میں چھوڑ کر نہیں جاتے۔ اب تو تمہیں میری بات پر یقین آہی گیا ہوگا۔" ٹرے درمیان میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"سچ کہتے ہو تم۔" عنبرین نے اس کی طرف دیکھا۔

"میری بات پہ ہمیشہ یقین کرو گی تو یہ زندگی بہت اچھی گزرے گی۔" اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوچا واقعی عباد ٹھیک کہتا ہے کہ راہ میں ملنے والے راہ میں ہی چھوڑ جاتے ہیں اور یہ بات اس کی سمجھ میں راستہ بند ہونے سے پہلے آگئی تھی۔

☼

کیا تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا' اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

اے شوقِ نظارہ کیا کہیے' نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کیجیے' ہم صورتِ جاناں بھول گئے

اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں' اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو، ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

سب کا تو مداوا کر ڈالا' اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے تو گریباں سی ڈالے' اپنا ہی گریباں بھول گئے

یہ اپنی وفا کا عالم ہے' اب ان کی جفا کو کیا کہیے
اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگِ جاں بھول گئے

اسرار الحق اعجاز

اُداسی کے اُفق پر جب تمہاری یاد کے جگنو
چمکتے ہیں
تو میری روح پر رکھا ہوا یہ ہجر کا پتھر
چمکتی برف کی صورت پگھلتا ہے!
اگرچہ یوں پگھلنے سے یہ پتھر، سنگ ریزہ تو
نہیں بنتا!
مگر اک حوصلہ سا دل کو ہوتا ہے
کہ جیسے سر سبز تاریک شب میں بھی
اگر اک زرد رو، سہما ہوا تارا نکل آئے
تو قاتل رات کا بے اسم جادو ٹوٹ
جاتا ہے
مسافر کے سفر کا راستہ تو کم نہیں ہوتا
مگر تارے کی چلمن سے
کوئی بھولا ہوا منظر اچانک جگمگاتا ہے
سلگتے پاؤں میں اک آبلہ سا پھوٹ جاتا
ہے

امجد اسلام امجد

یہاں موسم بھی بدلیں تو نظارے ایک جیسے ہیں
ہمارے روز و شب سارے کے سارے ایک جیسے ہیں

ہمیں ہر آنے والا زخم تازہ دے کے جاتا ہے
ہمارے چاند سورج اور ستارے ایک جیسے ہیں

خدایا تیرے دم سے اپنا گھر اب تک سلامت ہے
وگرنہ دوست اور دشمن ہمارے ایک جیسے ہیں

کہیں گر فرق نکلے گا تو بس شدت کا کچھ ورنہ
یہاں پر غم ہمارے اور تمہارے ایک جیسے ہیں

میں کس امید پہ دامن کسی کا تھام لوں اختر
کہ سب سے دوستی میں اب خسارے ایک جیسے ہیں

اختر امان

دل کو بے کار ہی مصروف ہوں سمجھانے میں
یہ وہ گتھی ہے اُلجھتی ہے جو سُلجھانے میں

ہو رہی تھی مری اپنی بھی سمجھ سے باہر
کوئی تفصیل تھی ایسی مرے افسانے میں

راکھ ہو سکتا ہوں میں دُور بھی رہ کر تجھ سے
اتنی توفیق ہے اب بھی ترے پروانے میں

کام دُشوار تھا اور عمر بھی سب خرچ ہوئی
ان اندھیروں پہ کسی خواب کو لہرانے میں

ظفر اقبال

صبا ساجد

اس ماہ کی مسکراہٹیں

وضاحت

"تمہاری شادی ایک دراز قد اور گندمی رنگت والے نوجوان سے ہوگی۔" نجومی نے ہاتھ دیکھتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

"ذرا وضاحت سے بتایئے نا۔" لڑکی نے شرماتے ہوئے کہا۔ "وہ چاروں۔۔۔ہی دراز قد اور گندمی رنگت والے ہیں۔"

سحر سہیل۔۔۔بفرزون

تیرے عشق کی انتہا۔۔۔

"اگر تمہیں مجھ سے سچی محبت ہوتی تو تم کبھی مجھ سے شادی کرکے میری زندگی تباہ نہ کرتے۔" بیوی نے اپنے بے حد محبت کرنے والے شوہر سے کہا۔

"ایسا مت کہو جان من!" شوہر تڑپ کر بولا۔

"میں نے تم سے سچی محبت کی ہے۔ پلیز میرا یقین کرو۔ تم سے شادی کرکے میں نے اپنی زندگی کو تباہ ہونے سے بچایا ہے۔ کیونکہ میں ایک دن بھی تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔"

"تم ہمیشہ اسی قسم کی باتیں کرکے مجھے بے وقوف بناتے رہتے ہو۔" بیوی نے خفگی سے کہا۔

"میری محبت پر الزام مت لگاؤ ڈارلنگ!" شوہر پھر جذباتی ہونے لگا۔ "اگر وحید مراد جیسا خوب صورت اور امیر ہیرو بھی مجھے یہ آفر کرے کہ وہ اپنی شہرت، خوب صورتی اور دولت مجھے دے دے اور خود میری جگہ لے لے تو بخدا میں انکار کردوں گا۔"

"مجھے پتا تھا۔" بیوی اب کے چلا اٹھی۔ "مجھے پتا تھا تم کبھی ایسا کوئی کام نہیں کروگے، جو میری دکھ بھری زندگی میں خوشیاں اور بہاریں بھر سکے۔"

مہ جبین۔۔۔اسلام آباد

ایک پینسل

ایک صاحب نے دفتر سے فارغ ہوکر اپنی سیکریٹری کو ساتھ لیا اور ہوٹل کھانا کھانے چلے گئے۔ وہاں سے فارغ ہوکر دونوں نے ایک فلم دیکھی، پھر سیکریٹری کے ساتھ اس کے گھر بھی چلے گئے۔ کچھ وقت وہاں گزار کر جب رخصت ہونے لگے تو سیکریٹری سے ایک پنسل لے کر کان کے اوپر پھنسالی۔

گھر پہنچنے پر جب بیوی نے تاخیر کا سبب پوچھا تو سب کچھ صاف صاف کہہ سنایا۔

"جھوٹ۔۔۔بکواس۔۔۔" بیوی نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے، تمہیں شو مارنے کی عادت ہو۔ مجھے جلانے کے لیے تم خوب ڈینگیں مارتے ہو۔ مجھے معلوم ہے تم اب تک آفس میں کام کرتے رہے تھے۔ پنسل ابھی تک تمہارے کان میں پھنسی ہوئی ہے۔"

شازیہ تبسم۔۔۔بہاول پور

اجنبیت

ایک نوجوان ہچکچاتا ہوا ایک صاحب کے پاس آیا۔

"میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ اگر تم میری بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم مجھے پسند آئے ہو۔" نوجوان کو اوپر سے نیچے تک پسندیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے صاحب نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے جناب!" نوجوان ایک دم سٹپٹا کر بولا۔ "میں تو آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں اور آپ سے ایک ہزار روپے ادھار مانگنے آیا تھا۔"

"واٹ!" وہ صاحب ایک دم گرج پڑے۔ "ادھار کیسے دے دوں تمہیں، میں تو تمہیں جانتا تک نہیں۔"

رخسانہ ظفر۔۔۔لاہور

اخراجات

"میں اپنے باس کی بک بک سن کر تنگ آچکی ہوں۔" لڑکی نے اپنی سہیلی سے اپنے افسر کا شکوہ کیا۔ "ہر وقت اخراجات کا رونا روتا رہتا ہے۔ آج کہہ رہا تھا فلیٹ کا کرایہ بہت مہنگا پڑتا ہے اسے۔"

"حد ہوگئی بھئی!" سہیلی نے تنگ کر کہا۔ "فوراً نوکری چھوڑ دو۔ بھلا فلیٹ کے کرائے سے تمہارا کیا تعلق؟"

"دراصل۔۔۔وہ میرے فلیٹ کے کرائے کی بات کررہا تھا۔" لڑکی نے ذرا توقف سے جواب دیا۔

فریال صلاح الدین۔۔۔کراچی

فوری اقدام

ایک مشہور و معروف اور بڑی کمپنی کے مالک نے اپنی کمپنی کے ملازم کو خراب حلیے میں دیکھا تو خوب خفا ہوئے۔

"تم نے اپنی حالت دیکھی ہے غور سے۔ بغل پھٹی ہوئی ہے۔ کوٹ کے سارے بٹن غائب ہیں۔ شرٹ بغیر استری کی ہے۔ تسمے کھلے ہوئے ہیں۔ بال گندے ہیں۔ کپڑوں سے انڈے کی ہیک آرہی ہے۔ کیا ہماری کمپنی کے ورکر کو یہ حلیہ زیب دیتا ہے؟"

"میں شرمندہ ہوں جناب!" ملازم نے شرمندہ ہوتے ہوئے سر جھکا کر جواب دیا۔

"صرف شرمندگی سے کام نہیں چلے گا۔" مالک کا غصہ کسی طور کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ "اس سلسلے میں فوری قدم اٹھانا ضروری ہے۔" مالک نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا۔

"تم فوراً" شادی کرلو اور اگر شادی شدہ ہو تو طلاق کا بندوبست کرو۔"

لبنیٰ شیخ۔۔۔کراچی

لکیر

ایک سردار نے کار سے پہلوان کو ٹکر ماردی۔ پہلوان نے غصے سے سردار کو کار سے نکالا اور کار سے دس میٹر دور کھڑا کرکے روڈ پر ایک لائن کھینچ دی اور کہا۔

"اگر لائن سے ذرا بھی ادھر آئے تو جان سے مار ڈالوں گا۔"

پھر خود ڈنڈے سے اس کی گاڑی توڑنے لگا۔ جب کار کا کافی نقصان کردیا تو پیچھے مڑ کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سردار زور زور سے ہنس رہا تھا۔

"تم کیوں ہنس رہے ہو؟" پہلوان نے حیران ہوکر پوچھا۔

"جب تم گاڑی توڑ رہے تھے، میں نے پانچ دفعہ لکیر پار کی تھی۔" سردار نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے جواب دیا۔

غزالہ شہباز۔۔۔روہڑی

ڈاکٹر؟

مریضہ نسخہ لینے کے بعد کمرے سے باہر جارہی تھی، کہ دروازے پر پہنچ کر وہ اچانک رکی اور اس نے پلٹ کر غور سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا خاتون۔۔۔؟" ڈاکٹر سمجھا کہ شاید وہ کوئی بات کہنا چاہتی ہے۔

"کچھ نہیں!" وہ دھیرے سے بولی۔ "ڈاکٹر صاحب! میں مقررہ وقت سے کچھ تاخیر کے بعد یہاں پہنچی لیکن آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ آپ نے پورا آدھا گھنٹہ مرض کی تشخیص پر لگایا، پھر نسخہ لکھا۔ جس کا ایک ایک لفظ میں پڑھ سکتی ہوں۔ کیا آپ واقعی ڈاکٹر ہیں؟"

مسرت الطاف احمد۔۔۔کراچی

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

سیدہ نسبت زہرا ——— کہروڑپکا
کوئی بچائے ہوئے ہے بہت مجھے ورنہ
ہزار جاں مرے اس پاس رہتے ہیں

گیلانی سسٹرز ——— کہروڑپکا
رازِ ہستی کچھ نہیں اکثر یہی دیکھا ہے
بے خبر ہنستے رہے، باخبر روتے رہے

نمرہ، اقرا ——— کراچی
نہ ہم ولی نہ پیغمبر یہ لوگ جانے کیوں
قدم قدم پہ ہمیں آزمانے لگتے ہیں

دعا شاہد ——— کورنگی کراچی
ہجر کا باب ہو گئے تم بھی
کتنے کم یاب ہو گئے تم بھی
میں نہ کہتا تھا وقت ظالم ہے
دیکھ لو خواب ہو گئے تم بھی

مدیحہ فہید ——— کراچی
جوق در جوق تمناؤں کے دھوکے کھا کر
دل اگر اب بھی دھڑکتا ہے تو حد کرتا ہے

آسیہ جاوید ——— علی پور چھٹہ
نہ مخلص تھا مجھ سے نہ واقف مرے جذبات سے تھا
اس کا رشتہ تو فقط اپنے مفادات سے تھا
اب جو بچھڑا تو کیا رونا اس کی جدائی پر
اس کا اندیشہ تو پہلی ہی ملاقات سے تھا

جے۔ آئی۔ اے ——— ڈیرہ غازی خان
کبھی جو مجھ سے بچھڑ کر، چاہا تم نے جینا
میں کبھی مر نہ جاؤں تو کافر مجھے کہنا

علشبہ احمد ——— بہاول نگر
ان کی اک مسکان پر ہم ہوش گنوا بیٹھے
ہم ہوش میں آنے والے تھے کہ وہ پھر مسکرا بیٹھے

خالق فاقی ——— چک 209
یوں تو میرا شاعری سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا
لفظوں میں مگر تیرا ذکر مجھے اچھا لگا

جگنو بوزدار ——— گڈو کالونی
اک پل کسی خواہش کی زیارت کو اٹھے تھے
اندر کے قلندر نے بڑی دیر نچایا

حافظ اقرا رحمن ——— لاہور
ایسے رہا کرو کہ کریں لوگ آرزو
ایسے چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

نوال افضل گھمن ——— لاہور
وفا ان دنوں کی بات ہے فراز
جب مکان کچے اور لوگ سچے تھے

انجل ——— ڈہرکی
ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

نمرہ کشور ——— میلسی
اس کائنات محبت میں، ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اک رابطہ مسلسل ہے اک فاصلہ مسلسل ہے
میں خود کو بیچ دوں پھر بھی تجھ کو پا نہیں سکتا
میں عام سا ہمیشہ ہوں تو خاص سا مسلسل ہے

سیدہ بشریٰ ایمان ——— بھکر
مایوس ہو گیا ہوں میں زندگی کے اس سفر سے
مقصد کی محبت مطلب کی دوستیاں اور دکھاوے کے رشتے

عظمیٰ غلام نبی ——— کراچی
اک عمر سے عادت ہے تیرے شام و سحر کی
اب کون تیری یاد کے معمول سے نکلے

صبا جمیل ——— پنڈی بھٹیاں
جہاں پہنچ نہیں سکتے کبھی زوال کے ہاتھ
عروج وہ حاصل مجھے ماں باپ کی دعاؤں سے ہے

ارم احمد ——— لاوہ
گزرے گی جوانی شہر میں رشتوں کے بغیر کس طرح
دل میں بھی کچھ نہیں ہے زباں پر بھی کچھ نہیں

تہمینہ احمد ——— درگاہی پور
یادیں تیرے خلوص کی ڈستی ہیں آج بھی
یہ آنکھیں تیرے دیدار کو ترستی ہیں آج بھی
میری آنکھوں میں رہ گیا تیری یاد کا ساون
چھپ چھپ کے دنیا والوں سے برستی ہیں آج بھی

سیدہ لوبا سجاد ——— کہروڑپکا
اک دنیا ہے کہ بستی ہے تیری آنکھوں میں
وہ تو ہم تھے جو تیری اک نظر کو ترسے
عمر اتنی تو عطا کر میرے فن کو خالق
میرا دشمن میرے مرنے کی خبر کو ترسے

ماریہ جہانگیر ——— مرالی
کوئی ہجوم دہر میں کرتا رہا تلاش
کوئی رہ حیات سے تنہا گزر گیا
ملنا تو خیر اس کا نصیبوں کی بات ہے
دیکھے ہوئے بھی اس کو زمانہ گزر گیا

رضوانہ شکیل راؤ ——— لودھراں
ریشم جیسے لوگ ہیں ہم
الجھے تن ہی رہتے ہیں

رقیہ سیف الرحمن ——— یزمان
ہم نے دنیا کو بڑی دور تک دیکھا ہے
غم سے لے کر سرور تک دیکھا ہے
کوئی بھی نہ ملا زمانے میں مخلص
عاجزی سے لے کر غرور تک دیکھا ہے

حمیرا نوشین ——— منڈی بہاؤالدین
مصلحت نے کر دیا پیدا دونوں میں اختلاف
ورنہ فطرت کا برا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں

دیا آفریں ——— شاہدرہ
منزلوں چلنا پڑا آخری منزل کے لیے
میرے ہمراہ مری عمرِ گریزاں بھی چلی

مدیحہ جاوید ——— سرگودھا
بھٹکا تو بہت بھٹکا، سنبھلا تو ولی ٹھہرا
اس خاک کے پتلے کا ہر رنگ نرالا ہے

کائنات اصغر بوزدار ——— ڈہرکی
تم بادشاہ وقت تھے کٹوا دیے تھے ہاتھ
اب قصر گر رہا ہے تو معمار کیا کرے

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ
ہم ایسی اپنی زندگی مختلف کے ساتھ
زندہ ہیں بے حساب زمانوں کے درمیان

سبط الرحمن ——— ماچھیوال گاؤں
ہو رہی ہیں ہر طرف نئے سال کی باتیں
وہی دوری، وہی تنہائی، نیا تو کچھ بھی نہیں

ثنا رحمن ——— نامعلوم
ہاتھ میں نے لیے اٹھا
اور دل سے آئے یہی صدا
مجھے بخش دے میرے خدا
مجھے بخش دے میرے خدا

بریرہ راجپوت ——— نوکوٹ (سندھ)
اس پیار میں بے وفائی کا دھوکا نہیں ہوتا
ہر رشتہ اتنا انوکھا نہیں ہوتا
فنا کر دوں زندگی ماں باپ کے قدموں میں
یہی تو وہ پیار ہے جس میں دھوکا نہیں ہوتا

کنزیٰ شاہین اعوان ——— آخون باندی
کھڑکیوں سے باہر اب کوئی جھانکتا نہیں ہے
درد و غم کسی کا اب کوئی بانٹتا نہیں ہے
بے حسی نے لوگوں کو ایسے باندھ رکھا ہے
جا رہا ہو تو کوئی روکتا نہیں ہے

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... زویا
میک اپ .... روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر .... موسیٰ رضا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو سعود بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم سے پہلے لوگوں میں سے (مرنے کے بعد) ایک شخص کا حساب کیا گیا تو اس کے پاس اس کے سوا کوئی نیکی نہیں پائی گئی کہ وہ لوگوں سے لین دین کا معاملہ کرتا تھا اور خوش حال تھا۔ اور اپنے غلاموں سے کہتا تھا کہ تنگ دست سے درگزر کیا کرو (جب وہ مرگیا تو فرشتوں سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"ہم درگزر کرنے کے اس سے زیادہ حق دار ہیں۔ تم اس سے درگزر کرو (اسے معاف کردو)"

سچ ہے یہ بھی،

کھیل بہت سے لوگ کھیلتے ہیں۔ میدان میں بہت سے اترتے ہیں۔ بہت سوں میں سے صرف تین لوگ جیتتے اور انعام پاتے ہیں۔

محبت کرنے والے، ثابت قدم اور خوش قسمت۔

راز کی حفاظت،

پرانی کہاوت ہے "ہر وہ راز جو دو سے تجاوز کرجائے، پھیل جاتا ہے"

پوچھا گیا کہ دو سے کیا مراد ہے تو جواب آیا کہ دو سے مراد دونوں ہونٹ ہیں۔ تاریخ میں اس سلسلے میں نہایت دلچسپ واقعہ بیان ہوا ہے۔

"معرکۂ بدر سے قبل جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا کہ شام سے قریش کا ایک قافلہ آرہا ہے تو آپ نے اس پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ آپ اپنے اصحاب کے ہمراہ قافلے کی جانب روانہ ہوئے۔ قافلے کے رہبر ابو سفیان کو مسلمانوں کی پیش قدمی کا پتا چلا تو اس نے ضمضم بن عمرو نامی ایک شخص کو اجرت پر مکے روانہ کیا اور کہا کہ فوراً جاؤ اور قریش کو صورت حال سے آگاہ کرو۔ ضمضم نہایت برق رفتاری سے مکہ روانہ ہوا۔ مکہ پہنچنے کے لیے اسے کئی دنوں کا سفر طے کرنا تھا۔ ادھر اہل مکہ کو درپیش خطرے کی کوئی خبر نہ تھی۔

اس دوران ایک رات عاتکہ بنت عبدالمطلب نے ایک پریشان کن خواب دیکھا۔ صبح ہوئی تو انہوں نے اپنے بھائی عباس بن عبدالمطلب کو بلا بھیجا۔ وہ آئے تو انہوں نے کہا۔

"یا اخی، واللہ! میں نے آج رات ایک خواب دیکھا ہے جس نے مجھے گھبرا دیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں اس خواب کے بعد آپ کی قوم پر کوئی مصیبت نہ آن پڑے۔ جو کچھ میں آپ سے کہوں، اسے راز رکھیے گا اور کسی کو نہ بتایئے گا"

حضرت عباسؓ نے کہا۔ "ہاں! ٹھیک ہے! اب بتاؤ تم نے کیا دیکھا ہے؟"

عاتکہ بولیں "میں نے ایک شتر سوار آتے دیکھا۔ وہ آیا اور وادی ابطح میں ٹھہر کر باآواز بلند پکارا۔

"سنو، ارے او بے وفاؤ۔ تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ"

پھر میں دیکھتی ہوں کہ لوگ اس آدمی کے اردگرد جمع ہوگئے۔ اس کے بعد وہ چلتا ہوا مسجد میں داخل ہوگیا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے مسجد میں آگئے۔ دریں اثنا کہ لوگ اس کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ اس کا اونٹ اپنے سوار کو لیے کعبہ کی چھت پر جا چڑھا۔ کعبہ پر کھڑے ہو کر اس آدمی نے پھر وہی اعلان کیا۔

"ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ"

پھر وہ آدمی اونٹ پر سوار جبل ابو قبیس کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ وہاں بھی اس نے وہی الفاظ دہرائے۔

"ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ"

پھر اس نے ایک چٹان اٹھائی اور پہاڑ کی چوٹی سے نیچے پھینک دی۔ چٹان لڑھکتی ہوئی پہاڑ کے دامن میں پہنچی تو ریزہ ریزہ ہو کر کنکروں میں بٹ گئی اور مکہ کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں چٹان کا کوئی کنکر نہ گرا ہو"

خواب سن کر حضرت عباسؓ بے قرار ہوگئے اور کہا۔

"بخدا یہ ایک اہم خواب ہے"

پھر انہیں خدشہ ہوا کہ خواب کی بات کھل جائے گی۔ چنانچہ انہوں نے عاتکہ کو متنبہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم بھی اس خواب کو پیٹ میں رکھنا اور کسی سے اس کا ذکر مت کرنا"

پھر حضرت عباسؓ خواب کے متعلق بے فکر ہو گئے۔ گھر سے نکلے تو راستے میں ان کا دوست ولید بن عتبہ انہیں ملا۔ حضرت عباسؓ نے سارا خواب ولید کو کہہ سنایا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی کہ اسے پوشیدہ ہی رکھنا اور کسی کو اس کی خبر نہ کرنا۔ ولید چلا گیا۔ اس کی ملاقات اپنے بیٹے عتبہ سے ہوئی تو اس نے خواب عتبہ کو بتا دیا، پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ عتبہ نے اپنے چند ساتھیوں کو بھی خواب سے مطلع کردیا۔ ہوتے ہوتے سب لوگوں کو خواب کا پتا چل گیا اور بات اہل مکہ میں پھیل گئی۔ حتیٰ کہ قریش کی عام محفلوں میں بھی عاتکہ کے خواب کا تذکرہ ہونے لگا۔

چاشت کے وقت حضرت عباس کعبہ کا طواف کرنے گئے۔ ابوجہل کعبہ کے سائے میں قریش کی ایک ٹولی میں بیٹھا تھا۔ وہ لوگ عاتکہ کے خواب کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

ابوجہل نے عباسؓ کو دیکھا تو کہا۔

"ابو الفضل! طواف سے فارغ ہو جاؤ تو ہماری طرف آنا"

حضرت عباسؓ کو حیرانی ہوئی کہ ابوجہل کو ان سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ انہیں بالکل توقع نہ تھی کہ ابوجہل ان سے عاتکہ کے خواب کے حوالے سے کوئی بات پوچھے گا۔ بہرکیف حضرت عباسؓ نے طواف مکمل کیا اور ابوجہل کی مجلس کی جانب بڑھے۔ قریب آکر ان کے درمیان بیٹھ گئے۔ ابوجہل نے ان سے کہا۔

"بنو عبدالمطلب! یہ نبیہ (نبی عورت) تم میں کب پیدا ہوئی ہے؟"

حضرت عباسؓ نے پوچھا "کیا مطلب؟"

اس نے کہا "وہ خواب جو عاتکہ نے دیکھا ہے"

اس پر حضرت عباسؓ ذرا گھبرائے اور انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا دیکھا ہے عاتکہ نے؟"

ابوجہل بولا "بنو عبدالمطلب! کیا اس بات سے تمہارا دل نہیں بھرا تھا کہ تمہارے مرد نبوت کا دعوا کریں۔ اب تمہاری عورتیں بھی نبی ہونے کا دعوا کرنے لگی ہیں۔ عاتکہ کہتی ہے کہ اس نے خواب میں دیکھا ہے، ایک آدمی کہہ رہا تھا "ارے او بے وفاؤ! تین دن کے اندر اپنی اپنی قتل گاہوں پر پہنچ جاؤ" ٹھیک ہے ہم تین دن انتظار کرتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہوئی تو ایسا ہو کر رہے گا۔ اور اگر تین دن گزرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہ ہوئی تو ہم تم لوگوں کے متعلق ایک تحریر لکھیں گے کہ تم عرب کا سب سے جھوٹا خاندان ہو" (نعوذ باللہ)

یہ سن کر حضرت عباسؓ بہت پریشان ہوئے اور کوئی جواب نہ دیا۔

پھر مجلس برخاست ہوگئی۔ حضرت عباسؓ گھر آئے تو بنی عبدالمطلب کی تمام خواتین ان کے پاس نہایت غصے کی حالت میں آئیں اور ہر ایک نے یہی کہا۔

"اس فاسق خبیث (اشارہ ابوجہل کی طرف تھا)

نے تمہارے مردوں کی بے عزتی کی اور تم چپ رہے۔ اب وہ تمہاری عورتوں کی بے عزتی کرنے پر اتر آیا ہے اور تم خاموش کھڑے سنتے رہتے ہو۔ تم لوگوں میں غیرت و حمیت نام کی بھی کوئی شے ہے کہ نہیں؟"

لعنت ملامت سن کر حضرت عباسؓ نے جوش اور غیرت میں آکر کہا۔ "واللہ! ابوجہل نے دوبارہ ایسی بات کی تو میں اس کی ایسی تیسی کر دوں گا۔"

عاتکہ کے خواب کے تیسرے روز حضرت عباسؓ مسجد میں آئے۔ وہ غصے میں تھے۔ مسجد میں انہوں نے ابوجہل کو دیکھا تو اس کے درپے ہوئے کہ وہ اپنی بات واپس لے۔ ابوجہل نے حضرت عباسؓ کے تیور دیکھے تو مسجد سے دوڑ لگا دی۔

حضرت عباسؓ کو اس کی برق رفتاری پر بڑا تعجب ہوا۔ وہ تو آج ابوجہل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ حضرت عباسؓ نے دل ہی دل میں کہا۔

"اللہ اس پر لعنت کرے۔ اسے کیا ہوا؟ کیا یہ میری سرزنش کے ڈر سے بھاگا ہے؟"

راستے میں ابوجہل کو ضمضم بن عمرو غفاری کی آواز سنائی دی جسے ابوسفیان نے اہل مکہ سے مدد مانگنے بھیجا تھا۔ ضمضم اونٹ پر سوار وادی میں شور مچاتا پھر رہا تھا۔ اس نے اونٹ کی ناک کاٹ دی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ ضمضم نے اپنا گریبان چاک کیا اور چلایا۔

"اے اہل قریش! تجارتی قافلہ، تجارتی قافلہ۔ ابوسفیان کے پاس تمہارے مال و متاع پر محمدؐ اور اس کے ساتھی حملہ کرنے والے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ تم وقت پر پہنچ کر انہیں روک لو گے۔"

پھر ضمضم پوری طاقت سے چیخا۔ "مدد، مدد۔"

اہل قریش نے فی الفور تیاری کی اور نکل کھڑے ہوئے۔ بدر کے معرکے میں جو شکست اور ذلت ان کا مقدر بنی وہ سب کو معلوم ہے۔

یہاں غور طلب پہلو یہ ہے کہ غیر معمولی احتیاط کے باوجود راز ایک لمحے میں جنگل کی آگ کی مانند پھیل گیا۔

(عبدالرحمٰن العریفی۔ زندگی سے لطف اٹھایئے)

واپسی کا راستہ کھلا رکھو

ایک جھیل کے خشک ہونے پر دو مینڈک نئی جگہ کی تلاش میں نکلے جہاں پانی موجود ہو۔ تلاش پر انہیں ایک کنواں نظر آیا۔ ایک مینڈک نے دوسرے سے کہا۔

"چلو اس میں چھلانگ لگائیں۔"

دوسرے نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے لیکن اگر یہاں بھی پانی خشک ہو گیا تو پھر باہر کیسے نکلیں گے؟"

کوئی کام شروع کرنے سے پہلے یہ عمدہ نصیحت ہے۔

علم اور تخلیق

- علم کے بغیر جو چیز لکھی جائے وہ بے علمی کا اشتہار ہوتا ہے۔

(مولانا وحید الدین)

- اتنا پڑھو، اتنا پڑھو کہ ابلنے لگو۔ اس کے بعد لکھو۔ (مولانا سید سلیمان ندوی)

موتی مالا

- محاورے قوموں کی عقل سلیم کا نچوڑ ہوتے ہیں۔

(سر جیمز میکنٹوش)

- عمر رسیدہ بیوی، بوڑھا کتا اور نقد رقم وفادار دوست ہوتے ہیں۔

(فرینکلن)

- شہادت موت سے نہیں مقصد سے نصیب ہوتی ہے۔ (نپولین)

- جو کسی سے حسد کرتا ہے۔ وہ اپنی کمتری کا اعتراف کرتا ہے۔ (لاطینی کہاوت)

مہوش۔ جام پور

واصفہ سہیل

خوش فہمی

اداکارہ فاطمہ آفندی کہتی ہیں۔ پاکستانی ڈرامے حقیقت سے قریب تر ہوتے ہیں۔ (مثلاً" کون سا ڈراما؟) اگرچہ میں بالی ووڈ کی فلمیں دیکھنے کی شوقین ہوں۔ (سب ہی ہیں) لیکن مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ پاکستانی ڈراموں کا نہ صرف معیار بلند ہے بلکہ وہ حقیقت کے بے حد قریب ہوتے ہیں۔ (پتا نہیں فاطمہ! آپ کون سے ڈراموں کی بات کر رہی ہیں، جبکہ ہمیں تو آج کل ایسا کچھ نظر نہیں آرہا۔ اپنے ڈراموں میں۔) بھارت میں میرا ڈراما ان دنوں آن ایر ہے۔ (اوہ... تو دراصل یہ بتانا چاہ رہی تھیں آپ؟) اور بھارتی شائقین بہت پسند بھی کر رہے ہیں۔ (یہ آپ کو کیسے پتا چلا؟) انہوں نے میری سوچ سے بڑھ کر میرے کام کو سراہا ہے۔ (شروع میں وہ سب کے ساتھ

دباؤ

چلغوزہ کینسر اور دل کے امراض سے بچاتا ہے۔ اس میں اعلا مقدار میں تکسیر کش اجزا پائے جاتے ہیں، جو فری ریڈیکلز کو نیوٹرلائز کرتے ہیں اور انسان کو نہ صرف دل کے امراض کے ساتھ کینسر جیسے موذی مرض سے تحفظ دیتے ہیں بلکہ بصارت اور جلد کو بھی تقویت دیتا ہے۔ چلغوزے کھانے سے قوت مدافعت بڑھتی ہے۔ سائنس دانوں کے مطابق تھکن اور دباؤ کو دور کرنے کے لیے چلغوزہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ (جی ہاں جب ہی ہمارے یہاں چلغوزہ کی قیمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جسے سن کر ہی تھکان اور دباؤ (بھئی جیب پر) بڑھ جاتا ہے۔

ایسا ہی کرتے ہیں۔) بھارتی میڈیا پاکستان کا تاریک پہلو دکھاتا ہے۔ (دشمن کا تو کام ہی ہے یہ۔) لیکن اس کے برعکس ہم بھی دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کی طرح ایک عام طرز زندگی رکھنے والے لوگ ہیں۔ (فاطمہ! دنیا کے کسی تیسرے درجے کے ملک میں حکمران اور عوام اتنی پر تعیش زندگی نہیں گزارتے۔) مجھے خوشی ہے کہ ہمارے ڈراموں کے ذریعے بھارتی عوام ہمیں زیادہ بہتر انداز میں جاننے لگیں گے۔ (صرف ڈرامے دیکھ کر....؟)

جنون

کرکٹر جب کرکٹ کے میدان میں نہیں چل پاتے تو پھر وہ اپنا رخ عموماً "فلم کی طرف کرلیتے ہیں۔ اب محمد عامر بھی اس راستے پر آگئے ہیں۔ انہیں فیصل بخاری کی فلم "بلائنڈ لو" میں بطور ہیرو کاسٹ کیا گیا ہے۔ محمد عامر کہتے ہیں کہ مجھے فیصل بخاری نے کام کرنے کی پیش کش کی' میں فارغ تھا۔ (بھئی کرکٹ جو نہیں کھیل رہے تو....) تو میں نے ہامی بھرلی۔ ہیروئن کے سوال پر انہوں نے کہا کہ مجھے تو کہا گیا تھا کہ انڈیا سے کوئی نیا چہرہ ہوگا۔ (ارمان!) لیکن میری طرف سے کسی کو بھی ہیروئن رکھ لیا جائے۔ مجھے تو اپنے کام سے غرض ہے۔ میں نے تو کام کرنا ہے۔ (ہائے! ادائے بے نیازی)

مزید کام کرنے کے متعلق عامر نے کہا کہ مجھ پر آئی سی سی کی طرف سے لگائی گئی پابندی ہٹ جاتی ہے تو میں اپنا پورا دھیان کرکٹ پر لگادوں گا۔ کیونکہ کرکٹ میرا جنون ہے جسے میں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔

گُر

آپ بھی کہیں گے کہ ہر مرتبہ میرا کہاں سے خبروں میں آجاتی ہیں۔ بھئی اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں' میرا کو بھلے ہی اداکاری اور انگریزی نہ آتی ہو مگر خبروں میں رہنے کا گُر خوب آتا ہے۔ اب یہ ہی دیکھ لیں کیپٹن نوید سے میرا کے اتنے جھگڑے ہوئے۔ لیکن میرا کیپٹن نوید کے ساتھ ساتھ ان کے والد راجہ خالد پرویز اور والدہ کو منانے امریکا پہنچ گئیں اور اچھی بہوؤں کی طرح سسرال والوں کی نصیحتوں کو پلو سے باندھ کر انہیں یقین دہانی کروائی کہ وہ انہیں شکایت کا موقع نہیں دیں گی۔ راجہ خالد پرویز نے بیٹے کے آگے بالآخر ہتھیار ڈال دیے اور اب سنا ہے کہ کچھ دنوں میں میرا دوبارہ امریکا جاکر اپنے میاں اور سسرال والوں کے تحفظات دور کریں گی اور پھر اس کے بعد ان کی رخصتی کا فیصلہ ہوگا۔ (دیکھا مزید خبروں میں رہنے کا سلیقہ۔)

ہدف

دنیا بھر میں ہر دس سیکنڈ میں ایک فرد فالج کا شکار ہوتا ہے اور پاکستان میں فالج سے روزانہ کم از کم چار سو افراد کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ پاکستان اسٹروک سوسائٹی کے سابق صدر اور آغا خان میڈیکل یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد واسع کے مطابق شریانوں میں خون کا لوتھڑا جم جانے سے جب خون کا دباؤ بڑھتا ہے' تو مریض پر فالج کا حملہ ہوتا ہے' اور ایک صحت مند انسان فوری طور پر مفلوج ہوکر بستر سے لگ جاتا ہے۔ پروفیسر محمد واسع کا کہنا ہے کہ پاکستان میں اس بیماری کی بڑی وجوہات میں بلند فشار خون یعنی ہائی بلڈ پریشر' مرغن خوراک' سگریٹ نوشی اور تمباکو سے تیار کردہ مواد خصوصاً" گٹکا شامل ہیں۔ مشینی دور میں جسمانی مشقت نہ کرنے والے لوگ جب ورزش نہیں کرتے اور ایک جامد قسم کی زندگی گزارتے ہیں تو یہ فالج کے لیے آسان ہدف ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بناسپتی گھی استعمال کرنا بھی اس بیماری کی وجوہات میں شامل ہیں۔ ماہرین کہتے ہیں کہ نمک' سگریٹ نوشی اور جامد طرز زندگی کو ترک کرکے اور ورزش کی عادت سے اس مرض سے بچا جاسکتا ہے۔

نتیجہ

"زندہ بھاگ" میں ایک اہم کردار کرنے والے زوہیب اصغر کہتے ہیں کہ "وہ فلم انڈسٹری میں آئے تو

تھے کچھ کرنے' لیکن یہاں ایک مافیا موجود ہے جو نئے لوگوں کو صرف اپنے لیے استعمال کرتا ہے اور ٹیلنٹ... ٹیلنٹ کی صرف باتیں کرتا ہے۔" زوہیب نے مزید کہا کہ "اگر فلموں میں کام کرنے کی بات چلتی ہے تو بس چلتی ہی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ یہاں صرف وقت کا زیاں ہے۔ میں تو ساری کشتیاں جلاکر شوبز میں آیا تھا۔ لیکن مجھے مایوسی کے سوا کچھ نہیں ملا۔" (زوہیب ہماری ساری ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن یہاں ہر شعبے میں یہ ہی حال ہے۔)

نیند

شعبہ نفسیات کی ماہر کیری پری بام جو کہ یونیورسٹی آف ایڈن برگ فار میڈیکل سائنسز سے وابستہ ہیں' کہتی ہیں کہ ویڈیو گیمز' کمپیوٹر اور ٹی وی کے زیادہ استعمال کی وجہ سے بچوں میں بے خوابی کی شکایت بہت زیادہ بڑھ رہی ہے۔ (ان ماؤں کو سوچنا چاہیے جو اپنی جان چھڑانے کے لیے بچوں کو کارٹون لگا کر ٹی وی کے آگے بٹھادیتی ہیں۔) کیری پری بام کے مطابق دس سے گیارہ سال کے بچے اس وقت نیند کی کمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ زیادہ دیر تک ٹی وی یا کمپیوٹر کے آگے بیٹھنے کی وجہ سے دماغ کے وہ حصے زیادہ متاثر ہوتے ہیں جو نیند کے لیے مخصوص ہیں۔ اس عمل سے دماغ کے اس خاص حصے میں تبدیلی واقع ہوجاتی ہے جو بچوں میں نیند کی کمی کا باعث بنتی ہے۔

نعمت

کینو کا پھل اور رس انفیکشن کا مقابلہ کرنے اور دوران خون کو بہتر بنانے میں مفید سمجھا جاتا ہے۔ یہ دل کی بیماریوں' ہائی بلڈ پریشر اور جسم میں سیال مادوں کے جمع ہونے سے جو سوجن اور ورم ہاتھوں اور پیروں پر نمایاں ہونے لگتی ہے ان کے علاج میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ کینو قدرت کی ایک ایسی نعمت ہے کہ ہر انسان آسانی سے استعمال کرکے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اس کو تازہ کھانا' رس پینے سے اچھا ہے۔ بعض اوقات آدھے سر کے درد کے مریضوں کو اس کی خوشبو راس نہیں آتی اور ان کا درد بڑھ سکتا ہے۔ اس لیے ان کو احتیاط کرنا چاہیے۔ سنگترے کے خشک چھلکوں کو جوش دے کر چائے کی طرح پینے سے جسم میں چستی اور توانائی آتی ہے۔

کچھ ادھر ادھر سے

☆ سانحہ پشاور کے بعد میڈیا پر پیدا کی جانے والی شدت سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ ہونے جارہا ہے۔

اس دہشت گردانہ کارروائی کا جو بھی اسکرپٹ رائٹر اور ڈائریکٹر تھا۔ اسے اچھی طرح اپنے اہداف معلوم ہیں۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس سانحے کے نتیجے میں پوری پاکستانی قوم کے جذبات کس طرح مزید بھڑکائے جاسکتے ہیں۔ اب پاکستان میں مزید خون خرابے کا امکان ہے اور اس کے بعد سیاسی تبدیلی کا بھی۔

(مسعود انور.... جسارت)

☆ مشرف کی ہوس اقتدار کے باعث نہ صرف فوج کا امیج خراب ہوا' بلکہ سول سوسائٹی بھی بری طرح دہشت گردی کا شکار ہوئی۔ آج اگر فاٹا میں گولی چلتی ہے یا پاکستان کے کسی حصے میں خودکش حملہ ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری مشرف پر ہی عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں پاکستانی معاشرے' پاکستانی آئین اور پاکستانی نظام میں اتنے کانٹے بودیے ہیں کہ انہیں چننے کے لیے کئی نسلیں چاہئیں۔

(جاوید چوہدری.... زیرو پوائنٹ)

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں

آپ کی عافیت ' سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو' ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف

پہلا خط گجرات سے فوزیہ ثمروٹ اور ام ہانیہ عمران کا ہے' لکھتی ہیں

دسمبر کا ٹائٹل بے حد پسند آیا۔ باوجود ناراضی کے' آپ نے تو شاید قسم کھا رکھی ہے۔ میرا کوئی بھی خط شامل کرنے کی غلطی نہیں کریں گی۔

انٹرویوز میں کیف غزنوی کا کپل ذرا منفرد سا لگا۔ مستقل سلسلے کچھ خاص نہ تھے اور شاعری تو بالکل بے جان سی لگی۔

افسانے سب ہی اچھے لگے۔ چور عورت موضوع اچھا تھا۔ مرد ساری عمر جس بات کو تختہ مشق بنا کر عورت کی ہستی فنا کرتا رہتا ہے۔ وہی بات خود اس کی ذات کے لیے بالکل معمولی بات ہوتی ہے سعدیہ رئیس "جا کے سسرال گوری" صحیح لکھا ہے۔ سسرال دو دھاری تلوار کی مانند ہوتی ہے شعاع کی شان اور جان تحریر "یارم" سمیرا حمید ہمیشہ کی طرح چھائی رہی ہیں ہمارے حواسوں پہ۔ مجھے کارل کا کردار اچھا لگتا ہے۔

زندگی اک کہانی ایک روایتی سی اسٹوری لگی۔ مگر اس کے یہ جملے بہت پسند آئے "زندگی ہر ایک کا امتحان ضرور لیتی ہے۔ مگر ناکامی یہ نہیں کہتی کہ جینا چھوڑ دیں۔ زندگی کو پوری طرح جینا ہی اصل زندگی ہے۔"

تیرے قول و قرار سے پہلے نادیہ احمد خاصی ڈرامائی انداز میں لکھی تحریر لگی۔ مجھے ثمینہ رؤف کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ اس دلی وابستگی کا جوان کو مجھ سے ہے۔

خط آپ کے میں اس ماہ سیدہ مقدس گیلانی کا خط پڑھا۔ میری بہن زندگی سب ہی کے ساتھ ایسا کرتی ہے یہاں کون ہے۔ جس نے دکھوں کا ذائقہ نہ چکھا ہو۔

مقدس صاحبہ بہن کے لیے ایک ٹپ ہے۔ ہر نئے دکھ پہ رج کے آنسو بہایا کرو اور صبح ایسے اٹھو جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ آزمالینا۔ اپنے رب سے لو لگالو۔ پھر کوئی غم کوئی فکر نہیں رہے گی۔

پیاری فوزیہ! مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے خط اور تبصرے بہت لیٹ ملتے ہیں' اس لیے شامل نہیں ہو پاتے' اس میں شک نہیں کہ آپ بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کرتی ہیں' اسی لیے ہماری قارئین بھی آپ کی کمی محسوس کرتی ہیں' آپ اپنا تبصرہ جلد بھجوائیں تو ضرور شامل ہو گا۔ حسب روایت آپ نے بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

دیا قریشی لکھتی ہیں

سمیرا حمید نے جو یارم میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم یا اور انبیا کے متعلق جو موضوع چھیڑا ہے۔ میری ناقص معلومات میں یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص تھی کہ جسے چاہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا حق معاف کر سکتے تھے اور جب مسلمان غالب آ گئے تھے تو آپؐ نے چند کفار کو قتل کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔ لیکن ان کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ وہ ایمان کی دعوت پر ایمان نہیں لائے۔

اور ایک شکایت یہ بھی کہ پلیز اردو کو اردو کے لہجے میں بولنے کی کوشش کریں نہ کہ ہندی لہجے میں۔ جیسے یارم میں بھی کہ "میں اس کو لے کر بہت پریشان ہوں۔" یہ پاکستانی لہجہ نہیں ہے پاکستانی لہجہ یہ ہے "میں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔"

ایک شعر امرحہ کی طرف سے عالیان کو۔

بدل گیا ہے وہ چاہتوں سے فراز
میری عادتوں کو خراب کر کے

اور بس کیا لکھوں میرا خط بھی عام سا ہے بالکل میری طرح۔

دیا جی! ہمارے لیے آپ بھی خاص ہیں اور آپ کا خط بھی.... بہت اچھا خط لکھا آپ نے۔ سمیرا حمید کے سلسلے میں ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ شاتم رسول صلی اللہ علیہ وسلم واجب القتل ہے اور اس مسئلہ پر دو رائے نہیں ہو سکتیں جہاں تک ہندی لہجہ کی بات کی ہے تو ہم یہی کہیں گے کہ اردو کو محدود نہ کریں۔ اردو کا دامن بہت وسیع ہے۔ اردو نے برصغیر میں جنم لیا اور آج ہندوستان اور پاکستان کے تمام حصوں میں سمجھی جانے والی واحد زبان ہے۔

طاہرہ عندلیب ہم اسلام آباد سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

اب خط لکھنے کی وجہ بلکہ وجوہات دو ہیں۔ پہلی وجہ سمیرا حمید اور عمیرہ احمد ہیں۔ عمیرہ احمد کے ناولوں سے ہٹ کے مزیدار بات یہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ کی طرح ہی بہترین طبیعت کی مالک ہیں۔ مجھ سے فون پہ بات کر کے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی اور پڑھائی پہ توجہ دینے کی تلقین کی۔ سمیرا حمید کی طرف آتی ہوں۔ یہ کہنا کہ وہ میری فیورٹ ہے بالکل آرڈنری لگے گا۔ مجھے عمیرہ احمد کے پیر کامل اور امر بیل اور نمرہ احمد کے "جنت کے پتے" کے بعد سمیرا حمید کا ناول یارم بے انتہا پسند آیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا موضوع روایتی کہانیوں سے ہٹ کے ہے۔ پتا نہیں ہم پودینے کی چٹنی اور پھلکوں اور ابلے چاولوں اور آلو کے سالن اور جھونپڑی اور محلوں سے نکل کیوں نہیں آتے؟ کبھی کبھی بچکانہ چیزیں شامل کرنے اور پڑھنے سے کیا جاتا ہے؟ فکشن ہوتا ہی مبالغہ ہے۔ سمیرا حمید سے ریکوئسٹ ہے کہ اس ناول کو جلدی وائنڈ اپ نہ کریں بلکہ اس کو ذرا طول دیں۔ آج دو دل شکن خبریں ملیں سننے کو کہ ملالہ یوسف زئی کو امن کا نوبل انعام مل گیا ہے۔ اتنا ملال ہوا مجھے نوبل انعام کی اس بے وقعتی پر کہ بیان سے باہر ہے۔ محترمہ ملالہ کا کوئی ایک پراجیکٹ بھی کہیں نمودار ہوا ہو تو پھر جو چور کی سزا وہ ہماری' جس بات کی وہ تبلیغ کرتی پھر رہی ہیں اور انعام پہ انعام بٹور رہی ہیں۔ میں پختون ہونے کے سبب بہت اچھی طرح واقف ہوں اس علاقے کی روایات اور کلچر سے۔ جس کی نفی ملالہ کرتی ہے۔ وہاں کوئی عورتوں پہ کوئی پابندی نہیں۔ میڈیا ایکسپوژر جس کو بھی ملے گا۔ تو UNO کے فلور پہ بینظیر بھٹو کی شال اوڑھ کے کوئی بھی یہی کہے گا کہ میں ہر بچے کے ہاتھ میں قلم اور کتاب دیکھنا چاہتی ہوں۔ ملالہ آپ زمین پہ اتر آئیں اور عملی اقدامات کریں' باتیں نہیں۔ کچھ لوگوں نے تو بیان داغا کہ ملالہ کی تقریر پہ وہاں موجود ادیب انگشت بدنداں رہ گئے۔ مطلب ملالہ کی تقریر کوئی ادب پارہ تھی؟ یا پھر ادبی ذوق اتنا گھٹیا ہو گیا ہے فرنگیوں کا؟ سمیرا حمید! ایک بار پھر گزارش۔ ناول کو جلدی ختم مت کرنا!

پیاری عندلیب بہت شکریہ آپ نے میڈیکل کی مشکل پڑھائی سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھا۔ ملالہ یوسف زئی ہو یا شرمین عبید چنائے۔ بیرونی میڈیا ان ہی پر نظر کرم کرتا ہے۔ جنہوں نے مسلمانوں کی کسی خامی یا کمزوری کو اجاگر کیا ہو۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنا کردار ایسا رکھیں کہ وہ ڈھونڈنے کے باوجود کوئی خامی نہ تلاش کر سکیں۔ ہم اسلام کے منافی کام کر کے اسلام کا نام خود بدنام کرتے ہیں اور انہیں موقع مل جاتا ہے۔ ہمیں اپنی کمزوریاں خامیاں دور کرنے پر توجہ دینی چاہیے۔

آپ نے ادارے میں فون کیا تھا۔ ہمیں یاد نہیں کہ کیا بات ہوئی تھی۔ آپ آئندہ خط میں اپنا فون نمبر بھجوا دیں ہم خود آپ کو فون کر لیں گے۔ آپ کی شکایت رفع ہو جائے گی۔

سمیرا حمید یہ ناول ختم ہونے کے بعد اگلا ناول لکھنے کا ارادہ رکھتی ہیں' اس لیے اس ناول کے ختم ہونے پر آپ اداس نہ ہوں۔ آپ کی اس بات سے ہم بھی متفق ہیں کہ کہانیاں ہلکی پھلکی خوشگوار ہونا چاہییں۔

فوزیہ نورین نے تحصیل سرائے عالمگیر ضلع گجرات سے لکھا ہے

آپ کی ہر چیز زبردست ہوتی ہے اور ہم کو اتنا سیکھنے کا موقع ملتا ہے کہ شاید ہی ویسے سیکھ سکیں۔ "ایک تھی مثال" تو بہت ہی لاجواب ہے۔ رخسانہ نگار عدنان، بہت اچھا بلکہ بہت ہی زیادہ اچھا لکھتی ہیں۔ یارم نے تو مجھے بھی قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ سمیرا حمید آپ کا جواب نہیں۔ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے کھانے پکانے کا سلسلہ بہت پسند ہے۔

پیاری فوزیہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید، ہمیں بہت خوشی ہوئی آپ نے خط لکھا، شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

اصباح منہاس ڈیرہ غازی سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

دو مہینے بعد خط لکھ رہی ہوں کیونکہ میں ایڈمیشن کی ٹینشن میں تھی۔ لیکن پھر بھی میرا B.Z.U میں ایڈمیشن نہیں ہو سکا .... (ہائے افسوس) خیر میرا ایڈمیشن غازی یونیورسٹی میں ہو گیا ہے۔ غازی یونیورسٹی جنوبی پنجاب کی دوسری یونیورسٹی ہے، اس میں پڑھنے والے ہم پہلے اسٹوڈنٹس ہیں۔ اس سے پہلے ڈیرہ غازی خان میں میڈیکل کالج بھی بن گیا ہے۔

اب آتے ہیں دسمبر کے شعاع کی طرف۔ ٹائٹل اچھا لگا لیکن سردیوں والی بات نہیں ملی۔ رقص بسمل کو نہ پاکر تھوڑی تشویش ہوئی کیونکہ اسٹوری جتنی بھی سلو ہے بہرحال اچھی بھی ہے۔

"ایک تھی مثال" پڑھ کے اچھا لگا۔ اچھی اسٹوری ہے۔ "یارم" کی تو بات ہی اور ہے۔ بس اب جلدی سے امرحہ اور عالیان مل جائیں .... بیوٹی بکس میں بالوں کے بارے میں ماسک پڑھے۔ اچھے تھے ان میں ایک، دو میں ضرور ٹرائی کروں گی۔

تاریخ کے جھروکے پڑھا۔ یہ بھی اچھی اسٹوری ہے عورت کے حوالے سے مطلب جس طرح رضیہ سلطانہ کا کردار تھا نا اور ان کی زندگی اس لحاظ سے اچھی اسٹوری تھی۔

اس بار سلیم احمد کی غزل مجھے بہت بہت اچھی لگی۔ ویسے شاعری میں زیادہ انٹرسٹ نہیں ہے مگر یہ غزل مجھے اچھی لگی۔

حمد اور نعت ویسے ہی اچھے ہوتے ہیں اس بار کی طرح مجھے بہت پسند آئی۔

اصباح! سب سے پہلے تو مبارک باد۔ آپ کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل گیا اور آپ اس کی پہلی طالب علم ہیں۔ ڈیرہ غازی میں میڈیکل کالج کھل گیا۔ یہ واقعی بہت خوشی کی بات ہے۔ اس ماہ کا ٹائٹل ہم نے سردیوں کے لحاظ سے دیا ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شاہدرہ سے دیا آفرین نے لکھا ہے

"ایک تھی مثال" دوسری قسط پڑھی تو سوچا تھا کہ بہت اچھا ناول جائے گا مگر اب تو ہر قسط پڑھنے کے بعد لگتا ہے۔ کچھ غلط ہی ہو گا۔ معذرت! دوسرے نمبر پر "رقص بسمل" کی طرف آئیں تو نبیلہ عزیز کے انداز کی تو میں دیوانی ہوں۔ کیا کردار تخلیق کرتی ہیں۔ نبیلہ جی! حقیقت میں لوگ ایسے ہوتے ہیں کیا؟ "تاریخ کے جھروکوں سے" سلسلہ بے حد خوب صورت ہے میرا خیال ہے، جس کو دلچسپی نہ بھی ہو، وہ بھی ضرور پڑھے گا اور (ہم تو تاریخ کے طالب علم ہیں) کہیں تو اپنی کہانیاں بھیجوں؟

پیاری دیا! رخسانہ نگار کا ناول عام ناولوں سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں ایک معاشرتی مسئلہ کے بارے میں، اس کی قباحتوں کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ آپ جو کہانیاں لکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور لکھیں خواہ مزاحیہ ہوں یا سنجیدہ، موضوع کی قید نہیں ہے۔

سبط الرحمٰن نے ماچھیوال گاؤں سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شعاع میرا موسٹ فیورٹ رسالہ ہے اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

جمع تم ہو نہیں سکتے، نفی سے مجھے نفرت ہے
تقسیم میں کر نہیں سکتی کیونکہ ضرب دل پہ لگتی ہے

پیاری سبط! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سمیعہ شاہ نواز خان نے نور کوٹ سے لکھا ہے

ویسے تو میں آپ کے تینوں رسالے ہی بڑے شوق سے پڑھتی ہوں لیکن شعاع میرا سب سے فیورٹ ہے اس میں حمد، نعت، احادیث نبوی، مسکراہٹیں اور ناول۔

پیاری سمیعہ! آپ نے یہ سوچ کر تبصرہ نہیں کیا کہ کون سا شائع ہونا ہے۔ اب آپ کا خط شامل اشاعت ہے۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

رابعہ تبسم ککو منڈی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل زبردست ہے مہندی لگے ہاتھوں کے ساتھ ماڈل اچھی لگ رہی ہے۔

ایک تھی مثال بہت اچھی قسط تھی اس دفعہ۔ اور مجھے لگتا ہے کہ پری کی مما کامیاب ہو جائیں گی پری کو فہد کی دلہن بنانے میں اور رہی بات یارم کی تو اس کی تعریف کے لیے تو میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں امرحہ اور عالیان دونوں میرے فیورٹ کردار ہیں۔ کیف غزنوی سے ملاقات اچھی رہی۔ رقص بسمل کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نبیلہ عزیز کو صحت و تندرستی دیں۔

پیاری رابعہ! نبیلہ عزیز کافی عرصے سے حالات کے گرداب میں الجھی ہوئی ہیں۔ ہم اپنی تمام قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نبیلہ کے لیے ان کی خوشیوں کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانیاں پیدا کرے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سعدی گل تکو سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

دسمبر کا شمارہ ہزار جتن کر کے حاصل ہوا۔ سب سے پہلے خطوط پر نگاہ دوڑائی۔ سرد آہ بھرتے ہوئے اطمینان کیا کہ ہمارا نام خطوط میں شامل نہیں۔ امید کی ہلکی سی روشنی پہ نظم و غزل کا صفحہ کھولا مایوسی ہوئی اور اسی مایوسی کے عالم پڑھ لیں اجمل سراج کی غزل بہت پسند آئی۔ اسی دل افسردہ کے ساتھ کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ بھی پڑھ ڈالا اور بیٹھے بیٹھے یارم کی قسط پڑھ لی۔ وہی محبتوں کے دکھ اور کرب لیے، پالینے کی امید اور کھودینے کا خوف لیے، زندگی کی حقیقتوں اور تھوڑا سا خیالی پن لیے خوشنما اور دلفریب تحریر۔ ایمل رضا کا چور عورت پڑھا اچھا لگا۔ ایک تھی مثال تو انڈین سوپ کی طرح بہت سست روی اور بغیر کسی تجسس کے آگے بڑھ رہا تھا۔ اب تھوڑا بہتر ہوتا نظر آتا ہے کیف غزنوی کا بولڈ اور ڈرامائی سچویشن والا انٹرویو بھی پسند آیا۔ نعت اور حمد تو بہت ہی بہترین ہیں۔

پیاری سعدی! خط آپ کے دیکھ کر آپ افسردہ ہوئیں اس کا ہمیں بہت افسوس ہے۔ اب خوش ہو جائیں۔ آپ کا خط شامل ہے۔ آپ کی تحریریں ابھی پڑھی نہیں گئیں۔ اطمینان رکھیں قابل اشاعت ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

نازیہ خالد ڈھوک چراغ دین راولپنڈی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

دسمبر کا شعاع ملا۔ ٹائٹل پہ اجاگر خوب صورت علینہ کو دیکھ کے سب کچھ فریش لگا۔ ڈائجسٹ کھولا تو یہ کیا "رقص بسمل" غائب۔ اللہ آپ کو جلد صحت دے نبیلہ جی تاکہ آپ اس جیسے اچھے ناول مزید لکھ سکیں "یارم" انٹرسٹنگ تھا لیکن کچھ ادھورا پن محسوس ہوا۔ بالوں کی سردیوں میں حفاظت دیکھ کے بہت خوشی ہوئی کیونکہ آج کل بال کافی خراب ہو گئے ہیں۔ موسم کے پکوان بہت زبردست تھے۔ نادیہ احمد کا "تیرے قول و قرار سے پہلے" پڑھ کے دل خوش ہو گیا۔ نہایت دلچسپ ناول تھا۔ قرۃ العین کا "رحمت" میں بیٹیوں کو اہمیت دینے کا احساس بہت ہی اچھا لگا "کوئلہ" میمونہ صدف کی کہانی سے بہت اچھا سبق ملا "بند دروازہ" میں سدرۃ المنتہیٰ نے کمال کیا ہے۔ اینڈ بس نارمل ہے۔ لیکن اسے پڑھنا اچھا لگا۔ "چور عورت" خاص نہیں تھا۔ عائشہ ناز علی نے بھی کمال لکھا ہے۔ کیا ان کی یہ پہلی کہانی ہے؟ "سعدیہ رئیس نے ہمیشہ کی طرح شارٹ مگر سبق آموز انٹرسٹنگ کہانی لکھی۔

پیاری نازیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ عائشہ ناز علی کی یہ پہلی کہانی نہیں تھی، وہ اس سے پہلے بھی ناول اور کہانیاں لکھ چکی ہیں۔

حمیرا نوشین نے منڈی بہاؤالدین سے لکھا ہے

"حمد و نعت" اور پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیضیاب ہونے کے بعد کیف غزنوی کا انٹرویو پڑھا جو کہ عجیب و غریب حقیقتیں لیے ہوئے تھا اور کسی دلچسپ افسانے سے کسی طور کم نہ تھا۔ میمونہ صدف اور قرۃ العین رائے نے کچھ زیادہ ہی پرانے اور بارہا لکھے ہوئے موضوع کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا بہرحال انداز تحریر اچھا تھا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی تحریر کافی جاندار تھی سدرہ کے لکھنے کا انداز

ان کی مقبولیت میں یقیناً "اضافے کا باعث بن رہا ہے۔

"خط آپ کے" میں ایک قاری بہن نے کہانی کے بارے میں پوچھا تھا تو میں اس کہانی کے بارے میں جانتی ہوں، یہ عمیرہ احمد کی کہانی تھی جب عمیرہ نے لکھنے کا آغاز کیا تھا "بس اک داغ ندامت" کہانی کا نام تھا۔

پیاری حمیرا! آپ کا افسانہ "مما" شامل اشاعت ہے۔ بقیہ دو افسانوں کے بارے میں ابھی فیصلہ نہیں کیا۔ آپ میں صلاحیت ہے۔ مزید لکھیں۔

آپ نے تو نہ صرف کہانی کا نام بتادیا بلکہ اس کے جملے تک آپ کو یاد ہیں۔ آپ کی یادداشت کے معترف ہیں۔ شعاع پر تبصرے کے لیے شکریہ

مدیحہ جاوید سرگودھا سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

دسمبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ ٹائٹل گرل کا لباس، جیولری اور میک اپ بہت پسند آیا۔ "یارم" میری ہارٹ فیورٹ تحریر، کارل میرا پسندیدہ کردار، مجھے پہلے لگا وہ سیاہ فام ہو گا، مگر یہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہ انتہائی خوب صورت نوجوان ہے۔ بہت خوشی ہوئی جان کر۔ امرحہ کی جلد باز اور جذباتی طبیعت کبھی کبھی اچھی نہیں لگتی اور ویرا کو بیچ میں نہیں آنا چاہیے۔ "ایک تھی مثال" بے حد سلو جارہا ہے، پلیز اس کے صفحات بڑھائیں۔ تمام افسانے بہت پسند آئے تیرے قول و قرار سے پہلے ایک اچھی تحریر تھی۔ احمر کا کردار اچھا لگا "زندگی اک کہانی" میں صحافت کو بہت اچھے طریقے سے بیان کیا گیا ہے۔ "بند دروازہ" میں ہاجرہ نے بہت ہمت دکھائی۔ اچھی تحریر تھی یہ بھی۔ میری دوست وجیہہ یوسف بھی بہت شوق سے شعاع پڑھتی ہے۔ میرے ابو جی بہت اچھے ہیں۔ شعاع پڑھنے سے منع نہیں کرتے۔ مجھے یہ شوق اپنی پھپھو سے وراثت میں ملا ہے پھپھو کو بھی بہت شوق تھا رسالے اکٹھے کرنے کا۔ ان کے پاس بھی کافی ذخیرہ ہے۔

اب آخر میں فواد خان کے انٹرویو کی فرمائش کرتی ہوں، امید ہے پوری کی جائے گی۔

پیاری مدیحہ! آپ کے ابو جی بہت اچھے ہیں، وہ آپ کے شوق پر پابندی نہیں لگاتے، آپ بھی ان کا خیال رکھا کریں۔ اپنی دوست وجیہہ یوسف کو ہماری طرف سے شکریہ کہہ دیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

اقرا ملک گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں

نبیلہ عزیز کو نہ پاکر مایوسی ہوئی۔ اللہ ان کو ان کی بیٹی اور پھوپھو کو صحت عطا فرمائے (آمین) "ایک تھی مثال" رخسانہ جی آپ بہت ظلم کررہی ہیں مثال پر

عمارہ جی! آپ کے گاؤں میں آکر بہت خوشی ہوئی، اتنا اچھا تبصرہ۔ دل تو کرتا ہے۔ آپ سے دوستی ہوجائے۔ جڑی بوٹی کی بات کروں تو کیا ایسی کوئی جڑی بوٹی ہے۔ جس سے وزن کم ہو اور کمر کی ہڈی صحیح ہو (اب بتاؤ بچو) ویسے میرا گاؤں بھی ایسا ہی ہے جہاں میں ہر سال جاتی ہوں۔ پاکستان کے گاؤں، دیہات دنیا میں کہیں نہیں ملتے، نہ ملیں گے۔

پیاری اقرا! ہم آپ سے متفق ہیں۔ پاکستان کا چپہ چپہ خوب صورت ہے، یہاں کے لوگ بھی بہت اچھے، ذہین، محنتی، خوددار، جفاکش اور قناعت پسند لیکن کیا کریں کہ کچھ لوگ ہمیں چین سے جینے نہیں دیتے۔ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان پاکستان دشمنوں سے محفوظ رکھے۔ جو بظاہر پاکستانی ہیں شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سمیعہ سحر قریشی ضلع بھاول نگر سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس بار ٹائٹل بہت ہی زبردست تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرے پاس بہت سارے رسالے ہوں اور میں ان کے درمیان بیٹھی ہوں۔ میں عید کے سروے میں شامل ہوئی۔ لیکن میرے بھائی نے پوسٹ ہی نہیں کیا۔ اب کیا کروں۔ اس بار بھی پورا شعاع لاجواب، بہت ہی اعلا اور مکمل ناول بہت ہی اچھے لگے۔ بندھن میں کیف غزنوی کے ساتھ ملاقات اچھی لگی اور یہ آسیہ رزاقی تو ہماری رائٹر ہیں۔ افسانے بھی بہت زبردست رحمت اور چور عورت بھی اچھے لگے۔

جی سمیعہ! آسیہ رزاقی رائٹر ہیں، انہوں نے شادی کا احوال لکھا تھا۔ عید سروے بھائی نے پوسٹ نہیں کیا تو کوئی بات نہیں، شعاع میں مختلف مواقع پر ہم سروے کرتے رہتے ہیں، آپ آئندہ کسی سروے میں شامل ہو جائیے گا۔

رقیہ سیف الرحمان نے یزمان سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

شعاع کا دسمبر کا شمارہ 2 تاریخ کو ملا اور ملتے ہی ہم نے ایک تھی مثال پہ چھلانگ لگائی، بے چاری مثال۔ ٹائٹل لاجواب تھا۔ اپریل میں میری شادی ہوئی۔ پہلے میں رقیہ اسماعیل کے نام سے دو تین دفعہ شامل ہوئی تھی۔ شوہر منع نہیں کرتے لیکن اپنی موجودگی میں ڈائجسٹ کی طرف توجہ برداشت بھی نہیں کرتے۔ اس لیے میں ان کی خوشی کی وجہ سے ان کی غیر موجودگی میں ہی ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتی ہوں سمیرا حمید "یارم" کو بہت اچھے طریقے سے آگے بڑھا رہی ہیں۔ نبیلہ عزیز کی کہانی بس سو سو ہے۔ شعاع اور خواتین کی کہانیوں نے مجھے جینے کا سلیقہ سکھایا ہے آج جب سسرال میں بھی اور دوست احباب اور شوہر بھی مجھ سے بے انتہا خوش ہیں۔ حتیٰ کہ میرے بڑے بھائی جان جو کم ہی کسی کو ستائش کے الفاظ بخشتے ہیں، انہوں نے بھی میری سمجھ داری اور خوش مزاجی کو ان ڈائجسٹوں کا نتیجہ کہا ہے۔ ثمینہ اکرم، حرا قریشی اور مسکان قریشی آپ لوگ ہمیشہ شامل رہا کریں۔ آپ سے دلی انسیت محسوس ہوتی ہے۔ ایک اور بات ان بہنوں کے لیے جو تبصرے کے وقت صرف تنقید کے پہلو کو مد نظر رکھتی ہیں ان سے گزارش ہے کہ اگر آپ لوگ تعریف نہیں کرسکتیں تو برائے مہربانی تنقید بھی مت کیا کریں اور آپ بھی ایسے خطوط کے کرارے سے جوابات دیا کریں یہ کیا بھئی کہ آپ میٹھے میٹھے ہی جواب دیتی ہیں کسی کو برا لگے تو معذرت۔ میں ایسی ہی دو ٹوک لڑکی ہوں۔

پیاری رقیہ! نئی زندگی کے آغاز پر مبارک باد اور دعائیں زندگی کا یہ موڑ آپ کے لیے خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

یہ آپ کی سمجھ داری ہے کہ آپ اپنے شوہر کی خوشی کا خیال رکھتی ہیں اور اپنا شوق ان کی غیر موجودگی میں پورا کرتی ہیں تنقید اور تعریف تو ہماری قارئین کا حق ہے۔ اس معاملے میں ہم آپ سے متفق نہیں۔ یہ آپ کی محبت ہے کہ آپ شعاع پر تنقید برداشت نہیں کرپاتیں لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ تنقید کے باوجود وہ ہر ماہ شعاع پڑھتی ہیں، اپنے قیمتی وقت سے وقت نکال کر ہمیں خط لکھتی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ وہ شعاع سے بہت اچھی توقعات رکھتی ہیں اور اسے مزید بہتر اور مزید اچھا دیکھنا چاہتی ہیں اور یہ بھی سچ ہے کہ اس محفل میں سب کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق ہے اور ہم سب کی رائے کا احترام کرتے ہیں۔

ازکیٰ عبدالخالق نے نارنگ منڈی سے لکھا ہے

میں پہلی بار کسی رسالے میں خط لکھ رہی ہوں۔ تینوں ڈائجسٹ تنہائی بانٹنے کا بہترین مصرف ہیں۔ میرے پسندیدہ ترین ناول "دیمک زدہ محبت" اور "دل کے راستے دشوار بہت تھے" ہیں۔ شعاع مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ "رقص بسمل" بہت زبردست ناول ہے۔ جو بہت عمدہ طریقے سے آگے بڑھ رہا ہے۔

پیاری ازکیٰ! آپ کی کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

ثوبیہ نور کشن گڑھ بھاول نگر سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

یہ بھی ایک بن کہا اصول ہے کہ جو منگوائے گا وہ ہی پہلے پڑھے گا اس دفعہ سمیرا باجی نے منگوایا ہے لیکن ہماری بے چین فطرت کہ سرسری نظر ڈالنے کو چند گھنٹوں کے لیے مانگ ہی لیا۔ ابتدائی اور آخری صفحات کی تفصیل سے ورق گردانی کی۔ پھر سب سے پہلے "ایک تھی مثال" کی باری آئی۔ غریب ہر دفعہ کسی نئے المیے سے ہی دوچار ہوتی ہے اور اس دفعہ تو جیتا جاگتا المیہ آن ٹکا ہے۔ جبکہ اس کی دلچسپی کا ایک باب زندگی میں آنے ہی لگا تھا تو.... بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ۔

آواز دے کر زندگی ہر بار چھپ گئی
اور ہم ایسے سادہ دل کہ ہر بار آگئے

پلیز رخسانہ جی! بہت دکھ جھیل لیے مثال نے۔ اب کچھ آسانیاں ہونی چاہئیں نا۔

یارم میں شادی کی تقریبات چل رہی ہیں۔ مشہور و معروف ہستی کی یونیورسٹی آمد پر بھرپور پذیرائی (امام کے پیچھے اللہ اکبر) والی صورت حال مزا دے گئی۔ اور یہ امرحہ کے ساتھ کیا مسئلہ ہے کہ تعلق بنانا بھی نہیں اور توڑنا بھی نہیں۔

مطلب "وہ ملے تو نہ ملوں نہ ملے تو ملنے کی جستجو کروں"

ٹھیک ہے معذرت بنتی ہے بلکہ بہت زیادہ بنتی ہے مگر یہ کیا کہ ہر وقت پیچھے پیچھے اور وہ بھی معذرت کے لیے نہیں بلکہ دوستی کے لیے؟ چہ معنی دارد؟

عزت نفس بھی کوئی چیز ہے یار۔ پلیز سمیرا اس پر دھیان دیں۔ ہاں البتہ انداز تحریر ایسا ہے کہ بندہ پڑھتا جائے اور سیر نہ ہو زبردست۔

پیاری ثوبیہ! سب سے پہلی بات آپ نے بہت اچھا خط لکھا۔ آپ کی کہانیاں بھی پڑھی نہیں ہیں اپنا فون نمبر بھجوادیں۔ امرحہ کا کردار آپ سمجھ نہیں پائیں' اس کا مسئلہ معذرت ہے نہ دوستی بلکہ وہ عالیان کو کھونے کا دکھ سہ نہیں پا رہی ہے۔ عزت نفس کی بات تو ٹھیک ہے لیکن امرحہ نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے عزت نفس مجروح ہوتی ہو' بلکہ اس نے عالیان کی عزت نفس کو مجروح کیا ہے ایک ایسے شخص کو تکلیف دی جو اس کے ساتھ مخلص تھا۔ اس کا دوست تھا۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

کائنات اصغر بوزدار نے ڈہرکی سے لکھا ہے

فہرست میں چار ناولز دیکھ کر دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا مگر دل سے خوش نہ ہو سکی کیونکہ اس خوشی پہ ایگزامز کی فکر حاوی تھی' میرے بی ایس سی کے پیپرز ہو رہے ہیں۔ میں یہ خط دو باتوں کی وجہ سے لکھ رہی ہوں ایک تو سیدہ مقدس گیلانی نے جس ناول کے بارے میں پوچھا' وہ ناول دراصل عمیرہ احمد کا "بس اک داغ ندامت" ہے۔ عمارہ رفیق کا گاؤں گھوم کر (تصوراتی طور پر) مزہ آیا۔ کاش! میں بھی کسی ایسے علاقے میں رہ رہی ہوتی' یا میرا آبائی گاؤں اتنے خوب صورت مناظر اپنے اندر سموئے رکھتا۔ اے کاش! میں بھی وادی سوات کی پہاڑیوں سے بہتے آبشاروں کا صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے کے وقت نظارہ کر سکتی۔ میں یہ خواہش کیوں کر رہی ہوں۔ کبھی اس بات پر خط لکھوں گی۔ ان شاء اللہ یارم کو مختصر طور پر دیکھا (پڑھا) نہیں۔ اتنا زبردست ناول.... یہ ناول اچھا بھی ہے اور حقیقت سے دور بھی' پھر بھی اچھا ہے۔ کیونکہ اس ناول میں عالیان ہے (میں پڑھ اس ناول کو رہی ہوتی ہوں اور تصور میں ترکی کا ڈرامہ فریحہ چل رہا ہوتا ہے اور عالیان عامر کی شکل میں گھومنے لگتا ہے۔ جی ہاں مانچسٹر کے بجائے وہ استنبول یونیورسٹی ہوتا ہے اور اس ڈرامے میں جتنے بھی کردار ہیں تو وہ امرحہ' فریحہ' عالیان' عامر' ویرا' ہاندے' اور کارل' کورائے) میری نظر میں۔ ضروری نہیں سب قاری بہنیں مجھ سے متفق ہوں۔

کائنات! آپ نے کہانی کا نام اور مصنف کا نام بتا دیا' ہماری کئی قارئین نے اس کہانی کو پہچان لیا ہے۔ ہم اپنی قارئین کی یادداشت کی داد دیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ صرف ایک سطر سے ہی کہانی اور مصنف کا نام بتا دیتی ہیں۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

آئینہ بچہ فرام بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی' ملتان سے لکھتی ہیں

لاسٹ ایئر ہم نومبر میں تھے' اس سال نومبر کے شمارے پر تبصرہ کے ساتھ پچھلا سال بیت گیا اور بڑی مشکل سے بیتا' سارے زندگی کے خواب' امنگیں' خواہشیں' ہمراہ لے گیا۔ آئینہ کو آئینہ میں بہت کچھ واضح دکھا گیا۔ خیر جی ہم MBBS کے خواب دیکھتے بی بی اے میں پہنچ گئے۔ چلو جی خیر ہے دنیا میں کون سا ڈاکٹروں کی کمی ہے اور پھر بی بی اے تو ہم ابھی بھی کر رہے ہیں۔ بس اسی وجہ سے شعاع سے ناتا ٹوٹ گیا تھا' دل بھی ٹوٹ گیا تھا اب دل کو جوڑ لیا ہے۔

ثوبیہ ڈیر! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے تھا' اب ڈائجسٹ کو کورس کی بکس میں چھپا کر پڑھنے کے بجائے کورس کی بک کے طور پر پڑھ سکیں گی۔ ہاں۔ کیمپس لائف میں ہونے پر دکھڑا بنتا ہے۔ پھر بھی میری طرح کا نہیں کہ دماغ میڈیکل میں' دل لٹریچر میں اور میں منہ اٹھا کر (اب بھلا رکھ کر آتی) IMS میں امن ڈیر! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ بس ایسے ہی کیوٹ سے کام جاری رکھیں۔

پیاری آئینہ! آپ کا خط لیٹ ملا۔ اس لیے نومبر کے شمارے میں شامل نہ ہو سکا۔ ایم بی بی ایس میں داخلہ نہ مل سکا۔ اس پر افسردہ نہ ہوں۔ بی بی اے کی ڈگری بھی کم اہم نہیں ہے۔ ایک بات یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ جو کچھ کرتا ہے وہ ہماری بہتری کے لیے ہی کرتا ہے' ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ آپ کے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔ ان شاء اللہ شعاع پر آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت دلچسپ ہے۔ لیکن آئندہ جلد بھجوائیے گا تاکہ ہم شامل کر سکیں۔

ارم کمال نے فیصل آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت ہی دیدہ زیب اور دلکش تھا۔ پہلی شعاع نے دل کو درد سے بھر دیا۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر اپنی دینی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ کیف غزنوی سے ملاقات بہت یونیک رہی۔ سلسلے وار ناول "ایک تھی مثال" بہت ہی پاور فل جا رہا ہے۔ پلیز کیسے بھی کر کے واثق اور مثال کو ایک کر دیجیے گا۔ "جا کے سسرال گوری" بہت ہی متاثر کن تحریر رہی۔ "دل و نظر کے آئینے" میں ایسی بیٹی کہیں دیکھی نہ سنی جو اپنے امیج کو خراب نہ ہونے کے لیے اپنی ماں سے معافی منگوائے بلکہ بیٹیاں تو اپنی ماں کی آن' بان اور شان کے لیے اپنے گھر بھی داؤ پر لگا دیتی ہیں۔ یہ تو سراسر بیٹی کی خود غرضی ہوئی "زندگی ایک کہانی"

قارئین متوجہ ہوں!

1- ماہنامہ شعاع کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- ماہنامہ شعاع کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ماہنامہ شعاع
37- اردو بازار کراچی

عائشہ ناز علی کا مکمل ناول سو سو تھا بعض دفعہ کہانی کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے سے کہانی کا سارا حسن تباہ ہو جاتا ہے "کوئلہ" نے بہت سوں پر اسرار کے در وا کر دیے ہوں گے سب سے شاندار اور زبردست تحریر ایمل رضا کی "چور عورت" رہی "تیرے قول و قرار سے پہلے" میں یقین نہیں آتا کہ احمر جیسے کول مائنڈ اتنا ٹمپر لوز کیسے کر سکتے ہیں کہ کسی کی پارسائی اور نیک نامی کو کنویں میں پھینک دیں لیکن خیر اچھا رہا "رحمت" نے آکر نعیمہ کی اذیت بھری زندگی کو واقعی رحمتوں سے پر کر دیا "یارم" سمیرا احمید کا شاہکار ناول جو ابتدا سے سپر ڈوپر جا رہا تھا لیکن اب اس میں بے جا طوالت اور تفصیل نے ٹیمپو توڑ دیا ہے۔ اب بوریت محسوس ہونے لگی ہے۔

پیاری ارم! ایک عورت کے لیے سب سے مقدم اپنا گھر اور شوہر ہونا چاہیے۔ اگر اس کا گھر اجڑتا تو سب سے زیادہ دکھ اس کی ماں کو ہی ہوتا ازدواجی زندگی میں شروع میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ صدف آصف نے یہ ہی بتایا ہے۔

صائمہ خلیل.... ملتان

میں نے تو شعاع کو اپنا سمجھا تھا کہ ایک عام سی خواہش کروں گی جس کا جواب آئے گا پیاری صائمہ! ہم آپ کی خوشی کے لیے نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کی تحریریں اب شعاع میں ہی شائع کریں گے۔" لیکن آپ نے تو الٹا مجھے ہی غلط کہہ دیا کہ اگر آپ شعاع لیتی ہیں تو اس میں بھی معیاری تحریریں ہوں گی۔ بھائی میں نے کب کہا کہ شعاع میں معیاری تحریریں نہیں ہوتیں بلکہ خواتین میں ہوتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ میں نے جنوری 2014ء سے شعاع پڑھنا شروع کیا تھا چونکہ میں صرف ایک رسالہ لے سکتی ہوں' میں نے شروع سے شعاع لیا ہے۔ اب میں سلسلے وار ناول چھوڑ کر خواتین تو نہیں لے سکتی نا۔

پیاری صائمہ! آپ اپنی جگہ درست ہیں ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کو ہمارے جواب سے تکلیف پہنچی۔

☼

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

مروت

عمر ثعلبی نے ولید بن عبدالملک کی ہجو کہی۔ ولید نے اسے سزا دینی چاہی۔ وہ دمشق سے بھاگ گیا اور مدت تک کہیں روپوش رہا۔ جب اس چوروں کی سی زندگی سے اکتا گیا تو ناچار دمشق میں واپس آگیا اور ایک دن موقع پاکر ولید کے پاس جا پہنچا۔ ولید کھانا کھا رہا تھا۔ نظر بچاکر دسترخوان پر جا بیٹھا اور کھانے میں شریک ہوگیا۔

جب کھانا بڑھایا جانے لگا اور لوگ اٹھنے لگے تو حاضرین میں سے کسی نے عمر کو پہچان لیا اور ولید کو بتا دیا۔ ولید نے قریب بلایا اور کہا۔ ”بدنصیب! خدا کا شکر ہے کہ میں نے ابھی بدلہ لینے کی قسم نہ کھائی تھی کہ تو ہاتھ آگیا۔“ پھر بولا۔ ”اچھا ذرا میری وہ ہجو تو سنا۔“

عمر کچھ دیر تو انکار کرتا رہا‘ لیکن جب ولید نے بہت مجبور کیا تو اس نے ہجو سنا دی۔ ولید نے کہا۔ ”بھلا بتا تو میں تجھے کیا سزا دوں گا؟“

عمر ثعلبی نے جواب دیا۔ ”میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ آپ کے دسترخوان پر بیٹھ چکا اور آپ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوچکا ہوں۔ اس کے بعد خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کرچکا ہوں‘ مجھے امید ہے آپ مجھے سزا نہ دیں گے۔“

ولید نے کہا۔ ”بے شک! دسترخوان کے حق کے مقابلے میں تیرے گناہ کی کوئی حقیقت نہیں۔“

چنانچہ اس نے نہ صرف عمر کو معاف کیا‘ بلکہ انعام بھی دیا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی کیسا ہی مجرم ہوا گر اس کے دسترخوان پر پہنچ جاتا تھا تو معاف کردیا جاتا تھا۔

تنویر عالم۔۔۔ کراچی

اعتدال

ایک مرتبہ یحییٰ بن الحسین الطائی‘ امیر المومنین مامون کی خدمت میں آیا اور اس کی تعریف کرنے لگا۔ اسی دوران میں نے اس سے کہا کہ میرے حال پر امیر المومنین کی اس قدر عنایتیں اور مہربانیاں ہیں کہ میں نہ تو ان کا شمار کرسکتا ہوں اور نہ ہی بیان کرسکتا ہوں۔

حیران ہوں ان میں سے کون سی حسین عنایت کے چہرے سے پردہ اٹھاؤں؟

اپنی تعریف میں اس قدر مبالغہ آمیز فقرے سن کر مامون نے کہا۔ ”تیرے لیے اتنا مبالغہ اور طوالت بیان مناسب نہیں‘ کیونکہ نعمت کا شکر‘ اس نعمت سے زیادہ ہو تو خوشامد اور چاپلوسی بن جاتا ہے اور کم ہو تو ادا کرنے والے کی ناقابلیت اور بے زبانی کہلاتا ہے۔ لہٰذا مناسب طریقہ یہ ہے کہ نہ تو غلو برتا جائے اور نہ کمی سے کام لیا جائے‘ بلکہ درمیانہ راستہ اختیار کیا جائے۔“

یحییٰ نے کہا۔ ”خدا کی قسم! یہ تعلیم میرے حق میں تمام انعاموں سے زیادہ قیمتی ہے۔“

رضیہ امین۔۔۔ کراچی

دور اندیشی

امیر اسمٰعیل سامانی کے عہد میں ایک بہت دولت مند شخص تھا۔ وہ مرو کے علاقے میں ایک شاہراہ پر رہتا اور مسافروں اور راہ گیروں کی تو اضع کیا کرتا تھا‘ جو راہ گیر نظر آتا‘ وہ اس کی دعوت اپنا فرض سمجھتا‘ اسے مہمان رکھتا اور انعام دے کر رخصت کرتا تھا۔ آس پاس کے علاقے کے لوگ اس کی بخششوں سے تنگ آچکے تھے۔

ان مہمانیوں اور فیاضیوں کا یہ اثر ہوا کہ دور‘ دور تک اس کی شہرت ہوگئی اور مخلوق اس کی سخاوت کے گن گانے لگی۔

جب امیر اسماعیل کو اس عجیب و غریب شخص کے حالات معلوم ہوئے تو اس نے پیغام بھجوایا کہ اگر خدا نے تمہیں دولت بخشی ہے تو اسے مخلوق کو جمع کرکے راستے پر لٹانے کی ضرورت نہیں‘ بہتر یہ ہے کہ راستے سے ہٹ جاؤ اور لوگوں کو جمع نہ کرو‘ بلکہ کسی گوشے میں جاکر سکون سے زندگی گزارو‘ اور اپنے مال و دولت کی حفاظت کرو‘ ورنہ ہماری ناراضی کا باعث ہوگا۔

یہ حکم پہنچا تو وہ شخص راستے سے ہٹ کر کسی اور جگہ جاکر رہنے لگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہی روز میں لوگ اس کی مسافر نوازیوں اور فیاضیوں کے افسانے بھولنے لگے۔

امیر اسماعیل کے مصاحبوں کو تعجب تھا۔ اس نے ایسا حکم کیوں دیا؟ وہ خود ایک نیک اور فیاض بادشاہ تھا اور نیک کاموں میں دل سے حصہ لیتا تھا‘ پھر اس نے ایک شخص کو نیکی کرنے سے کیوں روکا؟

آخر ایک مصاحب نے خلوت میں دریافت کیا تو امیر نے جواب دیا۔ ”بات یہ ہے کہ رعایا میں سے ایک شخص کا شاہراہ پر جا بیٹھنا۔ مسافروں کو کھانا کھلانا اور خیرات کرنا اس شخص کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے‘ ایسا ہر دلعزیز شخص ترقی کرکے عوام کا محبوب بن سکتا ہے اور ایسا ہونے پر کیا عجب ہے کہ اس کے دماغ میں خلل آجائے۔ عوام کی امداد اور فرماں برداری کے بھروسے پر زمینوں کا محاصل دینے سے انکار کردے اور ہمارے ملازموں کی پروا نہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ہم اسے سزا دیں اور رعایا اس کی نیکیوں کی وجہ سے اس سزا کو ظلم اور ہمیں ظالم سمجھنے لگے۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ ہوشیاری اور تدبیر سے کام لے کر اس فساد کا سرچشمہ ہی بند کردیا جائے۔ اس لیے اسے مہمان داری اور بخشش سے منع کردیا گیا‘ تاکہ چین سے گھر بیٹھ جائے‘ نہ خود مصیبت میں پھنسے نہ ہمیں فکر میں مبتلا کرے۔“

بچپن میں خلافت کا کھیل

خلیفہ منصور کے بھتیجے محمد بن ابراہیم امام کا بیان ہے کہ میں محمد بن علی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم کے فرزندوں کے ساتھ ہر جمعے کو منصور کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہاں مہدی کے بیٹے اور منصور کے پوتے موسیٰ اور ہارون بھی آیا کرتے تھے اور ہم سب اس کو ہفتے بھر کا آموختہ‘ جس میں ادب‘ لغت‘ نحو اعراب اور اشعار سب ہی کچھ شامل ہوتا تھا‘ سنایا کرتے تھے۔ اس روز کھانا بھی منصور کے ساتھ کھاتے تھے۔ کھانے کے بعد دس دس پانچ پانچ درہم سب کو انعام ملتا تھا۔

ایک جمعے کا ذکر ہے کہ ہم سب حاضر تھے۔ دسترخوان بچھا۔ بھنا ہوا برہ اور تنور سے تازہ تازہ نکلی ہوئی گرم گرم اور نرم نرم روغنی خمیری روٹیوں کے ساتھ قسم قسم کے اچار بھی لائے گئے۔

منصور نے۔ اچار کا ایک نوالہ لیا تو اس قدر تیز تھا کہ اس کا منہ جل گیا۔ ہماری طرف دیکھ کر بولا۔ ”تم میں سے کوئی یہ سارا اچار کھالے تو ایک ہزار درہم دوں گا۔“

منصور نے عنترہ خادم سے کہا کہ ہارون کو ایک ہزار درہم دے دے۔ عنترہ نے ہزار درہم لاکر اسے دے دیے تو منصور نے ہارون سے کہا ”بیٹا! جاؤ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ کھیلو۔“

یہ سن کر ہارون ہمیں ساتھ لے کر خلیفہ کے سامنے سے چلا گیا اور ہم سب کھیلنے لگے۔ کھیلتے کھیلتے ایک آڑ کی جگہ پہنچے تو ہارون ایک طرف بیٹھ گیا اور ہم سے بولا۔

”میں خلیفہ بنتا ہوں‘ تم سب میرے ہاتھ پر بیعت کرو تاکہ میں تمہیں انعام دوں۔“

ہم سب نے اس کی بیعت کی۔ پھر اس نے مجھے

مخاطب کر کے کہا "جاؤ تمہیں یمن اور بحرین کا والی مقرر کیا گیا۔ عیسیٰ جعفر سے کہا "جاؤ تمہیں بصرے کی ولایت سپرد کی جاتی ہے۔"

پھر فضل بن ربیع سے بولا "خزانے میں جاؤ اور علم لے کر آؤ!"

فضل آہستہ آہستہ ایک طرف چلا تو ہارون نے ڈانٹ کر کہا "یا فضل! یہ چال حاجیوں کی نہیں، وزیروں کی ہے۔ ذرا تیزی سے کام لو۔" اتفاق کی بات کہ عنترہ خادم کہیں چھپا ہوا ہارون کا یہ کھیل دیکھ رہا تھا۔ اس نے خلیفہ منصور سے جا کر کہا کہ "یا امیر المومنین! آپ کا پوتا ہارون خلیفہ بن گیا اور اس کے ساتھیوں نے اس کی بیعت قبول کر لی۔ ولایتیں بانٹ دی گئیں۔ علم بندی کر دی گئی اور بیعت کے شکرانے کا روپیہ تقسیم ہو چکا۔ غرض خلافت کا کوئی کام ایسا نہیں جس کا انتظام نہ ہو چکا ہو۔"

یہ سن کر منصور بہت ہنسا۔ ہمارا تماشا دیکھنے کے لیے باہر نکل آیا اور کسی پوشیدہ جگہ سے خلافت کا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ جب ضبط نہ ہوا تو ہمارے پاس آ گیا اور ہارون کو گود میں اٹھا کر اس کا سر اور منہ چومنے لگا۔ پھر بولا "جان پدر تو ایک دن واقعی خلیفہ بنے گا اور تیرے یہی ہم جولی تیرے مصاحب اور امیر ہوں گے۔ تیری خدمت کریں گے اور تیری ذات سے فیض یاب ہوں گے۔"

محمد بن ابراہیم امام کہتا ہے کہ جب ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید خلیفہ ہوا تو مجھے اس نے سچ مچ یمن اور بحرین کا والی مقرر کیا!

حکمرانی کے لائق

ہلاکو نے بغداد کو تاراج کر لیا تھا.... خون مسلم ایسا ارزاں ہوا تھا کہ تاتاری فوج کے گھوڑوں کے سم خون میں ڈوب گئے تھے.... مسجدوں کو اصطبل بنا دیا گیا تھا.... کتب خانے جلا دیے گئے تھے، وحشت اور درندگی کا راج قائم کر دیا گیا تھا.... اس لیے کہ امت مسلمہ خرافات میں کھو گئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب ہلاکو کی فوج بغداد میں داخل ہو رہی تھی تو بغداد کے اہل علم میں کوتے کے حلال و حرام پر بحث جاری تھی....

ہلاکو کی بیٹی مفتوحہ بغداد کے کوچہ بازار میں نکلی تو ایک جگہ اس نے عوام کا ہجوم دیکھا.... معلوم ہوا ایک عالم لوگوں سے مخاطب ہے.... ہلاکو کی بیٹی نے گفتگو کے اختتام کا انتظار کیا.... اس عالم دین کو اپنے پاس بلایا اور سوال کیا۔

"یہ بتاؤ کہ حکمران ہونے کے ۔ لائق ہم ہیں یا تم ؟"

جواب دیا گیا "بے شک آپ اسی لیے تو آپ حکمران ہیں۔"

"تو پھر یہ بتاؤ ہمارا دین (نظام زندگی) بہتر ہوا یا تمہارا ؟"

"دین تو ہمارا ہی بہتر ہے...." جواب دیا گیا۔ "یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کے تقاضے پورے نہیں کر رہے تھے۔ جس کی ہمیں سزا ملی ہے.... اب آپ آ گئے ہیں ہماری سزا مکمل ہو جائے گی... پھر ہم غالب آ جائیں گے۔"

"وہ کیسے؟" ہلاکو کی بیٹی نے پوچھا۔

"آپ نے کبھی کسی چرواہے کو اپنا ریوڑ سنبھالتے دیکھا ہے۔" عالم نے سوال کیا....

"ہاں، ہاں!" ہلاکو کی بیٹی نے جواب دیا۔

"آپ نے دیکھا ہو گا...." عالم نے کہا۔ "جب ریوڑ چرواہے کی نہیں سنتا.... بے قابو ہونے لگتا ہے تو چرواہا اپنے کتوں کو اشارہ کرتا ہے... وہ ریوڑ سے بچھڑنے والے جانوروں کا پیچھا کرتے ہیں.... انہیں زخمی کر دیتے ہیں انہیں تھکا مارتے ہیں یہاں تک کہ انہیں واپس ریوڑ میں لے آتے ہیں۔ جب ریوڑ منظم ہو جاتا ہے تو کتوں کا کام ختم ہو جاتا ہے۔"

اہل بغداد کی سمجھ میں یہ بات آ گئی.... اور جب ان کو عقل آئی تو سرکش اور وحشی تاتاریوں کو دین کا شعور عطا کیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ یورش تار تار.... رحمت الٰہی بن گئی.... تاتاریوں کو تائید ایزدی حاصل ہوئی تو کعبہ کو صنم خانے سے پاسبان مل گئے۔

☆

خالدہ جیلانی

اچاری بریانی

اجزا :

گوشت	ایک کلو
دہی	ایک پاؤ
چاول	آدھا کلو
پیاز، ٹماٹر	پانچ عدد
لیموں	دو عدد
لہسن ادرک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
اچاری بریانی مسالا	چھ چائے کے چمچے
نمک، تیل	حسب ذائقہ

ترکیب :

باریک کٹی ہوئی پیاز میں سے آدھی پیاز نکال کر رکھ لیں اور باقی پیاز کو گرم تیل میں سنہری ہونے تک فرائی کریں۔ اس کے بعد پیاز کو تیل سے نکالیں اور پھیلا کر رکھ دیں۔ اب اسی تیل میں بچی ہوئی پیاز شامل کریں اور بادامی ہونے پر اس میں گوشت اور ادرک لہسن پیسٹ شامل کر کے بھونیں۔ پھر گوشت میں پانی کٹے ہوئے ٹماٹر، دہی اور اچاری بریانی مسالا (ثابت دھنیا، زیرہ، سونف، رائی) شامل کر کے گلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے اور تیل اوپر آ جائے تو اس میں ثابت ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور پودینہ شامل کر کے چولہے سے نیچے اتار لیں۔ چاول ابالیں اور ایک کنی رہ جانے پر اتار لیں۔ پانی نتھار کر چاولوں کو ایک طرف رکھ دیں۔ الگ پتیلی میں سالن اور چاول کی دو تہیں لگا کر اوپر سے زردے کا رنگ ڈالیں اور پھر دم پر رکھ دیں۔ سلاد اور رائتے کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

سبزیوں کے کٹلٹس

اجزا :

آلو	دو عدد
مختلف سبزیاں	تین کپ
ثابت دھنیا، لال مرچ	ایک ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
انڈے	دو عدد
بریڈ کرمبز	ایک کپ
گھی یا مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	حسب ذائقہ ضرورت

ترکیب :

آلوؤں کو ابال کر میش کرلیں۔ سبزیاں (گاجر' بند گوبھی' چقندر اور مٹر وغیرہ) ابال کر باریک کاٹ لیں۔ ثابت دھنیا بھون کر موٹا موٹا پیس لیں۔ گھی گرم کر کے اس میں لہسن اورک پیسٹ بھونیں اور پھر کٹی ہوئی چار ہری مرچیں اور تمام پاؤڈر مسالے شامل کر کے ذرا سا بھونیں پھر سبزیاں شامل کر کے اس وقت تک فرائی کریں جب تک کہ ان کا پانی بالکل خشک نہ ہو جائے۔ اب اس آمیزے میں ابلے ہوئے آلو بھی شامل کریں اور اچھی طرح مکس کرلیں۔ چولہے سے اتار کر ایک انڈے کی سفیدی شامل کریں تاکہ سبزیوں کا آمیزہ یکجان ہو جائے۔ اب اس آمیزے سے کباب کی شکل کی ٹکیاں بنائیں' ایک پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر بریڈ کرمبز میں رول کر کے گھرے تیل میں تل لیں۔ سبزیوں کے مزے دار کٹلٹس تیار ہیں۔ کیچپ یا چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

وائٹ گوشت مسالا

اجزا :

گوشت	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
لہسن' ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
شملہ مرچ' آلو	ایک' ایک عدد
ہری مرچیں	چار عدد
کارن فلور	ایک چائے کا چمچہ
نمک اور تیل	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

گوشت میں پیاز' لہسن ادرک پیسٹ' سفید مرچ پاؤڈر' نمک' آلو اور تیل شامل کر کے پکائیں۔ گوشت گل جائے اور پانی کی مقدار آدھے سے بھی کم رہ جائے تو کارن فلور ذرا سے پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ شامل کریں۔ ساتھ ساتھ چمچہ بھی چلاتی رہیں۔ جب شوربا گاڑھا ہو جائے تو شملہ مرچ اور ہری مرچیں ڈال کر چولہے سے اتار لیں۔

کسٹرڈ شاہی ٹکڑے

اجزا :

ڈبل روٹی کے سلائس	چھ عدد
دودھ	آدھا لیٹر
ونیلا کسٹرڈ پاؤڈر	دو کھانے کے چمچ
پستے' بادام	حسب ضرورت
زردے کا رنگ	ایک چٹکی
کنڈینسڈ ملک	ایک ٹن
چینی' گھی	حسب ذائقہ و ضرورت

ترکیب :

ڈبل روٹی کے سلائسز کے چار چار ٹکڑے کرلیں اور انہیں گھی میں فرائی کریں۔ سنہری ہو جائیں تو نکال لیں۔ آدھا لیٹر دودھ میں سے تھوڑا دودھ نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔ باقی دودھ کو چینی اور زردے کا رنگ شامل کر کے پکائیں۔ جب چینی حل ہو جائے تو بچائے ہوئے ٹھنڈے دودھ میں ونیلا کسٹرڈ پاؤڈر گھولیں اور پکتے ہوئے دودھ میں ملا دیں۔ جب کسٹرڈ گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں تلے ہوئے سلائسز پھیلا کر رکھیں۔ اوپر سے کسٹرڈ ڈال دیں۔ ساتھ ہی آدھے پستے اور بادام بھی چھڑک دیں۔ آخر میں کنڈینسڈ ملک اوپر ڈالیں۔ باقی بادام اور پستے اوپر سے سجا دیں۔ مزیدار کسٹرڈ شاہی ٹکڑے تیار ہیں۔

دودھ کا حلوہ

اجزا :

دودھ	ایک لیٹر
دہی	آدھا کپ
چھوٹی الائچی	چار عدد
خشک میوہ	حسب ضرورت
چینی	حسب ذائقہ
گھی	تین چمچے

ترکیب :

پتیلی میں دودھ اور دہی ایک ساتھ ڈال کر رکھ دیں۔ جیسے ہی دودھ پھٹنے لگے اسے تیز آنچ پر رکھ دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب دودھ خشک ہونے لگے تو بادام' کشمش اور چھوٹی الائچی کے دانے اور چینی بھی شامل کر دیں۔ تھوڑی دیر بھوننے کے بعد آنچ دھیمی کر دیں۔ گھی ڈال کر تھوڑی دیر تک بھونتی رہیں۔ جب ہلکا بادامی سا ہونے لگے تو اتار لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر پستہ کی ہوائیاں چھڑک کر پیش کریں۔

قد اور عمر کی مناسبت سے آپ کا وزن بھی ہونا چاہیے۔ لیکن کس عمر میں کتنا وزن ہو' اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہم قد اور عمر کے لحاظ سے وزن بتا رہے ہیں۔ لیکن یہ محض اندازہ ہے۔ جو ایک لاکھ تیس ہزار عورتوں کے اوزان کے مشاہدے سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آئیڈیل اور مکمل اوزان بہرحال نہیں ہیں۔

جوانی میں تیس یا پینتیس سال سے کم عمر کی خواتین کا وزن میزان میں دیے ہوئے وزن سے کم ہونا چاہیے۔ اس عمر میں وزن کا زیادہ ہونا' بیماریوں کی نشوونما کا باعث بنتا ہے۔

ذیابیطس' دل و گردے کی بیماریاں زیادہ وزن کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ وزن ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں زیادہ چکنائی کی چیزیں استعمال کرتی ہیں۔ جبکہ محنت طلب کام اور ورزش نہیں کرتیں۔ چنانچہ فاضل چربی ان کے جسم میں جمع ہو کر موٹاپے کا باعث بنتی ہے اور زیادہ موٹاپا جسم کی زیادہ بے آرامی اور تھکن کا باعث بھی بنتا ہے۔

بعض خواتین کو یہ شکایت بھی ہوتی ہے کہ ڈائٹنگ کرنے کے باوجود ان کے موٹاپے میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مرغن چیزیں اور پھل فروٹ کا استعمال کرتی ہیں اور کھانا کھانا چھوڑ دیتی ہیں۔ ورزش اور محنت طلب کام بھی نہیں کرتیں۔ پھر ان کی ڈائٹنگ کرنے سے مقصد تو حل نہ ہوا تو موٹاپا کس طرح کم ہو۔

کچھ خواتین اس سلسلے میں بازار کی بنی ہوئی ادویات استعمال کرتی ہیں اور پھر اس کے بے کار ہونے کی شکایت کرتی ہیں۔

وزن کو کم کرنے کا آسان اور سادہ طریقہ یہ ہے کہ مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کیا جائے۔

1 - وزن کم کرنے سے پہلے کسی اچھے ڈاکٹر سے جسمانی معائنہ کروائیں۔ ممکن ہے' وزن کی زیادتی کسی مہلک بیماری کا پیش خیمہ ہو۔

2 - عمر اور قد کے لحاظ سے فالتو وزن کو ذہن نشین کرلیں اور اس کو کم کرنے کے لیے ایک مقدار مقرر کرلیں۔ وزن کو آہستہ آہستہ گھٹائیں۔ ہفتے میں ایک یا آدھا پونڈ وزن کم کرنا مناسب ہے۔

3 - ایسی غذا استعمال کریں' جس سے پوری غذائیت حاصل ہو' لیکن وزن نہ بڑھے۔

4 - ہر روز مناسب ورزش کریں۔

5 - دن میں تین دفعہ کھانا کھائیں' درمیانی وقفے میں دوسری چیزیں نہ کھائیں۔

6 - ہر ہفتے اپنا وزن کرائیں اور اس بات کا اندازہ لگائیں کہ کس رفتار سے آپ کا وزن کم ہو رہا ہے۔

غذا جسم کا لازمی جزو ہے۔ یہ جسم میں توانائی پیدا کرتی ہے اور اندرونی مشین کو کام کرنے کے لیے قوت فراہم کرتی ہے۔ لیکن غذا جسم میں اتنی ہی کام آتی ہے، جتنی جسم کو ضرورت ہوتی ہے۔ فالتو غذا چربی کی صورت میں جسم میں جمع ہو جاتی ہے۔ اس لیے آپ کم مقدار میں کھانا کھائیں۔

یہ وہ اصول ہیں، جن کے ذریعے وزن کو کم یا زیادہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک عورت کو روزانہ 1800 سے 2000 کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر وزن زیادہ ہو اور اسے کم کرنے کی ضرورت ہو تو 1200 سے 1600 کیلوریز کی مقدار جسم میں پہنچانی چاہیے۔

اگر تھوڑا وزن کم کرنا ہو تو زیادہ گھی، مٹھائی... تلی ہوئی اشیا سے پرہیز کرنا چاہیے۔ دوا کے طور پر وٹامن اے، ڈی، سی کیپسول ایک ماہ تک استعمال کریں۔

روزمرہ خوراک میں مندرجہ ذیل اشیا کو شامل کر لیں۔ کیونکہ غذا کی کمی کے باوجود جسم کو ضرورت کے لحاظ سے توانائی کی مقدار ملنی چاہیے۔

اگر دودھ کا استعمال کیا جا رہا ہو تو اس کی جگہ مچھلی کا تیل استعمال کریں۔ ایک انڈا، ٹماٹر کا رس، کوئی ایک پھل، تھوڑا سا مکھن، کچی ترکاری (مثلاً" گاجر، سلاد، چقندر وغیرہ۔) مچھلی یا گوشت کی کم از کم ایک بوٹی، پانچ چھ گلاس پانی۔

اگر وزن زیادہ بڑھ گیا ہو تو اس کے لیے کافی محنت اور مستقل مزاجی کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ وزن گھٹانے کے لیے مندرجہ ذیل پروگرام پر عمل کریں۔

وزن کم کرنے کے لیے مناسب غذا

ناشتا

ڈبل روٹی کا ایک توس بغیر مکھن یا جام کے، ایک انڈا ابلا ہوا اور چائے کی ایک پیالی بغیر چینی کے۔

دس بجے کے قریب کوئی پھل مثلاً" ایک سیب یا تین چار مالٹے، کینو وغیرہ یا ایک گلاس کسی تازہ پھل کا رس۔

دوپہر کا کھانا

سلاد، کھیرے، کچی سبزیاں، ٹماٹر زیادہ استعمال کریں۔ بغیر گھی کے پکی ہوئی سبزیاں، گوشت تین بوٹیاں یا کلیجی، مرغی یا مچھلی کا ایک ٹکڑا، دالیں بغیر بگھار کے۔ ایک چھوٹے سائز کی چپاتی (بغیر چھنے آٹے کی۔)

مندرجہ بالا اشیا میں سے سلاد، ٹماٹر، کھیرے وغیرہ روزانہ استعمال کریں۔ شام کو بغیر چینی کی ایک پیالی چائے۔

رات کا کھانا

گوشت کی دو بوٹیاں یا تھوڑی سی ابلی ہوئی سبزی یا دو عدد کباب، آدھی چپاتی یا ایک ڈبل روٹی کا توس۔

رات کو سونے سے پہلے ایک پیالی گرم دودھ بغیر چینی کے پئیں۔ صبح نہار منہ آدھا لیموں ایک گلاس پانی میں ڈال کر بغیر چینی کے پئیں۔

چاول، میدہ، نشاستہ والی چیزیں، گوبھی، آلو، گھی، مکھن، مٹھائیاں، میٹھی چیزیں، چینی، تلی ہوئی چکنی چیزوں سے مکمل پرہیز کریں۔

اس کے علاوہ صبح باقاعدگی سے سیر کریں۔ رات کو کھانے کے بعد کم از کم ایک میل پیدل چلیں، روزانہ صبح و شام رسی کودیں۔

اس پروگرام پر عمل کر کے ہر ماہ پانچ، چھ پونڈ وزن کم ہو گا۔ ملٹی وٹامنز کی ایک گولی صبح اور ایک شام کو کھانا چاہیے۔